تقدیس



سلمیٰ غزنوی

تقدیس

سلمٰی غزنوی

گلوب پبلشرز - ۱۲ اردو بازار لاہور فون ۶۲۴۶۳

انتساب

اپنے بہت ہی پیارے بھائی جان

فلائنگ آفیسر غزنوی شہید

— کے —

نام

ناشر رشید نظامی
مطبع نظامی پریس لاہور

نگارش

؎ تیرے نام سے ابتداء کر رہی ہوں تیرے نام سے انتہا چاہتی ہوں

اگرچہ صنفِ ادب ایک ایسا اتھاہ سمندر ہے جس کا کوئی ساحل نہیں کنارہ نہیں ایسا وسیع و عریض آسمان جس کی وسعتوں کا کسی کو کبھی کچھ بھی اندازہ نہیں۔ ایک ایسا طویل، طویل ترین سلسلہ وار پہاڑوں کا سلسلہ جو لگاتار چلا جاتا ہے، بے حساب، بے کتاب۔

ایسے سمندر میں، ایسے آسمان پر، ایسے بلند و بالا پہاڑوں پر قدم رکھنا، بسیرا کرنا، شاد و آباد قلم و دامِ رسنا، بہت سے اربابِ قلم کی طرح میری بھی تمنا رہی، اپنی امیدوں، آرزوؤں اور تمناؤں نے، آنکھیں ملتے ملتے صبحِ امید کے روشن، معصوم چہرے پہ جھکی زلفِ خمیدہ و پیچیدہ کو جب چہرے سے ہٹا دیا تو اجلے اجالے بکھر گئے، ستارے بجھ گئے، چاند ماند پڑ گیا۔ تمناؤں کی تکمیل کا سورج روشن روشن، اور روشنی ہر سو، چہار سو پھیل گئی۔ جب میں نے پہلی بار قلم اٹھایا، زنگار رنگ الفاظ کو ملایا تو نازک نازک گلاب کی گلابی پتی جیسی ننھی سی "فریحہ" کے گرد قلم گردشوں میں رہا۔ فریحہ کا ماہتابی شباب، آفتاب کے مقابل آ گیا۔ لمحات نے پہلو بدلا، موم شمع کی طرح روشن، دئیے کی لو کی طرح کومل قندیل کے کندنی چہرے پہ نگاہ نہ ٹھہرتی تھی۔ سنہری قندیل میرے قلم کی گردشوں کے ساتھ

رواں دواں رہی۔ وقت کی ایک اور گردش کے ساتھ شفق رنگ، سرمگیں، دلنشیں شام، بڑی سہانی، سانولی سلونی شام کی طرح خوبصورت "شاماں" کے گرد دائرے، دائرہ در دائرے بنتے گئے۔ اپنی شاماں کے سانولے سرمگیں روپ کے سامنے ہزاروں اجلی نکھری صبحیں اور روپہلی راتیں جھکی جھکی نظروں کے ساتھ چھپی چھپی سے نظر آنے لگیں، بادلوں کی اوٹ میں درختوں کی چھاؤں میں، پہاڑوں کے دامن میں ۔۔۔!

اور اب؟

زیرِ نظر تقدیس کی چکا چوند ہے کہ گویا آفتاب کی کرنوں نے، ماہتاب کے نور نے منور چہرے کو کندن بنا دیا ہے۔ اجلی نکھری چاندنی کی طرح، سورج کی حدت سے پگھلی چاندی کی طرح سبک خرام، نازک اندام لہراتی ندی کی طرح میرے قلم کے رنگوں کے ساتھ محوِ خرام، محوِ خود آرائی ہے۔ بال بال موتیوں سے مرصع تقدیس تمام تر کاوشوں کا ثمر ۔۔۔ ایک خاص اہمیت کی حامل ہے کہ اپنے ہی خیالات کی ترجمانی اپنے ہی احساسات کی عکاسی، نہ کچھ ڈھونڈنا پڑا، نہ سوچنا پڑا، شبانہ کی سوچ، شبانہ کے انداز، بھائی پہ صدقے واری جانے والی بہن شبانہ، بھائی کی اچانک وفات پر ہوش و حواس سے بیگانہ، دیوانہ وار، بیقرار بہن کا پیار، شبانہ کے روپ میں عکس میرا ہی رہا۔ ہر قدم، ہر ہر موڑ پر راہِ حیات میں، کہ میرے اپنے بڑے بھائی جان کہ ۔۔۔ بھائی تو بہن کی جان ہوتے ہی ہیں۔

"فلائنگ آفیسر غزنوی شہید" جب ہوائی حادثہ میں ہم سے جدا ہو گئے تو ان ہی حالات سے، ان ہی کیفیات سے گذرنا پڑتا تھا۔ ہر روز، ہر شب، ہر لمحہ، ہر پل دل چاہتا تھا۔ اب بھی دل میں ایک حسرت ہے، ایک یاس میں ڈوبی آس ہے کہ کاش "میرے بھائی جان آ جائیں" ۔۔۔ اور اس انہونی خواہش کو دوسرے واقعات کے ساتھ اس ناول میں سچ کر دکھانے کی کوشش کی ہے، اپنی دبی خواہش کو شبانہ کی زبان میں بیان کیا ہے ؎

اب اور کہیں کیا، جب کچھ نہ کہا جاتے

سلمیٰ غزنوی

باب ۱

ع جب گھٹائیں جھوم کر ساون میں آتی ہیں
تو مے بھی رقص میں آتی ہے میخانے بھی آتے ہیں

شدت کی سردی پھر سردیوں کی برسات !

کالی کالی گھنگھور گھٹائیں کئی دن سے گھر گھر کر آ رہی تھیں، پچھلی رات سے بڑے زور کا پانی برس رہا تھا۔ بارش کی زوردار بوندوں سے ٹکراتی مست، سرکش ہوا کا شور۔ بادل رہ رہ کر گرجتے اور بجلی کوندر رہی تھی۔ قدرت کی مہربانی سے بارانی پانی سے نہاتے دھوتے رنگارنگ پھولوں اور سرسبز پتوں پہ بڑا حسین نکھار آ گیا تھا۔

یخ بستہ نم آلود ہوائیں، اوپر سے جاڑوں کا موسم۔

سردی نے شدت اختیار کر لی تھی۔ ہر طرف دروازے بند، دریچے بند، بوجھل پردے گرائے، برقی ہیٹر لگائے، سردی کی شدت کو کم

کرنے کی کوششیں ناکام ہوتی جا رہی تھیں۔ سردی سے بچنے کے لیے لوگ لحافوں، کمبلوں میں لپیٹے، سمٹے دبکے ہوئے تھے۔

لیکن!

خوبصورت شہزاد ہمیشہ سے ایسے موسموں کے شیدائی تھے اور من پسند موسم میں گھومنا پھرنا، موسم سے لطف اندوز ہونا بہت پسند کرتے تھے۔ آسمانی رنگ کا نائیلون کا قیمتی رین کوٹ اور گھٹنوں تک لمبے ربڑ کے جوتے پہنے پتلون کے پائنچے بوٹوں کے اندر کر رکھے تھے۔ بہتے پانی میں شپ شپ کرتے بارش میں بھیگتے وسیع و عریض سفید عالی شان کوٹھی کے بلند قامت گیٹ میں داخل ہوتے۔ گیٹ سے لے کر پورچ تک پختہ سرمئی سڑک پر دو رویہ رنگ برنگ پھولوں کی کیاریوں کے درمیان سے گذرتے اندر آ رہے تھے۔ پورچ اور برآمدے کے سفید ستون سرخ اور سفید گلاب کی بیلوں سے ڈھکے ہوئے تھے۔ بارش کے زور اور ہوا کی تیزی کی وجہ سے گلاب اور سبز پتے نازک ٹہنیاں ادھر ادھر بکھری ہوئی تھیں اور بہتے پانی پر تیرتی بھلی معلوم دے رہی تھی۔ صبح سویرے گھر سے نکلے اب واپس آئے تھے۔ بیرونی وسیع برآمدے کی تین سیڑھیاں چڑھ کر برآمدے میں قدم رکھا۔ پانی کے قطرے کوٹ پر سے پھسل پھسل کر نیچے گر رہے تھے، جیسے

آبدار موتیوں کی لڑیاں ٹوٹ کر اور بکھر کر موتی لڑھک رہے ہوں۔
کوٹ کے ساتھ ہی سلی ہوئی ٹوپی سر سے اتار دی۔ سیاہ بھیگے بال روشن کشادہ پیشانی پہ چپکے ہوئے تھے۔ ہاتھ سے پیشانی کے بالوں کو نچوڑتے اور دونوں ہاتھوں سے بالوں میں کنگھی کرتے سلجھاتے، سنوارتے ہوئے طویل راہداری میں جھانکا۔ خاموش فضاؤں نے ماحول کو بوجھل اداسیوں کی لپیٹ میں لے رکھا تھا۔ بند دروازوں، کواڑوں، کھڑکیوں اور دریچوں پر نظر پڑی تو سخت ذہنی کوفت ہوئی شہزاد کو، وہیں پاؤں پٹخ کر جھلا کر رہ گئے۔

"اُف میرے خدا! آخر بد ذوقی کی بھی کوئی حد ہوتی ہے اور ہر حد کی ایک انتہا ہوتی ہے۔

"اتنے خوبصورت، اتنے پیارے رنگین و حسین موسم کو لحاف میں دبک کر یوں منہ چھپائے گذار دینا کہاں کی انسانیت ہے"؟

شہزاد نے شبانہ کی خوابگاہ کے دونوں دروازے دونوں ہاتھوں سے دھکیل کر زور سے کھول دیئے۔ گلابی رنگ کی مسہری کے سرہانے کی طرف قریب ہی مدھم نیلی روشنی کا بلب نازک سے ٹیبل لیمپ میں روشن تھا۔ نرگس کے مصنوعی پھولوں کے گلدستے میں سے نیلی روشنی کا بلب خریدنے والے کے عمدہ و اعلیٰ ذوق کا شاہد تھا۔

برقی ہیٹر سرخ انگاروں کی طرح دہک رہا تھا۔ باہر انتہائی شدید ٹھنڈی برف آلود مگر خوشگوار ہواؤں کی فضاؤں کی نسبت کمرے میں گرمی تھی۔ ایک دم گرمی کا احساس ملا اور چہرے پہ تپش محسوس ہونے لگی۔ بڑبڑاتے ہوئے بڑھ کر برقی ہیٹر کا سوئچ بند کر دیا۔ پھر ٹیبل لیمپ بھی بجھا دیا۔ پردے، قالین، لحاف، کمرے کی ہر چیز گلابی گلابی تھی۔ سارے گلابی سائے اندھیروں میں ڈوب گئے۔ اور شہزاد نے بھیگے، ٹھنڈے ہاتھ گلابی ریشمی لحاف میں ڈال کر شبانہ کے گرم گرم، نرم نرم گالوں اور گردن پر لگاتے اور اس کا نرم و نازک، ملائم ہاتھ اپنے ہاتھ میں پکڑ کر بولے۔

"جلدی اٹھو، بدذوق کہیں کی۔ کیسے اپنی دنیا محدود کر کے پڑی ہو۔" ایک بار پھر اپنے برف کی طرح ٹھنڈے ہاتھوں سے شبانہ کے چہرے کو چھوا۔

"اوئی۔" کہتے ہوئے نرم و نازک ہاتھ شہزاد کی گرفت سے چھڑایا۔ اور دوبارہ اپنے دونوں طرف خوب اچھی طرح لحاف سمیٹ کر کروٹ بدلی۔

"شبانہ کی بچی اٹھتی ہو — یا لاؤں پانی۔ قسم خدا کی تمہارے گرم بستر پر پانی ڈال دوں گا، ورنہ میرے ساتھ باہر چلو۔"

شہزاد تیزی سے کمرے کی کھڑکیاں کھول رہے تھے۔ پردے لپیٹ کر اوپر کر دیئے۔ بڑی ٹھنڈی ہوا کے جھونکوں کے ساتھ بارش کی زبردست بوچھاڑ بستر کو بھگونے لگی۔ اتنا موٹا مخمل کا لحاف اوڑھنے کے باوجود بھی اندر ہی کپکپی لگ گئی۔ اور وہ دبک کر سکڑ سمٹ کر بھٹھرنے لگی۔

"شبانہ — شبانہ! بھئی اب نکل بھی آؤ نا بستر سے باہر۔"

کھڑکیاں دروازے کھولنے کے بعد شہزاد واپس پلنگ کے قریب آئے۔ دونوں ہاتھوں سے لحاف کھینچ کر دور پھینک دیا۔ انہیں اب غصہ آ رہا تھا، بہت زیادہ غصہ۔

اور!

وہ!

جلدی سے دوپٹہ درست کرتی ہوئی پلنگ سے اتر کر ایک طرف دیوار کے قریب ٹھٹھرتی، لرزتی، کانپتی ہوئی کھڑی ہو گئی۔ باہر سیاہ بادلوں کی وجہ سے اندر بڑا اندھیرا تھا۔ بادلوں کی زوردار گرج، سردی کی شدت، پھر شہزاد کی شرارت کی وجہ سے وہ لڑکھڑا رہی تھی۔ کھڑا ہونا مشکل تھا اس کے لیے۔ برقی روشنی بند کر دینے کی وجہ سے اندھیرے اور بھی گہرے ہو گئے تھے۔ وہ دراز قامت الماری کھول

کر سیاہ زنانہ کوٹ اور اپنے ہی جیسا گلابی رین کوٹ لے کر پلٹے۔

"یہ پہن لو جلدی سے۔" سردی سے کپکپاتی نازک اندام سی لڑکی کو اپنے ہاتھ سے گرم کوٹ پہنا کر واپس الماری کی طرف گئے۔ وہ ربڑ کے جوتے اندھیرے کمرے میں تلاش کر رہے تھے۔ جلدی اور افراتفری میں شہزاد نے نہ تو بلب ہی جلایا اور نہ ہی شبانہ کی غیر معمولی خاموشی کو محسوس کیا۔

اور؟

وہ؟

سیاہ اونی کورٹ پر نائیلون کا برساتی کوٹ پہن کر ربڑ کے جوتے پہننے کے لیے جھکی ہی تھی کہ شہزاد اس کو اپنے بازو کے حلقے میں لیے تقریباً گھسیٹتے ہوئے کمرے سے باہر سیڑھیوں کی طرف آ گئے کہ وہ اپنے سرخ مخمل کے سلیپر بھی تبدیل نہ کر سکی۔

"شبانہ! میری پیاری! دیکھو تو کتنا پیارا، کتنا خوبصورت موسم ہے۔ چلو سیر کو چلیں۔ حیرت کی بات تو یہ ہے کہ تمہیں حسن فطرت سے، حسین نظاروں سے کوئی بھی لگاؤ نہیں۔ جبکہ میں جان دیتا ہوں بھیگتے، برستے، حسین موسموں پر۔"

شہزاد اپنی دھن میں، اپنے سہارے میں اس کو لیے سیڑھیاں اُتر

رہے تھے۔ اور وہ بھی موم کی گڑیا کی طرح خاموش، بے زبان۔ پہلو بہ پہلو، ساتھ ساتھ، قدم قدم، سحر زدہ سی چل رہی تھی۔

سحر زدہ تھی؟

یا ــــ!

مجسم سحر؟

یا ــــ؟

خود ہی ساحرہ تھی کہ شہزاد کے ہوش وحواس ہی ٹھکانے نہ تھے۔ وہ بے خود ہوتے جا رہے تھے۔ زینے پر سے اُترتے ہوئے نگاہ اٹھائی تو سامنے کوٹھی کے وسیع و عریض لان، کشادہ پختہ روشیں۔ روشوں کے کناروں پر ایک سفید اور ایک سُرخ اینٹ بڑی ترتیب سے لگا کر کنارہ بنایا گیا تھا اور دُور پھاٹک تک جاتی سرمئی سڑک پانی سے جل تھل ہو رہی تھی۔ سرخ، زرد، نیلے، سفید گلابی، کاسنی رنگ برنگ پھُول دھلے دھلے، نکھرے نکھرے سبز پتوں میں ان کے رنگ اور بھی گہرے لگ رہے تھے۔ پھلدار، پھولدار، قدآور تناور درخت سب ہی نہائے دھوئے خوش باش اور ہشاش بشاش تھے۔ بارش اب بھی زوروں پر ہو رہی تھی۔ نہر کی طرح بہتے پانی میں گرتی بوندوں سے بلبلے اٹھتے اور دائروں میں دائرے بنتے جا رہے تھے۔ ہوا

یخ بستہ مگر خوشگوار تھی - بڑی مزیدار تھی - برآمدے کے ستونوں سے لپٹی آتشیں سرخ اور سفید گلاب کی بیلیں اور گہرے سبز رنگ کے پتوں نے تیز بارش اور زوردار ہوا کی وجہ سے ٹوٹ کر بکھر کر سارے برآمدے میں اور برآمدے سے نیچے پورچ میں بڑا خوبصورت فرش بچھا دیا تھا- جیسے ماہرین قدرت نے گل رخ، گل اندام، گلبدن مہمان کی آمد کے لیے پھولوں سے سنوار کے رنگین پربہار آراستہ و پیراستہ راستہ بنایا تھا- بہاریں پھول برسا رہی تھیں- ہوائیں گیت گا رہی تھیں، بھیگی فضائیں صدقے واری جا رہی تھی - شہزاد پھول سے وجود کو بازو میں لیے قدرت کی کرم فرمائی میں کھوئے آخری سیڑھی سے نیچے اُترے - پھولوں اور پتوں کے تہ در تہ دبیز فرش پر قدم رکھتے آگے بڑھے-

قرمزی رنگ کی چمکدار چھوٹی موٹر برآمدے کے ساتھ پورچ میں آکر رُکی - سُرخ، نیلی اور سبز جلد کی چار کتابیں ہاتھ میں لیے سُرخ کوٹ کے کالر چڑھائے ہنستی مسکراتی سُرخ و سفید شبانہ گاڑی سے اُتر رہی تھی-

"شبانہ — تم — تم — کہاں تھی؟" انتہائی حیرانی میں شہزاد صرف اتنا ہی کہہ سکے-

"بھائی جان! آپ ہماری آپی کو اتنی ٹھنڈک اور بارش میں کہاں لے چلے؟" شبانہ نے شہزاد کے ساتھ کھڑی خاموش تقدیس کی طرف ہنستے ہوئے اشارہ کر کے پوچھا۔

صحت مند گلابی چہرہ سردی کی زیادتی سے سرخ ہو رہا تھا۔ ہنسی اور شوخی کی وجہ سے چمک اور بھی بڑھ گئی تھی۔ رخسار دہک رہے تھے، آنکھیں دمک رہی تھیں حسین شبانہ کی — چہرہ چمک رہا تھا۔

"اوہ — بڑا مزہ آیا بھئی آج تو حد ہی ہو گئی"۔ بڑی شوخ و شریر نگاہیں تقدیس کے شفق رنگ گلنار چہرے پہ نثار کرتے ہوئے شہزاد زور زور سے قہقہے لگا رہے تھے۔ شبانہ بھائی کے ساتھ ہنسی میں برابر شریک تھی لیکن تقدیس سر جھکائے دانتوں میں انگلی دبائے سرخ ہوتی رہی۔ بارش میں دھلے، اُجلے، نکھرے سرخ، گلابی گلاب کی طرح!

"یک نہ شد دو شد۔" شہزاد نے شبانہ کے برابر اور اپنے روبرو تقدیس کو شانوں سے پکڑ کر کھڑا کرتے ہوئے ذرا جھک کر شرارت سے کہا۔

"ہم بھی اکثر سوچا کرتے تھے کہ محترمہ تقدیس صاحبہ آتے ہی

شبانہ بیگم سے اس قدر کیوں گھل مل گئیں۔ ہاں بھئی ذوق جو ملتے ہیں۔ دونوں بدذوق جو ٹھہریں۔"

شہزاد بڑے خوش خوش، بڑے لبشاش تھے۔

"تم اتنی بارش میں چھٹی کے دن کالج کیا لینے گئی تھی"۔ شہزاد نے ایک زوردار گھونسا شبانہ کی کمر میں رسید کیا۔

"اُف — اُف — بھائی جان! ہزار مرتبہ کہا ہے کہ اتنی زور سے یہ مکہ نہ مارا کیجئے"۔ شبانہ نے مُنہ لبورتے ہوئے ہمیشہ کی طرح زوردار گھونسہ کھانے کے بعد اپنا مخصوص فقرہ دہرایا۔ واقعی شہزاد کا ہاتھ بوجھل تھا۔ اور نرم و نازک شبانہ کے لیے خاصہ تکلیف دہ تھا، لیکن بھائی کا لاڈ اور شرارت کی عادت بھر گہری محبت کی وجہ سے ہمیشہ سہہ جاتی۔

"ہمارے کالج میں کل اور پرسوں سالانہ مباحثہ ہے۔ پہلے اردو پھر انگریزی اور پھر رات کو بڑا شاندار مشاعرہ بھی ہے۔ میں بھی تو حصّہ لے رہی ہوں، اس لیے تیاری کی غرض سے آج جانا ضروری تھا۔ بارش میں جانے سے کیا فرق پڑتا ہے۔ موٹر میں گئی اور آگئی۔ دیکھئے جوتے تک بھی خراب نہیں ہوئے"۔ شبانہ نے کالج یونیفارم کے سرخ کوٹ کی جیب میں سے ہاتھ نکال کر سفید

سفید شلوار کے پائنچے اوپر کرتے ہوئے، اونچی ایڑی کے سیاہ کوٹ شوز کی طرف اشارہ کیا۔

"اچھا جی۔۔ تو مشاعروں، مباحثوں میں کتابوں سے کیا مطلب"۔ شبانہ کے دائیں ہاتھ میں پکڑی رنگین جلد کی کتابیں شہزاد نے اچکتے ہوئے کہا۔

ڈرائیور گاڑی صاف کرکے واپس اپنے کوارٹر کی طرف جا چکا تھا۔ اور یہ تینوں اپنے برآمدے میں کھڑے تھے۔ مہین کاغذوں کی طرح نازک پھولوں کی پتیاں ہوا کے زور سے اُڑ کے ان کے شانوں اور بالوں اور کپڑوں پر آ آ کے گر رہی تھیں۔ کالے بادل امڈ کر آ رہے تھے۔ بار بار بجلی چمک رہی تھی۔ گھن گرج اور کڑک کے باوجود تینوں بے فکرے موسم کی شدّت سے بے خبر اپنی ہی دنیا میں کھوئے ہوئے تھے۔

"اپنی آپی اور آپ کے لیے انگلش ناول لائی ہوں"۔ شبانہ نے خاموش متبسم کھڑی تقدیس کو اپنے دونوں بازوؤں کے حلقے میں لیتے ہوئے زینے کی طرف قدم بڑھائے۔

"لائیے ہماری کتابیں دیجیے"۔ شبانہ نے شہزاد کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے پلٹ کر دیکھا، وہ ابھی وہیں کھڑے تھے۔

"نا سنو باتیں — اپنی جڑواں بدذوقی۔ اور یہ کتابیں سب چیزیں چھوڑو اور جلدی رین کوٹ لے کر ہمارے ساتھ بارش میں گھومنے کے لیے تیار ہو جاؤ — ورنہ ہم چلے؟" شہزاد نے زینے کا سہارا لیے کھڑی تقدیس کا بازو پکڑتے ہوئے کہا۔ ایک پاؤں ایک سیڑھی پہ اور دوسرا ابھی نیچے ہی تھا۔ وہ تقدیس کو ساتھ لیے برآمدے سے نیچے پورچ سے باہر گیٹ کی طرف جاتی سڑک پہ پانی میں اُتر گئے۔ تیز چلتا کافی گہرا پانی، اوپر سے چھم چھم برستا بادل، بڑے خوش خوش، مسکراتے ہنستے لگاتے زور دار بارش میں بھیگتے، مست ہوا میں جھومتے رنگ برنگ پھولوں کی روشوں کے درمیان سے گذرتے آہستہ قدم جا رہے تھے کہ شبانہ بھی بھاگتی ہوئی ساتھ آملی تھی۔ وہ بارش میں گھومنے کے لیے تیار تھی۔ اس مختصر مگر حسین و شگفتہ قافلے کی آمد سے بہاروں پہ رنگین نظاروں میں مزید رنگ اور نکھار آگیا تھا۔ چار سو رنگینیاں بکھر گئی تھیں۔

تقدیس کے مخمل کے سلیپر پانی کی سطح پر تیرتے ادھر ادھر جا رہے تھے۔ اتنے زور دار پانی میں بیڈ روم سلیپر کیا ساتھ دیتے۔ وہ تو شبانہ نے عقلمندی کی، آتے ہوئے ربڑ کے لمبے بوٹ کمرے میں سے ساتھ لیتی آئی تھی کہ بہن کے پاؤں

میں سُرخ سیلپر دیکھ چکی تھی۔ گیٹ کے اطراف میں بنے ہوئے پختہ چبوترے پر رُک کر تقدیس نے بوٹ پہن لیے اور پاؤں خشک کرنے کے لیے شہزاد کا چھوٹا تولیہ نما رومال رضا کارانہ خدمات بجالایا موسم کی شدت کے باوجود تینوں کے عزائم پختہ تھے۔

آج صبح کالج جاتے ہوئے شبانہ نے تقدیس کو اپنے ساتھ لے جانا چاہا، لیکن سر میں درد اور طبیعت کی سستی محسوس کر رہی تھی۔ دوسرے یہاں کی برسات سے بھی کچھ گھبراتی تھی۔ یورپ کی بارشوں سے بالکل مختلف۔ اس لیے شبانہ زیادہ اصرار نہ کر سکی۔ اور اس کے جانے کے بعد تقدیس اس شاعرانہ، ساحرانہ موسم میں شبانہ کے پلنگ پر لیٹی باہر کا نظارہ کرتی رہی۔ اور پھر وہیں گرم بستر میں اخبار پڑھتے پڑھتے اُسے نیند آ گئی۔

اور!

اب — شہزاد اپنی ہی دھن میں شبانہ کی غلطی میں تقدیس کو گھسیٹتے، کھینچتے زبردستی سیر کے لیے لے جا رہے تھے۔ اب شبانہ کے آجانے سے رونق بڑھ گئی تھی۔

سعدیہ بیگم کھانے کے وسیع آراستہ کمرے میں بڑی گول میز کے گرد پڑی آٹھ خوبصورت کرسیوں میں سے ایک پر بیٹھی تھیں۔

کرسیاں کیا تھیں، شاہی نشستیں تھیں۔ پشت پر گولائی میں چمکدار پیتل سے مینا کاری اور نفیس شیشے کا کام بنا تھا۔ پھر سعدیہ بیگم کی رعب دار باوقار شخصیت کہ سادگی میں ہزاروں سنگھار تھے۔ خوبصورت گلابی رنگت بڑی ذہین کشادہ پیشانی، بڑی بڑی غلافی آنکھیں، مناسب ناک، خوبصورت دہن، جوانی میں بیوگی نے چہرے پہ ایک خاص سنجیدگی اور آنکھوں میں اداسیاں بھر دی تھیں۔ سیاہ مخملی کی شال نے حسن سوگوار کی تصویر کو زیادہ ہی نمایاں کر دیا تھا۔ اس وقت وہ کھانے پر بچوں کی منتظر تھیں۔ بوجھل پردے گرے تھے۔ برقی ٹیوب اور خوبصورت گلوب روشن تھے۔ ہیٹر دہک رہے تھے۔ بیرونی اندھیرے اندرونی روشنیوں کی فضا سے مات کھا گئے تھے۔ چمکدار شفاف میز انواع و اقسام کے کھانوں سے بھری پڑی تھیں۔ اتنی سخت سردی میں جبکہ رگوں میں خون بھی منجمد ہو رہا تھا۔ گرم کھانا تیار تھا۔ مزے مزے کی خوشبوئیں بھاپ کے ساتھ سارے کمرے میں بلکہ کمرے سے باہر بھی پھیلی تھی۔ مؤدب ملازم تعمیل حکم کے منتظر کھڑے تھے۔ سفید وردی اور سفید پگڑی، کمرے کی صفائی اور سجاوٹ اور نفاست میں اضافہ کر رہی تھی۔

شبانہ اور تقدیس کے پیچھے شہزاد بھی بادل نخواستہ کمرے میں دوپہر

کے کھانے کے لیے داخل ہوئے۔ اور سعدیہ بیگم کے دائیں ہاتھ کی کرسی پر بیٹھ گئے۔ ان کی امی (سعدیہ بیگم)، ان کے پسندیدہ موسم میں پہلی مرتبہ شہزاد کو کھانے کی میز پر دیکھ کر حیران رہ گئیں۔ بادل، بارش بس شہزاد کو کھانے پینے کی پرواہ کب ہوتی تھی، گھر آنے کا ہوش کب ہوتا تھا۔ اتنا جنون تھا، اتنا پیار تھا، انہیں موسم برسات سے۔

شہزاد، شوخ و شریر، بہت نٹ کھٹ تھے۔ ہر وقت ہر گھڑی چھیڑ چھاڑ، مار دھاڑ اور شرارت ان کا کام تھا۔

شبانہ — ہنستی مسکراتی، چہکتی، لہراتی، قہقہے لگاتی، بڑی باتونی بڑی سوشل، شوخ و شنگ تیز لڑکی تھی۔ محفلوں، بزموں، مشاعروں کی جان، کھیل کے میدان، غرض ہر جگہ ایک نمایاں مقام تھا۔ اپنے کالج کی روح رواں اور سہیلیوں کے جھرمٹ میں چاند — خوبصورت خوب سیرت!

اور!

بھولی بھالی — تقدیس — کی طبیعت میں رکھ رکھاؤ، تکلّف، متانت، سنجیدگی، بڑی کم گو، بڑی بے زبان واقع ہوئی تھی۔ اس وقت سعدیہ بیگم اور شبانہ کے درمیان میں بیٹھی نہ جانے کیوں معمول سے بھی زیادہ اداس چپ چاپ نظر آ رہی تھی۔

"بیٹی! کیا یہاں دل نہیں لگا؟" تقدیس کی غیر معمولی خاموشی اور اُداسی محسوس کرتے ہوئے سعدیہ بیگم نے تقدیس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"ہماری بیٹی جس دن سے آئی ہے ساون کی جھڑی لگی ہے۔ گھر سے باہر نہیں نکلی۔ ذرا موسم سنبھل جائے تو پھر شہزاد اور شبانہ کے ساتھ خوب سیر کرنا بیٹے۔" سعدیہ بیگم نے بڑی محبت سے کہا۔ بڑے پیار سے ایک ایک چیز تقدیس کو کھانے کے لیے کہہ رہی تھیں۔ خالص مشرقی کھانے روزانہ خاص طور پر تقدیس کے لیے تیار کرواتی تھیں۔

"امّی حضور! یہ سب کے سامنے تو کچھ کھاتی پیتی نہیں ہیں اور ہم نے کئی مرتبہ ان کو خانساماں سے علیحدہ روٹیاں، سالن، چاول، کھٹی میٹھی بہت سے دیگر ڈشش، کھانے کی تازہ بہ تازہ چیزیں اپنے کمرے میں چپکے سے منگواتے دیکھا ہے، یہ بستر میں چھپ چھپ کر کھاتی ہیں اور ہم سب پر یہ ظاہر کرتی ہیں کہ بڑی کم خوراک ہے ان کی۔" شہزاد نے کھانے کے دوران ہنسی روکتے ہوئے اپنی والدہ محترمہ سے کہا اور تقدس کے حسین چہرے کا تاثر، بکھرتے، سمٹتے رنگوں کی توس و قزح کا لطف اٹھانے کے لیے ادھر متوجہ ہو گئے۔

تقدیس نے ایکدم گھبرا کر پہلے شہزاد اور پھر سعدیہ بیگم کی طرف دیکھا جلدی سے پانی کا گلاس ہونٹوں سے لگا لیا۔ شبانہ بھی ہنسنے لگی۔

شریر شہزاد کی شرارت بھری ہنسی اور آنکھوں میں مسکراتی شوخی سرخ و سفید چہرے کو اور بھی حسین، حسین تر بنا رہی تھی۔

"آپی — آپ کو چند دن میں بھائی جان کی شرارتوں کی عادت ہو جائے گی۔ یہ تو ایسے ہی ستایا کرتے ہیں۔" شبانہ نے خوشدلی سے کہا۔ وہ شہزاد کی شرارت کی خاص عادت کے متعلق تقدیس کو بتا رہی تھی۔

"معلوم ہوتا ہے میری بچّی کو بہت ستاتے ہو۔" سعدیہ بیگم نے مسکراتے ہوئے بڑی محبت سے شرارتی شہزاد کی طرف دیکھتے ہوئے کہا اور تقدیس کو اپنے ساتھ چمٹا لیا۔ سیاہ گرم کوٹ میں تقدیس کا گلابی گلابی مکھڑا چمک رہا تھا۔ سیاہ ریشمی بال اور سفید ٹاپس بالوں میں سے جھانکتے کبھی صبح کبھی شام، کبھی دھوپ، کبھی چھاؤں کا منظر پیش کر رہے تھے۔

"بیٹی — ان کی باتوں کا کبھی، کچھ بھی خیال نہ کرنا۔ ان کی عادت ہی شرارت کی ہے۔ شبانہ کا بھی ہر وقت ناک میں دم رکھتے ہیں۔ گھر پہ ہوں تو ادھم، شور شرابے مچائے رکھتے ہیں۔ ان کے دم سے رونق اور بہار ہے میری زندگی میں۔" سعدیہ بیگم دھیمے لہجے میں بڑے پیار سے تقدیس کو بیٹے کی عادات

کا سمجھا رہی تھیں کہ وہ چند دن ہوئے یہاں آئی تھیں اور شہزاد کا پہلے دن سے ہی یہی رویہ تھا۔ ان کی ناواقفیت اور اتنا طویل عرصہ سب سے دُور رہنے کی وجہ سے پُر تکلف اجنبیت کی پرواہ نہ کرتے تھے۔

"امّی حضور! بھائی جان آج آپی جان کو اتنے زور سے برستی بارش اور جل تھل پانی میں اکیلے ہی لے کر شہر گھمانے لے جا رہے تھے اور وہ بھی بیڈ روم سلیپروں میں پیدل ہی۔" شبانہ نے شہزاد کی طرف دیکھتے ہوئے ہنس کر کہا اور سارا واقعہ سنایا کہ شبانہ کی غلطی میں تقدیس کو لیے جا رہے تھے۔ اتنے شوخ و شریر بنتے ہیں اور اپنی شبانہ کی پہچان نہیں۔" شبانہ بھی ہنسی ہنسی میں شہزاد کو چڑانے لگی۔" اور — ہم تو ڈر گئے تھے کہ ابھی ایک دھکا پڑے گا، اتنے زور سے گریں گے کہ سر پھٹ جائے ہمارا، دھاروں خون بہنے لگے۔ اور ہم امّی حضور کے ساتھ، خالہ جان کے ساتھ مرہم پٹی کرواتے، انجکشن لگواتے پھریں گے۔" شہزاد نے چپ چاپ سر جھکائے بیٹھی تقدیس کے بچپن کے اس واقعہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ جب وہ خود آٹھ برس کے اور تقدیس دو ڈھائی

سال کی تھی ۔ اس وقت شہزاد تقدیس کو بہت ستاتے چڑاتے، رلاتے تھے ۔ روتی دھوتی، چیختی چلاتی، ہزاروں احتجاج کرتی، لیکن شہزاد کو ایسے ہی مزہ آتا تھا ۔ ہر وقت چڑانا، ستانا رلانے کا بہانہ بنانا ۔

ایک دن ننھی منی، سجی سنوری گڑیا سی تقدیس سرخ ریشمی گھیر دار فراک، سفید موزے سُرخ جوتے پہنے اپنی تین پہیے کی چھوٹی سائیکل اسی کوٹھی کے وسیع و عریض برآمدے میں چلاتی چکر لگاتی پھر رہی تھی ۔ پچھلی سیٹ پر اپنے ہی جتنی بولنے اور چلنے والی گڑیا بٹھائی ہوئی تھی ۔ بڑی خوش خوش تیز سائیکل چلاتی گڑیا کو سیر کراتی اس کے ساتھ باتیں کرتی برآمدے کی وسعتوں میں گھوم رہی تھی ۔ شہزاد چھٹی کے وقت سکول سے واپس آئے، سکول کا یونیفارم، سفید قمیض، نیلی نیکر، سرخ ٹائی سفید موزے اور سیاہ جُوتے پہنے کتابوں کا بیگ شانوں کے نیچے سے ڈوریاں گذار کر کمر پہ بندھا تھا ۔ موٹر سے اُتر کر برآمدے میں آئے تقدیس بڑی موج میں بڑی روانی میں گڑیا کو گانا سناتی سائیکل چلاتی ادھر ہی آ رہی تھی ۔ شہزاد کو دیکھ کر بہت خوش ہوئی اور جلدی سے ان کے پاس پہنچی ۔

"بھائی جان آگئے" ۔ بڑی خوشدلی سے پہلے گڑیا کو اطلاع دی۔ سائیکل روک کر بھائی کا استقبال کرنا چاہتی تھی لیکن شرارتی بھائی نے ہاتھ بڑھا کر اس کا سُرخ ربن کھینچ دیا۔ گلابی نرم گال میں چٹکی بھرلی ۔ بالوں میں ہاتھ پھیر کر بال بکھیر دیئے۔ اور ربن کی دونوں ڈوریاں ہوا سے اُڑ اُڑ کر اس کے معصوم سے پیارے سے چہرے کی بلائیں لینے لگیں۔ وہ ایک ہاتھ سے ربن کو پرے کرتی ۔ دوسرے ہاتھ سے سائیکل پکڑے، شہزاد کی چھیڑ سے تنگ آکر غصہ میں بھری راستہ بدلنے لگی تو شہزاد نے راستہ روک لیا۔ جدھر بھی سائیکل موڑتی آگے کھڑے ہو جاتے ۔ تقدیس نے زبانی احتجاج کیا ۔ اس کی نگراں ملازمہ نے بھی دبی زبان میں بڑی نرمی سے شہزاد کو منع کیا۔ لیکن وہ تقدیس کو ستانے، چڑانے میں مزہ لے رہے تھے، باز کیسے آجاتے ۔ وہ چیختی تو شہزاد اسی انداز میں چیخ کر نقل اُتارتے ۔ ضبط کی انتہا ہوگئی، غصہ حد سے بڑھ گیا تو تقدیس کھلے ربن کی ہوا میں اڑتی ڈوریوں کو ہاتھ سے پیچھے ہٹاتی، غصّے میں بھری سائیکل چھوڑ کر اٹھ گئی ۔ شہزاد ہلکے پھلکے سائیکل کے اگلے حصّے پہ ایک پاؤں رکھے راستہ روکے جھک کر کھڑے تھے ۔

تقدیس نے دونوں ہاتھوں میں شہزاد کے ملائم سیاہ بال پکڑے اور پوری قوت سے پیچھے دھکا دے دیا۔ شہزاد کا توازن برقرار نہ رہ سکا، اوندھے منہ سائیکل پر گرے۔ بائیں آنکھ سے اوپر پیشانی سے خون پھوٹ کر بہنے لگا۔ ملازمہ نے دوڑ کر اٹھایا۔ ڈرائیور بھی دوڑا۔ وہ شہزاد کی گاڑی صاف کر رہا تھا۔ شرارتیں ہزار کریں آخر بچّہ ہی تو تھے۔ چوٹ کے درد اور خون کی دھاریں دیکھ کر پریشان دونوں ہاتھ زخم پر رکھے رونا شروع کر دیا۔ آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ گلابی ہاتھ، چہرہ اور سفید قمیض لہو سے بھر گئے تھے۔ فرش پر بھی دھبے گر رہے تھے۔ لہولہان سسکتے شہزاد کو دیکھ کر تقدیس نے پوری قوت سے باآواز بلند رونا شروع کر دیا۔ وہ بہت زیادہ خوفزدہ تھی۔ ایک تو فکر یہ کہ شہزاد کے خون نکل رہا تھا، دوسرے امّی، ابّو جان سے ڈانٹ کا خوف کہ دھکا جو انھوں نے دیا تھا اور اتنی چوٹ شہزاد کے آگئی تھی۔

ڈرائیور ابھی راستے میں دوڑا جا رہا تھا اندر اطلاع کرنے کہ سعدیہ بیگم اور فوزیہ بیگم دونوں تقدیس کے رونے کی آواز سن کر بھاگتی ہوئی آگئیں۔ لہولہان آنسو بہاتے شہزاد اور روتی بلکتی تقدیس صورت حال خاصی پریشان کن تھی۔ ملازمہ نے بڑے ادب سے ڈرتے

ڈرتے حادثہ کی وجہ بتائی۔ سعدیہ بیگم اور فوزیہ بیگم نے دونوں بچوں
کو پیار کیا، دلاسہ دیا۔ شہزاد کا زخم دوا لگا کر صاف کیا، پٹی باندھی،
گاڑی تیار کھڑی تھی، فوری ہسپتال لے کر گئیں۔ یہ سب کام فوزیہ نے
خود کیا۔ سعدیہ بیگم بھی ساتھ تھیں۔ زخم کافی بڑا اور بہت گہرا تھا۔
خون بند نہیں ہو رہا تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے کٹاؤ بڑا ہونے کی وجہ
سے ٹانکے لگائے، انجکشن بھی دیا تاکہ خرابی کا کوئی امکان نہ رہے
مرہم پٹی کے بعد شہزاد کی طبیعت کافی سنبھل گئی تھی۔ چونکہ خون
کافی ضائع ہو گیا تھا، اسی وقت گلوکوز اور دوسری طاقت کی
دوائیں بھی دیں۔ ابھی کئی روز تک گھر پہ آ کر پٹی بدلنے کا وعدہ
بھی کیا تھا۔ اگرچہ ابھی کمزوری تھی، زخم میں درد بھی تھا۔ سر پہ
سفید پٹی بندھی تھی۔ زخم کی جگہ پہ سرخ دوائی کا یہ بڑا سا دھبہ
بن گیا تھا۔ شہزاد ہنستے ہوئے اٹھے اور تقدیس کی نرم کلائی
کو بازو سے پکڑ کر ڈاکٹر صاحب کے سامنے کر دی۔

"ڈاکٹر صاحب! ان کو بھی زور سے انجکشن لگا دیجئے۔ کیونکہ
انہوں نے ہی ہمیں دھکّہ دے کر سر پھوڑا ہے"۔ وہ درد کی
شدّت کے باوجود حسبِ عادت ہنس رہے تھے اور تقدیس کو
ستانے، چڑانے پر پھر تیار۔

"پھر نہیں ماروں گی ڈاکٹر صاحب!" بہت زیادہ ڈری، سہمی ہوئی تقدیس فوزیہ بیگم سے لپٹی ہوئی تھی۔ خوفزدہ نظروں سے دیکھتی ہوئی ڈاکٹر صاحب سے بولی۔ ڈاکٹر صاحب نے بڑے پیار سے کہا۔

"نہیں بھئی — ہماری گڑیا بیٹی تو بڑی پیاری ہیں، آئندہ نہ ماریئے گا۔"

"بھائی جان — پھر — کیوں چھیڑتے ہیں؟" تقدیس نے ملائم لہجے میں فوزیہ بیگم کے شانے پر سے سر اٹھا کر ذرا گردن گھما کر بڑے پیارے انداز میں پلکیں جھپکتے ہوئے کہا۔ وہ روہانسی ہو رہی تھی۔ لہجے میں بڑی شکایت اور آنکھوں میں آنسو تھے، منہ بسور رہی تھی۔

"ڈاکٹر صاحب! آپ ان بھائی جان کو بھی پوچھیے۔ ہر وقت بچی کا ناک میں دم کر رکھا ہے۔ ہر گھڑی اس کو ستانا اور رلانا ہی ان کا کام ہے۔ آخر تنگ آ کر غصے میں انہوں نے بھی دھکا دے دیا۔ چوٹ کھائی ہے۔ اب تو شاید کچھ چین کریں گے۔" سعدیہ بیگم نے تقدیس کو اپنی گود میں لے کر پیار کرتے ہوئے کہا۔

"ہم تو اب ان سے کبھی نہیں بولیں گے، کھیلیں گے بھی نہیں ان کے ساتھ — بس ہماری کٹی —" شہزاد نے جھوٹ موٹ روٹھتے ہوئے تقدیس کو پھر ستایا۔ سر پہ سفید پٹی بندھی تھی اور شریر آنکھوں کی شوخی

لبوں کا تبسم کہہ رہے تھے کہ باز آنے والے نہیں۔

تقدیس شہزاد کی طرف سے کٹی کا اعلان سُن کر بہت پریشان ہو گئی۔ سعدیہ بیگم کی گود سے اُتر ی۔ ڈاکٹر صاحب کے سامنے گدی دار گول گھومنے والی کرسی پہ بیٹھے شہزاد کے قریب آئی۔

"میری توبہ — بھائی جان معاف کر دیں، پھر نہیں ماروں گی۔" دونوں ہاتھوں سے اپنے کان پکڑے تقدیس بڑی پیاری بھولی بھالی، کتنی معصوم لگ رہی تھی۔

"بس — اب ہم نہیں بولیں گے۔" شہزاد نے اپنے ہونٹوں پہ زور سے ہاتھ رکھ لیا اور آنکھیں بند کر کے منہ پھیر کے کھڑے ہو گئے۔ تقدیس بے چین ہو رہی تھی۔ ایڑیاں اونچی کیے دونوں منی سنی سی باہیں شہزاد کے گلے میں ڈال دیں۔ پیار کر رہی تھی، منا رہی تھی۔ شہزاد سے ہنسی ضبط نہ ہو رہی تھی، سنجیدہ کہاں رہ سکتے تھے۔

"صلح — ؟" شہزاد کو ہنستے دیکھ کر تقدیس نے بڑی معصومیت سے پوچھا۔ پیارا سا مکھڑا کتنا فکرمند تھا۔ پھر شہزاد نے بھی تقدیس کے گلے میں باہیں ڈال دیں، پیار کیا — اور سچ مچ صلح ہو گئی۔ پھر کبھی بھی نہ لڑنے کے، نہ روٹھنے کے وعدے ہو گئے۔ بچپن کی یہ پیاری سی لڑائی ایک یادگار تھی۔ کئی دن کے علاج کے بعد

زخم بھر گیا تھا۔ دوا اور مرہم پٹی کا سلسلہ ختم ہوا۔ لیکن اتنا بڑا۔ کافی گہرا نشان پیشانی پہ رہ گیا تھا۔ جو وقت کے ساتھ ساتھ چھوٹا ہوتا گیا۔ لیکن ابھی تک خاصہ نمایاں تھا۔ اور اکثر شہزاد تقدیس کو ستانے کے لیے دکھاتے، جتاتے اور وہ خواہ مخواہ شرمندہ ہو جایا کرتی۔

سعدیہ بیگم اور فوزیہ بیگم دونوں سگی بہنیں — دونوں کے شوہر طاہر نیازی اور ظفر نیازی سگے بھائی۔۔ دونوں کے دادا ایک ہی تھے یعنی آپس میں چچا تایا کی اولاد تھے۔ دونوں میاں بیوی شبانہ اور شہزاد، طاہر نیازی اور سعدیہ بیگم کے بڑے چہیتے بچے اور تقدیس ظفر نیازی اور فوزیہ بیگم کی لاڈلی تنہا بیٹی تھی۔ تقدیس ابھی چھوٹی تھیں کہ ان کے والد حکومت کی طرف سے سفیر بنا کر ملک سے باہر بھیج دیئے گئے۔ کم سن بچی اور فوزیہ بیگم کے ساتھ مختلف ممالک میں سفارت کے فرائض انجام دیتے رہے اور ایک ملک سے دوسرے اور دوسرے سے تیسرے میں تبادلہ ہوتا رہا۔ سلسلہ طویل ہوتا گیا اور عرصہ گذر گیا۔ بیرونی ترقی یافتہ ملکوں میں ایسا دل لگا کہ وطن واپسی کا خیال ہی نہ آیا۔ لاکھوں کروڑوں کی آبائی جاگیر داری بڑے بھائی طاہر نیازی کے ذمہ تھی۔ بغیر

کسی حساب کتاب کے جتنا چاہتے، جب چاہتے رقم ــــ بڑے بھائی نہایت محبت سے بہت شفقت سے بڑی اپنائیت سے بھجوا دیتے۔

پھر ــــ طاہر نیازی کی وفات پہ وطن واپس آئے۔ جاگیرداری کے جھگڑوں اور قدیم خاندانی دشمنیوں اور سوتیلے رشتےداروں کی وجہ سے ان کو قتل کروا دیا گیا تھا۔ ان کی موت کے بعد مقدمہ بازیوں میں بھی کچھ حاصل نہ ہوا۔ سرکاری ملازمت اور حاکم وقت کی اطاعت کی وجہ سے زیادہ دیر وطن میں ٹھہرنا مشکل تھا ـــ انتہائی مجبوری کی حالت میں واپس چلے گئے۔ انہیں اس بات کا بڑا دکھ تھا۔ اب وطن میں بڑے بھائی ــــ جو باپ بھی تھے اور ماں بھی بلکہ سب کچھ ہی وہ تھے ان کے لیے ــــ اب نہیں ہیں۔ بیوہ بھاوج اور دونوں معصوم بچوں کا خیال تو ہر وقت رہتا، لیکن اتنے شفیق اتنے مہربان بڑے بھائی کے حسین چہرے کی غیر موجودگی ــــ ناقابلِ برداشت تھی۔ جب کبھی بھی فوزیہ بیگم بڑی بہن اور بھانجے بھانجی کو دیکھنے کی، ملنے کی خواہش ظاہر کرتیں تو بظاہر بڑی لاپرواہی سے ٹال دیتے۔ اور جیسے ان سب سے ملاقات کی کوئی ضرورت، کوئی اہمیت ہی نہ ہو۔ فوزیہ بیگم

کا اصرار بڑھتا گیا تو ظفر نیازی بڑی بے نیازی سے کہتے۔

"بھئی ہمیں تو اپنی نوکری میں کسی بات کی فرصت ہی نہیں ملتی۔ آپ جب چاہیں جا سکتی ہیں لیکن ہم اپنی تقدیس کی جدائی برداشت نہیں کر سکتے۔ اور ماں کے بغیر لڑکی کا غیر ملک میں رہنا مناسب نہیں کیونکہ ہم تو دن رات سرکاری کاموں میں مصروف رہتے ہیں"۔

انہی چکروں میں ایک طویل عرصہ بیت گیا۔ ظفر نیازی کی بے پناہ مصروفیت اور بیٹی کی محبت دونوں بہنوں کے ملاپ میں حائل رہی۔ لیکن درحقیقت یہ سب بہانے تھے۔ بڑے بھائی طاہر نیازی کی عدم موجودگی اس کا اصل سبب تھی کہ ظفر نیازی اس وطن میں اس گھر میں جانے کی اپنے میں ہمت ہی نہ پاتے تھے۔ جہاں — بھائی جان نہ ہوں، جہاں سعدیہ بیگم کے سراپا پہ بیوگی کی اداسی، خاموشی چھائی ہو، جہاں شریہ شہزاد اور شوخ شبانہ کے معصوم چہروں پہ یتیمی کی بے بسی برستی ہو۔

نہیں — نہیں — وہ اس اٹل حقیقت کا سامنا کرتے ہوئے بہت گھبراتے تھے اور جیسے اپنے میں جرأت ہی نہ تھی، ہمت ہی نہ کر سکتے تھے اس سچ کو تسلیم کرنے کی۔

ادھر؟

سعدیہ بیگم — شہزاد اور شبانہ ان سب کو ملنے کے لیے بے قرار — بہت اصرار کرتے ۔ بڑی خواہش تھی دونوں بچوں کی خالہ جان اور چچا جان ادھر آ جائیں ۔ خاص طور پہ تقدیس کو دیکھنے کا، ملنے اور ہر وقت ساتھ رہنے کا تو بہت ہی زیادہ شوق تھا ۔ تصویروں اور تحریروں کے تبادلے ہوتے رہتے ۔ تحفے تحائف آتے جاتے رہتے ۔ کئی مرتبہ سعدیہ بیگم نے دونوں بچوں سمیت ان کے پاس آنے کا ارادہ ظاہر کیا ۔ پروگرام بنایا ۔ تو پھر بھی ظفر کوئی نہ کوئی بہانہ بنا دیتے ۔

آخر کار — خطوط سے، تصویروں سے، ملاقاتیں کرنے والوں کے لیے ایک مدت کے بعد حقیقی ملاقات کا یہ پہلا موقع تھا ۔ حسن اتفاق سے — خدا کی مہربانی سے — ظفر نیازی کو اندرون ملک مرکزی حکومت میں وزیر بنا دیا گیا تھا ۔ اور انہیں سرکاری طور پر وطن آنا پڑا ۔ وہ بغیر اطلاع دیئے آ گئے ۔ سیدھے مرحوم بھائی کے گھر آئے ۔ دل پہ پتھر رکھ کے بیوہ بھاوج اور ان کے یتیم بچوں کے ساتھ جو پندرہ دن گذارے تو خون کے آنسو ہی پیتے رہے ۔ دل و دماغ کی عجیب سی کیفیت رہی ۔ ضبط کرتے کرتے نڈھال ہو جاتے، وہ اس ماحول سے فرار

چاہتے تھے۔ لیکن پھر بھی بظاہر بڑے پُرسکون نظر آتے تاکہ سعدیہ بیگم کو یا بچوں کو ان کی کمزوری کی وجہ سے زیادہ احساس نہ ہو۔ کوئی تکلیف نہ پہنچے۔ ان کا غم تازہ نہ ہو جائے، ان کے زخم ہرے نہ ہو جائیں۔ اگرچہ نہ تو یہ غم مٹنے والا تھا اور نہ ہی زخم بھرنے والا۔ یہ تو ہر وقت دکھتا۔ دکھ اور ہر وقت رستا زخم تھا۔ جس کی درد کی شدت کبھی کم ہونے والی نہ تھی۔ وہ بیٹی اور بیوی کو ساتھ لے جانا چاہتے تھے کہ اکیلے گھر میں تنہائی بڑھ جاتی تھی لیکن شبانہ کے اصرار پر تقدیس کو یہاں چھوڑ گئے تھے۔ فوزیہ بیگم ان کی تنہائی کے خیال سے ساتھ جا چکی تھیں۔

شبانہ ایف اے کے دوسرے سال میں تھی۔

تقدیس نے فائن آرٹس میں گریجویشن کی تھی۔ آگے پڑھنا چاہتی تھی لیکن وطن واپسی کی وجہ سے خواہش پوری نہ ہو سکی۔ ان کے شوق کو دیکھتے ہوئے والدین نے تو دو سال کے لیے وہیں ٹھہرنے کی اجازت دے دی تھی۔ لیکن تقدیس کی ہمت نہ پڑی۔ امّی ابو کے بغیر دیارِ غیر میں اکیلے ٹھہرنا، اور دراصل تو ماں باپ بھی بیٹی کو ساتھ ہی رکھنا چاہتے تھے۔ اپنی پناہوں میں اپنی

نگاہوں کے سامنے، ایک ہی ایک تو بیٹی تھی — پیاری پیاری راج دلاری۔

شہزادی بی ایس سی کی تیاری کیا کرتے تھے لیکن جاگیرداری کا تمام انتظام ان کے پاس تھا۔ تمام کام بڑی سمجھ اور دانائی سے انجام دیتے۔ کالج بھی جاتے لیکن پابندی اور باقاعدگی نہ ہو سکتی تھی — کہ مصروفیت ہی اتنی زیادہ تھی — اس لیے ہر سال سالانہ امتحان کا مسئلہ التوا میں پڑ جاتا — بہرحال پڑھائی جاری تھی۔

شبانہ اور شہزاد تقدیس کو پاکر بہت خوش تھے۔

اور —!

تقدیس جس کا اپنا کوئی بہن بھائی نہ تھا۔ بہن بھائیوں کے اس ماحول میں ایک نئی لذت اور کیف محسوس کر رہی تھی۔ ان دونوں کی محبت میں، ان دونوں کے ساتھ میں — کہ ان دونوں پہ بڑا رشک آتا تھا کہ دونوں میں پیار بھی تو بہت تھا۔ ایک دوسرے کا بہت خیال رکھتے تھے۔

شبانہ اور شہزاد!

اور جب لڑتے تو لڑائی بھی خوب، خوب ہوتی۔ شہزاد، شبانہ کو چھیڑتے، ستاتے، رلاتے، جان کھاتے — وہ بہت چڑتی

روتی، کبھی مقابلہ کرتی ۔ کبھی ہار جاتی، روٹھ جاتی، کبھی تکرار ہوتی، اور بات مار پٹائی، ہاتھا پائی تک پہنچ جاتی ۔ شبانہ رو رو کر امّی حضور کے حضور فریاد بھری شکایت کرتی ۔ لیکن ماں کی پیار بھری ڈانٹ ڈپٹ، نصیحت، سرزنش شہزاد پہ بے اثر ہوتی ۔ والدہ کا ہزار ادب و احترام، ہر طرح کا خیال کرتے، ان کی دلجوئی اور دلداری میں کوئی کسر نہ چھوڑتے ۔ لیکن بہن سے لڑائی میں شرارت بھری ہنسی ہنس کر چھیڑتے، پھر چھیڑتے وہ روتی بسورتی، روٹھتی اور شہزاد کو بہت مزہ آتا ۔ اور بعد میں وہ روٹھی روٹھی پیاری پیاری بہن کو منا لیتے ۔ منت سے خوشامد سے، پیار سے، دلار سے، مذاق اور شرارت کو سنجیدہ صورت دینا انہیں پسند نہ تھا ۔ اور شبانہ بھی بھائی کے اصرار پہ رونا دھونا چھوڑ کر، آنسو پونچھ کر ہنس دیتی ۔ لڑائی کے دوران کے علاوہ وہ بہت پیار کرتی تھی شہزاد سے ۔ اس کے دل میں ان کا ادب احترام بھی بہت تھا ۔ لیکن اکثر اپنی عادت سے مجبور شہزاد ہی زیادتی کر جاتے ۔ پھر اپنی شرارت اور زیادتی کا ازالہ بھی کر دیتے ۔ کچھ نہ کچھ لے کر دینے کا وعدہ کوئی سیر، کوئی تفریح، لڑائی کے بعد صلح کی شرائط ہوتی تھیں ۔

اب — تقدیس کے آجانے سے شبانہ کی ایک بہن کی — اس کے ساتھ کی خواہش پوری ہو گئی تھی۔

اور — شہزاد کی شوخیوں و شرارتوں کو اب ایک کے بجائے دو شکار مل گئے تھے۔

شبانہ اور تقدیس!

شبانہ تو برابر مقابلہ کر لیتی۔ لڑائی، شکایت، صلح۔ غرض سارے مراحل سے گذر لیتی۔

لیکن تقدیس!

بڑی کم گو، بڑی بے زبان، خاموش طبع لڑکی چپ چاپ ہی رہ جاتی۔ زیرِلب مسکرا دیتی یا شکوہ بھری نظروں سے دیکھ کر رہ جاتی۔ شبانہ بہن کی طرفداری میں، دفاع میں برابر شہزاد کو جواب دیتی۔ اپنی پیاری آپی کو ہر طرح سے شہزاد کی شرارتوں سے بچانے کی کوشش کرتی — لیکن — کوشش کبھی کامیاب نہ ہوتی کہ مقابلہ شہزاد سے ہوتا تھا۔ جنہوں نے تقدیس کی خاموشیوں کو زبان، سنجیدگیوں کو شوخیاں اور مسکراہٹوں کو قہقہوں میں تبدیل کرنے کا عہد کیا تھا۔

باب ۲

سہ معطر معطر، خراماں خراماں
نسیم آرہی ہے کہ وہ آرہے ہیں

ہفتہ بھر کی زوردار بارشوں کے بعد مطلع صاف ہوا۔ چھم چھم برستے کالے بادلوں کے بعد چکیلی چمکیلی دھوپ شرمیلی شرمیلی مسکراہٹیں بکھیرتی ہر طرف پھیلی تھی۔ بلند و بام پر تھرک رہی تھی۔ ہر سو اُجالے پھیلے تھے۔ دھلے نکھرے، اُجلے نیلے آسمان پر قوس و قزح کے خوبصورت رنگ کمان کی صورت میں آسمان کے دونوں سروں کو ملاتے رنگا رنگ رنگ بکھیر رہے تھے۔ فضائیں حسین، ہوائیں رنگین و خوشگوار کہ موسم بڑا سہانا تھا۔

ایسے میں شوخ و شنگ شبانہ کالج کے سفید کپڑوں پر سُرخ یونیفارم کی بند گلے کی جرسی پہنے، سیاہ بالوں کا بڑا سا جوڑا بنائے

بڑی پیاری لگ رہی تھی۔ خوبصورت تراش خراش سے بنا نازک جسم دلکش نقوش، گوری گلابی رنگت، چہرے پہ صحت و مسرت اور جوانی کی تازگی اور چمک ۔۔ قد پہلے ہی اچھا تھا۔ پھر اونچی ایڑی کے جوتوں کی وجہ سے اور بھی لمبی لمبی، پتلی دبلی مگر بڑی سمارٹ نظر آرہی تھی۔

"آپی ۔۔ آپ تیار ہو گئیں ؟" تقدیس کے کمرے نیلا بوجھل ملائم پردہ اٹھاتے شبانہ اندر آئی۔ وقت زیادہ ہو گیا تھا۔ کافی دیر ہو گئی تھی، اور اب وہ گھبرا رہی تھی کہ مشاعرے میں بر وقت نہ پہنچے تو خفت اٹھانا پڑے گی۔ کیونکہ اس کو بھی تو مشاعرے میں اپنی نظم پیش کرنا تھی۔

"ہوں ۔۔ چلو ۔۔!" تقدیس نے کلائی پہ گھڑی لگاتے ہوئے خوشدلی سے کہا اور سنگھار میز کے سامنے پڑی گھومنے والی چھوٹی سی گدے دار سٹول پر سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ وہ نوک پلک سجی سنوری شبانہ کی انتہائی خواہش پر اس کے کالج کے مشاعرہ میں جانے کے لیے تیار کھڑی تھی۔ بڑے بڑے تین آئینوں والی میز کے سامنے کھڑی شبانہ نے بار بار تقدیس کے سر و پا کا بغور جائزہ لیا۔ پہلے ویسے دیکھا پھر

آئینے میں دیکھا۔ بڑی خوش بڑی مطمئن جاتے جاتے خوشبو کی بوتل اٹھا کر پہلے تقدیس پر اور پھر اپنے اوپر سپرے کیا۔ اور جلدی جلدی کمرے سے باہر نکل کر زینے کے راستے برآمدے کا رخ کیا۔

دراز قامت خوبرو شہزاد کھیل کے سفید لباس میں کرکٹ کا یہ بڑا بلا کندھے پر رکھے سفید کرکٹ کی ٹوپی پہنے، اپنی دھن میں سیٹی بجاتے، ایک ہاتھ میں سفید دستانے پکڑے، بڑے مست انداز میں ہنستے مسکراتے زینے کے بالکل سامنے اپنے کمرے کے دروازے سے نکل رہے تھے۔ ریشمی لباس کی سرسراہٹ اور ہلکی آواز میں باتوں کی آہٹ پر بے خودی میں نگاہ اٹھائی تو ــــ تو ــــ قدم وہیں رک گئے۔ مستی میں سیٹی بجانا بھول گئے کہ شبانہ کے ساتھ تقدیس سیڑھیاں اتر رہی تھی۔ لوہے کے سفید جالی دار کٹہرے کے اوپر براؤن پالش کی ملائم چمکدار لکڑی چڑھی ہوئی تھی۔ زینہ اترتے ہوئے کبھی کبھی تقدیس خوبصورت ہاتھ سے ریلنگ کا سہارا لے لیتی۔

تقدیس کے ترشے ہوئے سیاہ بال ملائم ریشم کی طرح شانوں سے نیچے کمر پر پھیلے ہوتے تھے۔ لمبی لمبی بڑی معصوم سیاہ نشیلی آنکھیں، کمان کی طرح کھنچی ہوئی خوبصورت ابرو، کومل سی ناک

منا سا دہن، بھرا بھرا گول چہرہ، صحت مند گلابی رنگت، نکھرتا روپ، سروقد، ابھرتی جوانی، شہابی شباب، سنہری ریشمین لباس کی خوبصورت تراش خراش، پھر قدرت کی صناعی کا فنکارانہ شاہکار تقدیس کا نازک سراپا — نازک ڈوریوں کی نازک سی اونچی ایڑی کے سنہری سینڈل میں گورے گورے پاؤں چمک رہے تھے۔ ناخنوں پہ لگی نیل پالش زیادہ ہی اچھی لگ رہی تھی۔ سفید سمور کا کوٹ بازو پہ ڈالے دوپٹہ سنبھالتی لطیف و نفیس، تقدیس کتنے کافرانہ، بڑے ساحرانہ انداز میں شبانہ کے ساتھ قدم بہ قدم نیچے اُتر رہی تھی۔ شبانہ کے بازو پہ پڑا اس کے سُرخ یونیفارم کے کوٹ کا عکس تقدیس کے گلابی چہرے کو آتشیں بنا رہا تھا۔ حسین و دلکش چہرے پہ تبسم کے اجالے، سیاہ دراز پلکوں کے جھکنے میں قیامت کا سماں — پلکیں اٹھاتی تو قیامت سے بڑھ کر قیامت — اور سراپا حشر ساماں — لطافت، نفاست، مجسم قیامت — اور — شہزاد — روبرو — پوری طرح تیر دل کی زد میں — بسمل یا نیم بسمل — بہرحال نٹ کھٹ شہزاد — بے خود ایکدم کھٹ سے کھڑے رہ گئے۔ بے خود، دم بخود، لیکن جلد ہی اپنے پر قابو پا لیا۔ ساری قوتیں بحال ہو گئیں۔ ساری شرارتیں عود کر آئیں اور

خوبصورت مست، نشیلی آنکھیں، نشے میں گھلی شرارتوں سے، مسکراہٹوں سے چمکنے لگیں۔ ہونٹوں پہ شریر تبسم، نگاہوں میں ہنستی شوخی — اس تصادم سے بچنے کے لیے تقدیس گھبراہٹ میں پلکیں جھپکاتی، کبھی اٹھاتی ہوئی شبانہ کے شانہ کی اوٹ میں ہونے کی کوشش کرنے لگی — اتنے آزاد یورپین ممالک کے ماحول میں رہ کر بھی، طویل عرصہ وہاں گذارنے کے باوجود بھی تقدیس کے مزاج میں مشرق کا روایتی حجاب تھا۔ وہ مغرب میں رہ کر بھی خالص مشرقی لڑکی تھی۔ شرمیلی شرمیلی سی حجاب آلود مسکراہٹ ہر دم، ہر گھڑی معصوم چہرے کو اپنی پناہوں میں لیے پھرتی تھی۔ اور بے پناہ، بے داغ حسن کی دلنشیں دلکشی میں اور بھی اضافہ کرتی رہتی۔

"کہاں کا ارادہ ہے؟" شہزاد نے شبانہ کے بڑے سے جوڑے میں لگا عمدگی سے بنا نائیلون کا مصنوعی گلاب کا پھول، سفید گلاب ہاتھ بڑھا کر اتار لیا۔ کیونکہ وہ دونوں زینہ ختم کر کے برآمدے کی سیڑھی سے نیچے اُترنے لگی تھی کہ شہزاد کو دیکھ کر رُک گیئں۔ اگرچہ شبانہ بڑی جلدی میں تھی۔ اب شہزاد بھی قریب آچکے تھے، اور آتے ہی شبانہ کے پھول پہ ڈاکہ ڈال دیا۔

"کیا کرتے ہیں بھائی جان! ہر وقت تو نہ ستایا کیجیے؟" شبانہ نے

دونوں خوبصورت نازک ہاتھوں سے جن پہ بڑے فنکارانہ طریقے سے ناخن بڑھا کر، سنوار کر سرخ پالش لگا رکھی تھی - نازک انگلی میں سرخ نگینے کی انگوٹھی بہت اچھی لگ رہی تھی - اپنا بڑا سا جوڑا دونوں ہاتھوں میں سنبھالتے ہوئے ناگواری سے کہا۔

وہ بہت جلدی میں تھی - کالج سے دیر ہو رہی تھی۔ حواس ویسے ہی بجا نہ تھے - گھبراہٹ اور پریشانی میں چڑچڑی ہو رہی تھی، اور شہزاد کی ہمیشہ کی عادت سے واقف کہ عین وقت پر اس کے ہزار محنت سے بنائے سنوارے بال بگاڑ دیتے تھے۔

"شبانہ! تم بھی بال ترشوا لو — زیادہ پیاری لگو گی۔" شہزاد نے شوخی سے ہنستے ہوئے شوخ نظریں تقدیس کے ملائم ریشمیں بالوں پہ ڈالتے ہوئے کہا۔

اور تقدیس!

ان نظروں کی تاب نہ لاتے ہوئے شرما کر، شریر نظروں سے بچنے کے لیے آگے چلی گئی - برآمدے کے گول ستون کی آڑ میں جس پر گھنے گہرے سبز رنگ کے پتوں اور شاخوں کے درمیان میں سرخ اور سفید گلاب مسکرا رہے تھے - پھولوں کی بیلیں ستون کے گرد لپٹی ہوئی تھیں۔

"آپ ہی بڑھا لیجئے زلفیں اپنی ۔ اور بھی خوبصورت ہو جائیں گے"۔
شبانہ نے پلٹ کر دیکھا ۔ نگاہوں اور لہجے میں ناراضگی اور شکایت تھی ۔ غصّے میں منہ پھلائے بولی ۔ وہ اس وقت مذاق و شرارت سہنے کے موڈ میں نہ تھی ۔ ایک ایک لمحہ بھاری تھا ۔ دیر ہو رہی تھی ۔ ایک تو پروگرام سے رہ جاتی ، دوسرے سہیلیوں سے شرمندہ ہوتی ۔ پروفیسروں سے الگ ڈانٹ پڑتی ۔ بے چاری ساری شوخیاں ، ہنسی مسکراہٹیں بھولے ہوئے تھی ۔ پریشانی ، گھبراہٹ ، غصّہ ، مزاج بڑا چڑچڑا ہو رہا تھا ۔

لیکن شہزاد !

اس برہم مزاج اور پریشانی کی پرواہ کیے بغیر بڑی لاپرواہی سے ان کے پاؤں کے آگے اپنا پاؤں رکھے کھڑے تھے ۔ جانے نہ دے رہے تھے ۔ راستہ روک رکھا تھا ۔

اور تقدیس !

سرسبز پتوں کے ساتھ لگے سُرخ اور سفید پھولوں کی بیلوں اور ٹہنیوں ، شاخوں کے درمیان میں سے چپکے چپکے جھانکتی بالکل بچوں کی کہانیوں والی پھول شہزادی لگ رہی تھی ۔ وہ خاموشی سے دونوں بہن بھائیوں کی لڑائی کا مزہ لے رہی تھی ۔ اس کی زندگی میں ایسے واقعات ، حادثات کہاں آتے تھے ۔ نہ کوئی چڑانے والا بھائی اور نہ

چڑنے والی بہن! ماں باپ کی اکلوتی اولاد جو تھی۔

"جانے بھی دیجئے نا بھائی جان ـــ پہلے ہی بڑی دیر ہو رہی ہے۔" اس نے اپنے دونوں ہاتھوں سے دھکیل کر شہزاد کو ہٹانا چاہا۔ ہر وقت مسکراتی پیشانی پہ بل اور ہنستے کھیلتے چہرے پہ ناگواری تھی۔ غصہ چڑھا ہوا تھا۔ شہزاد کی بے وقت کی دخل اندازی پسند نہیں آ رہی تھی۔ وہ بار بار بے تابی سے گھڑی دیکھ رہی تھی اور آنکھوں میں آنسو تیر رہے تھے۔

"اچھا میں نہیں جاؤں گی اب کالج۔" دونوں آنکھوں پہ ہاتھ رکھتے ہوئے شبانہ نے بے قابو آنسو چھپاتے ہوئے منہ پھیر کر کہا۔ اور باہر کی بجائے واپس زینے کی طرف مڑ گئی۔

شہزاد کو شبانہ کے حد سے زیادہ بگڑے مزاج، وقت کی نزاکت، آنسو دیکھ کر بے چارگی پہ رحم آ گیا۔ دونوں بازو پھیلا کر اپنے ساتھ لپٹا لیا۔ روٹھی روٹھی بہن کتنی پیاری لگ رہی تھی ان کو ـــ بڑی محبت سے اس کے آنسو اپنے ہاتھوں سے پونچھے۔ اس کے بالوں پہ پیار کرتے ہوئے جانے کے لیے راستہ دے دیا۔ شبانہ کے آنسو دیکھ کر ان کو واقعی بڑی تکلیف ہوئی تھی۔

"میری منی سی بہن کبھی نہ روئے۔" شہزاد نے پھر شبانہ کو اپنے

ساتھ لگا کر پیار کرتے ہوئے کہا۔

محبت بہت تھی شبانہ سے لیکن عادت سے مجبور تھے۔ ہزار کوشش کے باوجود بھی رہ نہ سکتے تھے شرارت سے۔ ان کی دونوں انگلیوں میں شبانہ کے بالوں میں سے اتارا ہوا سفید گلاب تھا۔ شبانہ کو جانے کی اجازت دے کر تقدیس کے آگے کھڑے ہو گئے۔ اس انداز سے ستون پہ ہاتھ رکھا کہ ان کے بازو کے اوپر سے تقدیس کا صرف چہرہ نظر آرہا تھا اور باقی سب شہزاد کی اوٹ میں تھی۔ وہ شبانہ کو جانے کی اجازت ملتے دیکھ کر پھولوں کی بیلوں کے پیچھے سے نکل کر ذرا سامنے آگئی تھی ستون کے قریب ہی۔

"ہمیں بھی ساتھ لے جاؤ— ورنہ اکیلے ہی جانا پڑے گا۔" شہزاد نے سر جھکائے کھڑی تقدیس کے سراپا پہ نثار ہوتے ہوئے کہا۔ گھبراہٹ اور شہزاد کی قربت میں تقدیس کی سانس تیز تیز چل رہی تھی۔ اور گھبرایا گھبرایا معصوم سا چہرہ۔

ادھر بے چین شبانہ ایک طرف سے راستہ بنا کر بھائی جان کی بات سنے بغیر آگے بڑھی۔ اور تقدیس بھی بڑی ہمت کر کے تھوڑا سا جھکی اور شہزاد کو پتہ ہی نہ چلا کہ وہ چپکے سے ان کے بازو کے نیچے سے نکل کر باہر چلی گئی۔ تقدیس کا ہاتھ پکڑے شبانہ

جلدی سے پورچ میں کھڑی اپنی ذاتی قرمزی رنگ کی چھوٹی موٹر کی طرف بڑھی۔

"اپنا جوڑے کا پھول تو لیتی جاؤ۔" شہزاد نے شبانہ کا سفید گلاب ہاتھ بڑھا کر دیتے ہوئے ہنس کر کہا۔ یہ بالکل اصلی پھول لگتا تھا — اور تقدیس کے شبانہ کے لیے لاتے ہوتے بیشمار تحائف میں سے ایک تھا۔

شبانہ نے پلٹ کر شہزاد کی طرف دیکھا۔ تقدیس بھی ہونٹوں میں ہنسی دبائی، پلکیں جھپکاتی ادھر ہی دیکھ رہی تھی۔

"لائیے — ؟" موٹر کا دروازہ کھولے کھڑی شبانہ نے وہیں سے دونوں ہاتھوں کی کٹوری بنا کر پھول اس میں لینا چاہا — شہزاد نے جان بوجھ کر پھول ذرا اونچا پھینکا جو شبانہ کے ہاتھوں میں آنے کے بجائے تقدیس کے ماتھے پہ لگا اور پاؤں میں آگرا۔ یعنی تقدیس کی قدم بوسی کر رہا تھا پھول۔ تقدیس نے جھک کر پھول اٹھا لیا۔ تھوڑا سا جھٹک کر پھونک مار کر، قدرے جھکی اور شبانہ کے بالوں میں لگانے لگی اور شہزاد برآمدے کے دوسرے ستون کی دوسری طرف گھوم پھر کر شبانہ اور تقدیس کے روبرو تھے۔

"شبانہ ہمیں بھی مشاعرہ سناؤ۔ ورنہ تمہیں بھی اکیلے جانا پڑے گا۔" تقدیس شبانہ کے بالوں میں پھول لگا چکی تھی۔ شبانہ موٹر کی پچھلی سیٹ پر پڑی اپنی دوست شمع کی کتابیں، جو وہ جاتے ہوئے بھول گئی تھی اٹھانے کے لیے موٹر کے اندر کی طرف جھکی ہوئی تھی۔ دونوں کوٹ بھی ملازم پچھلی نشست پر رکھ کر شبانہ کی اجازت سے واپس جا چکا تھا، کہ وہ عموماً خود ہی گاڑی چلانا پسند کرتی تھی۔ دروازہ بند کرتے ہوئے شبانہ جلدی سے سیدھی ہو کر کھڑی ہو گئی اور تقدیس کو اپنے دائیں بازو کے حلقے میں لے کر شہزاد سے بچانے کی کوشش کرنے لگی۔

"خدا خدا کر کے تو کہیں میری آپی آئی ہیں۔ آپ اب بھی مجھے اکیلے جانے کی دھمکیاں دے رہے ہیں۔" شبانہ تقدیس کے گرد، اس کو اپنے ساتھ لپٹائے کھڑی تھی اور پھر پلٹ کر موٹر میں بیٹھنے لگی۔ شہزاد نے شبانہ کو چپت لگانے کے لیے ہاتھ بڑھایا جو شبانہ کے بجائے تقدیس کے شانہ پر لگا۔ اور شبانہ نے انگوٹھا دکھاتے ہوئے زبان نکال کر چڑاتے ہوئے شہزاد کو ستایا۔ بدلہ لینے کے لیے شہزاد

نے تقدیس کے شانے پہ اپنی گرفت مضبوط کر لی اور ہلکی سی جنبش سے گھما کر تقدیس کو اپنے بازو کے حلقے میں لے لیا۔

"اب ہمّت ہے تو لے جاؤ چھڑا کر۔" شہزاد نے شبانہ سے کہا۔ خلافِ توقع اچانک جھٹکے سے تقدیس شہزاد کے کشادہ سینے سے جا لگی۔ خوبصورت دراز قامت شہزاد، سفید لباس پہنے تھے۔ ان کے بازوؤں میں سمٹی تقدیس، اس کا سنہری چمکیلا لباس، جیسے شفاف برف پوش چوٹی پر روپہلی، سنہری کرن، سورج کی نازک سی کرن سمٹ کر چمٹ گئی ہو۔ تقدیس کے گرم سانسوں کی گرمی سے جیسے شہزاد کے مضبوط سینے پہ برف سی پگھلنے لگی۔ جیسے سارے طاقتور جسم میں چمکدار، گرجدار، آسمانی بجلی تقدیس کے چمکیلے، سنہرے وجود کی صورت میں کوندنے لگی۔ اور شہزاد جیسے کھلنڈرے، لاپرواہ انسان نے اس شدّت کی حدت اور جواں جسموں کی گرمی سے قربت سے گھبرا کر اپنی گرفت ڈھیلی کر دی۔ ایک نشیلے سرور، رسیلے کیف کی کیفیت میں آنکھیں بند کیے، کتنی ہی دیر خاموش کھڑے رہے۔ اور — تقدیس بھی موم کی گڑیا کی طرح، جیسے پگھل کر شہزاد کی گرفت میں نہ ہونے کے باوجود بھی ساتھ ہی سمٹی کھڑی رہی۔ جب دونوں کو ہوش

آیا تو دیکھا کہ ہنستی مسکراتی شبانہ اپنی قرمزی رنگ کی چھوٹی موٹر تیز بھگاتی گیٹ کی طرف جا رہی تھی۔ ساتھ ہی پہلو میں بیٹھی تقدیس بے خودی میں مسکرا رہی تھی۔ تیز رفتار موٹر سے کر شبانہ کالج کے بڑے پھاٹک سے ہوتی ہوئی دوسری موٹروں کی قطار میں موٹر چھوڑ کر جلدی جلدی ہال میں پہنچی۔ وہ تو بہتری ہوئی کہ روشنیوں کی زیادتی اور بجلی کا خرچہ زیادہ ہونے کی وجہ سے دو تین مرتبہ بجلی فیل ہو گئی تھی۔ بار بار بجلی بند ہو جاتی تھی۔ کاریگر درست کرنے میں لگے ہوئے تھے۔ اس وجہ سے ابھی تک مشاعرہ شروع نہ ہو سکا تھا۔ ورنہ تو شامت آ جاتی شبانہ کی۔ اس نے سکھ کا سانس لیا کہ اگر پروگرام وقت پر شروع ہو جاتا تو یہاں آ کر اچھی خاصی شرمندگی اٹھانا پڑتی۔

تقدیس کو شمع کی بھابی فرح کے پاس بٹھا کر مطمئن ہو کر شبانہ اونچے سٹیج پر دوسری طالبات کے ساتھ نیم دائرے میں اُجلے فرش پر بیٹھ گئی۔

مہمان خصوصی کی آمد پہ ہال تالیوں سے گونج اٹھا۔ سب تعظیماً کھڑے ہو گئے، اور جب وہ اپنی جگہ پر سفید چاندنی اور گول تکیے کے سہارے سے بیٹھ گئیں تو سب حاضرین بھی اپنی اپنی جگہوں پر بیٹھ گئے۔ رنگ برنگ غباروں، رنگین کاغذی جھنڈیوں اور سہرول

کی نفیس آرائشوں، جلتے بجھتے، رنگین برقی قمقموں اور زیادہ طاقت کے بلب اور ٹیوبوں کی روشنی میں رنگ و نور کا سیلاب تھا۔ ہر چیز روشن، ذرہ ذرہ، کونہ کونہ جگمگا رہا تھا۔ رات پر دن کا گمان ہوتا تھا۔ مہکتی، سلگتی اگربتیوں کی خوشبو، روح کیوڑہ اور مختلف عطریات کے چھڑکاؤ سے سارا ہال معطر ہو رہا تھا۔ ہوائیں عطر بیز اور فضائیں دلفریب تھیں۔ مہمان خصوصی درمیان میں اور ان کے دونوں اطراف میں نیم دائرے کی شکل میں طالبات سفید کپڑوں پر سرخ سوئٹر (کالج یونیفارم) پہنے بیٹھی تھیں۔ سٹیج سے نیچے وسیع و عریض ہال خواتین و حضرات سے بھرا پڑا تھا۔ لڑکیاں باری باری اپنی غزل یا نظم پیش کر رہی تھیں۔ شبانہ کی غزل نے بھی بہت داد پائی۔ تالیوں اور واہ واہ کا شور تھا، ہر ہر شعر کو دوبارہ پڑھنے کی فرمائشیں ہو رہی تھیں۔ اسی طرح دوسری لڑکیوں نے بھی بڑی اچھی اچھی نظمیں سنائیں۔ کوئی تحت اللفظ پڑھ رہی تھی تو کوئی ترنم سے سماں باندھ دیتی۔ غرض ہر ایک نے پوری تیاری اور مہارت سے مشاعرے کے پروگرام میں جان ڈالنے کی کوشش کی۔ مشاعرے کی کامیابی پر سب لوگ نگران بزم اردو ادب پروفیسر کو بہت مبارکباد دے رہے تھے اور

وہ بھی اپنی جانفشانی کا نتیجہ دیکھ کر بڑی خوش تھیں کہ وہ خود بھی نامور شاعرہ تھیں۔ آواز بھی خدا نے بڑی پرسوز، مترنم عطا کی تھی۔ کئی مجموعہ کلام ان کے شائع ہو چکے تھے۔ خود اپنی تیاری کالج والوں کی خواہش اور حاضرین کی فرمائش پر انہوں نے اپنی ایک بڑی خوبصورت، تازہ نظم اپنی سریلی، پرسوز آواز میں پڑھی کہ ان کی نظم کا ایک ایک لفظ آبدار موتیوں کی طرح تھا۔ نظم کیا تھی قیمتی موتیوں کی ایک مالا تھی۔ جو ان کی کاوشوں نے پرو کر یادگار بنا دی۔

کالج کی لڑکیوں نے زور دار تالیوں، نعروں اور آوازوں کے شور سے سارا ہال سر پہ اٹھا لیا تھا۔ شوخی کی عمر، ہم جولیوں کا ساتھ، پھر یہ کہاں قابو میں رہتی ہیں۔ پروفیسر صاحبہ کو بیداد داد پیش کی جا رہی تھی۔ اس طرح بڑا جاندار، بڑا پُر بہار، بارونق بال بال موتیوں سے مرصع مشاعرہ بخیر و خوبی ختم ہو گیا۔ سب لوگ نظموں، غزلوں کے مقابلہ کے نتائج جاننے کے لیے بے چین تھے اور اب پہلو بدل بدل کر انتظار کرنے لگے۔

حاضرین کا دل بہلانے کے لیے مہمانوں نے بھی غزلیں پڑھیں۔ اور ایک طالبہ قدیم کی نظم نے تو محفل کو زعفران زار بنا دیا۔ مزاحیہ

نظم - پھر ثوبیہ نواز کا پڑھنے کا دلچسپ انداز۔ وہ اپنے زمانۂ طالب علمی کی کالج کی شریر ترین لڑکی، اب گھر بار والی تھی - ہر سال اس کی اس نظم کی فرمائش ہوتی تھی اور کالج کی طرف سے خاص دعوت نامہ مع واپسی ٹکٹ کے اس کو بھجوایا جاتا - وہ بھی اپنی خصوصی اہمیت دوسروں کی قدر دانی اور کالج والوں کی طرف سے عزت افزائی کا حق ادا کر دیتی - نظم کے واقعات کالج کے زمانے کی شرارتوں اور مختلف اساتذہ کے عادات، ڈانٹ ڈپٹ اور اندازِ تدریس وغیرہ کے گرد گھومتے تھے - نظم کے الفاظ، پھر ثوبیہ کا شریر انداز، تمام حاضرین جھوم جھوم جاتے - پوری نظم دو مرتبہ سنتے اور ہر شعر کئی بار دہرانے کی فرمائش ہوتی -

مائیکروفون پر تقدیس کا نام پکارا جا رہا تھا -

شبانہ اپنی سہیلیوں میں ہر وقت اپنی آپی کی باتیں کیا کرتی، خوب خوب خوبیاں گنواتی رہتی - اسی لیے سب کو معلوم ہو چکا تھا کہ تقدیس کی آواز بڑی پیاری ہے اور بڑا اچھا گاتی ہے - یہ اعلان فرح بھابی، شمع، شبانہ اور شبانہ کی سب سہیلیوں کی متفقہ فرمائش کے علاوہ شہزاد کی خواہش پر کیا جا رہا تھا -

تقدیس اجنبی ماحول اور لوگوں کی کثرت سے ہمیشہ گھبراتی تھی -

شبانہ کے اصرار و پیار میں یہاں آ تو گئی -اب پریشان سی -حیران و پشیمان سے بیٹھی تھی۔ وہ تو فرح بھابی ساتھ نہ ہوتیں تو نہ جانے کب سے واپس جا چکی ہوتی اور ستم بالائے ستم کہ نہ جانے کیسے اور کب شہزاد بھی ان کے ساتھ آ بیٹھے تھے -شبانہ کی ایک دوست نے اپنی باجی کی کرسی فرح بھابی کو دلوا دی اور شہزاد کے لیے فرح بھابی نے اپنی کرسی خالی کر دی - سب سے پہلی قطار میں درمیان میں تقدیس اور دائیں بائیں شہزاد اور بھابی بیٹھے تھے۔

تقدیس گھبراہٹ میں کبھی اپنے پرس کی ڈوریوں سے کھیلتی تو کبھی سنہری دوپٹہ انگلیوں پر لپیٹ لپیٹ کر کھولتی۔ مشاعرہ سننے کے بجائے شہزاد اس گھبراہٹ کا مزہ لے رہے تھے - زیادہ ستانے کے لیے تقدیس کی انگلیوں پہ لپٹتا، کھلتا دوپٹے کا آنچل پکڑ کر آہستہ سے اس کے سر پہ پھیلا دیا - سر پہ دوپٹہ اوڑھے ،سمٹی سمٹائی، لجائی لجائی تقدیس کا یہ روپ اور بھی دلکش تھا۔ کبھی بڑی بڑی یہ آنکھیں اٹھا کر سارے ہال کا جائزہ لیتی تو حیرانی میں پھیلی ہوئی خوبصورت آنکھیں کتنی خوبصورت لگ رہی تھیں - ادھر ادھر دیکھتی آہوئے پریشان یعنی تقدیس بار بار اپنے نام کی پکار سنتی تو رہے سہے حواس بھی ساتھ چھوڑے جا رہے تھے - پھر شہزاد کی قربت اور بھی

غضب تھی۔ ادھر فرح بھابی ہمت بندھا رہی ہیں۔ ادھر شہزاد سمجھا رہے ہیں، اٹھنے کے لیے اکسا رہے ہیں۔ ناصحانہ انداز میں شوق بھی — اپنے جذبوں کی خوشی بھی شامل ہے۔

اور تقدیس کا یہ حال کہ اٹھا ہی نہیں جا رہا۔

ادھر سے شبانہ اور شمع بھی آ گئیں۔

دونوں تقدیس کو اپنے ساتھ لے کر سٹیج تک پہنچا آئیں وہاں سے دوسری طالبات جا چکی تھیں۔ تقدیس کو مائیکرفون کے سامنے مخصوص جگہ دی گئی۔ ڈیوٹی پہ کھڑی طالبہ نے کرن کناری کا گنگا جمنی ہار تقدیس کے گلے میں ڈال دیا کہ کالج کی انتظامیہ کی طرف سے اس کے سپرد یہی کام تھا کہ ہر شاعرہ کو ہار پہنائی۔

سنہری دوپٹہ سر پہ پھیلائے۔ دوزانو بیٹھی تقدیس کے دائیں بائیں اور سامنے بہت سی موی شمعیں شمعدانوں میں روشن تھیں طشتریوں میں جلتی موم بتیاں، جگ مگ روشنیوں میں جھلاتا سنہری لباس چمکتا ہوا گلے میں پڑا گنگا جمنی ہار۔ شمع (شبانہ کی دوست) تقدیس کے پیچھے گھٹنوں کے بل کھڑی ہو گئی۔ دونوں ہاتھوں میں جلتی موم بتیوں کی پلیٹ پکڑ کر تقدیس کے سر کے اوپر بالکل قریب لے آئی۔ موم حرارت سے پگھل رہی تھی۔ ننھے ننھے موتی لڑھک لڑھک

کر طشتریوں میں گر رہے تھے۔ یوں لگتا تھا جیسے موم آگ کے شعلوں کی گرمی سے نہیں بلکہ ان شعلوں کی روشنی میں گھڑی بیٹھی بذاتِ خود شمع فروزاں کی طرح روشن تقدیس کے رو پہلے حسنِ جہاں سوز کی گرمی سے پگھل رہی ہے مومی موتیوں کی دھاریں، قطاروں کی صورت میں بہے جا رہی تھیں۔

اور تمام ہال!

ماہ رُخ تقدیس کے روپ، اس کے لباس اور روشنیوں میں جگمگاتے حسین سراپا، جس سے ماحول کا حسن دو چند ہو گیا تھا۔ تمام حاضرین مہر بہ لب — ایک بے زبان سناٹا۔ پُرسکون سکوت چھایا تھا سکوت و خاموشیوں کو توڑتی، تقدیس کی ترنم سے، سوز بھری آواز میں گھبراہٹ کی وجہ سے ہلکا سا ارتعاش اور بھی زیادہ حسن و دلکشی کا باعث تھا۔ خدائے پاک کی بے نیازی، بے پناہ فیاضی اور ماہر کارسازی پہ لوگ دانتوں میں انگلی دبائے بیٹھے تھے۔

تقدیس نیازی کے حسنِ کامل کو حسین آواز دے کر خدا تعالیٰ نے اپنی فنکاری کا شاہکار، اپنی صناعی کا پیکر بنا دیا۔ خدا کی خدائی نظر آ رہی تھی۔ سب کا یہی خیال تھا۔

نظم کب سے ختم ہو چکی تھی لیکن حاضرینِ محفل خاموش بیٹھے

رہ گئے۔ نہ کسی کو تالیاں بجانے کا ہوش رہا اور نہ ہی پُرجوش داد دینے کا — الٰہی یہ کون سی قیامت ہے۔ قیامت خیز حسینہ ہے کہ ہر کسی کو ہوش و ہواس سے بیگانہ کر دیا۔

اور —!

شہزاد کی کیفیت سب سے نرالی تھی۔

وہ مستی میں ڈوبے، کرسی کی دستی پہ کہنی رکھے، ہتھیلی پہ ٹھوڑی جمائے خاموش بیٹھے نیم باز نشیلی آنکھوں سے تقدیس کو دیکھتے رہے۔ دیکھتے رہ گئے۔

تقدیس اٹھنے لگی۔ شمع نے سر پہ سے موم بتیاں ہٹالیں۔ تقدیس نے ڈھلکتا اپنا بڑا دوپٹہ سنبھالنے کی کوشش میں اٹھایا تو فرش پر طشتریوں میں پڑی گھل گھل کر ختم ہوتی، نیم جان موم بتیوں کی لرزتی لَو آنچل کی ہوا سے دم توڑ گئی۔ یعنی رونق محفل جانے لگی تو روشنیوں کی جان نکل گئی۔ تقدیس کو جنبش ہوئی تو جیسے سب ہوش میں آگئے۔ ہال تالیوں اور واہ واہ کے شور سے گونجنے لگا — "ایک بار اور" "ایک بار اور" کا شور تھا کہ کان پڑی آواز سنائی نہ دے رہی تھی۔ لیکن تقدیس کی بساط میں اس سے زیادہ ہمّت کی دولت نہ تھی۔ وہ تو پہلے ہی ٹھنڈی ہو رہی تھی اور ٹھنڈے پسینے چھوٹ رہے تھے۔ پیشانی

یہ ستارے چمک رہے تھے۔ غنیمت تھا کہ شمع اور شبانہ جلدی سے قریب آگئیں۔ اور تقدیس کو اپنی حفاظت میں لے لیا۔ شہزاد عالم خواب سے بیدار ہوتے تو نہ جانے کیسے بے خودی میں اچانک سٹیج پر پہنچ گئے۔ سُرخ گلاب اور موتیا کے یہ ڈھیر سارے ہار تقدیس کے گلے میں ڈالنے کی کوشش کی۔ تقدیس کے ذرا سا پیچھے ہٹ جانے کی وجہ سے وہ سر پہ ہی لپٹ کے رہ گئے۔ یہ ادھورا سنگھار تو اور بھی قاتل تھا۔

حسن کی یہ ادا تو شہزاد کے دل کے پار ہو رہی تھی۔ شہزاد اپنے دائیں بازو کے سہارے میں تقدیس کو ساتھ ساتھ لا کر اپنی نشستوں کی طرف مُڑے۔ سٹیج کی سیڑھیاں اُترتے ہوئے سیاہ سوٹ میں شہزاد اور سنہری زرتار، چمکدار لباس، سر پہ پھُولوں کے ہار لپیٹے تقدیس شہزاد کے پہلو سے لگی، جیسے سیاہ گھنگھور گھٹاؤں میں بجلی کوند کر، کالے بادلوں کے ساتھ ہی لپٹ کر رہ گئی ہو۔ یہ بجلی اور بادل کا ملاپ —— وہ دونوں خوبصورت ساتھی اپنی جگہ پہ آ بیٹھے۔ جہاں بیٹھتے جگہ سج جاتی۔ اُجالے ہو جاتے، روشنیاں بکھر جاتیں ؎

یتر ے ہوتے ہوتے محفل میں جلاتے ہیں چراغ
لوگ کیا سادہ ہیں، سورج کو دکھاتے ہیں چراغ

مہمان خصوصی نے تقدیس کی نظم کے ساتھ ساتھ ان کے حُسن بے پناہ کی تعریف کرتے ہوئے برمحل شعر پڑھا۔ تقدیس نے تو شرما کر سر جھکا لیا اور شہزاد نے فخر سے سر بلند کر لیا۔

نتائج کا اعلان ہوا۔

تالیوں کے بے پناہ شور میں رنگارنگ محفل شعر و سخن برخاست ہوئی۔ مہمانِ خصوصی اور کالج کی پرنسپل نے تقدیس کو اعزازی انعام دیا۔ شبانہ کو اول قرار دیا گیا تھا۔ وہ مشاعرے کے نتیجہ سے بہت خوش تھی۔۔۔ بے انتہا خوش ـــ کہ اس کو تقدیس کا ہوش نہ تھا۔ اس کو شہزاد کی موجودگی کا احساس نہ تھا۔ ہال سے نکلی، شمع اور دوسری بہت سی سہیلیاں ساتھ تھیں۔ مشاعرے پہ تبصرے میں اتنی مگن اتنی مصروف کہ دونوں ہاتھوں کے ساتھ، سر کا بھی استعمال ہو رہا تھا۔ فرح بھابی بھی برابر ساتھ دے رہی تھیں۔

شہزاد اپنی خوش باش بہن کو دور سے دیکھتے، تقدیس کو ساتھ لیے، ہجوم سے ذرا ہٹ کر آہستہ آہستہ چل رہے تھے۔ کالج کی خوبصورت، صاف ستھری عمارت خوب سجی ہوئی تھی۔ خود دیکھ رہے تھے، تقدیس کو دکھا رہے تھے۔ ہجوم بہت تھا اور راستہ نکالنا مشکل۔ ہر کسی کو پہلے نکل جانے کی جلدی۔ پھر رُک

رک کر سنبھل سنبھل کر چلتی تقدیس کا ساتھ۔ پہلے تو تقدیس کی جھجک دیکھتے رہے لیکن آہستہ روی منزل تک نہ پہنچا سکتی تھی۔ سردی کافی تھی۔ رات ڈھل رہی تھی۔ تقدیس اپنا سفید سمور کا کوٹ پہنے، سر پہ پھولوں کے گجرے اب بھی لپیٹے تھے۔ شہزاد نے بھی اپنا بڑا کالا کوٹ پہن لیا تھا۔ ہوا بہت ٹھنڈی چل رہی تھی۔ انہوں نے موٹر تک جلدی پہنچنے کے لیے نازک اندام مست خرام تقدیس کا نرم ہاتھ پکڑا اور پھر اس کے شانوں کے گرد بازو ڈال کر ہجوم سے بچتے بچاتے نکل کر باہر آ گئے۔ کیونکہ لوگ ان دونوں کی اور خاص طور پر تقدیس کی بہت تصویریں لے رہے تھے۔ ہال میں نظم پڑھنے کے دوران لوگوں نے، اخباری نمائندوں نے اور خود شہزاد نے کئی تصویریں اتاری تھیں۔ اب بھی چلتے چلتے اچانک ان کے قریب شعلہ سا لپک جاتا — روشنی کا ایک ہالہ ان کے گرد پھیل جاتا۔ روشنی بکھر کر سمٹ جاتی۔

شبانہ سے پہلے شہزاد تقدیس کو لیے موٹر میں بیٹھ چکے تھے۔ وہ بھی بڑی تیز طرار لڑکی ہجوم کو چیرتی اپنے ڈھیر سارے دوست احباب سمیت آ پہنچی۔

"بھائی جان! آپ کب اور کیسے آ گئے؟" آتے ہی شہزاد سے شبانہ نے پوچھا۔ وہ شرارت سے ہنس دیئے۔ بڑی معنی خیز ہنسی۔ دونوں لڑکیوں کے کالج آجانے کے بعد جب وہ اپنی بے خودی سے خودی میں واپس آئے۔ ہوش و حواس برقرار ہوئے تو کھیل پر جانے کے بجائے تیار ہو کر ادھر ہی آ گئے۔ آتے ہوئے راستے میں سے پھولوں کے ہار بھی خرید لیے کہ انہیں موتیا، گلاب بہت پسند تھے۔ جب بھی اس راستے سے گزرتے تو ڈھیروں ہار، پھول خرید لیا کرتے امی حضور کو پیش کرنے کے لیے!

اور آج!

اپنی پسندیدہ چیز شہزاد نے تقدیس کے حسنِ بے نظیر کی نذر کر دی۔

فرح بھابی اور شمع آج ٹیکسی میں آئی تھیں۔ ان کی گاڑی ورکشاپ میں تھی۔ اتنی رات گئے ہجوم زیادہ ہونے کی وجہ سے سواری ملنے کا سوال ہی نہ تھا۔ شبانہ نے اپنی موٹر ان کو دے دی۔ اور شہزاد کے ساتھ تقدیس اور شبانہ گھر کی طرف چل دیئے۔

شہزاد نے شبانہ کو اول انعام پانے کی بہت مبارکباد اور شاباش دی۔ اور خود بھی "انعام" ان کا منہ مانگا انعام دینے کا

وعدہ کیا۔ تقدیس سے بھی پوچھتے رہے کہ اپنے خوبصورت فن کے مظاہرہ اور بے شمار تعریفوں کے حصول کے انعام میں وہ کیا لینا چاہتی ہے لیکن وہاں نہ جواب ملنا تھا اور نہ ہی ملا — ہاں شبانہ نے تقدیس کو اور تقدیس نے شبانہ کو گلے لگا کر خوب پیار کیا۔ دونوں ایک دوسرے کو مبارکباد دے رہی تھیں۔ گاڑی میں بیٹھتے وقت جگہ کے لیے پھر ایک چھوٹی سی جھڑپ ہو گئی کہ شبانہ تقدیس کو اپنے ساتھ بٹھانے پہ مصر تھی اور شہزاد اپنے ساتھ — !

"آپی — آپ کے ساتھ نہیں ہمارے پاس پیچھے بیٹھیں گی۔" شبانہ نے تقدیس کو شہزاد کے ساتھ اگلی سیٹ پر بیٹھے دیکھ کر کہا۔

"جی نہیں! آپ کی آپی — آپ کے ساتھ نہیں بلکہ آپ کے بھائی کے ساتھ بیٹھیں گی — یہ کوئی ٹیکسی نہیں ہے کہ بیگمات پیچھے اور ڈرائیور آگے بیٹھے۔" شہزاد نے شبانہ کے کہنے پر اٹھ کر گاڑی سے نکلتی تقدیس کو بازو سے پکڑ کر کھینچا کہ وہ وہیں سیٹ پر ٹک گئی۔

لمبی لڑائی کا وقت نہیں تھا۔ رات بہت جا چکی تھی اور لوگ

بھی جا رہے تھے۔ ہجوم کم ہو رہا تھا، اس لیے شبانہ منہ پھلائے، روٹھی روٹھی سی، خاموشی سے تقدیس کے ساتھ ہی اگلی نشست پر بیٹھ گئی۔ دونوں دبلی پتلی سی تو تھیں۔ تقدیس نے ایک طرف سمٹ کر بڑے پیار سے اپنی پیاری شبانہ کے لیے جگہ بنا دی تھی اور اس طرح اس کی وجہ سے دونوں بہن بھائی میں جو جھگڑا کھڑا ہو گیا تھا، اس کو تقدیس نے خود ختم کروا دیا۔ اور شہزاد مستی میں سیٹی بجاتے، جھومتے گاتے دونوں لڑکیوں کو لے کر گھر پہنچے۔

اور!

اگلے ہی دن شام کو شبانہ نے بڑی شاندار پارٹی دے ڈالی، مشاعرے میں انعام لینے پر۔ شبانہ کی سہیلیاں، شہزاد کے دوست، بڑی رونق، بڑا ہنگامہ — یہ نوجوان طبقہ نہ کوئی فکر نہ غم، ہنسی مذاق — بات بے بات قہقہے — یہی ان کی زندگی تھی۔

○

باب ۳

؎ نین کنول، سیال کٹورے، زلفیں ناگن، کالی رات
اس پہ قیامت حسن کی شوخی اور عالم انگڑائی کا

موسم سرما کی منہ زور ہوائیں شائیں شائیں کرتی دیواروں کواڑوں سے سر پھوڑ رہی تھیں۔ بڑے بڑے تناور درخت بھی اتنی رات گئے سرکش ہوا کی زیادتیوں پہ غصے میں بل کھا کھا کر اپنا سر زمین سے پٹخ رہے تھے۔ کبھی گرتے تھے، کبھی اٹھتے تھے ــ اور کچھ تو ہوا کی طاقت سے جڑ سے ہی اکھڑ گئے تھے۔ سڑکوں پہ لگے بجلی کے کھمبوں اور تاروں کو اس وجہ سے نقصان پہنچا تھا۔ کئی علاقوں میں بجلی فیل ہو گئی تھی۔ وہاں گھپ اندھیرے چھائے تھے۔ غرض ہوا کی تیزی طوفانی نوعیت کی تھی۔ ابتدائی راتوں کا ننھا سا چاند کب سے نیند کی آغوش میں سو چکا تھا۔ سیاہ آسمان پر

بے شمار ستارے اندھیری رات میں جگمگا رہے تھے۔ کہکشاں کی دودھیا روشنی بھلی لگ رہی تھی۔ سات سہیلیاں (ستاروں کا جھرمٹ)، سر جوڑے آسمان کی وسعتوں میں دبی دبی سرگوشیاں کر رہی تھیں۔ انہیں خوف تھا کہ کہیں چندا ماموں کی نیند ہی نہ ٹوٹ جائے کیونکہ جن راتوں میں وہ سوتے تھے یہ جاگتی تھیں اور جب وہ جاگتے تھے یہ سوتی تھیں — یعنی چاندنی راتوں میں تارے نظر نہیں آیا کرتے۔ تاریک راتوں میں ہی چمک اٹھتے ہیں۔ بے شمار جھلمل چمکتے تاروں کی ٹھنڈی چھاؤں میں آہنی گیٹ پر کھڑے چوکیدار نے قرمزی رنگ کی چھوٹی گاڑی پہچان کر بٹن دبا دیا۔ گیٹ آہستہ آہستہ کھلنے لگا۔ آدھی رات کے وقت جب دنیا والے اور دنیا کے ہنگامے خاموش سو رہے تھے۔ سوائے طوفانی ہواؤں کے جن کو چین نہ قرار تھا۔ اتنے شوریدہ موسم میں، نگاہیں جھکائے کتنے پُرسکون انداز میں مؤدب کھڑے چوکیدار نے اپنے موٹے گرم کوٹ کی جیب سے ہاتھ نکالا اور پیشانی پہ رکھ کر سلام کیا۔ ملازم کا مالک کو سلام — غلام کا آقا کو سلام۔ غربت کا امارت کو سلام۔

طلباء کے روا بتی ہنگاموں کی وجہ سے تعلیمی اداروں میں

اچانک چھٹیاں ہوگئیں۔ سب سکول کالج، یونیورسٹیاں فوری طور پر غیر معینہ مدّت کے لیے بند کردی گئیں۔ کیونکہ جلسے جلوس، توڑ پھوڑ، اور خون خرابے کے واقعات شدّت اختیار کر چکے تھے۔ تمام کالجوں، مدرسوں، یونیورسٹیوں، بازاروں، سڑکوں پہ پولیس اور فوج کے آدمی کھڑے کر دیئے گئے۔ جیپیں اور ٹرک سپاہیوں سے بھرے ہوئے ادھر سے ادھر سڑکوں پہ گشت کر رہے تھے۔ ایک تو شہروں کی فضا خراب، اوپر سے موسم کا مزاج خراب۔ اتنے زور کی طوفانی آندھی چل رہی تھی کہ بس خدا کی پناہ — شدّت کی سردی — سردیوں کی رات اور آندھی — ایسے میں شہزاد اور شبانہ پہلی فرصت میں اپنے چچا جان اور خالہ جان کے ہاں آ پہنچے۔ سارے شہروں میں اکسائے، بھڑکائے ہوئے مشتعل طلباء کی وجہ سے ہنگامی صورتِ حال — بعض لوگ اپنے مفاد میں قوم کے اس قیمتی سرمایہ نوجوان طلباء کو اپنے مقاصد کے حصول کے لیے آلۂ کار بنا لیا کرتے ہیں۔ اور یہ پُرجوش طبقہ، جوان خون اپنے حال، ماضی اور مستقبل سے بے فکر خواہ مخواہ ہی اشتعال میں آجاتے تھے۔ مار دھاڑ، پکڑ دھکڑ، خون خرابہ، جیلوں میں بند کیے جاتے۔ اکثر اوقات فریقین کی گولی کا نشانہ بن جاتے۔ لیکن پچھلے واقعات بھول کر آئندہ پھر وہی کچھ ہو رہا تھا۔ بڑی بدامنی پھیلی

تھی۔ اوپر سے موسم کا مزاج بھی خراب ــ طوفانی مزاج تھا۔ ایسے میں سعدیہ بیگم شہزاد اور شبانہ کا جانا مناسب نہ سمجھتی تھیں۔ یہ غنڈہ عناصر کسی کو نہیں دیکھتے۔ جوان جہاں لڑکوں کو مار پیٹ کر پھینک دیتے ہیں۔

پھر یہاں تو جوان لڑکی کا ساتھ ــ آدھی رات کا سفر لیکن شہزاد کے دلائل اور معقول بہانے۔ شبانہ کی منت سماجت، پیار بھری خوشامد تقدیس سے ملنے کی بے تابی ــ سعدیہ بیگم مضبوط ارادوں کی خاتون بچوں کی باتوں میں آگئیں۔ ان کی ہٹ کے آگے مجبور ہو گئیں۔ بادلِ نخواستہ اجازت دے دی۔ یہ وقت یہ سماں دونوں کے سفر کے لیے ہزار نامناسب سہی ــ پھر بھی شام کے وقت خود اپنی ہزاروں شفیق دعاؤں کے ساتھ اپنے جگر گوشوں کو گلے لگا لگا کر منہ ماتھا چوم کر رخصت کیا۔

اور ــ!

روانگی کے بعد کا یہ عالم کہ بے چینی میں رات بھر ٹہلتی رہیں۔ دعائیں پڑھتی رہیں۔ اپنے حبیب خدا کے صدقے میں بچوں کے خیریت سے پہنچ جانے کے لیے اللہ تعالے کے حضور دعائیں مانگتی رہیں۔ بڑی بی بھی ساتھ ہی تھیں، جنہوں نے شہزاد، تقدیس اور شبانہ کو بچپن میں کھلایا تھا۔ ان کے ناز نخرے اٹھائے تھے۔ ان کی لڑائیاں چھڑائی تھیں،

ان کے جھگڑے سلجھائے تھے۔ ان کے پیار کے دلار کے مناظر دیکھے تھے۔

شہزاد نے دروازے پر بوجھل ہاتھ مارا ۔۔ تو ۔ خلافِ توقع بند دروازے کی چٹخنی گری اور ہوا کے زور سے دروازہ چوپٹ ہوگیا۔ فوزیہ بیگم کی تقدیس کو خاص ہدایت تھی کہ دروازہ اندر سے اچھی طرح احتیاط سے بند کرکے، خوب دیکھ بھال کر احتیاط سے سویا کریں۔ اور خاص طور پر آج کی طوفانی رات میں اپنی پوری طرح تسلّی کرکے گئی تھیں۔ لیکن شاید دروازہ ٹھیک سے بند نہ ہوا تھا۔ یا زوردار ہوا کے زور کی وجہ سے ایسا ہوا ۔ یا پھر اتنے عزیز مہمانوں کی آمد کی خوشی میں خود بخود دروازہ کھل گیا۔ بہرحال شہزاد نے بوجھل پردہ ہاتھ سے ہٹاتے ہوئے پہلے شبانہ کو شانہ سے پکڑ کر اندر کیا اور پھر خود بھی آگئے۔ پلٹ کر دروازہ اچھی طرح بند کردیا۔

چینی پتھر کی گلابی گڑیا ۔۔ بنگالی انداز میں ساڑھی پہنے سر پہ مِنا سا لیمپ اٹھائے رقص کر رہی تھی۔ ہلکی نیلی روشنی کا ٹیبل لیمپ گڑیا کی صورت میں مسہری کے قریب سرہانے پڑی سائیڈ ٹیبل پہ روشن تھا۔ بڑی نفاست سے آراستہ خوابگاہ میں خوابناک روشنی۔ ہلکے نیلے رنگ کی روشنی پھیلی تھی۔ گہرے سبز رنگ کے مخملی لحاف میں گل رُخ تقدیس دروازے کی طرف رُخ کیئے محوِ خواب تھی۔ گلابی چہرے کے گرد سیاہ بال

بکھرے تھے۔ دراز نوکیلی سیاہ پلکوں کا سایہ صحت مند چمکیلے عارض کو چوم رہا تھا۔ ہلکی سی آہٹ پر ریشمی پلکوں کو جنبش دی۔ مخمور، نشے میں چور، کٹورا سی آنکھوں میں گلابی ڈورے، لرزتے آتشیں لب، گرتی اٹھتی، سیاہ پلکیں، چہرے پہ آئے سیاہ بالوں کو ہاتھ سے پرے کرتے ہوئے آدھی سوئی، آدھی جاگی تقدیس سبز لحاف میں اس طرح لیٹی ہوئی تھی کہ صرف چہرہ باہر تھا۔ جیسے سرسبز مخملیں سبزے میں نیم خوابیدہ گلاب، گلاب سے گلابی چہرے کی چمک، مہک اور مست، گلابی آنکھوں سے چھلکتی شراب کے نشے سے سرشار شہزاد نے ڈگمگاتے ہوئے کرسی کی پشت پر سہارا لے لیا۔

؎ نشہ بڑھتا ہے شرابیں جو شرابوں میں ملیں

اتنا سحر زدہ منظر دیکھ کر مسحور ہو رہے تھے، مخمور ہو رہے تھے۔ شبانہ جلدی سے بڑا گرم کوٹ اتار کر تقدیس کے بستر میں ہی گھس گئی اور لپٹ لپٹ گئی اپنی پیاری آپی کو، شہزاد امی بہکے بہکے انداز میں نشے میں، سرور آمیز کیف میں مدہوش سے بے ہوش سے کھڑے رہ گئے۔

"بھائی جان بیٹھ جائیے نا آپ بھی" شبانہ نے ایک ہاتھ سے تقدیس کے بال سمیٹتے ہوئے ان کو پیار کرتے ہوئے کہا۔

"میری پیاری آپی جان!" شبانہ اب بھی تقدیس کی گردن میں باہنیں ڈالے تھی۔

شہزاد بڑا گرم کوٹ اُتار کر کرسی پہ رکھنے کے بعد ٹائی کی گرہ ڈھیلی کر رہے تھے۔ کمرے میں ہیٹر لگے ہونے کی وجہ سے خاصی گرمی تھی۔ باہر کی نسبت تو درجہ حرارت میں بہت فرق تھا۔ انھوں نے اپنا سرمئی کوٹ بھی اتار دیا۔ گہرے سرمئی سوٹ پہ قرمزی رنگ کی ٹائی لگائے تھے۔ جس پر چھوٹے سفید دائرے بنے تھے۔ ٹائی کے ساتھ کا رومال کوٹ کے اوپر کی جیب سے تھوڑا سا باہر نکلا تھا۔ کشادہ پیشانی پہ جھکے سیاہ بال شہزاد نے دائیں ہاتھ سے ہٹاتے اور انگلیوں سے بالوں پہ کنگھی پھیرتے سنوارنے لگے۔ اور پیشانی پہ بچپن کی دی ہوئی تقدیس کی چوٹ کا نشان نمایاں ہو کر نظر آ رہا تھا۔ تقدیس کی خاموشی کو نیند کا غلبہ سمجھتے ہوئے شہزاد خاموشی سے تقدیس کے پلنگ کے ساتھ پاؤں کی طرف پڑی گدے دار کرسی پہ نیم دراز ہو گئے۔ آنکھیں بند کئے، پیشانی کو ہاتھ سے رگڑ رہے تھے، ٹھنڈی ہوا کی وجہ سے سر میں درد ہو گیا تھا۔ جوتوں سمیت سامنے پڑی میز پہ دونوں پاؤں لمبے کر دئیے۔ شہزاد کی غیر معمولی خاموشی تقدیس اور شبانہ نے محسوس کی۔

ابھی شبانہ ان کو دیکھنے پوچھنے کے لیے بستر سے نکلی ہی تھی کہ ملازم گرم گرم چائے مع خشک میوہ جات، تازہ موسمی پھل، کیک پیسٹری

مختلف اقسام کے بسکٹ، غرض بے شمار لوازمات کے ساتھ ٹرالی دھکیلتا حاضر ہو گیا۔ شہزاد اور شبانہ کے حضور مؤدبانہ سلام گذارا۔ شہزاد سیدھے ہو کر بیٹھ گئے، اور حسبِ معمول مسکرا کر شوخی سے اپنی فطری خوش مزاجی سے ملازم کی احوال پرسی کی۔ وہ سب کو ایک ایک پیالی چائے کی پیش کر کے مؤدبانہ ایک طرف کھڑا ہو گیا تھا۔

"آپی سچ بتائیے آپ کو آج ہمارا کتنا انتظار تھا" شبانہ نے ایک ہاتھ میں اپنی اور دوسرے ہاتھ میں تقدیس کی پیالی پکڑے چائے پیتے ہوئے کہا۔

"ہوں — آج تمہارا بہت انتظار تھا۔ تعلیمی ادارے بند ہونے کی بڑی خوشی ہوئی" تقدیس نے پلکیں جھکائے نرم مترنم آواز میں کہا۔ وہ شب خوابی کے قیمتی سفید لباس میں تھی اور باریک ریشمی ربن کی ڈوریاں پھول بنا کر شانوں پہ بندھی تھیں۔ اس لیے وہ لحاف میں اور بھی لپٹی جا رہی تھی کہ شہزاد کی موجودگی میں وہ کیسے باہر آ جاتی۔ شرم آتی تھی حجاب آتا تھا — اسی لیے تو اس نے چائے کی پیالی بھی نہیں لی تھی۔

"اور — ہمارا — نہیں" شہزاد نے شرارت سے مسکراتے ہوئے اپنے سینے پہ ہاتھ رکھتے ہوئے تقدیس کی طرف دیکھا۔ تقدیس نے شہزاد کی طرف رُخ موڑ کر ایک لمحہ کے لیے پلکیں اٹھائیں اور فوراً

جھکالیں۔ گلابی چہرے پہ سرخ رنگ بکھر گیا۔ حجاب کی اس رنگین لہر سے حسین چہرہ اور بھی نکھر گیا۔

"آپی! ہمیں تو تم سے اتنی زیادہ خوشی ہو رہی ہے کہ کیا بتائیں۔ وقت کاٹنا مشکل ہو رہا ہے" شبانہ تقدیس کی چائے والی اور اپنی خالی پیالی تقدیس کے اُوپر سے جھک کر سائیڈ ٹیبل پر رکھنے کے لیے آگے کو جھکی تو؟

مخمل کا سبز لحاف انجانے میں کھسک گیا۔ تقدیس کے عریاں شانے، تکون گلے پر لگے چوڑے باریک جالی کے فیتے میں سے چمکتا دمکتا گورا گورا، گلابی گلابی روپ! شہزاد کی توجہ اتفاقاً اپنی چائے کی پیالی کی طرف تھی۔ تقدیس نے جلدی سے دونوں ہاتھوں سے لحاف گردن بلکہ ٹھوڑی تک کھینچ کر لپیٹ لیا۔

"اور — ہمیں کیا خوشی ہو سکتی ہے جبکہ ہمارا کسی کو انتظار ہی نہ تھا۔" شہزاد نے زیرِ لب تبسم کو دباتے ہوئے سنجیدہ ہونے کی کوشش کی۔ لیکن شریر ہنسی حسین آنکھوں سے پھوٹی پڑ رہی تھی۔

تقدیس نے لحاف درست کرتے ہوتے سرخ چہرہ دوسری طرف پھیر لیا۔

"اب آپ کا علیحدہ انتظار تو نہیں ہونا تھا نا۔ ظاہر ہے ہم

دونوں نے اکھٹے ہی آنا تھا — ہے نا آپی جان! میں بھلا اکیلی کیسے آسکتی تھی۔ اپنے پیارے بھائی جان کے بغیر —" تقدیس کی ٹھوڑی انگلیوں سے اوپر کرتے ہوتے شبانہ نے میٹھے میٹھے لہجے میں کہا۔

"بھائی جان سے علیحدہ آپی میری توقع کیسے کر سکتی ہیں۔ ہم دونوں بہن بھائی یک جان دو قالب"۔ شبانہ تقدیس کی وکالت کر رہی تھی اور بھائی کا دل خوش کر رہی تھی۔ "اور دوسری بات ناخوشی کی یہ ہے کہ ہمیں صبح ہی جاگیر پر ضروری پہنچنا ہے۔ بہت سے حساب کتاب ادھورے پڑے ہیں" شہزاد نے منہ بسورتے ہوئے افسردگی ظاہر کی۔

تقدیس چونک سی گئی اور شبانہ منت سماجت پر اتر آئی۔

"میرے اچھے بھائی جان! دو چار دن ٹھہر جانے میں کیا حرج ہے۔ اگر یہ چھٹیاں نہ بھی ہوتیں — تو — بھی — آپ کے حساب کتاب ادھورے رہتے — التوا میں پڑ جاتے" شبانہ کا تو سارا مزہ ہی کرکرا ہو گیا۔ اسے شہزاد کا اتنی جلدی جانا اچھا نہ لگا۔ اور تقدیس بھی پہلو بدل کر رہ گئی۔ دو تین بار نگاہ اٹھائی

کچھ کہنا چاہا لیکن کہہ نہ سکی۔

"ٹھہرنا ناممکن ہے۔ کام بہت زیادہ ہے۔" شہزاد نے سر کو انکار میں ہلایا۔ وہ بڑی سنجیدہ صورت بنائے بیٹھے تھے۔

"کچھ دن رک جائیے، میرے بڑے ہی پیارے بھائی جان! آپ — آپی اور ہم سب مل کر تفریح کریں گے۔ پکنک منائیں گے۔" شبانہ شہزاد کو منا رہی تھی۔

"آپی جی! آپ بھی تو منائیے نا بھائی جان کو۔" شبانہ نے تقدیس کا چہرہ دونوں ہاتھوں میں پکڑ کر شہزاد کی طرف کرتے ہوئے کہا۔

شبانہ بڑی بے تاب ہو رہی تھی کہیں شہزاد سچ مچ ہی نہ چلے جائیں۔

"جی ہاں! آپ کی آپی ہمیں کیا منائیں گی۔ انہیں تو سر پھاڑنا آتا ہے۔ نہیں مانوں گا تو کہیں ڈنڈا اٹھا کر سر میں دے ماریں گی۔ زور دار دھکا دے کر اوندھے منہ گرا دیں گی۔ ہم زخمی ہو کر پڑ جائیں گے۔ ان کا غصہ ٹھنڈا ہو جائے گا اور سارا معاملہ طے۔" شہزاد ہنستے ہوئے کہہ

رہے تھے۔ تقدیس نے شرمندہ ہوتے ہوئے شہزاد کی طرف دیکھا۔ شہزاد جب بھی اس واقعہ کا ذکر کرتے، تقدیس کا رنگ اڑ جاتا۔ لیکن کچھ نہ کہنے کی عادت تھی اور شہزاد کو ہمیشہ ہی اس شرمندہ شرمندہ مکھڑے پہ پیار آجاتا۔ اسی لیے بار بار چھیڑنے کی خاطر تذکرہ کیا کرتے۔ یعنی سہ

میرے چپ رہنے پہ کب وہ باز رہتے چھیڑ سے
مسکرا کر دیکھتے، پھر مسکرا کر دیکھتے!

"بھائی جان! یہ بڑی بڑی بات ہے۔ آپ آپی کی بچپن کی بھول کو بھولتے بھی تو نہیں۔" شبانہ نے پھر تقدیس کی حمایت کی۔

"ہاں۔ اگر تقدیس ہمارا راستہ روکیں اور ہمیں نہ جانے کا کہیں تو پھر ہم غور کریں گے۔"

شہزاد بڑے فلسفیانہ انداز میں اپنی بند مٹھی پہ چہرہ رکھے آنکھیں بند کیے بڑی سنجیدگی سے بولے۔ لیکن چپکے سے ایک آنکھ تھوڑی سی کھولے ادھر کا منظر بھی دیکھ رہے تھے۔

"روک لیجئے آپی۔ کہہ دیجئے نا بھائی جان کو۔" شبانہ کتنے پیارے انداز میں بیقراری سے تقدیس سے اصرار کر رہی تھی۔

تقدیس ایک تو پہلے ہی کم سخن واقع ہوئی تھی۔ اور پھر نہ جانے کیا بات تھی کہ شہزاد کے سامنے تو ہزار کوشش کے باوجود بھی ہمت نہ پڑتی تھی۔ بات ہوتی ہی نہ تھی۔ انہوں نے شہزاد کی فرمائش، شبانہ کی خواہش اور سفارش پہ جھکی جھکی لرزتیں پلکیں اٹھائیں —— شہزاد کی طرف دیکھا۔ ان نگاہوں میں مسکراتی شرماتی التجا اور لبوں پہ دل آویز تبسم —— نرم گالوں میں مسکراتے ہوئے کتنے پیارے بھنور سے پڑ رہے تھے۔ شہزاد ہزار سنجیدہ ہونے کی کوشش میں ناکام ہو رہے تھے۔ اور بے اختیار ہنس دیئے۔ تقدیس کی خاموش نگاہوں کی زبان باعثِ گفتار تھی۔ نگاہوں نگاہوں میں ہی پیام پہنچ گئے۔ مستقبل کے نہ جانے کتنے افسانے مچل کر رہ گئے۔ کتنے ہی پروگرام مرتب ہو گئے۔ آنکھوں ہی آنکھوں کی باتیں دو دلوں نے سنیں اور سمجھ لیں کہ بھائی سے والہانہ چاہت اور تقدیس سے بے پناہ محبت کرنے والی شبانہ بھی اس اقرار و اصرار کی تہ تک نہ پہنچ سکی۔ دل نواز بڑا مقدس تبسم تقدیس کے چہرے پہ کھیل رہا تھا۔ شہزاد بھی متبسم تھے۔ اسی انکار و اقرار کی کشمکش میں نشیلی رات اپنا سفر طے کرتی رہی۔ چائے کے بعد شہزاد سامنے پڑی نیچی مگر لمبی میز پہ ٹانگیں

دراز کر کے کرسی پر ہی گدیوں کے سہارے بیٹھ گئے۔ وہ ادھ کھلی آنکھوں سے سامنے ہی دیکھ رہے تھے۔ بظاہر سونے کی ایکٹنگ کر رہے تھے۔ شبانہ اور تقدیس یہی سمجھیں کہ سو گئے ہیں۔

"محفل میں سرگوشی آدابِ محفل کے خلاف ہے"۔ شہزاد نے سیدھے ہو کر بیٹھتے ہوئے کہا۔ آنکھیں پوری طرح کھلی اور وہ بالکل بیدار تھے۔ انہوں نے تقدیس کے ہونٹ ہلتے دیکھ لیے تھے۔ وہ شبانہ سے آہستہ آہستہ کچھ کہہ رہی تھی۔

"آپ ہی کے بھلے کی سرگوشی ہے بھائی جان! آپی آپ پر کمبل ڈالنے کے لیے کہہ رہی ہیں"۔ شبانہ نے کمبل سنبھال کر بھائی کے اوپر ڈالتے ہوئے کہا۔

"مہمان تو میں ان کا ہوں — اور میری ہی بہن سے میری خدمت کرواتی ہیں۔ خود تو بستر سے کھسکتی نہیں"۔ شہزاد نے کمبل کے کنارے پر انگلیاں پھیرتے ہوئے کہا۔

شبانہ کو معلوم تھا کہ تقدیس ان کو بھائی پہ کمبل ڈالنے کے لیے کیوں کہہ رہی ہیں کہ وہ مجبور تھی اس وقت۔ بڑے پیار سے تقدیس کا دوہری طے کا ساٹن کے نرم بارڈروں والا آسمانی کمبل شہزاد پر ڈال رہی تھی۔ سفید قمیض — گلے میں ڈھیلی پڑی ٹائی،

الجھے بکھرے بال — سفر کی تھکن — نیند کا خمار — شہزاد بڑے اچھے لگ رہے تھے۔ شبانہ نے جھک کر کمبل اچھی طرح بھائی کے شانوں بلکہ گردن تک اچھی طرح لپیٹ دیا۔ اتنی ٹھنڈی رات میں کہیں بھائی جان کو سردی ہی نہ لگ جائے۔ آسمانی کمبل میں لپٹے شہزاد — جیسے نیلے نیلے سمندر کے پانی میں تیرتا گلاب کہ شہزاد کی گلابی صحت مند رنگت، مہکتی جوانی، ابھرتا شباب' خوبصورت کھلتے گلاب سے بھی زیادہ خوبصورت تھا۔ شہزاد آنکھیں بند کیے خاموش لیٹے تقدیس کی نوازش غائبانہ پر بڑا فخر محسوس کر رہے تھے۔ اور ایکدم سوچنے لگے کہ یہ دونوں تو نرم گرم بستر میں پڑ کر آرام سے سو گئیں اور وہ خود بے چارے آدھے کرسی اور آدھے میز پر اٹکے، ٹکے پڑے تھے۔ ساری سنجیدگی ساری نیند بھول بھال کر اچانک شرارت کی رگ پھڑکی۔ موٹا کمبل ایک طرف پھینک کر سفید قمیص کی آستین چڑھانے لگے۔

شبانہ گہری نیند سو چکی تھی۔

اور تقدیس بڑی گہری، بڑی میٹھی نیند سے بیدار ہوئی تھی۔

اب دوبارہ نیند نہیں آ رہی تھی۔ پھر بھی آنکھیں بند کیے

رخ موڑے خاموش لیٹی تھی۔ اس کے خیال میں شہزاد بھی شبانہ کی طرح سو چکے تھے۔

"یہ کہاں کا انصاف ہے کہ خود تو نرم گرم بستر پر سوئیں، مخمل کے ریشمی لحافوں میں پڑے رہیں اور ہم غریب مہمانوں کو، پردیسیوں کو میزیں، کرسیاں جوڑ کے اُوپر ڈال دیا جائے۔ یہ آداب مہمان نوازی ہے — یہ صلہ ہے — اتنی دُور سے ملنے آنے کا —؟ نہیں چاہیئے ہمیں آپ کی خیرات — آپ کے حسُن کی خیرات، آپ کی جوانی کا صدقہ — وہ پڑا ہے آپ کا کمبل — اوڑھ لیجیئے خود ہی" شہزاد نے بڑے غصّے میں بڑبڑاتے ہوئے بڑی سنجیدگی سے سبز لحاف دونوں ہاتھوں میں پکڑ کر کھینچا اور گھسیٹ کر زمین پر پٹخ دیا۔ سوئی ہوئی شبانہ — جاگتی ہوئی تقدیس دونوں ہی بستر پر خالی پڑی رہ گئیں۔

تقدیس ریشم کا سفید بڑا قیمتی شب خوابی کا لباس پہنے تھی۔ سفید باریک ربن کی ڈوریاں پھول بنا کر ملائم شانوں پہ بندھی تھیں۔ تکون گلے اور کمر پہ باریک جالی کا فیتہ لگا تھا۔ اور فیتے کے ساتھ ساتھ کٹاؤ میں جھول دے کر جھالروں سے خوبصورت ڈیزائن بنا تھا۔ تقدیس گھبرا کر، شرما کر جلدی سے بستر سے اٹھ کر کھڑی ہوگئی۔

پتلی کمر پہ چیست اور پاؤں تک لمبا، بڑے گھیر کا فراک نما لباس ــــ جس کے جھول اور گھیرے پر دوہری جھالریں لگی تھیں۔ ملائم سیاہ بال خوبصورت چہرے کے گرد اور سینے اور شانوں پر بے ترتیبی سے بکھرے پڑے تھے۔ گھرائی گھبرائی کھڑی کبھی دونوں ہاتھوں سے بال سمیٹتی تو اپنے دونوں ہاتھ مروڑتی ـــ سفید کپڑوں میں سر جھکائے کھڑی تقدیس ـــ گلابی، گلابی، شرابی، شرابی مہکتا شباب چھلکتی شراب، شہزاد کے لیے تقدیس کا یہ نوخیز روپ بڑا دلنواز، بڑا دل آویز، بڑا دلکش تھا۔ وہی سبز مخمل کا لحاف اپنے گرد لپیٹے کھڑے ـــ تقدیس کے سحر میں ڈوبے مسحور سے تھے۔ مخمور فضاؤں میں مدہوش ہوئے جارہے تھے۔ پھر ایکدم ہوش میں آئے تو منہ پھیر لیا۔

اور تقدیس!

بڑی مشکل سے بڑی ہمت کر کے، تھوڑا سا جھکی اور زمین پر پڑا آسمانی کمبل اٹھا کر اپنے اوپر اوڑھنا چاہا۔ لیکن شہزاد نے دونوں پاؤں شرارت میں کمبل کے اوپر کناروں پر رکھ دیئے ـــ اور خود بدستور منہ دوسری طرف کیئے ہی کھڑے تھے۔ ایک تو دوہری تہ کا بوجھل کمبل، اوپر سے شہزاد کا دباؤ۔ پھر لباس کی تراش خراش کا انداز تقدیس کا حجاب کے مارے برا حال تھا۔ پھر بھی حواس نے کچھ

ساتھ دیا تو پلنگ کے قریب ہی پڑی کرسی پر سے اپنا ڈریسنگ گاؤن لے کر پہن لیا۔ گھبرائی گھبرائی سی تھی۔ جلدی میں گاؤن کی کمر میں لگی ریشم کی موٹی بل دار ڈوری زور سے کمر کے گرد لپیٹنے لگی۔ گرم بستر سے نکلی تھی۔ سردی سے کانپ رہی تھی۔ حجاب سے لرز رہی تھی۔ دانت بج رہے تھے۔ ہونٹ تھرک رہے تھے۔ اور جیسے خود کو سنبھال نہ پا رہی تھی۔ وجود گرتا جا رہا تھا۔ اول تو کچھ زبان سے کہنے کی عادت ہی نہ تھی۔ پھر اس وقت تو کیفیت ہی کچھ اور ہو رہی تھی۔

شہزاد نے لحاف تو پلنگ پر پڑی بے خبر شبانہ پہ ڈال دیا۔ اس کی نیند بڑی گہری تھی — ہمیشہ ہی رات بھر سونے کے بعد صبح دس مرتبہ جگانے پر کہیں بیدار ہوتی تھی۔

اور — !

اور پلکوں میں دیپک جلائے گالوں پہ سُرخی پھیلائے دانتوں میں انگلی دبائے بڑے معصوم انداز میں کمر پھیرے کھڑی تقدیس کے شانوں پہ بکھرے بالوں کو سنوارتے، سمٹتے ہوئے دونوں شانوں سے پکڑ کر رُخ اپنی طرف پھیر لیا۔ پتلی کمر کے گرد بندھی ڈوری کی بندش سے شباب کے گلاب اور بھی مہک کر کھل اٹھے تھے۔

اتنے حسین خطوط و نقوش نے شہزاد سے شوخ، شریر، چنچل، شرارتی انسان کو جکڑا کر رکھ دیا۔ وہ اس نوخیز روپ اور سرخ لباس کے شعلوں کی لپیٹ میں آ گئے۔ بڑے بے خود سے ہو گئے۔ اور سردی سے ٹھٹھرتی، گھبراہٹ میں لرزتی گرتے گرتے بمشکل بچنے کی، سنبھلنے کی کوشش کرتی تقدیس کو ــــ شہزاد نے اپنی باہوں کے حصار میں لے لیا۔

پسینے چھوٹنے لگے،

ٹھٹھرتے وجود سے جیسے شعلے نکلنے لگے۔

اس کے باوجود ایک سکون کا احساس تھا۔

ایک لطیف سا لطف تھا۔

ایک لذت بخش مزہ تھا!

جو تقدیس کو گرتے سے سنبھلنے میں اور شہزاد کو گرتوں کو سنبھالنے میں ملا تھا۔

دونوں کو ــــ اس شدّت کی حدّت سے گھبرا کر گرفت نرم کرنی پڑی ــــ اور فاصلے بڑھنے لگے۔

وہ بہکے قدموں سے، بڑی مشکل سے شبانہ کے قریب اپنے پلنگ تک پہنچی۔ الجھی سانسوں کو ہموار کرتی، بے ترتیب بالوں کو

سنوارتی، بڑی خاموش، بڑی اداس سی پلنگ کے سرہانے کی طرف گٹھاؤ دار رنگین سہارے پہ سر رکھ دیا۔ آنکھیں بند تھیں اور آدھا چہرہ بالوں میں چھپا تھا۔ یہ دھوپ چھاؤں کا منظر۔ سینے کے زیر و بم کو۔ بے قابو دل کی دھڑکن کو، دل کی تیز رفتار کو دبانے کے لیے نازک سا ہاتھ سینے پہ رکھے تھی۔ پلکیں لرز رہی تھی۔ ماتھے اور گالوں پہ پسینے کے قطرے چمک رہے تھے۔

شہزاد چپکے کھڑے دیکھتے رہے، اور ایک بار پھر جو شرارت سوجھی — تقدیس کے گھٹنوں پہ آہستہ سے ہاتھ رکھتے ہوئے، اس کے سامنے گھٹنوں کے بل جھکے، منی سی ٹھوڑی کو اپنی انگلی سے پکڑ کر بولے۔

"اتنی سوگواری اور اداسی کا سبب آخر کیا ہے؟"

وہ اسی طرح خاموش، آنکھیں بند کیے، گہری گہری، تیز تیز سانس لے رہی تھی۔

"اوہ — اب سمجھا۔" تقدیس کی ٹھوڑی اپنی انگلی سے ذرا اور اونچا کرتے ہوئے خود اور بھی جھک گئے — قریب بہت قریب، جھکاؤ بڑھتا گیا۔ گرمی اور تپش سے گھبرا کر تقدیس نے آنکھیں کھول دیں۔ اپنے دونوں نازک ہاتھ اپنے چہرے پہ رکھ لیے۔

وہ شہزاد کو اتنا قریب پا کر اور بھی زیادہ گھبرا گئی تھی۔

"چلو معاف کیا ــــ لیکن ادھار رہا" کہہ کر شہزاد نے تقدیس کو نازک سی گڑیا کی طرح دونوں ہاتھوں میں اٹھا کر دھڑام سے بستر پہ گرا دیا ــــ سپرنگ والا پلنگ اور فوم کا گدا، تقدیس کے گرنے سے سارا بستر ہل گیا۔ اور شہزاد بھی اچھل کر پلنگ پر آ گئے تھے ــــ اور اتنے زور سے بڑی زندہ دلی سے آدھی رات کو بڑا بیدار قہقہہ لگایا کہ مست خواب پڑی شبانہ گھبرا کر بیدار ہو گئی۔ وہ اٹھ بیٹھی اور تقدیس بھی بیٹھ گئی، شبانہ کے ساتھ ہی۔

"آدھی رات کو بھی چین نہیں میرے بھائی جان کو، حد کرتے ہیں بھائی جان آپ بھی" شبانہ آنکھیں ملتے ہوئے گھبرا کر صورتِ حال کو سمجھنے کی کوشش کر رہی تھی اور مسکرائے بغیر نہ رہ سکی۔ اپنے شریر بھائی کی زندہ دلی، خوش مزاجی پر۔ وہ ان کی عادت سے واقف تھی۔ شبانہ نے تقدیس کو بھی اچھی طرح سے لحاف اوڑھا دیا۔ دونوں پلنگ کے سہارے سے سہارا لگائے بیٹھی تھیں۔ شہزاد بھی دونوں کے سامنے پاؤں کی طرف اسی بستر پہ لحاف میں بیٹھ گئے ــــ سب مل کر بڑی شرافت سے، بڑی صلح صفائی کے موڈ میں پہاڑی مقام کی سیر کا پروگرام بنانے لگے۔ کیونکہ

کل پرسوں سے اخباروں میں، ٹی وی اور ریڈیو پر برفباری کی خبریں آ رہی تھیں۔

اور پھر!

ریکارڈنگ کے ساتھ ساتھ تاش کی جو بازیاں لگی ہیں —— شہزاد کی بے ایمانیوں اور دھاندلیوں کی وجہ سے کئی بار جھگڑا ہوا۔ سینکڑوں بار شبانہ نے پتے پھینک دیئے لیکن پھر شہزاد بہلا کر منا کر فضا ہموار کر لیتے۔ چائے اور کافی کے نہ جانے کتنے دور چلے۔ ملازم بے چارہ بھی ساری رات جاگتا رہا۔ ہر دفعہ جب شہزاد گھنٹی بجاتے تو بڑی مستعدی سے بھاگا آتا اور بڑی فرمانبرداری سے حکم بجا لاتا۔ شہزاد صرف حکم ہی چلانا نہ جانتے تھے۔ ان نوکروں کے وارے نیارے تھے۔ جائز حساب سے دوگنا چوگنا شہزاد ان کو دیتے تھے۔ کبھی کسی کا حق نہ رکھا تھا۔ بلکہ فضول خرچی کی حد تک ان کی جھولیاں بھر دیتے تھے۔

تاش پہ جب آخری بار شدید لڑائی ہوئی تو کیرم بورڈ شروع ہو گیا اور وقت گزرنے کا احساس ہی نہ تھا کہ صبح کی روشنی چاروں طرف پھیل گئی۔

اگلی صبح فوزیہ بیگم دونوں بچوں کو دیکھ کر نہال ہو گئیں۔ صدقے

واری ہو گئیں۔ گلے لگا لگا کر پیار کرتی رہیں۔ رات کے وقت اپنی آمد کی اطلاع ان کو نہ دی تھی کہ شہزاد ان کو نیند میں ڈسٹرب کرنا نہیں چاہتے تھے۔

ظفر نیازی سرکاری کاموں کے سلسلے میں سرکاری دورے پر بیرون ملک گئے ہوتے تھے۔ تقدیس کی رہائش اوپر کے کمروں میں تھی۔ فوزیہ بیگم اور ظفر نیازی نیچے ہوا کرتے تھے۔ فوزیہ بیگم نے بڑی محبت سے شہزاد کو ہفتہ بھر کے لیے روک لیا۔ کیونکہ انہوں نے خالہ سے بھی یہی کہا تھا کہ وہ آج ہی زمینوں پر جارہے ہیں۔ آپ سب لوگ بھی ساتھ ہی چلئے ــــ تعلیم کے ساتھ ساتھ مرحوم والد کی شہری دیہاتی تمام جاگیرداری کا انتظام اور دیکھ بھال ان کو ہی کرنا پڑتی تھی کہ خواہ کتنے بھی وفادار اور ایماندار ملازم ہوں، پھر بھی مالکوں کی سرپرستی اور نگرانی میں زیادہ دلجمعی سے کام کرتے تھے۔ جاگیر کی نگہداشت اور حساب کتاب کی پڑتال اور دیکھ بھال کی مصروفیت کی وجہ سے ہی شہزاد پڑھائی میں اپنے ہم عمر ساتھیوں سے کچھ پیچھے رہ گئے تھے۔ سلسلۂ تعلیم کالج کی آمدورفت تک باقی تھا۔ امیروں، رئیسوں لیکن شریف زادوں کی طرح کالج کی تقریبات، کھیلوں اور پکنک

تفریحات وغیرہ میں برابر شریک ہوتے۔ البتہ سالانہ امتحان میں شمولیت کا مسئلہ کئی عرصہ سے التوا میں پڑا تھا۔ قسمت کے دھنی اور دھن کی فراوانی، سندات، ڈگریاں حاصل کرنے کے محتاج نہ تھے۔ پھر بھی بی اے کرنے کے بعد وکالت کی تیاری کر رہے تھے۔ شب و روز بڑے عیش و آرام میں گذر رہے تھے۔

شروع شروع میں سعدیہ بیگم کی نگرانی میں جاگیر کا کام کیا کرتے کہ شوہر کی وفات کے بعد بڑی دانا خاتون نے سارا نظام و انصرام خود ہاتھوں میں لے لیا تھا۔ پھر بیٹے کو تربیت دی اور اب بھی ہر کام ان کے مشورے اور ان کی رضا سے ہو رہا تھا۔ اکثر فصلوں کے موسم میں بیٹے کے ساتھ خود جاتی تھیں۔ وہاں رہائش کا معقول انتظام تھا۔ ہر طرح کی ذاتی ضروریات کے لیے سہولتیں مہیا کر رکھی تھیں۔

صبح ہوئی تو ــــ ساری رات اودھم، طوفان اور شرارتوں میں گذارنے کے بعد ـــ صبح نو بجے کے بعد سوتے ہیں تو دوپہر کا بھی ہوش نہ تھا۔ اپنے اپنے کمروں میں پڑے آرام سے پڑے سوتے رہے۔ شام کو اندھیرا ہوتے کہیں بیدار ہوتے۔

سب نے رات بھر کی کسر سارا دن سو کر پوری کی ۔ ادھر سعدیہ بیگم کی بیقراری تھی ۔۔ کہ دونوں بچوں کے بخریت خالہ کے گھر پہنچنے کی اطلاع کی منتظر ۔۔۔ وعدہ کر کے گئے تھے کہ جاتے ہی فون کر دیں گے ۔ بے چاری دعائیں پڑھتی رہیں ۔ صدقے دیتی رہیں ، منتیں مانتی رہیں اور فون کا انتظار کرتے کرتے بے حال ہو گئیں تو آخر کار ہار کر فوزیہ بیگم کو فون کیا ۔ شہزادا اپنی شرارتوں میں بھول ہی گئے تھے ۔

لاپرواہ ، بے فکرے بچوں کے آرام سے بے خبر سونے کی خبر ملی ، خدا کا شکر ادا کیا ۔ بے فکری اور خوشحالی نے بچوں کو کسی سوچ اور فکر کا احساس ہی نہ دیا ۔ ہر وقت فارغ البال خوشحال زندگی گذر رہی تھی ۔ دونوں بہنیں بڑی دیر تک فون پر باتیں کرتی رہیں ہنستی خوش ہوتی رہیں ، سوائے طاہر نیازی کے صدمہ کے ان کی زندگیوں میں ہر طرح کا اطمینان و سکون تھا ۔ روپے پیسے کی فراوانی ، خوشیاں ان کی قسمت میں اور خوشحالی ان کی تقدیر میں لکھی تھی ۔ دنیا والے ان کو دیکھ کر رشک کرتے اور وہ دونوں نیک بیبیاں ہر آن ، ہر گھڑی خدا کی رحمتوں کا شکر ادا کرتیں ۔

باب ۴

چاند، تارے، گھٹا، پھول، شبنم، صبا
چاندنی، شاخ، کلیاں، دھنک روشنی
سب ملے اک جگہ، تو یہ مکھڑا بنا
جس نے دیکھا یہ مکھڑا، کہا مرحبا

"بھائی جان! آپی کی طبیعت خراب ہو رہی ہے۔" شبانہ نے اپنے ساتھ بیٹھی تقدیس کی پیشانی سے پسینہ پونچھتے ہوئے کہا۔ وہ شہزاد کا کندھا ہلا رہی تھی۔

شہزاد نے پلٹ کر دیکھا۔ تقدیس رومال ناک پہ رکھے، گاڑی کی نشست کی گدی دار پشت سے سر ٹکائے تھی۔ رنگت خاصی زرد ہو رہی تھی۔ دراز سیاہ پلکیں عارض پہ جھکی تھیں اور عارض پہ پسینے کے موتی بھی چمک رہے تھے۔ شہزاد تو یہ سب

دیکھ کر سخت گھبرا گئے۔ ڈرائیور سے گاڑی رکوا کر تیزی سے باہر نکلے۔ اپنی نشست کی پشت کو جھکا کر راستہ بنایا۔ پہلے شبانہ اور پھر تقدیس کو سہارا دے کر باہر نکالا۔

"کیا ہوا — بلندی پر جانے کی وجہ سے طبیعت خراب تو ہو جاتی ہے۔ لیکن ہم تو ابھی چڑھائی پر نہیں پہنچے!" شہزاد نے بیقراری سے سگریٹ کا طویل کش لیتے ہوئے دھواں چھوڑا۔ بڑے خوبصورت انداز میں، ایک ہاتھ میں سگریٹ اور دوسرے ہاتھ سے تقدیس کو اپنے ساتھ لگائے سہارا دیئے تھے۔ تقدیس نے شبانہ کے شانے پہ سر رکھ دیا۔

شہزاد گہرے بھورے رنگ کی پتلون اور سفید دوہری اُون کی بند گلے کی جرسی پہنے تھے۔ اوپر سے سفید اور بھورا چیک کا کوٹ، سامنے سے بٹن بند تھے۔ خوبصورت بال جھک کر پیشانی پہ آتے تھے۔ سیاہ چشمہ لگائے دوسرا سگریٹ سلگایا۔ وہ تقدیس کے بہت قریب تھے۔ اور سگریٹ کا دھواں ہوا کے ساتھ تقدیس کی طرف آ رہا تھا۔ اب وہ شہزاد کی نیلی موٹر کا سہارا لیے، شبانہ کے شانے پہ سر رکھے بے دم سی ہو رہی تھی۔ گلابی دمکتا، صحت مند چہرہ، بالکل زرد ہوا جا رہا تھا۔ سر چکرا

رہا تھا ۔ جی متلا رہا تھا ۔ پاؤں کے نیچے زمین تیزی سے گھوم رہی تھی ۔ ٹھنڈے پسینے چھوٹ رہے تھے ۔ کمزوری ـــــ بعید بے حساب کمزوری محسوس ہو رہی تھی کہ آنکھوں کے آگے اندھیرا چھایا ہوا تھا ۔

" بھائی جان ! آپی کو سگریٹ کے دھوئیں سے تکلیف ہوتی ہے نا " شبانہ نے تقدیس کی طرف آتے دھوئیں کو دونوں ہاتھوں سے پرے کرتے ہوئے اپنے رومال سے تقدیس کی پیشانی اور چہرے پر سے پسینہ صاف کیا ۔ پھونکیں مار مار ہوا کے ساتھ ادھر آتے دھوئیں کو پرے کرتی کتنی پرخلوص اور پیاری نظر آ رہی تھی ۔ سگریٹ کا دھواں ناگوار محسوس ہو رہا تھا لیکن شبانہ کے کہنے کے باوجود وہ شہزاد کو بتانا نہیں چاہتی تھی ۔

" ان کی پسند کی چیز مجھے ناگوار لگے ، دل شکنی ہو گی ان کی " جب بھی وہ سگریٹ پیتے تقدیس سانس روک روک کر برداشت کرتی کہ رفتہ رفتہ خود ہی عادت ہو جائے گی ۔ وہ ہمیشہ یہی سوچتی ـــــ اور آج بھی اسی سوچ میں ضبط کرتی رہی ۔ لیکن سردی کی وجہ سے گاڑی پوری طرح بند تھی ۔ اس لیے سانس ہی رکنے لگا ۔ بری حالت ہو گئی ۔ جب بے ہوش سی ہو کر

شبانہ کا سہارا لیا ہے تو شبانہ نے گھبرا کر فوری طور پر بھائی کو مطلع کیا۔ گاڑی روکنے اور دروازے، شیشے کھولنے کے لیے کہا۔

شہزاد نے جلدی جلدی گاڑی کے دونوں دروازے کھول دیئے۔ تاکہ تازہ ہوا سے دھوآں صاف ہو جائے۔ اور تقدیس کے قریب ان کے کندھے پہ ہاتھ رکھے، اپنے بازو کا سہارا دیئے، اپنے رومال سے ان کے چہرے پہ ہوا کرنے لگے۔ سلگتا "سگریٹ" پختہ سڑک پر پھینک کر پاؤں سے بری طرح مسل دیا۔ تازہ، خنک خوشگوار ہوا سے تقدیس کی طبیعت بہتر ہو گئی۔ وہ آسمانی ریشمین لباس پہ سرخ رنگ کی بند گلے کی جرسی پہنے تھے۔ آسمانی دوپٹہ گلے میں پڑا تھا۔ اونچی ایڑی کے سُرخ جوتے پہنے ہوئے تھے۔ بڑے سلیقے سے ترشے ہوئے ملائم، سیدھے، سیاہ بال شانوں سے نیچے تک پھیلے ہوئے تھے۔ پختہ سرمئی سڑک کے دو رویہ لگے سرسبز درختوں کی ہوا سے لہراتے، مہکتے بالوں کی خوشبو سے ساری ہوائیں، پوری فضائیں مہکتی جا رہی تھیں۔

شبانہ بھی تقدیس کے ساتھ کے لباس میں بڑی پیاری بڑی سمارٹ لگ رہی تھی۔ دونوں بہنوں میں شباہت بھی تو بہت تھی۔ پھر ہمیشہ نہیں تو اکثر ہی دونوں کے لباس ایک سے ہوتے بس

جڑواں بہنیں ہی لگا کرتیں۔

شہزاد فوری طور پر تقدیس کو لے کر شہر کے بڑے نامور کلینک میں گئے۔ شبانہ بھی ساتھ تھی۔ ڈاکٹر نے تقدیس کا معائنہ کیا۔ طبیعت کی بحالی اور نڈھال تقدیس کی کمزوری دور کرنے کے لیے طاقت کی دوا کا انجکشن لگایا۔ اب وہ اپنے آپ کو بہتر محسوس کر رہی تھی۔

پہاڑ پہ جانے کے بجائے وہ تینوں مقامی بڑے ہوٹل میں آ گئے۔ چائے وغیرہ پی کر تازہ دم ہوئے۔ ایک تو تفریحی مقامات، خوبصورت آرائشی پارکوں میں گئے۔ دوپہر کا کھانا بھی ہوٹل میں ہی کھایا۔

شہزاد کی بے بنیاد گپیں، چھوٹے سچے من گھڑت قصّے، کالج کے واقعات، لطیفے، شرارتوں کا سلسلہ جاری رہا۔ شام کو بڑی اچھی انگریزی فلم دیکھ کر واپس آئے۔ اس دن کا پہاڑ پہ جانے کا پروگرام ملتوی ہو چکا تھا۔ فوزیہ بیگم تو اچانک غیر متوقع طور پہ بچوں کو واپس آتا دیکھ کر گھبرا گئیں، ایکدم پریشان ہو گئیں۔ وہ تو ان کے منزل پہ پہنچ جانے کی اطلاع کے لیے فون کی منتظر تھیں۔ لیکن شہزاد کا ہنستا مسکراتا، شریر چہرہ اور دونوں لڑکیوں کے مطمئن

متبسّم چہرے اور اندر آتے آتے شہزاد کی کسی بات پر تینوں کا بڑا خوشگوار قہقہہ ــــ وہ مطمئن ہوگئیں ــــ اور ــــ اگلے دن صبح سویرے یہ خوش باش، مختصر قافلہ دوبارہ پہاڑی راستوں پر رواں تھا۔ فوزیہ بیگم نے اپنی بڑی موٹر اور پرانا تجربہ کار وفادار ڈرائیور ساتھ بھجوایا تھا کہ شہزاد گاڑی بہت تیز اور لاپرواہی سے چلاتے تھے۔ پہاڑی پُرخطر سفر اور نڈر شہزاد کو گاڑی لے جانے سے منع کیا تھا۔ سمجھدار ڈرائیور مناسب رفتار سے گاڑی لے جا رہا تھا۔ بلندی پہ چڑھنے کے لیے مہارت اور ذہانت سے کام لے رہا تھا۔ گاڑی بڑی تھی اس لیے شہزاد بڑی سیٹ پر پیچھے دونوں لڑکیوں کے درمیان میں بیٹھے تھے۔

اس وقت تقدیس سرخ رنگ کی پتلون اور زرد بند گلے کی جرسی پہنے تھی۔ بڑے خوبصورت، ملائم، سیاہ بال شانوں پہ پھیلے تھے۔ شبانہ بھی ایسے ہی کپڑوں میں تھی۔ بالوں کو سمیٹ کر سر کے گرد بڑے خوبصورت انداز میں لپیٹ رکھا تھا۔ شہزاد گہرے پتلون اور قرمزی کوٹ پہنے تھے۔ سنہری گول بٹن، تین تین کی دو متوازی ہی قطاروں میں سامنے سے بند تھے۔ تکون گلے میں سے گہرے جرسی نظر آ رہی تھی۔

"یہ اپنے ہاتھ سے باہر کسی گھڈ میں پھینک دیجئے۔" شہزاد نے کوٹ کے اندر کی جیب سے عمدہ قسم کے سگریٹ کی ڈبیہ اور قیمتی لائٹر نکال کر تقدیس کے سامنے کرتے ہوئے کہا۔ وہ کچھ نہ سمجھتے ہوئے گردن موڑ کر شہزاد کی طرف دیکھنے لگی اور شبانہ بھی حیرت سے بولی۔

"کیوں بھائی جان؟"

"یہ چھٹتی نہیں ہے منہ سے یہ کافر لگی ہوئی"

لیکن ہم نے آج نہیں بلکہ کل سے، اسی لمحے سے پینا چھوڑ دیا۔ ہم نے توبہ کرلی — میری توبہ — ہزار بار توبہ۔" شہزاد ہنس رہے تھے۔ اس ہنسی میں سنجیدگی بھی بہت تھی اور فطری شرارت بھی شامل، وہ دونوں کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے تقدیس کی طرف جھکے ہوئے تھے۔

شبانہ بھی ہنسنے لگی۔

اور؟

تقدیس کا چہرہ شرمندگی سے سرخ ہو رہا تھا۔ بے چین سی ہو کر ہاتھ ملنے لگی۔ ایکدم خشک ہوتے لبوں پہ زبان پھیرنے لگی۔ دانتوں میں دبا رہی تھی نازک ہونٹوں کو۔

"اسی لیے — تو وہ ظاہر نہ ہونے دیتی تھی۔ ہمیشہ سانس روک لیتی تھی۔ چہرہ ادھر کر لیتی تھی۔ اور اب بھی شبانہ کو روک رہی تھی۔ اسی لیے — اس کو معلوم تھا کہ شہزاد سگریٹ پینا چھوڑ دیں گے میری خاطر سے۔"

وہ چھپا رہی تھی، خاموش تھی۔ اس کو ذاتی طور پہ سگریٹ ناپسند نہیں تھا۔ اس کا پینا بھی بُرا نہیں سمجھتی تھی۔ اور — پھر شہزاد تو سگریٹ کے کش لیتے ہوئے دھوئیں اڑاتے، لگتے ہی بڑے خوبصورت، بڑے سمارٹ تھے۔ شرارتی انداز میں کبھی شبانہ پہ دھواں چھوڑ دیتے تو کبھی تقدیس پہ — لیکن کھلی جگہ یا تازہ ہوا میں تکلیف اتنی زیادہ نہ ہوتی۔ گذارہ چل جاتا تھا۔ لیکن کل گاڑی بند ہونے کی وجہ سے وہ اپنے آپ پر قابو ہی نہ رکھ سکی۔ ہزار کوشش کے باوجود بھی۔

شبانہ اور تقدیس نے سفید سمور کے کوٹ اور ساتھ ہی لگی ٹوپیاں پہن لی تھیں۔ شہزاد بڑا براؤن کوٹ اور ویسی ہی فر کی ٹوپی پہنے تھے۔ پہاڑوں پر پھیلی، حدِ نگاہ تک برف ہی برف تھی جو چاروں طرف بکھری پڑی تھی۔ وہ تینوں سفید سفید برف کا نظارہ کرتے بلندی پر پیدل چلنے لگے۔ برف کی زیادتی

اور پھسلن کی وجہ سے اُوپر گاڑیاں موٹریں نہیں جا سکتی تھیں۔ سرمئی پختہ سڑکوں کی بجائے سورج کی روشن کرنوں میں چمکتی ، پگھلتی چاندی کی طرح شفاف برف کی سڑک پہ چڑھتے ہوئے پاؤں پھسلتے تھے ، اور تقدیس کا سانس پھول رہا تھا اور پھول سی شبانہ بھی گہرے گہرے سانس لے رہی تھی ۔ شہزاد مضبوط و توانا ، صحت مند ، خوش باش اور تازہ دم تھے ۔ ان کا بھلا ان نازک لڑکیوں سے کیا مقابلہ ۔

میدانی علاقوں میں ہنگاموں کی وجہ سے اچانک تعلیمی ادارے بند ہو گئے ۔ طلباء ، طالبات کو فوری ہوسٹل تک چھوڑ دینے کا حکم ملا تھا ۔ جس کی تعمیل کرنا ضروری تھا ۔ اسی لیے فارغ البال طالب علموں کی کثیر تعداد نے مختلف قافلوں کی صورت میں برفباری کے مناظر دیکھنے کے لیے چڑھائیوں پہ چڑھائی کر دی تھی ۔ پہاڑوں پہ آ گئے تھے ۔ یہی وجہ تھی کہ خاموشیوں میں رونق اور چہل پہل ہو گئی تھی ۔ اگرچہ سردی بہت تھی ۔ چاروں طرف پھیلی ، دُور نزدیک تک چمکتی ، شیشے کی طرح شفاف برف ، کئی کئی منزلہ عمارتوں پر ، ڈھلوان چھتوں پر ، قد آور ، تناور درختوں پہ ٹہنیوں پہ پتوں پہ بلکہ پتوں کے بجائے برف اٹکی تھی ۔

چھوٹی بڑی جھاڑیاں، پودے، پھول، گھاس وغیرہ، غرض ہر چیز برف کی تہوں میں دبی تھی۔ کام تیزی سے ہو رہا تھا۔ مشینوں کی مدد سے راستے بنائے جا رہے تھے۔ برف ہٹائی جا رہی تھی۔ کھڈوں میں، ڈھلوانوں میں گرائی جا رہی تھی۔

ایک شور تھا۔

ہنگامہ تھا۔

رونق تھی ـــ میدانوں سے آ جانے والوں کی وجہ سے۔ ورنہ وہاں کے علاقائی لوگ تو اپنا پہاڑی لباس پہنے، میلے کچیلے، پھٹے پرانے چیتھڑوں میں، ادھورے، نامکمل لباس میں شدید سردی کے باوجود اپنی مجبوری کے لیے، مزدوری کے لیے، ضروریاتِ زندگی حاصل کرنے کے لیے ادھر ادھر بھٹک رہے تھے۔ سرخ و سفید چہرے سردی کی شدت کی وجہ سے اور بھی سرخ ہو رہے تھے۔ یہ روکھی سوکھی کھانے والے، اپنی ضرورتوں، اپنی حاجتوں کے لیے پیسے پیسے کو ترسنے والے مگر صحت مند چہروں کو دیکھ کر رشک آتا تھا ـــ لیکن ـــ

رحمدل، خداترس، کمزور دل تقدیس!

ان کی یہ حالت دیکھ کر، ان کی تنگ دستی اور غربت کے متعلق

سوچتی، رحم کھاتی، بڑی پریشان ہو رہی تھی - اس فکر میں اُلجھی اُلجھی بڑی غمزدہ بڑی فکر مند تھی کہ برف پہ پھسل کر گرتے بچی - پاؤں بہک گئے تھے - شہزاد نے جلدی سے پکڑ لیا — اسے اپنا سہارا دیا -

"ہم نے تو پہلے ہی درخواست کی تھی کہ ہم سے مضبوط سہارے کا سہارا لے کر چلیئے - ورنہ تو برف پر محبت کی راہوں کی طرح قدم قدم پہ قدم پھسلتے ہیں - اور پھر سب سے خطرناک بات یہ ہے کہ ادھر کھڈ ادھر کھائی — نازک لوگوں کے لیے تو محبت کرنا بھی مشکل اور برف پہ سنبھلنا بھی مشکل -" شہزاد ہنستے ہوئے کہہ رہے تھے - ان کے دائیں پہلو میں شبانہ بھائی کے بازو میں بازو ڈالے تھی — اور دوسری طرف اپنے بازو میں تقدیس کو سمیٹے تھے — چمکیلی چمکیلی، روپہلی دھوپ میں چمکتی، سفید آبدار، چمکدار دو ندیوں کے درمیان شہزاد براؤن کوٹ پہنے، سربلند پہاڑ کی طرح بلند تھے اور یخ بستہ ہوائیں بلائیں لے رہی تھیں — ان محبت بھرے دلوں کی، خوبصورت، خوب سیرت — دلنواز و دلنشیں -

مختصر سا کارواں رواں دواں تھا - تقدیس شبانہ اور شہزاد

اپنے اپنے رنگین فلموں والے کیمرے ساتھ لائے تھے۔ وہ کیمرے کندھے پہ ڈالے ہوتے تھے۔ حسین مناظر میں بلکہ نظاروں میں ان کی موجودگی سے حسن بڑھا جا رہا تھا۔ وہ تینوں ایک دوسرے کی تصویریں اتارتے جاتے، شبانہ اور شہزاد کی تقدیس کے ساتھ زیادہ تصویریں لی جا رہی تھیں۔ کبھی تقدیس شہزاد کے ساتھ کبھی تقدیس شبانہ کے ساتھ، حسین عکس محفوظ ہو رہے تھے۔ اور تینوں ہی خوب محظوظ ہو رہے تھے۔ شہزاد کے کیمرے میں یہ صفت بھی تھی کہ اس کو فٹ کر کے خود بھی ان دونوں کے ساتھ آجاتے تو بھی تصویر اُتر جاتی تھی، دن بھر کی تفریح — شغل میلہ — سیر کے بعد وہ اپنی آبائی کوٹھی میں پہنچے۔ ڈرائیور پہلے ہی مزدوروں کی مدد سے ان کا سامان اُوپر کوٹھی میں لا چکا تھا۔

ایک ہفتہ کے بجائے پندرہ دن کے لیے وہ لوگ وہیں رُک گئے۔ سارا سارا دن سیر کرتے، گھومتے، مزے کرتے، عیش اُڑاتے، ہوٹلوں میں کھانے، ناشتے ہوتے — اکثر گھوڑ سواری بھی کرتے۔ شہزاد تو خیر مانے ہوئے شہ سوار تھے۔ اکثر ہی زمینوں پہ جا کر گھوڑوں پر ہی ساری جاگیر کو دیکھنا ہوتا

تھا ۔ شبانہ بھی بڑی تیز تھی ۔ عموماً شہزاد کے ساتھ دوڑ لگاتی تھی گھوڑے کی ۔

البتہ تقدیس!

مدت گذر گئی تھی، گھوڑے کی سواری نہیں کی تھی ۔ سب سے زیادہ ہی کم ہمت اور کمزور واقع ہوئی تھی ۔ پہاڑی راستوں پہ جہاں دونوں طرف گہرے کھڈ اور پتھریلی کھائیاں تھیں ۔ نامانوس جانور کو قابو کرنے سے گھبراتی تھی ۔ پہلے دن گھوڑا سواری کا پروگرام بنا تو ڈر گئی ۔ بہانے بنا بنا کر بچنے کی کوشش کرنے لگی ۔ لیکن شہزاد کہاں ماننے والے تھے ۔ زبردستی پکڑ کھینچ کر لے گئے ۔

گول گھیرے کا سرخ کوٹ، اور بڑے خوبصورت شوخ زرد رنگ کی پتلون پہنے تھی تقدیس — سرخ ہیٹ نما بڑی سی ٹوپی میں سے خوبصورت ملائم ملائم سیاہ بال، ہوا میں لہراتے، شانوں پہ بکھرے ہوئے تھے — شبانہ سیاہ پتلون پہ سبز کوٹ اور سبز ہیٹ میں تھی ۔

شہزاد براؤن پتلون اور موتیا رنگ کی چمڑے کی جیکٹ اور کرکٹ کے کھلاڑیوں کی جیسی کیپ پہنے تھے ۔ بے فکری — فارغ البالی، تفریح اور ہر وقت کی خوش گپیوں، ہنسی مذاق،

قہقہوں، زندگی کی حقیقی خوشیوں اور خوبیوں سے چہرے چمک رہے تھے ۔ شبانہ بڑی چست اور تیز تھی ۔ بیڈمنٹن کی چمپئن، کالج کی اچھلتی کودتی شوخ ترین لڑکی ۔۔ چھلانگ لگا کر بڑی مہارت سے گھوڑے پہ بیٹھ گئی ۔

شہزاد اپنے سفید گھوڑے کی لگام تھامے کھڑے تھے کہ تقدیس بھی بخیریت گھوڑے پہ چڑھ جائیں تو ایک بار ہی سب ساتھ ساتھ روانہ ہوں ۔۔ لیکن تقدیس گھوڑے کے قریب آہستہ آہستہ جاتی، پھر رکتی اور پلٹ جاتی ۔ دو قدم چلتی تو رک جاتی ۔

"ہمیں ڈر لگتا ہے ۔" وہ ایک بلند قامت، چوڑے تنے کے درخت کے ساتھ لگ کر کھڑی ہو گئی ۔

"صاحب ۔۔ اپنے ساتھ ہی بٹھا لیجئے ۔" پرانا ملازم بھی تقدیس کی جھجک کی طبیعت سے واقف تھا ۔

شہزاد پہلے ہی اسی سوچ میں تھے ۔ مشورہ ملتے ہی اپنا گھوڑا تقدیس کے قریب لے آئے ۔۔ وہ مسکراتی، شرماتی، ڈری ڈری سی آنکھیں جھکائے وہیں درخت کے نیچے کھڑی تھی ۔

"چلیئے ادھر ۔" شہزاد نے تقدیس کا بازو پکڑا ۔

"نہیں ۔ نہیں ۔" تقدیس کہتی رہ گئی ۔ اور شہزاد گھوڑے

پہ بیٹھے، تھوڑا سا جھکے، تقدیس کو کھینچ کر اپنے سہارے سے گھوڑے پہ بٹھا لیا۔ وہ ان کے آگے قریب بہت قریب بیٹھی گھبرا رہی تھی۔ ایک بازو سے تقدیس کو سنبھالے دوسرے سے گھوڑا قابو کیے، باتیں کرتے شبانہ کے گھوڑے کے ساتھ جا رہے تھے۔ وہ دبلی پتلی سی لڑکی بڑے اعتماد سے بڑی بشاش بڑی ماہر گھوڑ سوار، شہزاد کے ساتھ چھیڑ چھاڑ کرتی جا رہی تھی۔ چڑھائی سے اترائی کی طرف تو باوجود شہزاد کے مضبوطی سے پکڑنے کے تقدیس کی چیخ نکل گئی۔ نشیب کی طرف ڈھلوان پہ جاتے تیز رفتار گھوڑے، بے قابو سے، دونوں طرف گہرے بہت گہرے کھڈ، چاروں طرف برف اور برف کا بہتا پانی ــــ مارے خوف کے دونوں آنکھیں بند کر کے شہزاد کے سینے کے ساتھ سر لگا لیا۔ ان کے دونوں ہاتھوں کو اپنے دونوں ہاتھوں سے اتنی مضبوطی سے پکڑا ہوا تھا کہ اس سے زیادہ طاقت ہی نہ تھی اس نازک اندام وجود میں۔ پہلے ہمیشہ گھوڑ سواری کرتی تھی۔ کئی میل کا فاصلہ طے کیا کرتی لیکن صاف ستھرے، سیدھے راستے، کشادہ سڑکیں، ہموار علاقے، لیکن ایسے پُر خطر پہاڑی علاقوں میں کھڈوں، کھائیوں کے درمیان پگڈنڈیوں پر یہ پہلا موقع تھا۔ شہزاد قیمتی خزانے کی طرح اپنے ساتھی کو

اپنے ساتھ لگائے۔ سینے میں چھپائے، بڑے خوش، بڑے مسرور سے، بڑے مخمور سے شبانہ کے ساتھ باتیں کرتے اور تقدیس کو عزیز از جان جانتے ہوئے بھی جان بوجھ کر ستانے، ڈرانے کے لیے گھوڑے کو تیز کرنے پر آمادہ۔

وہ ارادہ ہی کرتے رہے کہ ذرا ہموار راستہ آیا تو شبانہ اپنا گھوڑا بھگا کر لے گئی۔ یہ اس کی ہمیشہ کی عادت تھی۔ چپکے سے بھاگ کھڑی ہوتی اور شہزاد اس وقت آگے نکلنے کی کوشش میں تیز سے تیز تر ہوتے گئے۔

دوڑ زور پہ تھی۔ کبھی شہزاد آگے نکل جاتے کبھی شبانہ، ماہر شہ سوار بڑی دیر تک، بڑی دور تک بھاگتے رہے۔ لوگوں کی رشک بھری، بڑی پسندیدہ نظریں ان پر پڑتی رہیں۔ اور نازک سی کومل سی تقدیس خوفزدہ، پیلی اور ٹھنڈی ہوئی جا رہی تھی۔ آخر کار کافی دیر کے بعد ۔۔ تھکے ہارے، ہانپتے ہوئے ۔۔ ایک پُرسکون سی جگہ پہ پہاڑی کے دامن میں، درختوں کے جھنڈ میں آبادی سے دور، جنگل کے قریب کا علاقہ ۔۔ برف جمی ندی دھوپ میں چمک رہی تھی۔ کچھ کچھ پانی پگھلا ہوا تھا۔ درخت پودے، جھاڑیاں، گھاس سب خزاں رسیدہ تھے۔ دور سے کوٹھیاں

عمارتیں، مکانات، سڑکیں، ان کو گہرائی میں ہونے کی وجہ سے بہت چھوٹی چھوٹی نظر آ رہی تھیں۔ صرف نگاہ کے سامنے کا علاقہ نظر آتا۔ باقی نظروں سے اوجھل تھا۔ صبح سویرے سے ہلکا پھلکا انگریزی ناشتہ کر کے نکلے تھے۔ اب دوپہر گذر رہی تھی۔ بھوک خوب چمک گئی تھی۔ لیکن آس پاس کہیں کھانے پینے کا کوئی بھی بندوبست نظر نہیں آ رہا تھا۔ موسم بھی عجب آنکھ مچولی سا تھا۔ ایکدم بارش ہونے لگتی۔ کبھی سورج نکل آتا۔ تو کبھی گھرے بادل چھا جاتے۔ اتنے گھرے اتنے قریب کہ انسان پانی میں بھیگ جاتے۔ ایک طرف دھوپ نکلی تھی تو دوسری طرف بارش ہو رہی ہوتی۔

دوپہر کے کھانے کے لیے نہ تو کچھ ساتھ لائے تھے اور نہ ہی اس طرف کوئی ہوٹل، کیفے وغیرہ نظر آ رہا تھا۔ صبر شکر کر کے دونوں گھوڑے سامنے پتھروں سے باندھ دیئے۔ شبانہ اور شہزاد تھک سے گئے تھے۔ دونوں وہیں زمین پر لیٹ گئے کہ برفباری کی وجہ سے گھاس بے چاری کا تو نام ونشان بھی نہ تھا۔ زمین بھی خاصی پتھریلی تھی۔ ان دونوں کے درمیان میں تقدیس دوزانو بیٹھی تھی۔

"کھبیٔ ـــ بڑی ڈرپوک ہیں ـــ آپ کی آپی صاحبہ"۔ شہزاد نے شرارت سے شبانہ کو مخاطب کیا ـــ اور ہاتھ بڑھا کر تقدیس کی ہیٹ اتار لی۔ سرکش ہوا سے بال اڑنے لگے۔ خوبصورت چہرے کو چھپانے، دکھانے لگے جیسے موسم دھوپ چھاؤں تھا۔ ویسے ہی یہ نظارہ تھا۔ بادلوں کی طرح سیاہ بال کبھی تقدیس کے چہرے پہ چھا جاتے۔ کبھی سورج کی طرح روشن چہرہ صاف نظر آنے لگتا۔ دونوں ہاتھوں سے تقدیس اپنے بالوں کو قابو کرنے کی کوشش کرتی تو ـــ نظارے کچھ اور بھی خوبصورت، زیادہ ہی رنگین نظر آنے لگے تھے۔

"کوئی بھی نہیں ـــ" شبانہ بڑے جوش میں بولی۔ وہ ہمیشہ ہی تقدیس کی حمایت کیا کرتی۔ "وہ تو آپی کو پریکٹس نہیں رہی"۔ شبانہ کروٹ بدل کر تقدیس کے قریب آتے ہوئے بولی۔ وہ کہنی زمین پر رکھے ہتھیلی پہ چہرہ رکھے سر اونچا کیے تقدیس پر نثار ہوتے ہوئے شہزاد سے مخاطب تھی۔

"دیکھنا تو سہی ـــ اب کیسی پریکٹس دوبارہ کرواتا ہوں"۔ شہزاد دونوں ہاتھ کی انگلیاں ایک دوسرے میں الجھائے سر کے نیچے رکھے سیدھے لیٹے تھے۔ کروٹ لے کر وہ بھی تقدیس کی طرف مڑ گئے۔

تقدیس کے بال بکھر کر ہوا میں اڑ رہے تھے ۔ وہ دونوں ہاتھوں سے بال سمیٹتی ، سنوارتی ، شہزاد کی والہانہ ، بے تابانہ نگاہوں سے نگاہیں چراتی مسکراتی رہی ۔ روشن چہرے پہ خوبصورت رنگ بکھرتے ، سمٹتے رہے ۔ شبانہ نے اپنے کوٹ کی جیب میں سے بڑا سارا پھولدار ، ریشمی رومال نکال کر دوہرا کر کے تکون سی بناتے ہوئے ، سر پہ باندھ دیا ۔ ٹھوڑی کے نیچے گرہ دی — تو حسن کا ایک اور ہی رنگ ہو گیا — گلابی چہرے پہ گلابی رومال تو قیامت ہی ڈھا گیا ۔

" آپی جان ! آپ بھی لیٹ جائیے ۔" اپنے دونوں کے درمیان میں بیٹھی تقدیس کو شبانہ نے شانہ پکڑ کر اپنے قریب ہی لٹا لیا ۔ شہزاد دائیں طرف شبانہ بائیں طرف ۔

" جی ہاں — خوب ۔" تھک بھی تو بہت گئی ہوں گی نا کر اتنی دور سے گھوڑا جو دیر تک بھگاتی رہی ہیں ۔" شہزاد نے سر اونچا کرتے ہوتے کہا — اور تقدیس کا سر زمین پر سے کھردری ، پتھریلی جگہ سے اٹھا کر اپنی بڑی سی ہتھیلی پھیلا کر اس پر رکھ لیا ۔ تقدیس نے اٹھنے کی کوشش کی تو شبانہ نے اس کے شانے پہ ہاتھ رکھ کر دوبارہ دبا دیا ۔ وہ اٹھ نہ سکی ۔ شبانہ اوندھی لیٹی ، کہنی زمین پہ

اور ہتھیلیوں کی کٹوری میں ٹھوڑی رکھے دونوں سے باتیں کر رہی تھی۔ پھر پلٹ کر اپنا سر تقدیس کے اُوپر رکھ کر سیدھی ہو کر لیٹ گئی۔ اور آنکھیں بند کیئے، گنگناتی رہی، مسکراتی رہی۔

خالق فطرت کی!

حسین قدرتوں کی صناعی کے خولصبورت شاہکار، فنکاری کی دلفریب تصویریں۔ تینوں حسینوں کی، چاہنے والوں کی، اس مثلث پہ ہواؤں کو فضاؤں کو اور خود خدائی کو بھی رشک آرہا تھا۔ اب تو بھوک کی شدّت بڑھ گئی تھی کہ وقت بھی تو بہت ہو گیا تھا۔ پھر تینوں کچھ دُور تک پیدل چلتے رہے۔ شبانہ اپنے گھوڑے اور تقدیس شہزاد کے گھوڑے کی لگام پکڑے تھیں۔ ایک طرف سڑک کے کنارے پہ چھوٹی سی ڈربہ نما لکڑی کی بنی دکان پہ اُبلے ہوئے بھٹے بک رہے تھے۔ نمک مرچ چھڑک کر کھٹائی میں ڈبو ڈبو کر انہوں نے خوب مزے لے لے کر کھائے۔ اور چشمے کا یخ بستہ پانی چلوؤں سے پینے میں بڑی لذت محسوس کی۔ دوکاندار نے سبز چائے کا گرم قہوہ بھی چھوٹے پیالوں میں ڈال کر پیش کیا۔ سخت سردی میں قہوے کی پیالی نے جان میں جان ڈال دی۔ قہوہ تھا بھی تو بہت مزیدار۔ کہ شہزاد نے تو

اسس جائے کی پتی کا شجرہ نسب پوچھ ڈالا۔ بلکہ جاتے جاتے ایک پیکیٹ بھی دکاندار خان صاحب نے بڑی اپنائیت، بڑے پیار سے تحفے میں دیا۔ کہ ان کو تعارف سے معلوم ہو گیا تھا کہ یہ بھی ان کی خان برادری سے ہیں ــــ اور بڑی کوشش کے بعد بھی خان صاحب نے ان سے بھٹے اور چائے کے دام نہ لیے بلکہ قدرے ناراض سے ہو گئے۔ اب تو ان سب کی بڑی پکی دوستی ہو گئی تھی۔ روزانہ ہی وہاں دعوت اڑائی جاتی اور خانصاحب کی نذر شہزاد اکثر ہی کوئی نہ کوئی تحفہ پیش کرتے ــــ جو دوستی کے ناطے خانصاحب قبول کر لیتے۔

یہ عیش و عشرت کے پروردے جو سونے کا چمچہ منہ میں لے کر پیدا ہوئے۔ ہوش سنبھالا تو چاندی کے ظروف میں چینی کے چمکدار قیمتی برتنوں میں کھاتے پیتے، نرم فوم کے گدے دار بستروں پہ سونے کے عادی۔ اس طریقے سے، سادگی سے کھاتے پیتے، پتھریلی زمین پر لیٹتے تو کتنے خوش تھے کہ جیسے مخمل کے فرش پہ پڑے ہیں۔

یہ خوش باش اور فارغ البال زندگی اور بے فکری کے دنوں کی خوشیاں تھیں۔ لذتیں تھیں۔ جو تینوں ہی خوب خوب

دونوں ہاتھوں سے لُوٹ رہے تھے۔ زندگی کے مزے لے رہے تھے۔ اپنے خزانے بھر رہے تھے۔

شہزاد کی حوصلہ افزائی، پیار و محبت کی تاثیر تھی کہ تقدیس بڑے اعتماد سے اپنے گھوڑے پر سوار ہو کر ان لوگوں کے ساتھ سیر کے لیے جاتی۔

باب ۴

سہ بہار آئی کھلے گلاب، زیبِ صحنِ بوستاں ہو کر
عنادل نے مچائی دھوم، سرگرمِ خواں ہو کر

خنک ہوائیں تیز چل رہی تھیں - سردی بہت زیادہ تھی - پھر بہار رتوں کا بے بھروسہ موسم - پل بھر رم جھم، پل بھر میں جھم جھم تارے نکل آتے - کہیں چاند بادلوں میں چھپ رہا ہے تو کہیں بادلوں کے پردے میں ہولے ہولے کھسکتے ہوئے پورے کا پورا چاند آسمان و زمین پہ اُجالے بکھیر دیتا - ایسے ہی خوبصورت شب و روز میں شہزاد مع اپنے ساتھیوں کے ایک ہفتہ کے بجائے پندرہ دن سے یہاں تھے - سارے حساب کتاب، جاگیرداری، ذمہ داری وغیرہ سب کچھ بھولے ہوئے تھے - یہاں تو ہر روز، روزِ عید اور ہر

شب شبِ برات تھی۔

رات کا وقت تھا۔

چاند آہستہ آہستہ بادلوں کی اوٹ سے نکل کر باہر آ گیا تھا۔

اور شہزاد، تقدیس اور شبانہ رات کو ہوٹل سے کھانا کھا کر ہنستے کھیلتے اپنی قیام گاہ پر واپس پہنچے۔ تقدیس بڑے قیمتی، نرم گرم کپڑے کی جامنی رنگ کی میکسی پہنے تھی۔ کف والی پوری آستین لمبی گردن پر بند گلا، گلے اور باہنوں پر سنہری ریشمی دھاگے کی بیلیں، آڑے جھول پر بھی لمبی لائنوں کی شکل میں بڑی نفاست سے کڑھائی کی گئی تھی۔ جامنی رنگ میں تقدیس کا سنہرا روپ — صحت مند گلابی چہرہ دمک رہا تھا۔ جامنی رنگ کی انگلش سٹائل کی زنانہ فلیٹ پہنے تھی۔ اس پر بھی اسی دھاگے سے بیلیں بنی تھیں۔

شبانہ کی طبیعت ہر وقت پھرنے، سردی کی زیادتی کی وجہ سے دو دن سے سست تھی اور اسے ہلکا بخار بھی تھا۔ اس لیے وہ بڑا گرم کوٹ اور کوٹ کے ساتھ کا قیمتی سکارف سر پہ پگڑی کے انداز میں لپیٹے تھی۔ بالوں کو سمیٹ کر اندر ہی لپیٹ رکھا تھا۔ اس انداز میں وہ خاصی پیاری لگ رہی تھی۔ شہزاد سیاہ ڈنر

سوٹ میں تھے - ان کی تازہ بہ تازہ شرارتوں، ہنسی مذاق اور لطیفہ گوئی اور چھیڑ چھاڑ کی وجہ سے ہر وقت وہ تینوں قہقہے لگاتے ہنس ہنس کر دوہرے ہوئے جاتے۔ حسن و صحت و مسرت و شادمانی کی دولت تو پہلے ہی خداداد تھی - اب ہر وقت کی تفریح، مل جُل کر رہنا، دلی مسرتوں کے حصول سے حسن و جوانی کا روپ اور بھی سنورتا، نکھرتا جا رہا تھا۔

سعدیہ بیگم اور فوزیہ بیگم دونوں ہی بچوں سے اور خاص طور پر شہزاد کی رونق کے لیے اداس ہو گئی تھیں - کیونکہ ان کی موجودگی تو ایک ہلچل، ایک ہنگامہ، شوخیوں شرارتوں کا طوفان ہوتا - زندہ دل زندگیوں کا ہنستا کھیلتا شاہکار — دونوں بیگمات کے اصرار پہ اگلی صبح واپسی کا پروگرام تھا۔ تینوں مل کر سامان باندھنے لگے - سامان کیا تھا، ڈھیروں قیمتی کپڑے تھے، سینکڑوں رنگا رنگ ڈیزائن، مختلف نمونے کے لباس تھے - اونی ریشمی کپڑوں کے ڈھیر تھے - چونکہ شدید سردی کے دن تھے اس لیے گرم کپڑوں کی زیادتی تھی - ایک ایک بڑا اٹیچی کیس بھر کر ساتھ لائے تھے - پھر قیام کے دوران، کئی مرتبہ ڈرائیور کو بھیج کر مزید کپڑے منگوائے جاتے رہے - اور اب ساری

الماریاں، دراز خالی کر کے قالین پہ سارے لباس پہاڑ کی طرح ڈھیر کیے پھیلائے ہوئے تھے۔ شہزاد کے سوٹ، سویٹر، جرسیاں کئی کوٹ بے شمار، پتلونیں، قمیصیں، بنیانیں، موزے، دونوں لڑکیوں کی سینکڑوں ساڑھیاں، سوٹ، کوٹ، سویٹر، میکسیاں، غرض بے شمار، بے حساب، لاتعداد کپڑے ہی کپڑے، لباس ہی لباس تھے۔ باقی تو کوٹھی ہر طرح سے پہلے ہی آراستہ تھی —— سہولت کی تمام ضروریات مہیا تھیں۔

اب یہ بڑے بڑے اٹیچی کیس کھولے وہ تینوں کپڑے تہہ کر کر کے بڑے آرام و سکون اور خاموشی سے رکھ رہے تھے۔ کام بڑی تیزی سے ہو رہا تھا۔ لیکن شہزاد خلاف طبع خاموش بھی نہ رہ سکتے تھے اور نہ ہی چین سے کوئی کام کر سکتے تھے۔ ایسی مصروفیت میں بھی شوخیاں کر رہے تھے۔ کبھی تقدیس کو ستاتے تو کبھی شبانہ کو چڑاتے۔

"اُف — ہائے — میں مر گیا۔" کام کرتے کرتے شہزاد نے اپنا بایاں بازو دوسرے ہاتھ سے پکڑ لیا۔ زور سے دبا رہے تھے۔ دانتوں میں ہونٹ دباتے زور زور سے کراہنے لگے۔ اور وہیں نرم نرم موٹے سرخ قالین پر گر

سے گئے۔ اچانک ہی درد اٹھا تھا۔ درد کی شدّت بڑھتی جا رہی تھی۔ بے قراری میں کروٹیں بدلتے، اور سر ادھر ادھر پٹخ رہے تھے۔ دوسرے ہاتھ سے بیمار بازو کو دباتے، درد کی زیادتی سے نڈھال ہوتے جا رہے تھے۔ اور کبھی کبھی تو آنکھیں بند کر کے بے ہوش سے ہو جاتے۔

"ہائے میرے بھائی جان!" شبانہ بے چین ہو گئی۔ حواس باختہ ہو گئی۔ تڑپ گئی۔ درد سے بے تاب تڑپتے بھائی کے قریب آ کر جلدی سے بیٹھ گئی۔ ان کا بازو دونوں نرم نرم ہاتھوں سے دبانے لگی۔ کبھی بیقراری میں بھائی کا چہرہ پکڑ کر پیار کرتی۔ کبھی بالوں پہ ہاتھ پھیرتی، کبھی چہرے پہ — پہلے چونکہ گرم اور بوجھل کپڑے پہنے تھی — اب سادہ پھولدار شلوار قمیص پہ سُرخ شال اوڑھے تھی۔ آتے ہی تیاری کے خیال سے لباس تبدیل کر لیا تھا۔

تقدیس بھی پریشانی میں جلدی سے پکنگ چھوڑ چھاڑ کر آ گئی۔ اور گھبراہٹ میں اور تو کچھ نہ سوجھا، بے چاری نرم نازک ہاتھوں سے خواہ مخواہ ہی شہزاد کا سر دبانے لگی۔ معصوم سی لڑکی مریض کے بازو میں درد ہے اور دباتی سر ہے۔ شہزاد کی طبیعت تو

لمحہ لمحہ بگڑتی جارہی تھی۔
"آپی ــ شاید بھائی جان کو ٹھنڈ لگ گئی ہے"۔ اتنی شوخ و شنگ شبانہ، شرارتی بھائی کی بیماری اور بیقراری دیکھ کر رونے لگی۔ تقدیس تو پہلے ہی بڑے چھوٹے دل کی تھی، وہ شبانہ کو کیا تسلّی دیتی۔ اُس کے آنسو بھی شہزاد کے اُوپر گرنے لگے۔ لیکن بظاہر ہونٹ دانتوں میں دباتی، اپنی سسکیاں روکتی رہی۔ دونوں نوعمر لڑکیاں تو تھیں۔ کبھی کوئی فکر، پریشانی دیکھی نہ تھی۔ کسی بات کا ہوش نہ تھا۔ اتنا بھی خیال نہیں تھا کہ شہزاد بستر کے بغیر لحاف نہیں، کمبل نہ تکیہ ــ اسی طرح سفید قمیص کی آستین چڑھائے گریبان کے دو بٹن کھولے، ٹائی ڈھیلی ڈھیلی گلے میں پڑی تھی۔ سرخ قالین پہ پڑے کروٹیں لے رہے تھے۔
شبانہ ایک ہاتھ سے آنسو پونچھتی تو دوسرے سے بازو دباتی۔ کبھی دونوں ہاتھوں کا دباؤ پورا زور لگا کر شہزاد کی دکھتی بازو پہ ڈالتی۔ پھر سوچا کہ شہزاد کو بستر پہ لٹا دینا چاہیئے۔ اب نازک نازک سی دونوں دھان پان لڑکیاں ــ اور یہ لمبے تڑنگے خوب صحت مند، توانا اچھے جسم کے شہزاد ــ دونوں مل کر بھی اٹھائیں تو کہاں ــ کافی دیر کی کوشش کے بعد دونوں ہار

سی گئیں ۔ بڑی مشکل سے درد سے کراہتے، بے ہوش، نڈھال سے شہزاد کو دونوں نے مل کر وہیں قالین پہ بٹھایا۔ تقدیس ان کے پیچھے بیٹھی اور بڑی مشکل سے سہارا دیا۔

شبانہ دوڑ کر درد کی شدّت دُور کرنے کی گولی اور گلاس میں پانی لے کر آئی اور اپنے ہاتھ سے گولی کھلانے لگی تو — ایکدم پھر دھڑام سے سیدھے لیٹ گئے ۔ اتنا طاقتور جسم لیکن کمزوری سے گرتے جا رہے تھے ۔ پیچھے سہارا دیئے بیٹھی تقدیس بیچاری سنبھالتی ہی رہی ۔ قالین پہ سے سر اٹھا کر اپنی گود میں رکھ لیا۔ درد کا بہت سخت دورہ تھا۔ شبانہ نے پھر بڑی مشکل سے سہارا دے کر اٹھایا ۔ کچھ شہزاد نے ہمّت کی، کچھ تقدیس نے مدد کی ۔ اب شبانہ نے دونوں کندھوں سے شہزاد کو پکڑا اور تقدیس نے ان کے منہ میں اپنے ہاتھ سے گولی رکھ کر پانی پلایا — اور دوسرے کمرے میں ان کی خوابگاہ تک — پلنگ پر لٹانے کو لے جانے کے لیے ایک طرف سے شبانہ نے اور دوسری طرف سے تقدیس نے سہارا دیا ۔ سفید قمیض اور سیاہ پتلون پہنے تھے۔ گلے میں سیاہ ٹائی ڈھیلی پڑی تھی ۔ گریبان کھلا، بال بکھرے تھے۔ آہستہ آہستہ قدم، قدم قدم چلتے ایک طرف تقدیس کی گردن

میں ہاتھ ڈالے دوسری طرف سے شبانہ ان کو سنبھالے، اپنے بستر تک پہنچے۔ دونوں نے مل کر ہزار احتیاط سے اور بڑی مشکل سے جواں جہان شہزاد کو لٹا دیا۔

تقدیس نے قرمزی لحاف خوب اچھی طرح دونوں طرف سے لپیٹ دیا۔ پاؤں کی طرف سے درست کیا۔ شبانہ ایک بار پھر وہی گولی اور پانی لے آئی۔ دوائی کھلائی، لیکن دوا اور دُعا دونوں بے اثر تھیں۔ مرض بڑھ رہا تھا۔ درد میں کوئی افاقہ نہ تھا۔ دونوں لڑکیوں کا رو رو کر بُرا حال تھا۔ شبانہ گرم پانی کی بوتل لینے کے لیے بھاگی جاگی جا رہی تھی کہ سوائے چوکیدار کے رات کے ڈھیر بجے سب ملازمین اپنے گھروں میں لحافوں میں سوئے پڑے تھے۔ بے چاری خود ہی ہیٹر پہ پانی گرم کر کے بوتل کو موٹے تولیے میں لپیٹی لے کر آئی، اور دکھتے بازو پہ رکھ دی۔

تقدیس پریشان سی شہزاد کے سرہانے پلنگ کے کنارے پہ بیٹھی تھی۔ ان کا ہاتھ شہزاد کی پیشانی پہ تھا۔ ادھر شہزاد نے اپنا ہاتھ رکھا ہوا تھا۔ آہستہ سے سر اٹھا کر تقدیس کی گود میں رکھ لیتے، پھر تکیے پہ رکھ لیتے۔ غرض بڑے بیقرار تھے۔ پھر تقدیس

کا ہاتھ پکڑ کے اپنے سامنے بٹھا لیا۔ اپنے بازو کی طرف اشارہ کیا کہ دباؤ۔ وہ شہزاد کے پلنگ پر سامنے دائیں طرف بیٹھی اُوپر سے ہو کر بازو دبا رہی تھی۔ پلنگ سے پاؤں لٹکائے جھک کر آہستہ آہستہ ملائم ہاتھوں بلکہ سارے جہاں کا بوجھ ڈالنے کی کوشش میں آگے کو جھکتی، تھوڑا پیچھے ہٹتی، چست لباس کی تراش خراش وہی جامنی سکیسی غضب ڈھا رہی تھی۔ سانچے میں ڈھلے بڑے خوبصورت جسم کے خطوط و نقوش کے ساتھ پتلی کمر اور بھی قیامت تھی۔

شہزاد کے درد میں کچھ کمی ہو گئی تھی۔ شاید دوا اثر کر گئی تھی یا تقدیس کی مسیحائی یعنی دبانے کی تاثیر تھی۔ رونے دھونے پہ خدا کو رحم آ گیا تھا یا دعائیں قبول ہو گئی تھیں۔ بہرحال شہزاد پُرسکون تھے۔ نیند آ گئی تھی ان کو۔

بظاہر محوِ خواب شہزاد ایک آنکھ نیم وا کیے، دزدیدہ نظروں سے تقدیس کے جھکنے، اٹھنے کے خوبصورت انداز، نازک وجود کی دلنشیں بناوٹ اور حرکت کا دلفریب منظر دل میں چھپا رہے تھے۔ دلکش منظر سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ ہر وقت متبسم حسین چہرے پہ ان کے لیے پریشانی کے بادلوں کو دیکھ کر تو نہ جانے کیسے ضبط کر رہے تھے۔ دل میں نہ جانے کیا کیا طوفان اُٹھ

آخر کب تک صبر کرتے۔

ایکدم درد کی لہر سی اٹھی۔

بڑے شدید درد سے شہزاد بے تاب ہو گئے۔

"کوئی اور گولی یا دوا لاؤں"۔ درد کی شدّت زیادہ ہوتے دیکھ کر تقدیس نے بڑی نرمی سے بڑی ملائمت سے ہمّت کر کے پوچھا۔ آواز آنسوؤں میں بھیگی ہوئی تھی اور بڑی بڑی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز پیالوں کی طرح چھلکنے پہ تیار۔

اور شہزاد اس ادا پہ قربان ہی تو ہو گئے۔ ڈاکٹر کو کئی بار فون کیا۔ نہ جانے ادھر فون خراب تھا یا ادھر بہرحال رابطہ قائم نہ ہو سکا۔

"ہائے۔ ہائے۔ اُف۔" درد سے کراہتے ہوئے شہزاد نے اپنے بازو کو بڑے زور کا جھٹکا دیا۔ جھکی جھکی تقدیس کے دونوں ہاتھ اس پہ تھے۔ توازن قائم نہ رہ سکا۔ اور وہ شہزاد کے اوپر اوندھے منہ گری۔ شہزاد نے ایک دفعہ پھر ہائے کا نعرہ لگاتے ہوئے بازو تقدیس کے اوپر رکھ دیا۔ یہ سب کچھ ایسے اچانک ہوا کہ تقدیس سنبھل ہی نہ سکی۔ وہ کچھ اس انداز سے ان کے اوپر پڑی تھی کہ یخ بستہ گال شہزاد کے نرم گرم ہونٹوں پہ۔

وہ گھبرائی — سٹ پٹائی — اور اس شکل سے آزاد ہونے کی ہلکی سی کوشش میں ہی کامیاب ہوگئیں — اور جلدی سے اٹھ کر علیحدہ کھڑی ہو گئیں - شہزاد نے ہاتھ بڑھا کر ان کا ہاتھ پکڑ لیا — اور انتہائی شرارت میں زوردار قہقہہ لگا کر اچھل کر بستر پہ بیٹھ گئے۔ دھرنا مارے، لحاف تو پہلے درد کے بہانے گھبراہٹ کے ڈرامے میں پرے پھینک چکے تھے۔ اچھے بھلے صحت مند، توانا، سرخ و سفید شہزاد اور نازک پتلی دبلی تقدیس۔ ان کی پریشانی میں تو بالکل ہی بے جان، ناتواں ہو رہی تھی - اوپر سے ان کی اتنی بڑی شرارت نے اور بھی پریشان، خطا اوسان کر دیا۔ اب تو رہے سہے حواس بھی جاتے رہے۔ تقدیس کا ہاتھ پکڑے اپنے ساتھ بٹھائے ہوئے تھے۔ وہ سر جھکائے شرمندہ شرمندہ سی بیٹھی تھی۔ معصوم سے چہرے پہ حیرانی تھی - اپنی نادانی کی پشیمانی تھی، کہ شہزاد کی شرارت اور بے ایمانی کا پتہ نہ چل سکا۔

"ہماری بیماری کو گولیوں، دوائیوں سے آرام نہیں آتا۔ ہماری دوا تو —" انہوں نے تقدیس کا چہرہ اوپر اپنی طرف کرتے ہوئے شریر آنکھوں میں شرارت بھری مسکراہٹ بھر کے کہا۔ وہ اپنی ساری بیماری، درد اور گھبراہٹ بھول چکے تھے۔ محض شرارت

تھی۔ کچھ ہوتا تو تب نا۔

"ہماری صحت کا راز ۔۔ ہماری بیماری کا علاج، درد کی دوا، آج آپ کو پتہ چل گیا کہ کیا ہے۔" وہ ہنس رہے تھے۔ خاص طور پر تقدیس کے بھولپن کا مذاق اڑا رہے تھے کہ مریض کے بازو میں درد ہو تو آپ سر دباتی ہیں۔ سر میں ہو تو پاؤں میں دوا لگائیں گی۔ ادھر شبانہ بھابی کی بیقراری اور گھبراہٹ سے گھبرا کر روتی ہوئی، سسکتی ہوئی، امی اور خالہ کو فون کرنے کے لیے، کہ کل سے کوٹھی کا فون خراب تھا یا وہ بھی شہزاد کی شرارت میں شامل تھا۔ اب شبانہ بھاگی پھر رہی تھی۔ چاروں طرف سناٹا، خاموشی، برآمدوں کے زینوں کے بلب روشن تھے۔ باورچی، چوکیدار بندوق لگائے ٹہل رہے تھے۔ بھابی کی فکر کرتی، خوف سے لرزتی، سردی میں ٹھٹھرتی شبانہ تیز قدم چلتی گیٹ کی طرف بھاگی جا رہی تھی۔ دونوں میں سے ایک چوکیدار کو لے پبلک کال آفس پہنچی۔ گھبراہٹ میں، پریشانی میں بڑی مشکل سے اتنی سخت سردی میں بے چاری شبانہ نے دو مرتبہ فون پر امی سے کبھی خالہ سے رابطہ قائم کیا۔ لیکن بات ہونے سے پہلے لائن کٹ جاتی۔

فوزیہ بیگم سے بات کرنا چاہی تو کبھی ٹیلی فون والے اس کی

پریشانی سے بے نیاز ٹالتے ٹرخاتے ہی رہے کہ ابھی لائن مصروف ہے کال جارہی ہے، بات ہورہی ہے۔!

ادھر شبانہ کی گھبراہٹ بڑھتی جارہی تھی۔ فون پر ہی بیٹھی رہی۔ انتظار ہی کرتی رہی، فون والوں کی مہربانی کا۔۔ کہ صبح کی روشنی نمودار ہونے لگی۔ سر درد سے پھٹ رہا تھا۔ تمام بدن شب بھر کی بیداری اور بیقراری سے ٹوٹ رہا تھا۔ ہلکا بخار اور طبیعت کی خرابی پہلے ہی تھی۔ فون نہ ہو سکنے کی صورت میں ڈرائیور کو فوزیہ بیگم کے پاس بھیج کر بڑی دیر کے بعد شہزاد کے کمرے میں آئی تو وہ حسبِ معمول اپنے موڈ میں تھے۔ شرارتوں اور شوخیوں سے مسکراتا چہرہ، بالکل سرخ و سفید چمکدار رنگت، خوب صحت مند نظر آرہے تھے۔

اور تقدیس!

پلنگ کے قریب خاموش، سر جھکائے، دانتوں میں انگلی دبائے کھڑی تھی۔ شرمندہ شرمندہ، افسردہ افسردہ؟

"بڑا مزہ آیا۔ خوب بے وقوف بنایا۔" شہزاد بڑے کوٹ کے بٹن بند کرکے گرم ٹوپی سر پہ رکھتے ہوئے بولے۔ وہ تیار ہوکر شبانہ کے پیچھے جارہے تھے۔ اپنی شرارت میں ان کو یہ خیال

ہی نہ رہا تھا کہ وہ اتنا گھبرا جائے گی۔

"خوب الّو بنی ہو تم دونوں"۔ شہزاد نے تقدیس کا شانہ ہلایا۔ شبانہ کی کمر میں مکّہ لگایا اور بڑا جاندار، زندگی سے بھرپور خوشدلی سے قہقہہ لگایا۔

"اچھا تو بس ــ ٹھیک ہے۔ ابھی امّی حضور اور خالہ جان آتی ہوں گی، آپ کی شرارت کا مزہ دوگنا ہو جائے گا۔ آدھی رات کو اتنا پریشان کیا ہے۔" شبانہ بڑبڑاتی ہوئی وہیں پلنگ پر گر گئی"۔ کچھ تو غصّہ بہت آ رہا تھا۔ ناراض تھی دوپہر سے سردی کی وجہ سے بخار بھی تیز ہو گیا تھا۔ اس نے زار و قطار رونا شروع کر دیا۔ تقدیس بھی رونے لگی۔ شہزاد پہلے تو ہنسی مذاق کے موڈ میں ہی تھے۔ لیکن فضا زیادہ خراب ہوتے دیکھ کر فوری سنجیدہ ہو گئے"۔ اب شبانہ کی خاطریں مدارتیں کر رہے ہیں۔ بستر میں لپیٹ رہے ہیں۔ منتیں سماجتیں ہو رہی ہیں۔ بڑی خوشامدیں کر رہے ہیں۔ بڑی مہارت تھی اس کام میں کہ ہر وقت تو ستانا، شبانہ کا روٹھنا اور ان کا منانا۔ــ اور آخر کار صلح ہو گئی۔ شبانہ ویسے بھی بخار میں بے سُدھ ہو رہی تھی۔

اور اب شہزاد کی کوشش یہ تھی کہ کسی طرح ڈرائیور کے گھر

پہنچنے سے پہلے' فوزیہ بیگم کی ادھر روانگی اور سعدیہ بیگم کو ان کی بیماری کی اطلاع ملنے سے پہلے ہم وہاں پہنچ جائیں یا کسی نہ کسی طرح فون پر بات ہو جائے۔ لیکن باہر نکلنے کا تو اب سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ کہ باہر شدید برف باری شروع ہو گئی تھی۔

ادھر شبانہ کا بخار بہت تیز ہو گیا تھا۔

دونوں مل کے اس کو سنبھال رہے تھے۔ شرارت بڑی مہنگی پڑی تھی۔ بڑے پریشان اور پشیمان تھے۔ انہوں نے تو شبانہ اور تقدیس کو تنگ کیا تھا۔ یہ خیال ہی نہیں آیا تھا کہ گھبرا کر اگر ان دونوں نے گھر والوں کو اطلاع دے دی تو ـــ تو شرارت شروع کرنے سے پہلے تو یہ سوچا ہی نہ تھا۔ اب اسی فکر میں تھے کہ برف باری کے دوران ڈرائیور کا جانا کتنا مشکل ـــ بے چارا حکم کا بندھا جاتا ہو گا یا کہیں رکا کھڑا ہو گا۔ پھر مالک کی بیماری سے بھی متفکر ہو گا۔

ادھر ماں اور خالہ کی طرف دھیان لگا تھا۔ ظاہر ہے اطلاع ملتے ہی فوراً روانہ ہو جائیں گی۔ اب بڑے فکر مند سے ٹہل رہے تھے۔ پھر شبانہ کے بخار سے بھی پریشان تھے۔

"اب مزہ آیا نا شرارتوں کا" تقدیس بھی ان کو متفکر دیکھ کر زیرِ لب مسکرا رہی تھی۔

شبانہ سو چکی تھی۔ رات بھر کی تھکن اور کوفت سے سر بوجھل ہو رہا تھا۔ نیند آ رہی تھی۔ ہونٹوں میں ہنسی کو دباتی چپکے سے جا کر تقدیس اپنے کمرے میں سو گئی۔ جب اس پریشانی کے حل کی کوئی صورت نہ نکلی تو جا کے بستر میں پڑ رہے، اور نیند نے آ لیا۔ شام ڈھلے کہیں نیند سے بیدار ہوئے۔ موسم بالکل صاف تھا اور طبیعت بھی ہمیشہ کی طرح ہشاش بشاش۔ پھر واپسی کی تیاری اور ادھر سے امی اور خالہ کی آمد کا انتظار۔ شبانہ بھی پہلے سے بہتر تھی۔ البتہ کمزوری محسوس کر رہی تھی۔

پہلے سعدیہ بیگم اور پیچھے فوزیہ بیگم اسی کمرے میں داخل ہوئیں — جہاں رات سے واپسی کا سامان بندھ رہا تھا — اور شہزاد نے درد کا بہانہ بنا کر سب کچھ وہیں چھوڑ دیا تھا۔

"آہا — آہا — میری امی — میری خالہ جان —" شہزاد ایکدم اچھل کر دونوں باہوں میں امی اور خالہ کو لے کر ایک ساتھ لپٹ گئے۔ شبانہ اور تقدیس بھی جلدی سے قریب آ گئیں۔ تینوں بچوں کو دونوں خواتین نے گلے لگا لگا کر پیار کیا، اور شہزاد کو بالکل ٹھیک

صحت مند، ہشاش بشاش دیکھ کر ان دونوں کو بڑی حیرت ہوئی اور دل ہی دل میں خوش ہو کر ان کا ڈھیروں صدقہ خیرات کے لیے بھجوا دیا۔

شہزاد ادھر امی حضور کو گدیوں کے سہارے نرم کرسی پہ بٹھا رہے ہیں۔ ان کے شانے دبا رہے ہیں۔ گلے میں باہیں ڈال کر صدقے واری جا رہے ہیں۔ ادھر خالہ کی راہوں میں آنکھیں بچھا رہے ہیں۔ خوب خاطر و مدارت کر رہے ہیں۔ لپٹے لپٹے جا رہے ہیں۔ بار بار پیار کر رہے اور کروا رہے ہیں۔ خالہ بھی نثار ہوتی جا رہی ہیں۔ اس سارے ڈرامے کے پیچھے وہ پریشانی اور پشیمانی تھی کہ ان کی وجہ سے بلکہ ان کی ذرا سی شرارت کی وجہ سے بزرگوں کو اتنی زحمت اٹھانا پڑی۔ اور پھر ان کے پوچھنے پر بتایا کہ — رات اچانک طبیعت کچھ خراب ہو گئی تھی۔ ان دونوں نے گھبرا کر آپ کو بلوا بھیجا — ورنہ دوا تو بڑی مؤثر تھی۔ فوری اثر ہوا اور وہ ٹھیک ہو گئے۔

"ادھر لائیے — ہم بھی دیکھیں کیا دوائی ہے؟" امی حضور کے پوچھنے پر خالہ بھی ادھر ہی دیکھ رہی تھیں۔

"یہ لیجیے" شہزاد نے جان بوجھ کر تقدیس کو امی حضور کے

سامنے کرتے ہوئے کہا۔ شرارت کی رگ پھڑک رہی تھی۔ آنکھوں میں اور ہونٹوں پہ بڑی شرارتی مسکراہٹ تھی۔

"انہوں نے رات میری بہت خدمت کی ہے۔ شبانہ تو بزدل ہیں، آپ کو بلوا بھیجا۔ صاحبزادی بڑی بہادر ہیں۔" شہزاد نے جیسے دوائی والی بات تو سُنی ہی نہ تھی۔ اپنی ہی دھن میں کہہ رہے تھے۔ اور تقدیس بے چاری کی جان نکال کر رکھ دی تھی کہ شاید دوا کے طور پر اس کو پیش کر رہے ہیں۔

سعدیہ بیگم نے پھر سینے سے لگا کر تقدیس کو ڈھیروں پیار کر ڈالا۔ اور سینکڑوں دعائیں دے رہی تھیں۔

شبانہ خالہ کی کرسی کے بازو پہ بیٹھی، ان کے شانے پہ سر رکھے ساری کہانی آہستہ آہستہ سنا رہی تھی۔ اور تقدیس ابھی تک سعدیہ بیگم سے ہی لاڈ کروا رہی تھی۔ سیاہ زمین پہ کھلتے سبز رنگ کی پتیوں کے جال میں چھوٹے چھوٹے گلابی پھولوں والا شلوار قمیص، سیاہ جرسی پہنے تھی۔ کالا دوپٹہ گلے میں پڑا تھا۔

"چلو اچھا ہوا — خیریت گذری۔ بیٹے دوا کا استعمال کچھ دن تک جاری رکھیے اور احتیاط بھی لازمی ہے۔" سعدیہ بیگم نے بڑی محبت سے بیٹے کی طرف دیکھا۔ وہ سامنے کھڑے بڑی سعادت مندی

سے ماں کی بات قدرے سر جُھکا کر نہایت ادب سے سُن رہے تھے۔

"جی اچھا — امّی حضور — دوا کی خوراک تو اب دن میں تین بار لیا کروں گا۔" امّی اور خالہ کی نظر بچا کر انہوں نے تقدیس کو ستایا۔ وہ ایک ہاتھ پیشانی تک لے جا کر تھوڑا سا جھکے ہوئے تقدیس سے مخاطب تھے۔

"آداب — بہت شکریہ۔" جیسے کسی مشاعرے میں اپنی کامیابی پر بے پناہ داد وصول کر رہے ہیں۔ تقدیس — گھبرائی — شرمائی — مسکرائی اور چپکے سے اُٹھ کر سامنے کرسی پر بیٹھ گئی۔ ملازم چائے لے آیا تھا۔ سب کی پیالیوں میں چائے ڈالنے لگی۔ اور شہزاد اس معصوم سی لڑکی کی ہر ادا پر دل وجان سے فریفتہ مسکراتے رہے۔

شہزاد نے رات کو بھی اور صبح بھی شبانہ سے معافی مانگی تھی۔ کان پکڑ پکڑ کر توبہ کی تھی۔ نہ جانے کیا کیا کچھ لے کر دینے کے وعدے کیے تھے۔ ورنہ تو شبانہ اگر امّی سے ان کی کارستانی کہہ دیتی تو پھر بڑی بری بات تھی۔ شرمندگی کے علاوہ آئندہ کے لیے اعتبار بھی جاتا رہتا۔

بے شک شبانہ اور ان کی لڑائی بہت ہوتی تھی۔ لیکن بے پناہ

پیار بھی تھا دونوں میں۔ وہ ایک دوسرے کے راز دار بھی تھے بھرم بھی رکھتے تھے ایک دوسرے کا — اور اس کے لیے شہزاد شبانہ کو کافی مالیت کا خرچہ دیتے رہتے تھے۔ اب بھی خالہ کو رات کا واقعہ سناتے وقت شبانہ نے بھائی سے کیئے وعدے کو برقرار رکھا تھا۔

"شہزاد بیٹے — کل فوری کسی ماہر ڈاکٹر سے معائنہ کروائیے۔ یہ بازو کے درد کی تکلیف اچھی نہیں ہوتی میرے چندا — تمہارے نانا جان مرحوم (اللہ تعالےٰ غریق رحمت کرے) کو بھی ایسے ہی تکلیف تھی — درد اٹھا کرتا تھا"۔ سعدیہ بیگم کافی فکرمندی سے کہہ رہی تھیں۔ اور چائے ختم کر چکی تھیں۔

"تو — نانی جان کیا کرتی تھیں"۔ شہزاد نے بڑی معصوم شکل بنا کر اس سنجیدگی سے پوچھا کہ تقدیس تو ہنسی ضبط نہ کر سکیں۔ شبانہ بھی ہنس رہی تھی۔ سعدیہ بیگم اور فوزیہ بیگم نے بھی بمشکل ہنسی کو دبایا پھر بھی مسکرا دیں — اور شہزاد بڑے معصوم بنے بظاہر سعدیہ بیگم اور دراصل تقدیس سے پوچھ رہے تھے۔

"بیٹے۔ کبھی تو سنجیدہ ہو جایا کرو"۔ سعدیہ نے بھی ضبط کے باوجود ہنستے ہوئے کہا۔ "اگر نانا جان بیمار ہوں گے تو ظاہر ہے

نانی جان تیمارداری ہی کریں گی نا۔"

"جی ہاں ۔۔ درد ان کے بازو میں ہوتا ہوگا اور وہ ان کا سر دباتی ہوں گی ۔۔ ہیں نا۔" ہنستے ہوئے ماں سے مخاطب تھے۔ اور تقدیس سے تصدیق کروا رہے تھے۔

سعدیہ بیگم نے سنجیدگی سے شہزاد کو منع کیا کہ بزرگوں کی شان میں اس طرح کی بات ان کی بے ادبی ہوتی ہے لیکن شہزاد آنکھوں میں شرارت بھرے خاموش ہو گئے۔ وہ تو تقدیس کو جتا رہے تھے۔ ستا رہے تھے۔

"لائیے ۔۔ ادھر ۔۔ مجھے وہ دوا تو دکھائیے، کہاں سے لی تھی"۔ اب کی بار فوزیہ بیگم نے شہزاد سے پوچھا۔

"شبانہ ۔۔ لانا ۔۔ ذرا وہ دوا"۔ شہزاد نے اپنی ہنسی روکنے کے لیے منہ پر ہاتھ رکھ لیا۔

"مجھے تو معلوم نہیں ۔۔ آپی جان نے ہی دی تھی"۔ شبانہ چونکہ فون کرنے گئی ہوئی تھی ۔ اس لیے لاعلمی کا اظہار کر رہی تھی۔

"ادھر لائیے ۔۔ ایک خوراک اور لے لوں ۔۔ طبیعت پھر کچھ کچھ گھبرا رہی ہے"۔ شہزاد نے تقدیس کا ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا۔ وہ تو جلدی سے اٹھ کر سعدیہ بیگم کے ساتھ لگ گئی۔ اور شہزاد

شرارت سے ہنستے ہوئے دوسرے کمرے میں چلے گئے۔ تقدیس کی گھبراہٹ سے سخت مزہ آ رہا تھا۔

"اچھا پھر سہی"۔ جاتے جاتے زیرِلب کہہ گئے تھے۔ تقدیس خاموش بیٹھی مسکراتی رہی۔ ہونٹوں کو دانتوں میں دباتی رہی۔ شہزاد کی شرارتوں میں چھپی محبتوں کا موازنہ کرتی رہی۔ لطف لیتی رہی۔ مسحور سی، مخمور سی ہو رہی تھی۔۔ کسی اور کی موجودگی کا یہاں احساس ہی نہ تھا۔ جیسے وہ بھی شہزاد کے بازوؤں کے سہارے ساتھ ساتھ ہی چل رہی تھی، دوسرے کمرے کی طرف۔

باب ۵

نہ محبت، روح انساں کی ہے، وہ معصوم کیفیت
بیاں الفاظ میں، جس کی لطافت ہو نہیں سکتی

جون کا مہینہ ۔۔ گرمی بے حساب پڑ رہی تھی۔ اتنی تیز روشن چکا چوند سی دھوپ کہ آنکھ کھولنا مشکل۔ گرم لو اور جھلسا دینے والی ہواؤں نے بے دم کر کے رکھ دیا تھا۔ یوں لگتا تھا آسمان سے آگ برس رہی ہے۔ زمین سے بھاپ نکل رہی ہے اور ہر چیز جل بھن کر فنا ہو جائے گی ۔۔ لیکن دنیا کا کارخانہ چل رہا تھا۔ غریب، امیر، متوسط طبقہ سب ہی اپنی ہمت، توفیق اور بساط اور وسائل کے مطابق دن گذار رہے تھے۔

لیکن دن کاٹے نہ کٹتے تھے۔

رات گذارے بھی نہ گذرتی تھی۔ بڑی مشکل گھڑیاں ما بڑے

کٹھن لمحات تھے۔ رات اور دن دونوں ہی طویل تر ہو گئے تھے۔

سعدیہ بیگم اچانک شدید علیل ہو گئی تھیں۔ اطلاع ملتے ہی فوزیہ بیگم بیٹی کو ساتھ لیے فوری پہنچ گیئں۔ ظفر نیازی سرکاری مصروفیات کی وجہ سے آ نہیں سکتے تھے کیونکہ غیر ملکی وفود آئے ہوئے تھے۔ خارجہ امور کا شعبہ ان کے سپرد تھا۔ بین الاقوامی امور پر بحث و مباحثوں کے اجلاس ہو رہے تھے۔ صبح و شام رات دن کی بڑی سخت مصروفیت تھی۔ نوکری کا معاملہ تھا ــــ بڑی سخت مجبوری تھی ــــ ورنہ تو وہ بھی بھاگے آتے۔ سعدیہ بیگم ان کی بڑی بھاوج، چہیتی بہن ہی نہ تھیں بلکہ چاہنے والی ماں کا رتبہ تھا ان کا۔ چھوٹی عمر میں والدہ کی وفات کے بعد سعدیہ بیگم نے ہی ان کو دیکھا سنبھالا تھا۔ لیکن اس لمحے وقت نے مجبور کر دیا تھا۔ بہرحال فوزیہ بیگم آ گئی تھیں۔ بہن کی بیماری سے بہت سخت پریشان۔ لے دے کے دنیا میں یہی تو ایک میکے کی نشانی باقی تھی۔ سب کچھ وہی تو تھیں، ان کے لیے ماں، بہن، ساس، نند، غرض سارے رشتے ہی اس ایک مشفق وجود میں سمٹ آئے تھے۔ محبتوں، رحمتوں اور شفقتوں کا خزانہ تھیں سعدیہ بیگم۔ ان سب کے لیے ذرا کوئی دکھ سکھ

ہوتا دونوں بہنیں مل کر بیٹھ جاتیں۔ ایک دوسرے کی فکروں کی ساتھی ـــ خوشیوں کی شریک۔

اب بڑی بہن بیمار تھیں تو فوزیہ بیگم کو تو جیسے کچھ نظر ہی نہ آرہا تھا۔ پاؤں رکھتی کہیں تھیں تو پڑتا کہیں تھا۔ کام کوئی کرنا ہوتا تو ہو جاتا کوئی اور تھا۔ دوا علاج کے ساتھ صدقہ خیرات پہ بھی زور تھا۔ ہر وقت گھبرائی گھبرائی، پریشان ـــ بے حال ـــ بڑا ہی حال تھا۔

خاندانی ڈاکٹر ریاض رضوی نے مکمل آرام اور بہت سے پرہیز و احتیاط بتائے تھے۔ خون کے دباؤ کی تکلیف تھی۔ شدید اعصابی کمزوری ـــ ایکدم بلڈ پریشر بڑھ جاتا اور ایکدم اتنا گر جاتا کہ نبض ہی نہ ملتی تھی۔ ذرا طبیعت بگڑتی تو فوراً ڈاکٹر کو بلا لیتیں۔ ہزاروں سوالات کر ڈالتیں۔

ڈاکٹر صاحب کی دی ہوئی تسلّی و تشفی تھوڑی دیر کے لیے اطمینان کا باعث ہوتی۔ وہ کچھ اس انداز سے بات کرتے کہ حوصلے بلند ہو جاتے، ہمّت جوان ہو جاتی۔ لیکن ضعیف العمر، ناتواں، بیمار بہن کو جب یوں نڈھال بستر پر پڑے دیکھتیں، تو سب کچھ جواب دے جاتا۔ نہ کوئی ہمت، نہ کوئی حوصلہ، نہ تسلی

نہ دلاسہ!

لیکن سعدیہ بیگم کے بعد وہی اب بزرگ تھیں۔ سب میں بڑی جو تھیں۔ تینوں بچوں کی خاطر ان کو سنبھلنا تھا۔ وہ تو ہر وقت کے شرارتی، لاپرواہ شہزاد، جو دراصل بڑے حساس اور ذمہ دار بھی تھے۔ خالہ کی ہمت بندھاتے اور ان کے دلاسوں کے سہارے تھے۔ ان کی حوصلہ افزائی تھی۔ ورنہ تو اچھی خاصی صحت مند، سُرخ وسفید جوان جہاں فوزیہ بیگم — بہن کی بیماری سے خود برسوں کی بیمار نظر آتی تھیں۔ خالہ کی بیماری اور ہر وقت کی تیمارداری۔ سے تقدیس کا بھی حال خراب تھا۔

شبانہ سب میں چھوٹی۔ پہلے بچپن میں والد کی وفات کی وجہ سے زیادہ لاڈ پیار کی وجہ سے ماں سے بہت وابستہ تھیں کہ باپ کی شفقت ومحبت بھی تو ان کو ماں سے ہی ملتی تھی۔ ہر جائز و ناجائز ضد اور لاڈ ماں ہی کو پورا کرنے ہوتے تھے۔ جب بھی امّی کے کمرے میں آتی، رونے لگتی۔

اور کمزور دل تقدیس پہلے ہی سب سے پہلے رونے کو تیار۔ فوزیہ بیگم کے آنسو بھی مچل اٹھتے۔ چھپ چھپ کر گھٹ گھٹ کر روتیں — اور منہ پھیر کر آنسو پونچھتیں۔ بچوں کا بہت خیال

رہتا۔ شہزاد ماں کی بیماری سے اوسان خطا پہلے ہی تھے۔ اوپر سے شبانہ اور تقدیس کی گریہ و زاری ۔ اتنا زیادہ چاہنے والی خالہ کی بیقراری دیکھ کر بیقرار ہو جاتے۔ اس افسردہ ماحول کو برداشت نہ کر پاتے۔ لیکن پھر بھی سب کے سامنے آنکھوں میں آنسو آتے بھی تو پی جاتے۔ دل روتا تو اس کو بہلا لیتے۔ جگر جلتا تو اس کی آگ بجھانے کے لیے ٹھنڈے پانی کے کئی کئی گلاس پی جاتے اور ضبط کی خاطر کمرے سے باہر نکل جاتے۔

آخر کو سعدیہ بیگم ان کی ماں تھیں۔

دنیا بھر کی خوشیوں کا سرمایہ؟

شفقتوں، محبتوں کی چھایا! ممتا کی ٹھنڈی ٹھنڈی گھنی، بڑی سرسبز چھاؤں کا سایہ ۔ چاہتوں کا خزانہ، مسرت و عافیت کا گنجینہ، بھلا کیسے افسردہ نہ ہوتے۔ باہمت جوان مرد ہوتے ہوئے بھی یہ کمزوری قدرتی تھی۔ فطری فعل تھا کہ ماں تو سب کی ماں ہی ہوتی ہے۔ بڑی پیاری پیاری، بڑی انمول بڑی گرانقدر، نعمت خداوندی؟

فوزیہ بیگم دن رات بہن کی پٹی سے لگی تھیں۔ تقدیس خالہ کو ماں سے زیادہ چاہتی تھیں۔ جس کی وجہ خود فوزیہ بیگم تھیں ۔ یہ

جذبہ ان کا ہی پیدا کردہ تھا۔ کہ وہ بڑی بہن کو اپنی محترم ماں کی، قابلِ احترام باپ کی جگہ ۔۔۔ دونوں کی جگہ ہی سمجھی تھیں۔ اُن کی پُرخلوص چاہت، بے لوث محبّت اور بے پناہ خلوص اور پیار کا ہی نتیجہ تھا کہ تقدیس ان کو اصلی ماں سمجھتی۔ اور فوزیہ بیگم کے ساتھ تو بہنوں کے سے تعلقات تھے۔ دوستانہ، بے تکلفانہ مراسم تھے۔ جو بات بھی ہوتی، جو مطالبہ بھی ہوتا سعدیہ بیگم سے جا کر کہتی۔ بہت چھوٹی سی تھی۔ جب بھی اپنی ہر بات، ہر شکایت' شہزاد کی شرارت، چھیڑ چھاڑ کی شکایت ۔۔ اپنے امی، ابّو سے شکوہ شکایت سارا دفتر لے کر سعدیہ بیگم کے پاس ہی آیا کرتی۔ وہ بڑے پیار سے گود میں اُٹھا لیتی۔ محبت سے باہوں میں چھپا لیتیں۔ سینے سے لگا لیتیں۔ ڈھیروں پیار کرتیں۔ سر پہ بالوں پہ ہاتھ پھیرتی جاتیں۔ سارے شکوے، شکایتیں مسکرا مسکرا کر سنتیں اور پھر ان شکایات کی وجہ سے سب کی باز پُرس ہوتی۔ سب کو ڈانٹ پڑتی۔ اور تقدیس بڑے فخریہ انداز میں خالہ کی گود میں بیٹھی رہتی۔ ان کے گلے میں باہیں ڈال کر لپٹ جاتی۔ ان کے سینے میں منہ چھپا لیتی۔ ہنستی مسکراتی بہت ہی خوش ہوتی۔

لیکن اب تو بڑی ہو گئی تھی۔ بڑی سمجھدار، بڑی ذہین، بڑی

فہیم بڑی حلیم۔ اپنی امّی کو ہر وقت مصروف، ہر وقت فکر مند دیکھ کر ان کی طرف سے بھی فکر لگی تھی۔ بڑی صحت مند گوری گلابی، خوش شکل، خوش لباس، جواں سال امی، جو دیکھنے میں تقدیس کی بڑی بہن لگتی تھی۔ اچھی صحت، رکھ رکھاؤ اور بے فکری کی وجہ سے دونوں میں بہت تھوڑا فرق نظر آتا تھا، اب تو چند دن میں ہی بوڑھی، کمزور نظر آنے لگی تھیں کہ سعدیہ بیگم کی بیماری نے تو ان کو نچوڑ کر رکھ دیا تھا۔ اتنا زیادہ اثر لیا تھا انہوں نے۔ خالہ کی تیمارداری کے ساتھ ساتھ ماں کا بھی خیال رکھتیں۔ مناسب وقفوں سے ان کو آرام کرواتیں۔ مقررہ اوقات میں نیند پوری کرنے پر مجبور کرتیں۔ خالہ کی دوا، غذا، یخنی، تازہ پھلوں کے رس، ٹھنڈا دودھ وغیرہ، غرض ہر چیز بروقت دیتیں اور ان کے ساتھ ساتھ فوزیہ بیگم کے خوراک، لباس کا بھی خیال رکھتیں۔ کہ ملگجے، بے استری، بے ترتیب کپڑوں میں اپنی امّی کو دیکھ کر انہیں بہت تکلیف ہوتی تھی۔

شبانہ کے سالانہ امتحان ہو رہے تھے۔ گرمی کی شدت، پڑھائی کا زور، ماں کی بیماری، وہ تو حواس باختہ سی رہتی تھی۔ تقدیس اور شہزاد اور فوزیہ بیگم سب ہی اس کی بہت دلجوئی

کرتے۔ بالکل چھوٹے بچوں کی طرح اس کے لاڈ اور ناز برداریاں کرتے۔ ہر طرح کا خیال رکھتے۔ ہزاروں ناز اٹھاتے ، نخرے سہتے اور خاص طور پر تقدیس تو گلے لگا لگا کر پیار کر لیتی۔ پڑھائی کے دوران اس کو پاس بٹھا کر تسلیاں دیتی رہتی۔

" میری اچھی بہن ــ بس تم تسلّی سے امتحان دے لو خالہ حضور کے لیے پریشان نہ ہوا کرو ۔ وہ تو بہت جلدی ٹھیک ہو جائیں گی۔ وہ بڑی محبت سے اس کی کمر پہ ہاتھ پھیرتی ۔ اس کے شانوں کو تھپکتی ۔ بالوں کو سنوارتی ، سر ماتھا چوم لیتی۔ غرض ہر طرح سے تسلی دیتی ۔ صبح کو پرچے کے لیے خود جا کر چھوڑ کر آتی۔ ٹھنڈا جوس ساتھ لے کر آتی ۔ بڑی بہنوں والے سارے ہی لاڈ کرتی۔ ناز اٹھاتی ، اپنی بڑائی کا حق ادا کر رہی تھی۔ شریر شہزاد کی شرارتیں شوخیاں ، سب گول ہو چکی تھیں۔ بالکل خاموشیوں میں بدل گئی تھیں ۔ اگلے مہینے ان کا امتحان بھی سر پہ ــ جائیداد کی دیکھ بھال کا بوجھ ، والدہ کی بیماری کی پریشانی ، وہ تو غیر معمولی سنجیدہ ہو گئے تھے ۔ ان دنوں جو بھی فرصت کا لمحہ ملتا ، تقدیس کا ہاتھ بٹاتے خالہ کا حوصلہ بڑھاتے ، ہمت دلاتے ، شبانہ کو یکسوئی سے امتحان دینے کی ہدایت فرماتے۔ بڑی محبت سے بڑی شفقت

سے، کبھی کبھار وہیں بیٹھے خود بھی کوئی کتاب کھول لیتے۔ غرض آج کل ہر خوشدلی پہ اداس سی پڑی تھی۔ تمام خوشیاں، شرارتیں اور شرارتیں جیسے روپوش ہو گئی تھیں۔

"تقدیس — آپ دن کو امّی حضور کی خدمت کرتی ہیں، رات کی تیمار داری اور خدمت ہمارا فرض ہے"۔ وہ کتنے خلوص، کتنی اپنائیت سے، بڑی محبت سے تقدیس کو ساتھ لے کر اپنے بازو کے سہارے میں لے جا کر آرام کے لیے چھوڑ کر آتے، بڑی زبردستی سے — کہ تقدیس کا خالہ حضور کو چھوڑ کر جانے پر دل نہیں مانتا تھا — کہ ان کو سعدیہ بیگم سے بڑی محبت تھی، اپنی ماں سے بھی زیادہ۔

شہزاد کو فوزیہ بیگم بھی تو کچھ کم عزیز نہ تھیں۔ اتنا چاہنے والی — اکلوتی بڑی چہیتی خالہ — جو آج بھی شہزاد کو اسی طرح لاڈ کرتیں — اسی طرح ناز برداریاں کرتیں، جیسے وہ اب بھی ننھے سے ہوں — ابھی تک شہزاد چھوٹے بچوں کی طرح خالہ کی گود میں سر رکھ کر لیٹ جاتے — ان سے لپٹ لپٹ کر پیار کرتے اور کرواتے — اپنی کوئی نہ کوئی بات منواتے — خالہ قربان ہو ہو جاتیں — اتنے عزیز — عزیز از جان بھانجے کا کتنا خیال

کرتیں کہ شہزاد دن بھر کام کرتے تھے۔ فصل کی کٹائی کے بعد سنبھالنے کے دن تھے۔ جاگیرداری کی ساری ذمہ داری ان پر تھی۔ تھکن ہوتی تھی! کوفت ہوتی تھی، آخر۔ نازوں کے پلے ہوئے شہزاد ــــ اس لیے رات کو فوزیہ بیگم ان کے ساتھ برابر جاگ کر گذارتیں۔ رات کو باری باری اور کبھی تینوں مل کر سعدیہ بیگم کی دیکھ بھال کرتے، ان کے کمرے میں ہی موجود رہتے۔ وہیں سبز رنگ کے دبیز قالین پر تکیے، کشن رکھ کر لیٹ جاتے، کبھی صوفوں پر اٹک جاتے۔

شبانہ رات کو پڑھائی کے دوران نہ جانے کتنی مرتبہ امّی کو دیکھنے کے لیے آتی۔ یا وہیں اسی کمرے میں ایک کونے میں پڑے ٹیبل لیمپ کی روشنی میں کتاب دیکھنے لگتی۔ ایسے میں پڑھائی تو کیا ہو سکتی تھی۔ بس اپنی سی کوشش تھی۔ اور سب کا پیار بھرا اصرار ــــ ورنہ تو امتحان دینے والا کوئی حال نہیں تھا۔ پرچے کیسے ہو رہے تھے، یہ اس کو خود بھی معلوم نہیں تھا۔

ایئرکنڈیشنڈ کمروں کے بوجھل پردے گرے تھے۔ دروازے کھڑکیاں بند تھیں ــــ کہ جون کے مہینے کی گرمی شباب پر تھی، عتاب میں تھی۔ سعدیہ بیگم اپنے کمرے میں اُجلے لباس، ستھری

مسہری پر آنکھیں بند کیے لیٹی تھیں۔

فوزیہ بیگم پلنگ کے قریب ہی نیچی آرام کرسی پہ بیٹھی آہستہ آہستہ بہن کا سر دبا رہی تھیں۔ سرہانے کی طرف چھوٹی سی چمکیلی لکڑی کی میز، جس پر موٹا شیشہ جڑا تھا۔ میز پر چھوٹی بڑی دواؤں کی شیشیاں ترتیب وار پڑی تھیں۔ میز کے درمیانی خانے میں تھرموس میں ٹھنڈا مشروب تھا۔ ساتھ ہی سبز رنگ کی ڈائری کے نیچے ڈاکٹر صاحب کے لکھے نسخے اور دیگر ہدایات کے کاغذ تہ کیے رکھے تھے۔ ساتھ ہی ایک پن اور رائٹنگ پیڈ بھی پڑا تھا۔ کمرے کے مشرقی کونے میں قدرے اونچی میز پہ جس میں لکڑی کے اندر پیتل سے مینا کاری کی گئی تھی۔ اسی مینا کاری والا لکڑی کا ٹیبل لیمپ میز پہ تھا۔ خوبصورت مکمل لیمپ کے ساتھ پیتل کے بڑے خوبصورت نازک سے اگردان میں سلگتی اگربتیوں کا دھواں خوشبو کی لپٹیں لیے سارے کمرے کو اپنی لپیٹ میں لیے تھا۔ درمیانی دروازے کے بالکل سامنے درمیانی کھڑکی کے قریب بیکی دبزن سیٹ پڑا تھا۔ جس پر بلوریں گلدان میں موسم کے تازہ پھول، اتنی اداس اور خاموشی کی بوجھل فضا میں بھی تبسم تھے۔۔۔ کہ پھول ہی تو کانٹوں میں

گھرے ہونے کے باوجود چمن دہر میں خنداں رہنے کا سبق دیتے تھے۔ اگرچہ دلوں میں نوکیلے کانٹوں کی دھاریں آر پار ہو رہی ہوتی ہیں۔ ہلکے سبز رنگ کی دیواریں اور دروازوں، دریچوں پر گہرے سبز رنگ کے دبیز پردے سکون اور ٹھنڈک کا باعث تھے۔ لمبی کھڑکی سے ذرا اوپر سنہرے فریم میں سیاہ بڑے خوبصورت بڑی قیمتی گھڑیال نے گیارہ بجائے۔

آہستہ سے دروازہ کھول کر، بوجھل پردہ ہٹا کر تقدیس گیلری کے اندر کھلنے والے درمیانی دروازے میں سے اندر آرہی تھیں۔ بلوریں پیالہ چاندی کی پھولدار پلیٹ میں رکھے، دونوں ہاتھوں میں تھامے تھیں۔ آہستہ چلتی آئیں۔ اور سعدیہ بیگم کے سرہانے کی طرف پڑی میز پر بڑی احتیاط، بڑے سلیقے سے رکھ دیا۔ چہرے پہ، پیشانی پہ آتے، ننھے منے پسینے میں بھیگے بالوں کو ہاتھ سے پرے کرتی، تھوڑا جھک کر اپنی پیاری پیاری خالہ حضور کی ٹھنڈی پیشانی کا بوسہ لیا۔ طبیعت کے بارے میں پوچھا۔ انہوں نے مسکراتے ہوئے سر کے اشارے سے جواب دیا کہ "وہ اب بہتر ہیں"۔ اور تقدیس کے دونوں ہاتھوں کو آہستہ سے چوم لیا۔ اور کتنی دیر تک اس کے ہاتھوں کو اپنے

ہاتھ میں لیے اپنے سینے سے لگائے خاموش پڑی رہیں۔ نقاہت بہت تھی۔ ابھی بات یا حرکت کی ہمت نہ تھی ان میں۔

"لاؤ بیٹی یخنی میں پلا دوں"۔ فوزیہ بیگم نے بڑی محبت سے سعادت مند، خدمت گذار بیٹی کی طرف دیکھتے ہوئے نرم لہجے میں کہا۔

"امّی جان! آپ تھوڑا آرام فرمایئے۔ خالہ حضور کو یخنی میں خود ہی پلا دُوں گی"۔ تقدیس نے سعدیہ بیگم کے قریب کرسی پہ بیٹھی اپنی امّی کو شانوں سے پکڑ کر اٹھاتے ہوئے کہا اور سامنے نرم صوفے پر لیٹنے میں مدد دی۔ وہ واقعی بہت تھکی ہوئی تھیں۔ کئی روز سے پریشان تھیں۔ نڈھال سی لیٹ گئیں۔ ساری توجہ بہن کی طرف تھی۔ آدھ کھلی آنکھوں سے ادھر ہی دیکھ رہی تھیں۔

شہزاد شدید گرمی کی وجہ سے گرمیوں کے ہلکے پھلکے لباس میں تھے۔ بڑی مہین عمدہ لان کی سفید قمیص، جس کے گلے اور کندھوں پر سفید ریشمی دھاگے سے نازک نازک بڑی نفیس بیل کڑھی ہوئی تھی۔ سفید شلوار اور پشاوری چپل پہنے تھے۔ کُرتے کے اوپر کے دو بٹن کھلے تھے۔ گرمی بہت لگ رہی تھی۔ چہرہ خاصا سُرخ ہو رہا تھا۔ بار بار چھوٹے تولیے سے پسینہ

پونچھتے جا رہے تھے۔ پھر گرمی میں باہر سے آتے تھے۔ ٹھنڈے پھولوں اور اگربتیوں کی خوشبو اور سعدیہ بیگم کے پسندیدہ پرفیوم کی خوشبو سے مہکتے کمرے میں آکر بڑا سکون محسوس ہوا۔ ٹھنڈی جنت کا سکون' خاص طور پہ جب ماں کے نازک نازک زرد پیروں پہ ہاتھ رکھے۔ اپنا سر ماں کے قدموں میں رکھ دیا۔ تو اصلی جنت کا سکون اور پُرسکون احساس مل رہا تھا۔ نیلے رنگ کی فائل اور دو بڑی بڑی سرخ جلد کی کتابیں ہاتھ میں ساتھ لائے تھے۔ بہت خاموش اور افسردہ سے تھے۔ ہمیشہ کی مسکراتی، شوخیاں برساتی، شریر آنکھوں میں اداس اداس بڑی ٹھنڈی گہری سوچوں کے بادل چھائے تھے۔ ہر وقت متبسم لبوں پر خاموشی تھی، سکوت تھا، وہ ابھی ابھی کالج سے واپس آئے تھے۔ پاؤں سے اٹھے تو والدہ کے تکیے کے ساتھ سر رکھ دیا کہ انہوں نے اشارے سے بلایا تھا۔

وہ آہستہ آہستہ بیٹے کے بالوں اور چہرے پہ ہاتھ پھیر رہی تھیں۔ اتنی سکت نہ تھی کہ پریشان حال بیٹے کو سینے سے لگا کر پیشانی چوم کر تسلّی دیتیں۔ دل ہی دل میں ڈھیروں دعائیں دے رہی تھیں۔ آواز میں ابھی بڑی کمزوری تھی۔

تقدیس سفید لباس پہ سبز رنگ کا ایپرن لگائے تھی۔ چھوٹے چھوٹے سفید دائروں والے ایپرن کے گول گھیرے کے گرد دوہری گھنی جھالر لگی تھی۔ کمر میں لگی ڈوریوں کی بندش کی وجہ سے نازک بدن کی نزاکتیں اور پتلی کمر نمایاں ہوگئی تھیں۔ لمبی پتلی دودھیا گردن کے گرد پڑی سنہری زنجیر میں نازک سی سنہری گھڑی، نازک بدن کی دلکش رفعتوں پر پڑے فخر سے جھول رہی تھی۔ ملائم سیاہ بال سمیٹ کر ربڑ باندھ لیا تھا۔ ربڑ میں دو سفید چھوٹے چھوٹے پھول جڑے تھے۔ ابھی ابھی باورچی خانے سے آئی تھی۔ روزانہ یخنی اپنے ہاتھ سے بنا کر لاتی۔ گرمی کی شدت سے سرخ ہوتے مکھڑے پہ، پیشانی پہ اور خوبصورت بڑی بڑی نشیلی آنکھوں کے نیچے دہکتے، دمکتے رخساروں پہ پسینے کی شبنمی بوندیں، چمکتے موتی، جیسے گرمی کی زیادتی کی وجہ سے دہکتے، لپکتے شعلوں پہ مچلتے شبنم کے قطرے، پاؤں کے ناخنوں پر بڑے خوبصورت رنگ کی نیل پالش لگی تھی۔ سفید شلوار کے پائنچوں میں چھپتے نکلتے گورے گورے نازک پاؤں، سیاہ چرمی چپل میں سے جھلکتے کتنے اچھے لگ رہے تھے۔ چلتے ہیں، یہاں سے وہاں جاتے میں — وہ فوزیہ بیگم کو صوفے پہ لٹا کر ان کے سر کے نیچے

نرم نرم ریشمی گدیاں اوپر تلے دور رکھ کر واپس سعدیہ بیگم کی طرف آرہی تھی۔ انہیں شہزاد کی آمد اور کمرے میں موجودگی کا علم نہ ہوا تھا۔ وہ فوزیہ بیگم یہ جھکی تھی جب شہزاد کمرے میں داخل ہوئے۔

"بس — میری اچھی امّی جان — آپ اب سو جائیے۔"

کتنے محبت بھرے جذبوں کے ساتھ وہ ماں کے بال سنوارتے ہوئے آنکھوں کو اپنے ہاتھوں سے بند کرتے ہوئے کہہ رہی تھی۔ وہ آتے بھی تو بہت دبے دبے پاؤں، بڑی آہستگی سے تھے۔ پھر آتے ہی ماں کے حضور جھک گئے۔ بڑی عقیدت، بڑی محبّت سے، ان کی طبیعت کے بارے میں پوچھ رہے تھے۔ اس کے بعد سعدیہ بیگم کے پلنگ کے قریب ہی دوزانو بیٹھے، اپنے سامنے متحرک کومل سراپا کو نظر لگا دینے والے انداز میں نیم باز آنکھوں سے دیکھ رہے تھے۔ بے خودی میں بھرے بھرے ہونٹ بھی ادھ کھلے تھے۔

کتنی پیاری، کتنی اچھی لگ رہی تھی تقدیس اس وقت۔ خاص طور پر شہزاد تو نثار ہوتے جا رہے تھے کہ وہ ان کی ماں کی خدمت کتنی اپنائیت سے کتنے سچے خلوص سے، صدق دل سے

کر رہی تھی ۔ نازک نازک سی لڑکی ۔۔ اگرچہ اس سارے خلوص و خدمت میں اس کے اپنے والہانہ جذبے شامل تھے ۔ وہی محبت اور لگاؤ کروا رہا تھا جو سعدیہ بیگم سے ایک مقدس ماں کے رشتے سے بندھا تھا ۔ جلدی سے قالین پر اپنے قریب پڑی، فائل اور کتابیں میز پر رکھتے ہوئے اٹھے، تقدیس سعدیہ بیگم کو سہارا دے کر اٹھانا چاہتی تھی ۔ شہزاد نے اپنے مضبوط بازو کے سہارے سے والدہ کو پکڑ کر اٹھایا ۔ خود پیچھے ہو کر اپنے سہارے سے بٹھایا ۔ وہ بھی پلنگ کے کنارے پر بیٹھ گئے ۔ وہ سعدیہ بیگم کو اپنے سہارے سے بٹھائے تھے ۔ تقدیس نے بڑا گول تکیہ اور اس پر دو نرم تکیے ان کے پیچھے رکھ دیئے ۔ وہ اب بڑے آرام بڑے مضبوط سہاروں کے سہارے سے بیٹھی تھیں کہ شہزاد کا بازو اب بھی ان کے پیچھے سے گذر کر آہستگی سے کندھے پہ رکھا تھا ۔ شہزاد نے تقدیس کے دونوں نازک ہاتھوں سے پیالہ لے کر اپنی بڑی سی ہتھیلی پہ رکھ لیا ۔ تقدیس نے بالکل اُجلا، سفید بڑا سا رومال سعدیہ بیگم کے آگے گردن کے گرد لپیٹ کر سینے پہ پھیلا دیا ۔ اور شہزاد کی مدد سے ایک ایک چمچہ یخنی ان کو پلانے لگی ۔ آہستہ آہستہ یخنی ختم

ہوتی۔ پیچھے مڑکر شہزاد نے پیالہ میز پر بڑے میں رکھ دیا، اور تقدیس نے بڑی احتیاط سے سفید رومال کھول کر لپیٹ دیا۔ اسی سے ہونٹ صاف کیے۔ پیچھے سے بڑا گول تکیہ ہٹایا۔ اور شہزاد نے سعدیہ بیگم کو دونوں نرم تکیوں پر بڑی آہستگی سے لٹا دیا۔ اور ہاتھ سے بستر کی چادر درست کرتے ہوئے شکن ہٹائے، اور اپنے ہاتھ سے خوشبودار الائچی ان کے منہ میں ڈال دی۔ انہوں نے بڑی محبت سے دونوں بچوں کی طرف دیکھا۔ دل ہی دل میں دعائیں دے رہی تھیں، لب ہل رہے تھے۔ آواز نہیں تھی۔ بڑی نقاہت سے آنکھیں بند کر لیں۔ کمزوری اور غنودگی بہت محسوس کر رہی تھیں۔ یخنی کے ساتھ ہی دوا بھی دیدی گئی تھی۔ تقدیس نے ایپرن کی ڈوریاں کھول کر ایک طرف دیوار کے ساتھ مؤدب کھڑے ملازم کو پکڑا دیا۔ وہ میز پر سے خالی برتن بھی اٹھا کر، جھک کر سلام کرتا ہوا باہر چلا گیا۔

تقدیس لان کی سفید ڈھیلی ڈھیلی قمیص، سفید شلوار کے ساتھ ہلکا سا مہین سفید دوپٹہ گلے میں ڈالتی، فوزیہ بیگم کے قریب صوفے کے ساتھ کی نرم کرسی پہ آ بیٹھی۔ شہزاد خاموش

اس موتیا کی نازک، مہکتی کلی کو دیکھتے رہ گئے۔ وہ اُجلے اُجلے سفید کپڑوں میں موتیا کی کلی ہی تو لگ رہی تھی۔ اور کپڑوں پر لگی عطر کی خوشبو سے موتیا کی لپٹیں آ رہی تھیں اور شہزاد کو جیسے اپنی لپیٹ میں لے رہی تھیں۔

شبانہ آخری پرچہ دے کر کالج سے سیدھی والدہ کے کمرے میں آئی۔ ان کو پُرسکون سوتا پایا۔ ڈر کے مارے قریب نہ گئی کہ ڈسٹرب نہ ہو جائیں۔ دُور کھڑی دیکھتی رہی۔ آنکھوں میں آنسوؤں کو روکنے کی کوشش میں سر جھکائے خاموش کھڑی رہی۔ پھر چپکے سے آکر فوزیہ بیگم کے ساتھ ان کے پہلو میں صوفے پر آبیٹھی۔ انہوں نے لپٹا لیا۔ سینے سے لگا کر پیار کیا۔ شہزاد اور تقدیس بھی جلدی سے قریب آگئے، اور دائیں بائیں کھڑے ہو گئے۔ باری باری سب نے ہی پوچھا کہ پرچہ کیسا ہوا ہے۔ والدہ کی علالت، نقاہت، گرمی کی شدّت، پرچوں کی مصیبت، قباحت سے گھبرا کر شبانہ رونے لگی۔ پھر آج کا پرچہ بھی تو بہت خراب ہوا تھا۔ رات بھر سر میں درد رہا تھا۔ اور اب پرچے کے دوران نیند آتی رہی۔ کچھ پتہ ہی نہیں چل سکا کہ کیا سوال تھا اور کیا جواب لکھا تھا۔ فوزیہ بیگم نے بڑی محبّت

سے اس کو اپنی گود میں لٹا لیا کہ اب وہ اسی صوفے پر بیٹھی تھیں، جہاں تقدیس ان کو لٹا کر گئی تھی۔ شبانہ کے بالوں پہ ہاتھ پھیرتی رہیں۔ چہرے پہ ہاتھ پھیرتی رہیں، چومتی رہیں، پیار کرتی رہیں۔ اس کا سر اپنے سینے سے لگائے پیار سے سمجھاتی رہیں۔ تسلّی دیتی رہیں، ہمت بندھاتی رہیں۔

تقدیس بھی وہیں صوفے کے قریب قالین پر گھٹنوں کے بل بیٹھی تھی۔ شہزاد نے تھرموس میں سے ٹھنڈا مشروب لے کر شبانہ کو اپنے ہاتھ سے پلایا، اس کے آنسو پونچھے۔ سر پہ محبت سے ہاتھ پھیرنے لگے۔ اس کے بالوں پر پیار کیا۔ لیکن شبانہ بہت پریشان تھی، تقدیس کا ہاتھ پکڑے بس روئے جا رہی تھی۔ بہن کو یوں روتا دیکھ کر تقدیس بھی ضبط نہ کر سکی۔ اس کے بھی آنسو چھلکے پڑ رہے تھے۔ سسکیاں بلند ہوئیں تو فوزیہ بیگم جلدی سے ان دونوں کو مریضہ کی بے چینی کے خیال سے دوسرے کمرے میں لے آئیں، کیونکہ وہ سو رہی تھیں، یا دوائی کا اثر تھا۔ پھر ان کی نیند بھی بڑی جلدی کھل جاتی تھی۔ ہلکی سی آہٹ پر، شہزاد بھی آہستگی سے بڑی احتیاط سے باہر آ گئے۔ بوڑھی اماں بچوں کی کھلائی اور گھر کی پرانی نمک خوار، بڑی وفادار ملازمہ

سعدیہ بیگم کے پاس قالین پر بیٹھی دعائیں پڑھ رہی تھی۔ قرآنی آیات پڑھ پڑھ کر پھونک رہی تھی۔ خیر و برکت اور مالکن کی صحت کی دعائیں مانگ رہی تھی کہ ان کی بیماری کی وجہ سے گھر کی اداسی، ویرانی اور خاموشی دیکھی نہ جاتی تھی۔ جہاں ہر وقت شہزاد اور شبانہ کے قہقہے گونجتے تھے۔ تقدیس مسکراتی، اٹھلاتی پھرا کرتی تھی۔ اب سب کے روشن چہروں پہ ہوائیاں اُڑ رہی تھیں۔ گھر کی ساری رونقیں جیسے سمٹ کر چھپ گئی تھیں۔ شہزاد اماں کو سرگوشی میں کچھ ہدایات دے کر ساتھ کے کمرے میں فوزیہ بیگم کے پاس ہی آ گئے تھے۔ ادھر ادھر کی باتوں سے دونوں لڑکیوں کا دل بہلانے لگے۔

کچھ شہزاد کی دل لگی، کچھ فوزیہ بیگم کی محبّت بھری تسلّیاں دلاسے تھے جو شبانہ کو قدرے اطمینان ہوا۔ اس پر تقدیس بھی کچھ مطمئن نظر آنے لگی۔ چاہت جو بہت تھی۔ دونوں میں محبّت بھی تو بہت زیادہ تھی۔ ایک دوسرے کی تکلیف دیکھ ہی نہ سکتی تھیں۔ پھر سب نے بڑی خاموش بوجھل سی فضا۔ میں کھانے کے ہر طرح سے آراستہ و پیراستہ کمرے میں وسیع گول میز پر بڑی خاموش، بڑی بوجھل سی فضا میں دوپہر کا کھانا کھایا۔ سعدیہ بیگم کی خالی کرسی

دیکھ کر سب کا ہی لقمہ حلق میں اٹک جاتا۔ لیکن ہر کوئی اپنی اپنی جگہ برداشت کی کوشش میں رہا۔

"خالہ جانی! اتنی خاطر داریاں، تیمار داریاں دیکھ کر تو سچ آج ہمارا بھی یوں ہی بیمار پڑ جانے کو دل چاہنے لگا"۔ شہزاد نے طبیعتوں کا بوجھ کم کرنے کے لیے تقدیس کے حسین و معصوم چہرے کی طرف مسکراتے ہوئے دیکھ کر کہا۔ وہ دراصل تقدیس سے ہی مخاطب تھے کہ وہ شب و روز خالہ حضور کی بڑی خدمت کر رہی تھی۔ اپنے ہاتھ سے تیار کر کے کھانا کھلاتی، یخنی پلاتی۔ دودھ جوس، پانی خود لے کر آتی، اپنے سہارے سے بٹھا کر یا چمچے کی مدد سے پلاتی۔ دوا مقررہ اوقات پر دیتی۔ ان کے بال سنوارتی، ہاتھ منہ دھلاتی، لباس کا خیال کرتی۔ ان کی پسند کی خوشبو لگانا یاد رکھتی —— غرض ایک ماہر تربیت یافتہ نرس سے بھی زیادہ مہارت، فنکاری سے تیمار داری کرتی تھی۔ جس میں اپنی محبت، خلوص اور سچے کھرے جذبوں کی آمیزش بھی تھی۔ تقدیس نے ان کی بات سُنی، اشارہ سمجھتی تھی، نگاہیں جھکا لیں۔ شرما کے مُنہ پھیر لیا۔ بڑے ناز سے، بڑے فطری انداز سے، دراز پلکوں کو بار بار جھپکتے ہوئے، سرخ سرخ رنگوں کی بہار سے تقدیس کے حسین

چہرے پر بہار کا نکھار آگیا اور شہزاد دل تھام کر رہ گئے اس پُر لطف ادا پر۔ شبانہ اپنی ہی فکروں میں خاموش سر جھکائے بیٹھی تھی۔ یہی فکر کھائے جا رہا تھا، پرچہ خراب ہو گیا ہے، فیل ہو جاؤں بدنامی ہو گی، سہیلیوں میں شرمندگی ہو گی، پھر ہمجولیوں سے پیچھے بھی تو رہ جاؤں گی۔

"نہ۔ نہ۔ بیٹے۔ ایسی بُری باتیں مُنہ سے نہیں نکالا کرتے۔ خدا نہ کرے ۔ خدا نہ کرے کہ دشمن بھی بیمار ہوں۔ اللہ پاک اپنے حبیبؐ کے صدقے میں سب کو صحت و مسرت و زندگی دے۔ ہم سب خوشی خوشی تم سب کی خوشیاں دیکھیں۔ اور خوشیاں تم سب کے قدم چومیں۔ ہر آن، ہر گھڑی"۔ فوزیہ بیگم بڑی سنجیدگی سے شہزاد کو سمجھا رہی تھیں۔ تینوں بچوں کو دُعائیں دے رہی تھیں۔ اپنی آپا حضور کی صحت و عافیت سے سلامتی کی دُعائیں مانگ رہی تھیں۔ وہ تو شہزاد کی اس مذاق کی بات سے ہی بے چین ہو گئی تھیں۔ خدانخواستہ بیماری تو بعد کی بات تھی۔

"میں تو کہتی ہوں۔ ساری دنیا میں کوئی بیمار ہی نہ ہو۔ امّی حضور کی بیماری سے اندازہ ہوا ہے کہ اپنے عزیز بیمار ہوں تو کتنا دکھ ہوتا ہے۔ کیسے لمحہ لمحہ جان پہ بنی رہتی ہے۔ اللہ میاں نے

میرے اچھے اچھے، پیارے اللہ میاں — میری امّی حضور کو صحت دیدے (آمین)" شبانہ نے اپنی بھیگی بھیگی پلکیں اٹھاتے ہوئے کہا۔ لہجے میں آنسوؤں کی نمی اور بڑی بڑی خوبصورت آنکھوں میں آنسو تیر رہے تھے۔ وہ بات رُک رُک کر کر رہی تھی۔ اُس نے شہزاد کی بات کے جواب میں بھائی کی طرف کچھ اس انداز سے دیکھا، جیسے کہہ رہی ہو ؎

ساری دنیا کے مریضوں کو شفا دے یا رب
آج معلوم ہوا ہے کہ علالت کیا ہے

اس کی آنکھوں کے تیرتے آنسوؤں میں بھائی کے لیے پیار اور ایک معصوم بہن کی دعائیں تھیں۔ شہزاد کو اپنی پیاری بہن پر ڈھیروں پیار آگیا۔ گلے سے لگالیا۔

"نہ — نہ — میری منی سی بہن روتے نہیں!" بہن کو گلے لگاکر پیار کرتے ہوئے بولے۔ "میں تو ایسے ہی کہہ رہا تھا!"

شبانہ مطمئن ہوکر پانی پینے لگی۔

"اور — آپ کا کیا خیال ہے جناب عالی!" شہزاد نے سفید چمکدار آبدار چمچ سے تقدیس کے سامنے پڑی پلیٹ بجاتے ہوئے پوچھا۔ شہزاد، شبانہ اور تقدیس کے درمیان بیٹھے تھے۔ ان کے بائیں

ہاتھ بیٹھی تقدیس مسکرادی، کہ مسکرانا ان کی عادت تھی۔ ایک قدرتی مسکراہٹ، ایک بڑا دل آویز تبسم کا تبسّم ہر وقت، ہر گھڑی، اس معصوم دلکش چہرے پر کھیلتا رہتا۔ شہزاد، فوزیہ بیگم اور شبانہ کی رائے سننے کے بعد تقدیس کا خیال بھی جاننا چاہتے تھے۔

"میری اچھی خالہ جان! آپ کو اور میری پیاری پیاری بہن کو ہمارا بیمار پڑنا پسند نہیں — لیکن یہ محترمہ — شبانہ کی آپی صاحبہ — آپ کی صاحبزادی صاحبہ — کی مرضی ہے کہ ہم بیمار پڑ جائیں — اور یہ خدمت کرنے کے بجائے ہمیں ہسپتال میں چھوڑ آئیں"۔ شہزاد نے مصنوعی سنجیدگی طاری کرتے ہوئے افسردگی سے کہا — ہنسی روکنے کے لیے ہونٹ دانتوں میں دبانے کی کوشش کر رہے تھے اور تقدیس کے کندھے پہ ہاتھ رکھتے ہوئے اشارہ کر رہے تھے اور ساتھ اس کی پلیٹ میں سے چمچ بھر بھر کر چاول بھی کھا رہے تھے۔ یہ ان کی بچپن کی عادت، تقدیس کے ساتھ کی کرسی پہ بیٹھنا اور اس کی پلیٹ میں سے کھانا، چھوٹی تھی تو وہ اس بات پر چڑتی اور رونے لگ جاتی — خالہ حضور سے شکایت کرتی، روٹھ جاتی،

لیکن آہستہ آہستہ وقت کے ساتھ ساتھ اس کی عادت سی پڑ گئی - اور اب تو بڑی فراخدلی سے مسکرا کر رہ جاتی -

"کب ــ ایسے ہی "

تقدیس نے گھبراہٹ میں حیرت زدہ چہرہ اٹھا کر شہزاد کی طرف دیکھا - اس بے ساختہ انداز ــ گھبراہٹ ــ بدحواسی پہ شہزاد نے کئی دن کے بعد ایک زور دار قہقہہ لگایا ــ زندگی سے بھرپور ــ بڑا جاندار قہقہہ ــ شوخیوں سے جڑ آنکھوں میں شرارت کے ساتھ پیار محبت بھی خوب بھرا تھا - انہیں تقدیس کے حیران، انجان سے چہرے پہ کتنا پیار آیا - نہال ہو گئے ــ نثار ہو گئے ــ اس حسن کی معصوم سے دیوی پہ ــ شہزاد اپنی شرارت اور شوخی کے موڈ میں تھے - سارے گھر کی فضاء پہ جو سکوت و جمود چھا گیا تھا - ان بادلوں کو گھرے جھکے بادلوں کو اپنی شرارت اور خوش مزاجی کے سورج سے بھگانا چاہتے تھے - بھائی کی زندہ دلی اور شوخی دیکھ کر شبانہ کچھ سنبھل گئی ــ بڑا سہارا ملا تھا اس کو -

تقدیس کے دل پہ سے بھی جیسے اداسیوں کا غبار دھل سا گیا تھا - فوزیہ بیگم بھی مسکرا رہی تھیں - وہ بچوں کی طرف

سے ذرا مطمئن ہو کر بہن کے پاس جانے کے لیے اُٹھ گئیں - دو بج رہے تھے - بڑی بی کو بھی کھانا کھلانا تھا - ورنہ تو شہزاد کی باتوں میں، شرارتوں میں وقت گذرنے کا پتہ ہی نہ چلتا - اور شہزاد وہیں بیٹھے ٹھنڈے برف سے آم فریزر میں سے نکال کر اپنے ہاتھ سے کاٹ کر شبانہ اور تقدیس کو کھلاتے رہے، خود بھی کھاتے رہے -

آج شبانہ کا امتحان ختم ہوا تھا -

کئی دن کی کوفت، محنت، لگن، تھکن اور پریشانی سے اس کا سرخ و سفید صحت مند چہرہ اترا ہوا تھا - رنگت زرد اور آنکھوں کے نیچے حلقے سے پڑ گئے تھے - بڑی کمزور لگ رہی تھی - تقدیس بھی اتنے دنوں کی شب بیداری اور تیمارداری کی وجہ سے نڈھال، تھکی تھکی سی نظر آ رہی تھی - نازوں کے پلے ان لوگوں کو بھلا اتنی محنت کی کہاں عادت تھی - سینکڑوں نوکر خدمت گار، ملازم ہر وقت حکم کے منتظر، اشارے پہ بجلی کے بٹن کی طرح تابعدار — اب اپنی مرضی سے سعادت مندی سے اپنی پیاری خالہ کی خدمت کرتی - ان کے سارے کام سنوارتی — تو ظاہر ہے — سہل پسند — عیش و آرام کے عادی وجود نے

تھکنا ہی تھا۔ اس لیے شہزاد ان دونوں کی دل داریاں کرتے۔ لطیفے سناتے، قصے سناتے، ہنساتے بہلاتے رہے۔ پھر دونوں کو ساتھ لیے شبانہ کے کمرے میں آ گئے۔ تھکے ہوئے وہ بھی بہت تھے۔ کئی راتوں اور دنوں کی بے آرامی اور بے چینی اٹھا رہے تھے۔ سونے کے بہانے سے جمائیاں لے رہے تھے۔ نیند واقعی ان کو آ بھی رہی تھی۔ کئی راتوں سے نیند بھر کے سوئے بھی تو نہیں تھے۔

"بھائی جان آپ کو بہت نیند آ رہی ہے۔ آپ بھی سو جائیے!" شبانہ نے بھائی کی طرف دیکھتے ہوئے اپنے بستر کے نرم تکیے پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بھائی کو بستر پہ لیٹنے کی پیش کش کی۔

"تم دونوں بھی آرام کرو۔ سو جاؤ تو میں بھی بے فکر ہو کر کچھ دیر میں اپنی نیند پوری کر لوں، کیونکہ آج امی حضور کی طبیعت پہلے سے بہت بہتر ہے۔ ڈاکٹر صاحب کہہ رہے تھے کہ جلدی ٹھیک ہو جائیں گی۔ جتنی زیادہ نیند لیں گی ان کی تندرستی کی طرف اچھا قدم ہو گا۔ شہزاد پلنگ کے قریب ہی نیچے قالین پر لیٹ گئے۔ دونوں ہاتھ انگلیوں میں الجھا کر سر کے نیچے رکھ لیے انہیں اچھا نہیں لگتا تھا کہ وہ تو پلنگ پہ سو جائیں اور شبانہ اور

تقدیس قالین پر ۔ اور شبانہ کو یہ اچھا نہیں لگا کہ بھائی تکیے کے بغیر قالین پر ۔ جلدی سے دونوں نرم تکیے اٹھا کر بڑی محبّت سے دونوں ہاتھوں سے بھائی کا سر اونچا کر کے تکیوں پر رکھ دیا، اور وہیں قالین پر ہی شبانہ اور تقدیس بھی گدیاں سر کے نیچے رکھ کر لیٹ گئیں ۔ کئی راتوں کی بیداری اور بیقراری کی وجہ سے تھکی ہاری شبانہ کو سکون ملا تو جلدی سو گئی ۔

اپنی پیاری پیاری ۔ بڑی لاڈلی، نازوں پلی شبانہ، اپنی بہن کے بکھرے بالوں کو سنوارتے، چومتے ہوئے شہزاد تقدیس کو اپنے بازو کے حلقے میں لیئے چپکے سے باہر آ گئے ۔

"کتنی پیاری ۔ کتنی مقدس ہو تم تقدیس" تقدیس کو دونوں باہوں میں سمیٹتے ہوتے سینے سے لگا لیا ۔ شبانہ کے کمرے سے باہر اپنے کمرے کی طرف جاتے ہوئے دونوں گیلری میں کھڑے تھے، تقدیس نے گھبرا کر ڈری ڈری نظروں سے ادھر ادھر دیکھا ۔ کچھ کہنا چاہا، ہونٹ کھلے ۔ ادھ کھلے گلاب کی دو نازک پتیوں کی طرح ادھ کھلے ہونٹ ۔ شہزاد نے اپنے ہی تشکّر کے جذبوں سے مجبور ہو کر، محبّت سے سرشار ہو کر، بڑی عقیدت، بڑی محبّت سے اپنی محبّت کے حضور ۔ نذرانۂ محبّت، ہدیۂ الفت بڑے بھرپور انداز میں پیش کر دیا ۔ کہ تقدیس کچھ بھی نہ کہہ

سکی۔ حسبِ معمول گھبرائی شرمائی — پلکیں جھپکتی — شہزاد کے سینے پہ سر رکھے ان کے ساتھ لگی رہی۔

پھر بڑی لاپرواہی سے ہنستے مسکراتے شہزاد اس کو اپنی باہوں کے سہارے میں لیئے سعدیہ بیگم کے کمرے میں آئے، دیکھا تو وہ پُرسکون سو رہی تھیں۔ ان کے سکون سے سکون پا کر فوزیہ بیگم بھی صوفے پہ کروٹ کے بل گدیوں پہ سر رکھے ہوتے محوِ خواب تھیں۔ بوڑھی ملازمہ اماں بھی وہیں قالین پر بے سدھ پڑی تھی۔ اس صورتِ حال سے شہزاد کو بڑا اطمینان ملا۔ تقدیس کو ساتھ لیئے واپس آ گئے۔

"کچھ دیر ہم دونوں بھی آرام کر لیں"۔

تقدیس نے اپنے کمرے کی طرف جانے کا ارادہ کیا تو شہزاد ان کو اپنے کمرے میں ہی لے آئے۔ ایک آرام کرسی پر نیم دراز ہو گئے۔ قریب کھڑی تقدیس کو بھی ہاتھ سے پکڑ کر اپنے ساتھ کرسی کے نرم بازو پہ بٹھا لیا۔ بس نہیں چل رہا تھا کہ اپنے سینے میں چھپا لیتے، اپنے دل میں بسا لیتے۔ اپنی آنکھوں پہ بٹھا لیتے۔ اس کے دونوں نرم نرم ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیتے ہوئے اپنی آنکھوں سے لگا لیا۔ ہونٹوں سے لگاتے ہوئے کہا۔

"اگر میں بھی بیمار پڑ جاؤں، تو کیا میری بھی ایسی ہی خدمت کرو گی — ایسی تیمارداری، نازبرداری ہو سکتی ہے؟" وہ تقدیس کے کندھے پہ سر رکھے تھے۔

"ایسی بات کیوں کہتے ہیں" تقدیس نے اپنا نازک ہاتھ ان کے بھرے بھرے نرم ہونٹوں پہ رکھتے ہوئے بڑی نرمی سے ذرا خفگی سے شکایت کے انداز میں کہا۔

اور شہزاد اس انداز پر، اس لہجے پر، اس آواز پر صدقے واری ہو گئے — دو تین بار اپنے ہاتھ میں دبا کر تقدیس کا خوبصورت ہاتھ — بڑی عقیدت سے آنکھوں سے لگایا۔ کئی بار — بار بار چوم لیا۔ بڑی محبت سے، بڑی عقیدت سے — کہ تقدیس تو تھی ہی پوجا کے قابل اور شہزاد اس کے پجاری — پجاری ہونے پہ بھی بڑا فخر، بڑا غرور، بڑا ناز تھا۔ ناز پرور تقدیس کے ہاتھوں کی نرمی — اس کے نازک بڑے حسین وجود کی قربت کی گرمی سے بے خودی میں — خوابناک بڑی مسحور — سحر آلود فضا میں تقدیس کے شانے پہ سر رکھے خوابوں کی دنیا میں کھو گئے۔ تھکے ہوئے تو تھے ہی ذرا سا سکون ملا تو فوراً سو گئے۔ تقدیس کی آنکھیں نیند سے بھری پڑی تھیں۔ غنودگی اور بے آرامی سے سر

بوجھل ہو رہا تھا - لیکن شہزاد کی خاطر بیٹھی رہی - آہستہ آہستہ ان کے بالوں پہ ہاتھ پھیرتی رہی - ان کی پیشانی پہ بال سنوارتی رہی - ان کی زندہ دلی کی باتوں، شرارتوں، ان کی محبتوں کے نشے میں ڈوبی، ان کی قربتوں کے سحر میں سحر زدہ سی نیم خوابیدہ سی جھکی ___ ان کی مسکراہٹوں ___ ان کے حسین لبوں پہ نیند میں بھی شرارتی تبسم کھیل رہا تھا - اس تبسم کو، اس مسکراہٹ کو اپنے دامن میں سمیٹ لیا ___ اپنے دل میں چھپا لیا، محفوظ کر لیا - بڑے محبت بھرے انداز میں، شہزاد کا سر اب ڈھلک کر تقدیس کے شانے پر سے گود میں پڑا تھا -

ایک قیمتی خزانے کی طرح، ایک انمول گنجینہ کی طرح، متاعِ حیات عزیز کی طرح اس خوبصورت سر کو گود میں رکھے ان کی کرسی کی پشت پر سر رکھے وہ بھی نیند کی آغوش میں چلی گئی - کافی دیر کی نیند کے بعد تقدیس نے سرخ سرخ گلابی گلابی خوبصورت ڈوروں والی نشیلی آنکھیں کھولیں ___ تو ___ شہزاد بھی جاگ رہے تھے -

تقدیس نے شرماتے ہوئے خواہ مخواہ ہی آنکھیں ملتے ہوئے بڑے حسین، بڑے ہی دلربا انداز میں ادھر ادھر دیکھا -

"اوہ — میں تو سمجھی آپ سو رہے ہیں" اور دونوں ہاتھوں میں اپنا چہرہ چھپا لیا ۔ اس سے بات کرنا مشکل ہو رہی تھی ۔ کیونکہ شہزاد — دوران خواب میں بھی تقدیس کے اظہارِ محبت عزت افزائی کے لیے، خوشی سے، مسرت سے جھوم رہے تھے ۔ سوتے میں بھی ان کی ساری حسیں بیدار تھیں ۔ وہ تقدیس کے لمس کو، تقدیس کی خوشبو کو تو بے ہوشی میں بھی پہچانتے تھے ۔ یہ تو نیند تھی ۔

؎ خوشی سے مر نہ جاتے اگر اعتبار ہوتا

والہانہ محبت میں دیوانہ وار خوش تھے ۔

اور چہرہ — امیدوں کے چراغوں کی طرح روشن تھا ۔ دمک رہا تھا — چمک رہا تھا ۔

"تقدیس — تمہاری خوشبو، تمہارے سائے، تمہاری رفاقتیں تو مجھے مر کے بھی زندہ کر دیں گے — اب تو میں سو رہا تھا" وہ تقدیس کے سرخ چہرے کو نرم ہاتھوں میں چھپا دیکھتے ہوئے کہہ رہے تھے ۔ انہیں یہ انداز بھی بہت پیارا لگ رہا تھا ۔ تقدیس جلدی سے اٹھی، اور پردہ ہٹا کر تیزی سے باہر چلی گئی ۔ اور شہزاد وہیں خاموش، مدہوش سے، مست سے آنکھیں بند کیے

پڑ رہے ۔ مسکراتے رہے ۔ جھومتے گاتے، گنگناتے رہے ۔ بڑی مزید، لطیف و پُر لطف ، لذّت کا احساس ہو رہا تھا ۔ مزہ آرہا تھا ۔ نشہ چھا رہا تھا اور ایسے نشہ آور سی فضا میں پانیوں پر تیرتی کشتی کی طرح چلتے رہے ۔۔ پھسلتے رہے ، سنبھلتے رہے ، ڈوبتے ، کبھی ابھرتے رہے ۔

تقدیس جھکی ہوئی تھی ۔ سعدیہ بیگم کو دوا پلا رہی تھی ۔ سب ایسے سوئے تھے کہ ان کی دوا بھی ایک گھنٹہ لیٹ ہو گئی ۔ شرمندہ ہو رہی تھی ۔ اپنے فرض سے غفلت پر معذرت کر رہی تھی ۔ خالہ حضور کے حضور، فارغ ہو کر پلٹی تو شہزاد کی ہنستی مسکراتی ، شوخیاں برساتی ، بڑی میٹھی میٹھی ، پیار بھری نظر دل سے نظریں چراتی سعدیہ بیگم کے قریب ہی کرسی پہ بیٹھ گئی کہ شہزاد بھی وہیں آگئے تھے ۔۔ ان کے قریب ۔۔ اپنی امّی کے قریب، تقدیس نے جلدی سے اٹھتے ہوئے مسکرا کر کرسی شہزاد کو دینا چاہی، تو شہزاد نے ان کے کندھے پہ ہاتھ رکھتے ہوئے دباؤ ڈال کر وہیں بٹھا دیا ۔۔ اور خود سعدیہ بیگم کے پلنگ پر بیٹھ گئے ۔ وہ بیدار تھیں ۔ خاصی بہتر نظر آرہی تھیں ۔ ان کی طبیعت اب کافی ٹھیک تھی ۔ وہ بڑی محبت سے بیٹے کی کمر

پہ ہاتھ پھیر رہی تھیں۔ ایک ہاتھ شہزاد اپنے ہاتھوں میں لیے سہلا رہے تھے، دبا رہے تھے۔ سعدیہ بیگم مسکراتے ہوئے بولیں۔

"بیٹے ۔۔ تم سب کی دعاؤں سے، محنتوں اور خدمت گذاریوں سعادت مندیوں کا نتیجہ ہے کہ آج میں بہت ٹھیک ہوں۔"

شہزاد نے ان کی طبیعت کے بارے میں پوچھا تھا۔ وہ بڑے بشاش سے اپنی امّی کو رو بصحت دیکھ کر انہیں باتوں میں لگا رہے تھے۔ اکیلے اور خاموش پڑے پڑے وہ بھی تو گھبرا گئی تھیں۔ اس طرح طبیعت اور ہلکی اور بہتر ہونے کا امکان تھا۔

"امّی حضور! آپ کے پیار، دلار کی حقدار تو صرف تقدیس ہیں ۔۔ کہ میں اور شبانہ تو دونوں کالج چلے جاتے تھے۔ کہ میرے کچھ بڑے ضروری لیکچرز اور شبانہ کے سالانہ امتحان ہو رہے ہیں۔ یہ ہی دن رات آپ کی خدمت کرتی رہی۔" شہزاد نے تقدیس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"میری بڑی پیاری ۔۔۔ بڑی اچھی بیٹی جو ہوئی۔" سعدیہ بیگم نے بڑی محبّت سے، بڑی شفقت سے تقدیس کے نرم ہاتھ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے ساری دنیا کی محبتیں آنکھوں میں بھرے اس پر نچھاور کرتے ہوئے کہا۔ وہ کرسی کے بازو پہ ہاتھ رکھے پلنگ

کے قریب ہی بیٹھی تھی۔

"اچھا — یہ محترمہ — آپ کی بیٹی ہیں؟" شہزاد نے بڑی شرارت سے بڑے معنی خیز انداز میں حیرانی کا لہجہ بناتے ہوئے پوچھا۔

"میں — تو — سمجھا تھا!" وہ دانتوں میں انگلی دبائے حیران حیران نظروں سے کبھی سعدیہ بیگم کو اور کبھی تقدیس کو دیکھ رہے تھے۔

"میں — تو — میں تو — سمجھا تھا"

"کیا سمجھے تھے" سعدیہ بیگم نے پوچھا۔ وہ ہنس رہی تھیں اور تقدیس ان کے پوچھنے کے انداز اور مصنوعی سنجیدگی اور بناوٹی حیرانی ادھر اور دیکھنے اور پوچھنے کے انداز پہ اپنی ہنسی ضبط نہ کر سکی۔

"آپ کی بہن کی لڑکی — ہماری کزن" شہزاد نے تقدیس کو اپنے پہلو میں سعدیہ بیگم کے پلنگ پر بٹھا لیا۔ کرسی پر سے کھینچ کر ہاتھ پکڑ کر اٹھا لیا تھا اور ہنس کر بولے۔

"اگر واقعی بیٹی ہے آپ کی — تو اپنے لاڈلے بیٹے کے پاس بٹھائیے، اس کی تابعداری کروائیے" شہزاد تقدیس کے گلے میں بازو ڈالے، بچوں کی طرح جھول رہے تھے۔ جیسے چھوٹے بچے، بچپن میں کوئی کھیل کھیلنے سے پہلے جھوم جھوم کر ساتھی بننے کے لیے

گلے میں بانہیں ڈالے ہوتے ہیں۔ تقدیس بھی اس مذاق، شرارت میں مزہ لے رہی تھیں۔ بڑا لطف آرہا تھا۔

فوزیہ بیگم نے شہزاد کی آواز سن کر آنکھیں کھول دیں۔ شہزاد کی نظر پڑی تو جلدی اٹھ کر خالہ کے ساتھ جا لیٹے، وہیں صوفے پر، لمبے تڑنگے، اچھے صحت مند شہزاد اتنے بڑے ہو کر بھی خالہ سے یوں لپٹے تھے، جیسے بہت چھوٹے سے ہوں۔ جس طرح بچپن میں گود میں لے کر، اپنے ساتھ بازو پہ لٹا کر۔ ان کے بالوں کو سہلا کر، لوریاں گایا کرتی تھیں، کہانیاں سنایا کرتی تھیں اور یہ خود مُنّے سے شہزاد خالہ کے سینے میں مُنہ چھپا کر نیند کی آغوش میں کھو جاتے۔

"خالہ جانی — آج ایک نیا انکشاف ہوا ہے، سُنا آپ نے بھی؟ ہماری امّی حضور کی بیٹی دیکھی بڑی اچھی، بڑی پیاری، پیاری سی بیٹی۔" وہ خالہ کے گلے میں بانہیں ڈالتے ہوئے کہہ رہے تھے۔ وہ ہنس ہنس کر مذاق اُڑا رہے تھے۔ اس صداقت کو جھٹلانے کی خاطر تقدیس کو چڑا رہے تھے۔ پھر خالہ کو چھوڑ، جلدی سے اُٹھ کر گئے، اور سعدیہ بیگم کے پلنگ پر سے تقدیس کو کھینچ لائے۔ بازو پکڑے ہوئے تھے۔ اور فوزیہ بیگم ان کی ہر ہر حرکت پر، ہر ہر بات پر دل و جان سے فدا — بڑی خوش باش ہنس رہی تھی۔ سعدیہ بیگم بھی

نظروں ہی نظروں میں بیٹے پر اور ساتھ ہی کھڑی تقدیس پر قربان جا رہی تھیں۔ دل و جان سے واری جا رہی تھیں۔

"اس میں شک کی کیا گنجائش ہے — بیٹے۔" فوزیہ بیگم نے اٹھ کر بیٹھتے ہوئے کہا۔ شہزاد خالہ کے گھٹنوں پہ دونوں ہاتھ رکھے، ان کے پاؤں کے قریب قالین پر گھٹنوں کے بل بیٹھ گئے۔ تقدیس ان کے قریب ہی کھڑی تھیں۔

"شک ہی کیا — شکوک و شبہات ہیں۔"

"میرا تو خیال تھا — کہ —" شہزاد قہقہہ لگاتے ہوئے بولے۔ اور شرارت میں شرارتی نظروں سے سر اٹھا کر تقدیس کی طرف دیکھ رہے تھے۔ جان بوجھ کر بات پوری نہ کی تھی۔

"بس جی — ہم تو مارے گئے غلط فہمی میں ہی۔" اپنے ماتھے پہ ہاتھ مارتے ہوئے بولے۔ ہنسی آنکھوں سے ہونٹوں سے شرارتی چہرے سے پھوٹی پڑ رہی تھی۔

سعدیہ اور فوزیہ بیگم دونوں بہنیں دل ہی دل میں انکی شرارتوں اور دلچسپی — تقدیس میں دلچسپی لینے پر بڑی خوش ہو رہی تھیں۔ اور مسرت و محبت بھری نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھ رہی تھیں۔ انہیں یہ معلوم ہی نہیں تھا کہ معاملہ کہاں تک پہنچ

چکا ہے۔ نہ صرف دلچسپی۔ یہاں تو وہ دونوں ایک دوسرے کو پلکوں میں چھپائے، دلوں میں بسائے ہونٹوں پہ سجائے تھے۔ اب تو دونوں ایک دوسرے کے سائے تھے۔

"شریر" فوزیہ بیگم نے شہزاد کے سر پہ محبت سے تھپڑ لگاتے ہوئے ہنس کر کہا۔ "تم میری بیٹی کو چڑاتے، ستاتے ہو۔ دیکھنا تمہاری بیٹی کو کیسا تنگ کروں گی" وہ بھی بڑی خوشدلی سے ہنس رہی تھیں۔

فوزیہ بیگم اور شہزاد میں دوستانہ مراسم تھے۔

ادب لحاظ کے ساتھ ساتھ برابری اور ہم عمری کا ہنسی مذاق، چھیڑ چھاڑ بھی ہو جاتی تھی۔ وہ سُرخ و سفید، صحت مند، مگر دبلی پتلی سی، بڑی خوبصورت، بڑی سمارٹ تھیں۔ آسائشوں بھری زندگی کی وجہ سے بالکل جوان لگتی تھیں۔ اجنبی۔ ناواقف لوگ تو عموماً تقدیس کی بڑی بہن ہی سمجھتے تھے۔ اور سعدیہ بیگم کی بڑی بیٹی۔

"لو۔ اور سنو! میری بیٹی کو۔ میری بیٹی کو۔ آپ ستائیں گی۔ تنگ کریں گی۔ میری معصوم سی خالہ جانی؟" شہزاد نے زور سے تالی بجاتے ہوئے قہقہہ لگایا۔

"آپ۔ تو۔ میری نورِ نظر۔ میری لختِ جگر۔ میری ہی کیا،

اپنی نورچشمی کو ——— لبریز چشم ——— آنکھوں پہ بٹھائیں گی ۔ بلکہ لاڈوں میں سر پہ چڑھائیں گی ۔ آپ کے شہزاد خان کی بیٹی تو ——— آنکھوں کا تارا ہو گی ——— دل کا سہارا ہو گی ——— خالہ جان آپ کا ہی نہیں ہم سب کا خوشیوں کا گہوارا ہو گی ——— سب کا ۔" انہوں نے ہاتھ گھما کر سعدیہ بیگم ——— فوزیہ بیگم کی طرف سے ہوتے ہوتے تقدیس کی طرف اشارہ کیا ۔

"کیوں ——— جی ——— ٹھیک ہے نا ۔" انہوں نے قریب کھڑی تقدیس کا ہاتھ پکڑ کر اٹھنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا ۔ وہ کھڑے ہو کر تقدیس کا چہرہ پکڑے اپنی طرف کرتے ہوئے بڑے خوبصورت انداز میں پوچھ رہے تھے ۔

دونوں بہنیں تو جھوم جھوم اٹھیں ۔ شہزاد کے اتنے خوبصورت بڑے لطیف ، معنی خیز اشارے پر ——— وقت اور موقع نہیں تھا ۔ ورنہ خوشی کے مارے دونوں زور زور سے گلے لپٹ جاتیں ۔ وہ صرف اشارے پر ہی نہال و نثار ہو رہی تھیں ۔ خوشی ضبط کرنا مشکل ہو رہا تھا ۔ یہ جان کر نہ جانے کیا ہوتا کہ وہ دونوں تو یک جان دو قالب ہیں ——— تقدیس شہزاد کی زندگی اور شہزاد تقدیس کی روح ۔

"امی حضور ! ذرا پوچھئے تو اپنی بیٹی صاحبہ سے ۔" شہزاد نے

سعدیہ بیگم سے بھی کہا ۔ وہ تقدیس کا رُخ اب ان کی طرف موڑے کھڑے تھے ۔ اور بڑا خوبصورت قہقہہ لگاتے ہوئے تقدیس کو دونوں شانوں سے پکڑے تھوڑا سا جھکے ہوئے تھے ۔

شبانہ بڑی دیر تک سونے کے بعد جاگی تو چاروں طرف اندھیرا پھیلا تھا ۔ ایکدم چونک کر اُٹھ بیٹھی ۔ آنکھیں ملتی جلدی جلدی امّی کے کمرے میں پہنچی تو یہاں تو اور ہی سماں تھا ۔ شہزاد کے قہقہے گونج رہے تھے ۔ امّی اور خالہ بڑی بشاش تھیں ۔ ہنس رہی تھیں ۔ تقدیس کچھ شرمائی کچھ گھبرائی مسکرا رہی تھی ۔

"میری بچی ۔" سعدیہ بیگم نے اس کو دیکھتے ہی بازو پھیلا دیئے ۔ اس وقت سے کئی بار شبانہ کے لیے پوچھ چکی تھی ، اور یہی ہدایت کرتی رہی تھیں کہ "سونے دو تھکی ہوئی ہے ۔" "امتحانوں کا بوجھ شکر ہے اترا ہے ۔" وہ آج بڑی پُرسکون نظر آ رہی تھیں ۔

"امّی جانی ! ــــ میری امّی حضور ۔" شبانہ یہاں کے ماحول سے بے خبر اپنی ہی دُھن میں دوڑ کر ماں سے لپٹ گئیں ۔ اور ان کے سینے پہ سر رکھے رونے لگی ــــ کمرے میں داخل ہوتے ہی اس نے اپنی امّی کو کھلی آنکھوں ــــ اور پھیلی باہوں کے ساتھ دیکھا جو اس کے لیے ہی تھی ــــ تو سب کچھ بھول بھال کر ان سے چمٹ ہی تو گئی ۔

کئی دن کی پریشانیوں کے بعد یہ سنہری موقع ملا تھا۔

"روتے نہیں — بیٹی"۔ اب تو میں ٹھیک ہوں — دیکھو تو سہی میں پہلے سے کتنی بہتر ہوں"۔ سعدیہ بیگم اس کی پیشانی چومتے ہوئے اس کے آنسو پونچھتے ہوتے تمام تر محبت سے بڑی شفقت سے ماماتا بھرم نرم و ملائم لہجے میں بولیں۔ پھر پرچوں کا پوچھا — تو اور بھی غضب ہو گیا۔ شبانہ تو امیّ کا سہارا پا کر اور بھی رونے لگیں۔ اور رفتار رفتہ رفتہ تیز ہو رہی تھی۔

"میرا پرچہ — آج — بہت خراب ہوا ہے"۔ روتے روتے رک رک کر بڑی مشکل سے آنسوؤں بھری آنکھیں بند کئے وہ بولی۔

"رونے کی اس میں کوئی بات نہیں — اٹھو میری جان — میری چندا"۔ سعدیہ بیگم شبانہ کی بھیگی آنکھوں کو صاف کر رہی تھیں۔ بار بار پیار کر رہی تھیں — کمر پہ، سر پہ ہاتھ پھیر رہی تھیں اور پھر شہزاد سے کہا۔

"بیٹے — بہن کا امتحان ختم ہوا۔ کئی دن سے کتابوں میں لگی تھی۔ کہیں گھما پھرا لاؤ — کچھ تفریح ہو جائے گی — دماغ پر سے بوجھ اُتر سے گا"۔

"اچھا جی — امی حضور! یوں کرتے ہیں کہ جہاں آج ان کا پرچہ

پڑتال کے لیے گیا ہے۔ وہیں پیچھے چلے جاتے ہیں۔ سو، پچاس دے کر نیا پرچہ کروالیں گے یا زائد نمبر لگوالیں گے"۔ شہزاد نے بڑی سنجیدگی طاری کرتے ہوئے، بڑی سوچ بچار کے انداز میں تجویز پیش کی۔

"نہ ــــ نہ ــــ بیٹے۔ ایسی بے ایمانی کی بات تو سوچا بھی نہیں کرتے۔ ناجائز ذرائع اور دوسروں کی حق تلفی سے تو اللہ پاک بہت ناراض ہوتے ہیں"۔ سعدیہ بیگم بڑی سنجیدگی اور بڑے وقار سے آہستہ آہستہ کہہ رہی تھیں۔ انہیں شہزاد کی بات اچھی نہ لگی تھی۔

" اپنی بہن کی خاطر ــــ میں کہہ دوں گا کہ جناب پروفیسر صاحب بڑی مجبوری ہے۔ ہماری لڑکی کی منگنی ایسے گھرانے میں ہوئی ہے کہ جہاں سب پڑھے لکھے ہیں اور لڑکا بڑا افسر ہے ــــ سی ایس پی ہے اور لڑکی کا ایف اے پاس ہونا بہت ضروری ہے ورنہ گڑبڑ ہو جائے گی۔ معاملہ خراب ہونے کا خطرہ ہے"۔ شہزاد جانے کے لیے فوری تیار ہو گئے۔

"چلو اٹھو لڑکی"۔ وہ شبانہ کا بازو پکڑ کر اٹھانے لگے۔

" امی جان ــــ امی حضور! دیکھیے بھائی جان کیسی باتیں

کر رہے ہیں۔" شبانہ رونا بھول کر فوری اٹھ بیٹھی اور بھائی کی شکایت کرنے لگی۔

"حد ہو گئی بھئی — پرچہ خراب ہوا ہے۔ فیل ہونے کے ڈر سے روتی ہے — پاس کرانے کی آس دلاتا ہوں تب بھی بگڑتی ہو۔ عجب زمانہ ہے بھئی، ہمدردی اور نیکی کا کوئی صلہ ہی نہیں — چلو اٹھو، نہا دھو کر جلدی تیار ہو جاؤ۔" شہزاد نے زبردستی اٹھا کر کھڑا کرتے ہوئے کہا۔ "میں اپنی بہن کو فیل نہیں ہونے دوں گا۔"

"بڑا آیا سی ایس پی — کہیں سے — بھائی جان آپ بڑے خراب ہیں۔" شبانہ ہوش و حواس میں آ گئی تھی۔ بھائی کی نقل اتار رہی تھی، اور شکوہ بھی کر رہی تھی۔ آنکھوں میں نیند کے خمار کے ساتھ آنسوؤں کی نمی بھی تھی۔ بال بے ترتیب تھے۔ جیسی سوئی تھی اٹھ کر آ گئی تھی۔ لباس بھی شکن آلود تھا اور ایسے میں شکوہ بہ لب بہن پر شہزاد کو بہت پیار آ گیا۔ دونوں بانہوں میں بھر کر بہت محبت سے، بڑے پیار سے پیار کر لیا۔

"بیٹی مذاق کر رہے ہیں۔ بھائی کی عادت جانتی بھی ہو، پھر خفا ہو جاتی ہو۔" سعدیہ بیگم نے مسکراتے ہوئے کہا اور شہزاد

کو بھی سمجھایا کہ "ایسی بات مذاق میں نہیں کہتے، پاس ہونا ہو گا تو ہو جائے گی، نہیں تو نہ سہی۔ ہم ایسے نمبر لگوانے سے باز آئے، سراسر بے بنیاد جھوٹ بول کر۔" وہ بڑے ناصحانہ انداز میں ٹھہر ٹھہر کر بات کر رہی تھیں۔ اگرچہ وہ جانتی تھیں وہ شبانہ کو بہلانا چاہتے ہیں۔ ایسی بات کہہ کر اس کو پرچے کا خیال بھلانا چاہتے تھے۔

"امی حضور! لوگ تو ایسے ہی کہانیاں بنا کر، افسانے سنا کر اپنی لڑکیوں کے نمبر بڑھوا لیتے ہیں۔ میں تو روتی دھوتی لڑکی کے فائدے کے لیے کہہ رہا تھا — چلو جی' نہیں منظور تو نہ سہی، ہمارے پیسے بچے — اچھا جی — چھوڑو — اس قصے کو سب جلدی تیار ہو جائیں۔ آج امتحان ختم ہونے کی خوشی میں زبردست پروگرام ہے — پکچر۔ پان — آئس کریم —" شہزاد نے چٹکی بجاتے ہوئے کہا۔ اور تھوڑی دیر میں شہزاد شبانہ اور تقدیس کو لے کر باہر چلے گئے۔ جاتے جاتے خالہ کو بھی بہت کھینچا، منت سے، پیار سے اصرار کیا لیکن وہ بہن کے خیال سے نہیں گئیں۔ جانا مناسب بھی نہیں تھا۔ بچوں کی دلچسپی اور تفریح کے تو وہ بھی حق میں تھیں۔ چند دن کی

پریشانی سے ہی پھول سے چہرے کملا کر مرجھا سے گئے تھے۔ جیسے باغباں کی عدم موجودگی میں ہر وقت آبیاری اور توجہ کی کمی کی وجہ سے خوبصورت تروتازہ پھولوں کے ساتھ ہوتا ہے۔ اسی طرح ان کے بچوں کے اُترے ہوئے چہرے اور نڈھال نظر آتے تھے ۔۔ اور ۔۔ واپسی ۔۔ پر ۔۔ سعدیہ بیگم تو دنگ ہی رہ گئیں۔ حیرانی کے مارے پلک جھپکنا ہی بھول گئیں۔ وہ تو جیسے خود بھی اپنے بچوں کو پہچان نہیں رہی تھیں۔ تھوڑی ہی دیر میں اُجلے اُجلے نکھرے نکھرے خوشیوں سے شادمانیوں سے دمکتے چہرے چاند کی طرح روشن۔ آنکھوں میں جگمگ جگمگ چمکتے تارے، خوشیوں کی بہار سے' رنگوں کی پھوار سے، گل و گلزار، باغ و بہار کا سماں تھا۔

نوبہار نقرئیں کھلتے سبز کپڑوں میں ۔۔ تو شبانہ گلابی لباس میں نورستہ، شگفتہ ۔۔ اور پھر ہزاروں شگفتہ شگوفوں سے گلزاروں سے، لالہ زاروں سے بھی تروتازہ شہزاد اُجلے اُجلے سفید لباس میں فرشتوں کا سا نور تھا۔ اس مسرور و مسحور چہرے پہ ۔۔ سعدیہ بیگم تو تینوں بچوں کے دمکتے رخسار، چمکتی آنکھیں مسکراتے لب ۔۔ لہکتے وجود دیکھ کر جی اٹھیں۔ اپنی ساری

بیماری بھول گئیں۔ ان کے بچے تو ترو تازہ پھولوں کی طرح دُھلے دُھلے، شفاف سے، اُجلے اُجلے لگ رہے تھے۔ وہ فوزیہ بیگم کی مدد سے بلکہ کسی حد تک خود بخود اٹھ کر بیٹھ گئیں۔ اتنی کمزوری اور نقاہت کے باوجود ان میں اتنی ساری ہمّت آ گئی تھی۔ وہ تو اپنے آپ کو جوان محسوس کر رہی تھیں۔ سارا ضعف ضعیفی کہیں اور جا چکی تھیں اور یہ سب ان کی صحت یابی کی خوشی تھی — ان کی بیماری سے مُرجھا گئے تھے۔ تو ان کے آنکھیں کھولتے سے ان کے ہنس کر بولنے سے ہی بچے کِھل اُٹھے تھے۔

"خالہ جانی! یہ سب آپ کا حصّہ ہے" کوئی دس بارہ قسم کی آئس کریم کے ڈبے فوزیہ بیگم کے آگے ڈالتے ہوئے شہزاد خوشی سے بے قابو ہوتے ہوئے بولے۔ ہر لفظ میں مٹھاس تھی، اور لہجے میں محبّت کا جذبہ اپنی خالہ جانی کے لیے۔ "اتنا بہت — بہت زیادہ ہے شہزاد — میں یہ سب کھا سکتی ہوں؟" فوزیہ بیگم بڑی حیرانی سے بڑی پریشانی سے — بڑی محبت اور اپنے شہزاد کے اس اظہارِ محبّت پہ خوش بہت خوش ہوتے ہوئے بولیں — وہ درجن بھر فیملی پیک آئس کریم

کے ڈبوں کو اٹھا کر باری باری دیکھ رہی تھیں۔

"خالہ جانی! نام آپ کا لگا رہے ہیں — اور خود سب سے زیادہ کھائیں گے۔ سب سے چھین چھین کر، جھپٹ کر۔" شبانہ بھی چہکی — "پھر آپ ہمیں بھی ساتھ میں کھلائیں گی نا"۔ شبانہ نے خالہ کے گلے میں بانہیں ڈالتے ہوئے کہا۔ تقدیس بھی مسکرا رہی تھیں۔

"تم دونوں اپنا حصّہ کھا کر آئی ہو۔ بالکل بھی اور نہیں ملے گا۔" شہزاد بات شبانہ سے کر رہے تھے اور اشارے سے ملازم کو ڈھیروں ڈھیر مٹھائی کے ڈبے قالین پر رکھنے کے لیے کہہ رہے تھے۔

"میں خالہ جانی سے لے لوں گی — آپ نہ دیجئے گا۔" شبانہ اپنی فطری شوخی اور لاڈ میں اٹھلا رہی تھی۔

سعدیہ بیگم کی طبیعت بہتر ہونے کی خوشی میں من بھر مٹھائی اٹھا لائے تھے۔ بے شمار ڈبے تھے اور ہر ڈبے میں دو دو کلو موتی چور کے لڈو، ہر ملازم کے لیے ایک ڈبہ — اماں بی کو تقسیم کرنے کا طریقہ سمجھاتے ہوئے — شہزاد — ایک ڈبہ اٹھا کر ڈوری کھولنے لگے — سب سے پہلے سعدیہ بیگم کے منہ میں

اپنے ہاتھ سے لڈو ڈالا — پھر فوزیہ بیگم کو کھلایا۔ تقدیس اور شبانہ کو دیا — اماں کے سامنے ڈبہ کھول کر رکھ دیا۔

"یہ سارا صرف آپ کھائیں گی — میری اماں۔" شہزاد اماں سے بڑے ناز سے بڑے لاڈ سے لپٹے ہوئے تھے۔ وہ جھٹ جھٹ بلائیں لے رہی تھیں۔ دعائیں دے رہی تھیں۔ آیاتِ قرآنی پڑھ کر پھونک رہی تھیں۔

"بٹیا — وہ غریب شوگر کی مریضہ ہے۔ کہاں کھائے گی۔" فوزیہ بیگم نے بوڑھی کمزور اماں کے منہ میں لڈو ٹھونستے ہوئے شہزاد کو سمجھایا اور اماں کا دم گھٹنے لگا۔

"خالہ جان — آج تو اماں چاہے شوگر فیکٹری ہی بن جائیں لیکن — یہ خوشی کی مٹھائی کھانا ہی ہوگی۔" شہزاد بڑے مان سے کہہ رہے تھے۔ وہ اپنی آپا کا اسی طرح احترام کرتے تھے جیسے ماں اور خالہ کا — لاڈ پیار بھی خوب کرتے۔ اس بڑھاپے میں اس کی ضروریات کا کتنا خیال ہوتا۔ دوا علاج کی فکر ہوتی۔ اماں کے لیے کپڑے جوتے خرید کر لاتے تھے۔

بعد میں شہزاد نے ڈاکٹر صاحب کے گھر، ٹیکے لگانے والے ڈسپنسر کے گھر، ہمسایوں میں دور نزدیک میل ملاقات والوں میں

سب میں ہی مٹھائی تقسیم کی — اپنی خوشی اور دلی مسرت کا اظہار کر رہے تھے۔

"ہماری امی حضور بالکل صحت یاب ہو جائیں تو دیکھئے گا کیسا جشن مناتے ہیں — کہ ساری دنیا میں دھوم مچ جائے گی۔"

شہزاد جوش محبت میں جذبات مسرت میں کہہ رہے تھے۔

اور فوزیہ بیگم نے اسی وقت سعدیہ بیگم کی ہدایت پر ملازم کو بھیج کر تین کالے بکرے صدقہ کروا دیئے۔ اپنے بچوں کا صدقہ۔ ان کی صحت و عافیت و مسرت و شادمانیوں کا صدقہ — ان سب کو نظر بد سے دور رکھنے کا صدقہ — اس گھر میں سدا خوشیوں، خوشحالیوں کا صدقہ۔

○

باب ۶

رنگ پیراہن کا، خوشبو زلف لہرانے کا نام
موسم گل ہے، تمہارے بام پر آنے کا نام

اوائل اکتوبر — گرمی — سردی — کا ملاپ — بلکہ گرمی کی روانگی اور سردیوں کی آمد آمد — بارشوں اور خنک ہواؤں نے دھوپ کی حدت اور موسم کی شدت کم کر دی تھی۔ گرمی دم توڑ چکی تھی۔ رات تو خاصی ٹھنڈی جاں بخش، بڑی پر لطف، بڑی خوشگوار ہوتی۔ موسم بہت خوشگوار، فضائیں پر بہار، گل و گلزار پہ نکھار تھا، سنگھار تھا، خمار — سحر آفرین خمار تھا۔

شبانہ شام کے وقت بڑے خوبصورت، گہرے، نیلے رنگ کی شوخ ساڑھی پہنے بڑی پیاری لگ رہی تھی۔ ساڑھی کے بالشت چوڑے بارڈر اور آنچل سنہری ہونے کے علاوہ پوری ساڑھی پہ جگہ جگہ مناسب فاصلے

پر بڑے خوبصورت ڈیزائن کے پھول بنے تھے۔ چمکدار سیاہ گھنے بالوں کا بڑا سا جدید فیشن کا جوڑا بنائے تھے۔ ریشمی پردہ ہٹا کر تقدیس کے کمرے میں داخل ہوئی۔ وہ بھی بالکل شبانہ کے ساتھ کی نیلی ساڑھی پہنے، لمبے لمبے، تین قدِ آدم آئینوں والی نیچی سنگھار میز کے سامنے گدی دار چھوٹی سی، گھومنے والی، مخمل کی سٹول پر بیٹھی، کنگھی کر رہی تھی۔ بکھرے بکھرے سیاہ بالوں میں گورا، گلابی، شگفتہ چہرہ کندن کی طرح چمک رہا تھا اور بڑی بڑی خوبصورت آنکھوں میں سچے موتیوں، روشن ستاروں کی چمک تھیں۔ تینوں آئینوں میں تقدیس کے تین خوبصورت عکس نظر آ رہے تھے۔

"آپی جان لائیے، ہم آپ کے بال بنائیں"۔ شبانہ نے تقدیس کے دونوں اوپر کو اٹھے ہوئے ہاتھ کنگھی کرنے کے دوران، پکڑ کر کھڑے کھڑے جھک کر آئینے میں دیکھتے ہوئے ___ اور مسکراتے ہوئے سنہری دستی کا سیاہ کنگھا تقدیس کے ہاتھ سے لے لیا۔ شبانہ تقدیس کے پیچھے، آئینے کے روبرو کھڑی تھی۔ کانوں میں پڑی بڑی بڑی بالیاں، جھوم جھوم کر، تقدیس کی کنگھی کرنے کے دوران جھک جھک کر اس کے گلابی گالوں کو چوم رہی تھیں۔ شبانہ بڑی خوبصورت بڑی پُرکشش، بڑی پیاری، بڑی سجیلی، بڑی بانکی چھبیلی سی لڑکی

تھی اور اس وقت تو کتنی پیاری لگ رہی تھی۔ سجی سنوری، بڑے سنگھار پٹار میں۔ تقدیس نے سامنے آئینے میں شبانہ کا عکس دیکھا، پھر پلٹ کر چہرہ اُوپر اٹھا کر دیکھا۔ قدرتی خوشگوار تبسم چہرے پہ کھیل رہا تھا۔ شبانہ بھی متبسم تھی۔

"بڑی پیاری لگ رہی ہو شبانہ۔" تقدیس نے اسی طرح بیٹھے بیٹھے شبانہ کے ساتھ لگتے ہوئے سر اونچا کر کے شبانہ کے روشن چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ وہ شبانہ کا دلکش چہرہ دونوں ہاتھوں میں تھامے تھی۔ شبانہ نے بھی جھک کر تقدیس کے گلے میں باہیں ڈال دیں۔

"اپنی پیاری آپی کو اپنی شبانہ پیاری نہ لگے گی بھلا؟" شبانہ نے جوش محبت میں کتنی ہی بار تقدیس کو بار بار پیار کر ڈالا۔ "میری پیاری آپی"۔ شبانہ زور سے لپٹی ہوئی تھی — اور تقدیس نے بھی محبّت کا جواب محبّت سے دیا۔ دہکتے گالوں کو، چمکتی پیشانی کو چوم چوم لیا۔ بہت محبت تھی دونوں میں — بے پناہ پیار تھا دونوں کو۔ دونوں ہی ایک دوسرے پہ صدقے واری، جی جان سے قربان، نہال و نثار ہر ادا پہ فدا تھیں کہ اندازہ لگانا مشکل تھا کہ کس کی چاہت زیادہ ہے۔ پیار دلار سے فارغ ہو کر شبانہ نے تقدیس کے بالوں کو بڑے سلیقے سے

بڑے طریقے سے سنوار کر، بڑی نفاست سے اپنی طرح کا بڑا سا جوڑا بنا دیا۔ لمبی لمبی دودھیا گردن اور بھی نمایاں ہوگئی۔ اپنے ساتھ کے بڑے ہالے کے طلائی بالے تقدیس کے کانوں میں ڈالے، جن کے ہالے کے درمیان بڑے سے گول جھمکے کے نیچے دائرے کی صورت میں آبدار سفید موتیوں کی جھالر جھول رہی تھی۔ طلائی موتیوں کی رنگ برنگ بلور جڑی مالا تقدیس کے جوڑے پہ تین بل دے کر لپیٹ دی۔ مالا کے ساتھ کا ہی گلوبند اور طلائی موتیوں کے شیشہ لگے تین لڑی کے بازو بند کلائی میں ڈال کر اچھی طرح دبا دیا۔ نازک نازک سنہری ڈوریاں کی اونچی ایڑی کے سینڈل پہن کر ساڑھی کے بل درست کرتی تقدیس کھڑی ہوگئی۔ نوک پلک سنور کر، نکھر کر تیار۔

شبانہ اور اس کی بہت سی سہیلیوں نے ایف اے کے امتحان میں کامیابی کی خوشی میں مقامی ہوٹل میں دعوت اڑانے کا اہتمام کیا تھا۔ ملن پارٹی تھی۔ خرچ سب نے مل کر بانٹ لیا تھا۔ ایک ایک مہمان ہر ایک کو اپنے ساتھ لانے کی اجازت تھی۔ کوئی اپنی آپا کو، کوئی باجی کو، کوئی بھابی، کوئی چھوٹی بہن، کوئی بھانجی، بھتیجی، کسی نہ کسی کو ساتھ لے کر آئی تھی۔

آج تقدیس بھی شبانہ کی کامیابی کی خوشی میں اس کی دلی خواہش

پر، اس کے مخلص جذبات کا احترام کرتے ہوئے، اپنے اور اس کے سچے، خالص پیار کے صدقے میں دعوت میں جانے کے لیے تیار تھی کہ شبانہ کے پاس ہو جانے کی تو خود شبانہ کو اور سب افرادِ خانہ کو، خاص طور پر تقدیس کو بڑی خوشی ہوئی تھی کہ اس بے چاری نے کتنی مصیبت کے دنوں میں مشکلوں سے امتحان دیا تھا۔ پرچے بھی اچھے نہ ہوئے تھے۔ لیکن قسمت نے ساتھ ــــ خدا کی کرم فرمائی سے امتحان میں پاس ہو ہی گئی۔ یہ سیکنڈ کلاس میں کامیابی سب کے لیے اوّل آنے سے بڑھ کے تھی۔ بیر نیلی ساڑھیاں اور جڑاؤ جھمکا بالیاں فوزیہ بیگم نے اپنی عزیز ترین بہن سعدیہ بیگم کی صحت یابی کی خوشی میں دونوں بچیوں کو لے کر دی تھی۔

شہزاد نے امّی کی صحت یابی اور شبانہ کی کامیابی پر شاندار دعوتیں دی تھیں۔ علیحدہ علیحدہ ــــ اور دونوں کی خوشی میں تحفہ بھی لیکر دینے کا وعدہ کیا تھا۔ لیکن کچھ تو مصروفیت زیادہ تھی، زمین کا کوئی مقدمہ چل رہا تھا۔ اس کے لیے عدالتوں، وکیلوں کے چکروں میں پڑے تھے۔ اور زیادہ تر محض ستانے چڑانے کے لیے شبانہ سے بہانے بناتے رہتے۔ وعدوں کی ڈوریاں، دھنوں کی لڑیاں طویل اور مضبوط ہوتی رہیں۔ شبانہ اصرار کرتی رہی، کبھی پیار سے، کبھی تکرار سے، جھگڑا

بھی ہو جاتا۔ کبھی رُوٹھ جاتی، کبھی مان جاتی لیکن شہزاد نہ جانے کونسی مصلحت کی وجہ سے مصروفیت سے فرصت اور فراغت ملنے کا انتظار کرتے رہے۔ اور اب تو شبانہ نے نا اُمید ہو کر اصرار کرنا بیقرار ہو ہو کر وعدہ یاد دلانا چھوڑ دیا تھا۔ شہزاد جانتے تھے ناراض ہو گئی ہے۔

"ہائے اللہ۔ شبانہ پیاری۔ آج تو غضب ڈھایا ہے تم نے"۔ شمع گلابی ساڑھی پہنے تھی۔ اپنے دل پہ ہاتھ رکھتے ہوئے بیساختہ بولی اور دوڑ کر سجیلی، چھبیلی شبانہ سے لپٹ گئی۔

"اف۔ اف۔ لیکن آپی تو سب سے ہی بمبر لے گئیں"۔ شبانہ کے پیچھے کھڑی تقدیس کا ہوشربا رُوپ، قدرتی حسن، سجاوٹ بناوٹ دیکھ کر شمع تو چیخ ہی پڑی۔ شبانہ کو چھوڑ کر تقدیس سے لپٹ گئی۔ دونوں کندھوں سے پکڑ کر سر سے پاؤں تک دیکھتی رہی۔ ٹھوڑی پکڑ کے چہرے کو نظر لگانے کے انداز میں، بے ساختہ انداز میں کھڑی ہی رہ گئی۔ وہاں موجود شبانہ کی سب سہیلیوں نے سہیلیوں کے مہمانوں نے، بہنوں، بھابیوں نے سب نے ہی تحسین و آفرین بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے، اس روپ کی سنگھار کی، اس مجسّم گل و گلزار کی واقعی بہت تعریف۔ ایسا حسن، ایسی

کشش کبھی بھی، کہیں بھی دیکھی جو نہ تھی۔ سب حاضرین نے ہی عمدہ قیمتی، بڑھیا، ہلکے، گہرے، شوخ، بھڑکیلے کپڑے پہنے تھے۔ شہر کی اونچی سوسائٹی، امیر طبقہ کی، مالدار والدین کی۔ بیٹیاں، بہوئیں یہاں جمع تھیں۔ امیروں، رئیسوں کی اولاد اچھے لباس کے ساتھ سنگھار پٹار میں بھی سب نے اپنی سی پوری کوشش کی تھی، لیکن جو نکھار، جو پھبن، جو بانکپن تقدیس کے سنگھار میں تھا۔ جو حُسن اس کے سروقد نازک سراپا اور مسکراتے شرماتے مکھڑے پہ تھا، وہ کسی اور میں کہاں۔

شمع کی بھابی فرح — مناسب قد وقامت — خاصا خوبصورت ناک نقشہ، گوری رنگت، دبلی نہیں ذرا بھرے بھرے صحت مند وجود کی مالک تھیں۔ مزاج بڑا خداداد پایا تھا۔ بڑی زندہ، بڑی انجمن آرا، رونق محفل، جانِ محفل، سراپا انجمن — جہاں بیٹھتی خود بخود ہی محفل جمع ہو جاتی۔ شمع اور اس کی سہیلیوں سے چار پانچ سال بڑی تھیں۔ پھر شادی شدہ، دو بچوں کی ماں، گھریلو ذمہ داریاں، لیکن لڑکیوں میں لڑکی، ویسی ہی چنچل، شوخ، شرارتی کہ محفل میں رنگ آ جاتا تھا۔ ان کے آنے سے — باتیں بڑے مزیدار انداز میں سنوار کر بڑی ہی مزیدار کرتی۔ لطیفہ گوئی، بذلہ سنجی، ہنسی مذاق ان کی فطرت تھی۔

شہزاد کے ساتھ خوب بنتی تھی۔ بڑی دوستی تھی دونوں میں۔ دیور راجہ بھابی رانی، وہ شوخ و شریر اور یہ بھی نہ یہ چین سے بیٹھیں نہ وہ بیٹھنے دیں۔ نہ وہ آرام کریں نہ کرنے دیں۔ غرض ایک ہی سا مال تھا۔ اس وقت بھی بڑے موڈ میں تھیں۔ اپنے مخصوص انداز میں ساری محفل کو قابو کیا ہوا تھا۔ سب لطف اندوز ہو رہے تھے۔ لڑکیوں کی چھیڑ چھاڑ، چیخ پکار، مار دھاڑ، چھینا جھپٹی کے دوران دعوت زوروں پر تھی۔ مشروبات کے دور چل رہے تھے۔ چائے کے جام گردش میں تھے۔ لہو گرم نہیں بلکہ محفل گرم رکھنے کا یہ بہانہ۔

یہاں سب کچھ ہی ہے، ایک کمی ہے تو میرے دیور راجہ کی، میرے شہزاد بھیا کی۔ وہ واقعی اس وقت شہزاد کی کمی اور ضرورت بڑے زور سے محسوس کر رہی تھیں۔ نہ جانے اب کیا شرارت سوجھی تھی کہ وہ بھی ہوتے تو مل کر طوفان ڈھاتے دونوں دیور بھابی۔

"آئیے بھئی آپ ہمارے ساتھ بیٹھئے۔ کیوں کہ یہ تو ہماری برادری سے ہیں۔ ہماری صنف میں شامل ہونا چاہیئے۔ ہماری صحبت میں بیٹھنا چاہیئے۔" فرح نے سب سے الگ ایک طرف علیحدہ سے کھڑی دعوت کا نظارہ کرتی تقدیس کو ہاتھ پکڑ کر اپنے ساتھ ہی صوفے پر بٹھا لیا۔ وہ خاموشی سے پلیٹ کانٹا ہاتھ میں پکڑے

بیٹھ گئی۔ چہرے پہ سرخ سرخ رنگوں کے قمقمے جل اُٹھے تھے۔ جھکی پلکوں کے نیچے جگمگ جگمگ ستارے چھپے تھے۔ سر جھکائے دلہنوں کی طرح شرماتے فرح بھابی کے ساتھ سمٹی ہوئی لگی تھی۔ لڑکیاں اپنی ہی دھن میں کھانے پینے کی شرارتوں کی لگن میں پھر کامیابی کی خوشی میں مگن — بھابی کی بات پر خواہ مخواہ ہی قہقہے لگا رہی تھیں۔ خاص طور پر شمع اور شبانہ تو ہنس ہنس کر دوہری ہو رہی تھی۔ نہ بات سمجھی تھی نہ سمجھ میں آئی تھی۔ محض بے فکری کے قہقہے تھے کہ سارا کمرہ گونج رہا تھا۔

"بھابی جان — محترمہ — کیا ہماری صنف آپ سے مختلف ہے — اور برادری کیوں جدا ہو گئی آپ دونوں کی ہم سے۔ فرق کیا ہے آخر — ؟" شبانہ نے ہنستے ہوئے قریب آ کر پوچھا۔ وہ ساڑھی کا پلو کمر کے گرد لپیٹے — پلیٹ ہاتھ میں لیے، گال میں کچھ دبائے جبائے جا رہی تھی۔

"بھئی — تم نندیں — اور میں بھابی — فرق تو بہت بڑا ہے۔" فرح بھابی نے اسی طرح ہنستے ہوتے شبانہ کی بات کا جواب دیا — اور تقدیس کی خالی پلیٹ دائیں ہاتھ قریب ہی پڑی ٹرالی میں سے بھرنے لگیں۔

"تو آپی بھی تو ہماری ہی بہن ہیں — بھابی صاحبہ — وہ بھی آپ کی نند ہی ہوئیں"۔ شبانہ نے ادھر ادھر دیکھا۔ لڑکیاں اس کو آوازیں دے رہی تھیں — لیکن شبانہ فرح کو قائل کرنے کے لیے بڑا زبردست فرق ڈھونڈ کر لائی تھی۔

"میری رانی — تمہیں یہ بات شہزاد کے سامنے سمجھاؤں گی — تقدیس تمہاری آپی ہیں — شہزاد کی تو نہیں"۔ فرح نے پھر تقدیس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے کہا۔ وہ اسی طرح پلیٹ ہاتھوں میں پکڑے بیٹھی تھی۔

"لو جی — بھابی کی باتیں سنیئے ذرا — بھائی جان بڑے ہیں۔ آپی چھوٹی ہیں — آج آپ بھی عجیب ہی باتیں کر رہی ہیں"۔ شبانہ نے دلیل پیش کرتے ہوئے ایک دفعہ پھر فرح کو لاجواب کرنا چاہا۔ اور اپنی کامیابی پر ہنسنے لگی۔ فرح مسکرا رہی تھی، وہ بھی لاجواب ہو گئیں۔ ادھر سے عذرا نے چپکے سے اس کی پلیٹ میں سے سینڈوچ اٹھا لیا۔ وہ اس کے پیچھے بھاگی۔ اسی بھاگ دوڑ میں وہ دونوں کافی دور چلی گئیں۔ اور — فرح نے تقدیس کے ہاتھوں سے بیکار میں پکڑی پلیٹ لے کر ایک طرف رکھ دی — اور اس کے دونوں نرم نرم ہاتھ اپنے ایک ہاتھ میں پکڑ کر — زبردستی — جبکہ وہ انکار ہی کرتی

رہی۔ اپنے کالے پرس میں سے بڑی سی گول بندیا، سُرخ بندیا پہ سنہری پھول بنا تھا، نکال کر تقدیس کی اُجلی نکھری پیشانی پہ لگا دی۔ چمکتی پیشانی پہ دمکتی بندیا اور بھی چمک اٹھی۔ جھلمل جھلمل دمک اٹھی اپنی خوش بختی پر۔ اپنی خوش نصیبی پر۔

"چشم بد دُور۔ شہناز۔ ان کو گھر سے کاجل کا ٹیکہ لگا کر نکالا کرو۔" تقدیس کے ملائم ملائم، روشن روشن، چمکتے گال پہ محبت سے چٹکی بھرتے ہوئے فرح بھابی بڑی ہشاش بشاش تھیں۔ آنکھوں میں شرارت اور ہونٹوں پہ شریر بڑی شوخ سی مسکراہٹ تھی۔ تقدیس نے مسکرا کر شرما کر بڑے دلکش انداز میں سر کو جھکا کر تھوڑا سا پلکوں کو اٹھا کر، تھوڑا سا گھما کر فرح بھابی کی طرف دیکھا۔ اوپر کے ہونٹ سے ذرا اُوپر دائیں طرف، چمکدار سیاہ تل، گورے گورے روشن روشن چہرے پہ اور بھی چمک رہا تھا۔ جیسے وہ حُسن کا دربان تھا۔ نگہبان تھا۔ محافظ تھا۔

"جی ہاں۔ تو۔ بھابی۔ یہ صنف اور برادری والی بات کیا تھی۔ کیا چکر ہے۔ آپ کیا فرما رہی تھیں؟" شمع نے قریب آتے ہوئے پوچھا۔ شہناز بھی ساتھ تھیں۔ دونوں اپنی اپنی چائے کی پیالی پکڑے تھیں۔

"شہزاد کی بھابی کے ناطے ہم نے تو دیورانی جی کے بندیا لگا دی ہے"۔ انہوں نے بات سمجھانے کے انداز میں تقدیس کی بندیا کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ اور دونوں لڑکیوں کے ہاتھ سے چائے کی پیالیاں اپنے اور تقدیس کے لیے پکڑلیں "جاؤ دو پیالیاں اور بنالاؤ۔" یہ نندیں بڑی ظالم ہوتی ہیں۔ بھابیوں کو کھوڑ کا مار کے اپنی پیٹ پوجا ہی کرتی ہیں"۔ سمع بڑی پلیٹ میں دو پیالیاں چائے رکھ کر لے آئی۔

"آپ کی دیورانی کیسے — ہماری آپی جان" توقیر بھائی والی بھابی آپ کی دیورانی ہیں تو"۔ شبانہ نے تنویر (فرح کے میاں) کے چھوٹے بھائی کے متعلق کہا۔

"تم ایسے نہ سمجھو گی — یہ بات"۔ وہ جانتی تھیں شبانہ بہت بھولی ہے اور پھر بہن کے شوق میں اس کے دماغ میں یہ بات آ ہی نہیں رہی جو وہ سمجھانا چاہ رہی ہیں۔ وہ بڑی خوشدلی سے ہنس رہی تھیں۔ اور پرس میں سے سیاہی مائل گہری سُرخی لپ اسٹک نکال رہی تھیں۔ بڑی نرمی سے بڑی آہستگی سے تقدیس کا چہرہ پکڑے، بڑے آرام سے بڑے ارمان سے کومل سی ٹھوڑی کو دو انگلیوں میں پکڑے، تقدیس کے نازک ہونٹوں کو کتنے سلیقے سے

رنگ دیا۔ روشن کر دیا۔ سرخ سرخ — سرخی کی تہ سے تقدیس تو اور ہی روشن روشن، کندن کندن، جھلبل جھلبل کر اٹھی۔

"لو دیکھو۔ اب اپنی دلہن بھابی، میری دیورانی جی میرے دیور راجہ کے من کی رانی جی"۔ فرح بھابی نے ٹھوڑی پکڑ کے دلہن دکھانے کے انداز میں زبردست وضاحت کر دی اور شبانہ پہلے تو حیرت میں گنگ ہی ہو گئی۔ پھر فرح سے لپٹ گئی، تقدیس سے لپٹ گئی۔

"ایسا ہو سکتا ہے۔ ہائے ایسا ہو جائے۔" اب شبانہ پوری طرح بات سمجھ گئی تھی۔ تالیاں بجا بجا کر ناچنے لگی۔ ٹھمک ٹھمک کر گانے لگی۔ اس نے تو کبھی یہ بات سوچی ہی نہ تھی۔ کبھی دل میں خیال ہی نہ آیا تھا۔ ایسا اچھا خیال، ایسی اہم سوچ۔

"ہائے ہائے میں بھی کتنی پاگل ہوں؟" خوشی کے مارے دیوانی ہوئی جاتی شبانہ فرح بھابی سے کہہ رہی تھی۔ اور جب شبانہ کی تالی کے ساتھ فرح بھابی نے تالی کی آواز ملائی تو شمع بھی دوڑی آئی۔ اور باقی سب لڑکیاں بھی تالی سے تال ملا کر، ٹھمکے کے ساتھ ٹھمکا لگا کر یہ بڑا سا دائرہ بنا کر ناچنے لگیں، گانے لگیں، شادی بیاہ کے گانے، سہرے سہاگ، گھوڑیاں، رخصتی کے گیت، ان کو کیا نہیں

آتا تھا۔ تالی، چٹکی بجاتی، جھوم جھوم کر خوشدلی سے گاتی لڑکیوں نے دیکھتے ہی دیکھتے شادی کا سماں باندھ دیا تھا۔ ساتھ ساتھ ہنسی مذاق، بڑے جاندار قہقہے رونق میں اور بھی جان ڈال رہے تھے۔ فرح بھابی اس ساری کارروائی کی ناظمِ اعلےٰ تھیں۔ بڑے سے دائرے میں لڈی ڈالتی، رقص کرتی لڑکیوں کے درمیان میں تقدیس دانتوں میں انگلی دبائے حیران پریشان سی کھڑی دیکھتی رہ گئی۔ وہ جگمگ چمکتے ستاروں کے درمیان ٹھنڈی چاندنی نور ہی نور پھیلاتے چاند کی طرح منوّر، کسی بڑے ماہر مصوّر کی تصویر فریم میں لگی پینٹنگ لگ رہی تھی۔

پہلے تو اپنی خوش گپیوں میں، ہنسی مذاق اور شرارتوں میں فرح بھابی کے مذاق میں کہی بڑی معنی خیز بات پر کسی نے خاص توجّہ ہی نہ دی۔ انہیں کھانے پینے اور ایک دوسرے کو چھیڑتے، ستانے سے ہی فرصت نہیں تھی۔ اگرچہ تقدیس تو پہلی ہی بات پر پہلے ہی اشارے پر بھابی کی بات میں چھپی بات کو سمجھ گئی تھی۔ ان کی شرارت بڑی ذومعنی تھی۔ لیکن کیا کہتی۔ کیا کرتی بے چاری، سر جھکائے خاموش بیٹھی اپنے ہی ہاتھوں کو ملتی رہی۔ انگلیوں کو مسلتی رہی اور دل ہی دل میں دعائیں مانگتی رہی۔

سو کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی

لیکن فرح بھابی بھی ایسے چھوڑنے والی نہ تھیں۔ سب ناسمجھوں کو آخر سمجھا کے رہیں۔ پھر جو لڑکیوں نے شور ہنگامہ مچا رکھا تھا کہ ادھر ادھر کے دوسرے کمروں کے لوگ بھی آکر رونق سے لطف اٹھانے لگے۔

اور!

شبانہ کا دلِ بیقرار!

یہی اصرار کر رہا تھا کہ کہیں سے ایسے میں بھائی جان آجائیں۔ اسے بڑی جلدی تھی کہ یہ نئی بات، فرح بھابی کی اتنی خوبصورت تجویز فوراً بھائی کو بتائے۔ امی حضور اور خالہ جانی تک بات پہنچائے۔ ان لوگوں کو سب کو یہ انوکھا راستہ دکھائے کہ ان سے شکوے کر ڈالے کہ ان سب کے دلوں میں ایسے خوبصورت خیال کبھی کیوں نہ آئے۔

شہر کے سب سے بڑے، بڑے بارونق بازار میں اپنی چھوٹی موٹر روک کر شبانہ۔ روشن روشن، روشنیوں سے جگمگاتی، بڑے طریقے بڑے سلیقے سے سجی سجائی، ضرورت کی چیزوں سے بھری بڑی دکان میں داخل ہوئی۔ دائیں ہاتھ تقدیس ساتھ تھی۔ سعدیہ بیگم اور فوزیہ بیگم نے کچھ چیزوں کی فہرست آتے ہوئے دی

تھی کہ دعوت سے واپسی پہ لیتی آئیں ۔ کیونکہ جس ہوٹل میں دعوت تھی وہ شہر کی سب سے بڑی مشہور شاہراہ پر شہر کے مرکز میں اور بازار کے درمیان میں ہی تھا ۔ رنگ و نور کی پھوار میں روشنیوں کی برسات اور رنگ برنگ لوگوں کے سیلاب میں بے پناہ ہجوم میں دکانوں پر گھوم پھر کر مطلوبہ اشیاء خریدتی رہیں ۔ وسیع و عریض، صاف ستھرے، آراستہ و پیراستہ بازار میں بڑی بڑی شاندار دکانیں تھیں ، دوکانیں کیا بلکہ شیش محل تھے ۔ شیشے کی بڑی بڑی بے شمار الماریوں میں جھلملاتی ساڑھیاں ، دوپٹے ، جوڑے، سوٹ ، خولصبورت ڈیزائن کے سِلے اور بن سلے کپڑے ، زیورات، کراکری سجاوٹ کی چیزیں ، جوتے، پرس ، دستکاری کے، کشیدہ کاری کے غیر ملکی صنعتوں کی جیسے ایک بہت بڑی نمائش لگی تھی ۔ اور یوں لگتا تھا ، پورا ہی شہر بلکہ ساتھ کے شہروں سے بھی لوگ بازار میں ہی آگئے تھے ۔ سب کی ضروریاتِ زندگی ختم ہوگئی ہیں اور سب کو ہی سب کچھ خریدنے کی جلدی، افراتفری پڑی ہے ۔ زندگی کی ہلچل ، رونق، اس وقت روزانہ ہی اسی طرح عروج پر ہوتی تھی ، اور جوں جوں رات ہوتی اس میں اضافہ ہی ہوتا ۔ زور شور بڑھتا ہی جاتا ، کئی لوگ تو محض دل بہلانے کے لیے ، سیر کے لیے ، تفریح طبع کی خاطر گھومنے آجاتے تھے ۔

چاٹ کھائی، دہی بڑے اڑائیے، آئس کریم کھا کر پان گال میں دبا کر یوں بے فکرے لوگ ادھر ادھر چکر لگاتے رہتے۔ خریداری کے دوران ساڑھیوں کی ایک بڑی عالی شان دوکان، رنگا رنگ ساڑھیاں، رنگا رنگ روشنیوں میں بہار دکھا رہی تھیں۔ رنگوں کی بے شمار بھرمار کے باوجود شبانہ کو ایک سفید ساڑھی بیحد پسند آئی۔ خریداری کافی کر چکی تھی۔ رقم ختم اور پرس تقریباً خالی تھا۔ ساڑھی کے دام تو بہت زیادہ تھے۔ دکاندار سے کہہ کر اپنے لیے رکھوالی۔ جبکہ وہ اصرار ہی کرتا رہا ہے۔

"بی بی۔ آپ ساڑھی لے جائیے۔ گھر کی بات ہے۔ پیسوں کی کوئی بات نہیں۔" لیکن سعدیہ بیگم کی ہدایت اور اپنے اور اپنے خاندانی وقار کے لیے ادھار کے خلاف تھیں۔ پھر آ کر لے جانے کا وعدہ کر کے وہیں چھوڑ آئیں۔

"ایک نہیں بلکہ دو لیں گے۔" شبانہ نے خوشدلی سے مسکراتے ہوئے کہا تھا۔ اور دکاندار اچھی طرح جانتا تھا کہ وہ دو ۲ چھوڑ ایک سو بھی لے سکتی ہیں۔

خریدی ہوئی چیزوں کے یہ بڑے بڑے بنڈل اٹھا اٹھا کر دکانداروں نے ان کی گاڑی میں رکھوا دیئے تھے۔ دارالامان سے

درخواست آئی ہوئی تھی، اور سعدیہ بیگم حسبِ معمول کچھ لڑکیوں کی شادی کا خرچ اور جہیز کی چیزیں منگوانا چاہتی تھیں۔ خود رئیس تھیں تو ان کا دل دولت امارت سے بھی زیادہ رئیس تھا۔ بہت بڑا، بڑا ہی وسیع۔

شہزاد نے شبانہ کی قرمزی گاڑی پہچانتے ہوئے اپنی آسمانی رنگ کی چھوٹی موٹر کے بریک لگائے۔ اُتر ہی رہے تھے کہ سامنے ہی شبانہ اور تقدیس بڑی سج دھج میں، بڑے ہار سنگھار میں، بڑی شاندار دکان کی کئی منزلہ عمارت کی چوڑی چوڑی مگر نیچی سیڑھیاں اُتر رہی تھیں۔ تیز، سنہری اور رنگ برنگی قمقموں کی چکا چوند میں ان کے جھلمل جھلمل لباس، زیورات منظر کو اور بھی حسین اور بھی رنگین بنا رہے تھے۔ تقدیس کی سُرخ چمکتی بندیا میں سے سُورج کی کرنیں سی پھُوٹ رہی تھیں۔ چاروں طرف سے روشنی جو بہت پڑ رہی تھی۔ گہرے رنگ کی لپ اسٹک، متبسم ہونٹوں پہ چمکتے چمکتے روشن چراغوں کو ماند کر رہی تھی۔

حسین چہرے کی صباحت، نازک بدن کی نزاکت، قیمتی لباس و زیورات کی نفاست، فرحت و مسرّت، بڑی عافیت، بڑے سکون کی دیوی، کہیں چاند ستاروں کی دنیا کی مخلوق لگ رہی تھی۔ پریوں

کے دلیس کی شہزادی لگ رہی تھی۔

پھر دھیمے دھیمے انداز میں، گھبرا گھبرا کر، ادھر ادھر دیکھتے ہوئے پلکیں اٹھا کر، بجلیاں گراتے ہوئے پلکیں جھکا کر ان جگمگ جگمگ ستاروں کو چھپاتے ہوئے، بڑے محتاط طریقے سے قدم رکھ رہی تھی۔

شہزاد موٹر کا دروازہ پکڑے کھڑے ہی رہے۔ دیکھتے ہی رہے۔ شبانہ اپنی ہی دھن میں مڑ مڑ کر ساڑھی کو، اسی سفید، اپنی پسندیدہ ساڑھی کو دیکھتی تقدیس کا ہاتھ پکڑے ساتھ ساتھ اُتر رہی تھی۔

"آہا — آہا — بھائی جان — آپ" شبانہ نے بالکل سامنے شہزاد کو اپنا ہی منتظر پایا تو — خوشی سے بے قابو ہوتی دوڑ کر ان سے لپٹ گئی۔ اچانک بھائی کو دیکھ کر بڑی خوشی ہو رہی تھی۔ پھر آج تو بڑی اہم بات، فرح بھابی کی شرارت جلدی سے جلدی بتانے کے لیے، اس نے کئی بار، بڑے بیقرار انداز میں چاہا تھا کہ بھائی جان آجائیں۔ وہ کئی دن سے ضروری کاموں کے سلسلے میں شہر سے باہر جاگیر پر گئے ہوئے تھے۔ کالی زمین پر چھوٹے سُرخ پھولوں والی ریشمی قمیض، سیاہ پتلون پہنے تھے کہ آج کل لڑکے بھی لڑکیوں کی طرح پھولدار رنگدار قمیص پہنتے تھے۔ بڑا زبردست فیشن تھا۔ بغیر آستین کا ہلکا مگر

قیمتی سُرخ سویٹر پہنے تھے۔ اکتوبر کی شام بلکہ رات ہوگئی تھی۔ موسم میں خنکی ہونے کی وجہ سے ہوا خاصی ٹھنڈی تھی۔ وہیں کھڑے اُوپر سے سیڑھیاں اترتی لڑکیوں کی طرف نگاہیں جمی تھیں۔ سویٹر کے تکون گلے میں سُرخ رنگ کی ٹائی پہ لگی ٹائی پن کا ہیرا، رنگ برنگ روشنیوں میں اور بھی بہت سی رنگین روشنیاں بکھیر رہا تھا۔ اور ہیروں سے بھی زیادہ انمول، شہزاد کے بالوں سے ہوا چھیڑ چھاڑ کر رہی تھی — شرارتوں کے نور سے چور نشیلی آنکھیں تقدیس کے مقدس سراپا پہ بیقراری سے نثار ہونے کے لیے بیقرار تھیں۔ شریر لبوں پہ مسکراہٹ تھی تو اجلی پیشانی پہ بھی تبسم کے پُرنور اُجالے تھے۔ نکھری نکھری چاندنی کی طرح سفید سفید اُجالے، اُجلے اُجلے سویرے تھے۔

ہزاروں، سینکڑوں بلکہ بے شمار لاتعداد لڑکیاں دیکھی تھیں۔ بے تکلف ہم جماعت لڑکیاں، اچھے سے اچھے گھروں کی مہذب، مقتدر، شریف، شریر لڑکیاں ساتھ پڑھتی تھیں۔ دوستی، بے تکلفی ہنسی مذاق، چھیڑ چھاڑ ہوتی رہتی۔ کسی سے پڑھائی کے معاملے میں سنجیدہ گفتگو بھی ہوتی۔ دوست احباب کی، تعلقداروں، جاگیرداروں شہروں میں رہنے والے عزیزوں رشتہ داروں کی ملنے ملانے والوں کی، بہنیں، بیٹیاں، بازاروں میں سڑکوں پہ، سکولوں، کالجوں سے

آتی جاتی، تقریبات میں گھومتی، مٹکتی، سجی سنوری لڑکیاں۔ سب سے بڑھ کر اپنی بہت پیاری جان سے پیاری، نازوں نخروں والی، لاڈوں کی پالی، بڑی خوبصورت، بڑی فیشن ایبل، بڑی سمارٹ معصوم بھی، بڑی شوخ و شنگ بھی ہر وقت چہکتی چڑیا، ہر وقت مہکتی گڑیا۔ ان کی اپنی اکلوتی بہن شبانہ — پھر تقدیس کے ساتھ شباہت بھی کتنی تھی۔ شبانہ کو بہت چاہتے تھے، حد سے زیادہ پیار کرتے تھے۔

لیکن؟

جو بات تقدیس کے روپہلے، سجیلے، بڑے نشیلے، بڑے رسیلے روپ میں، پُر حجاب شباب میں، معصوم حسن و جوانی میں تھی وہ کسی اور میں کہاں — پھر شرمیلی شرمیلی بڑی البیلی سی مسکراہٹ تو دنیا بھر میں یہی ایک تھی۔ ہونٹوں پہ تبسم اور پلکوں کے گرانے، اٹھانے کا انداز تو بس مار ہی ڈالتا تھا۔

نہ جانے کیوں؟

یہ سب کچھ کہیں اور کسی اور میں، سارے دنیا جہاں میں کسی بھی لڑکی میں نظر نہیں آتا تھا۔ ایک خاص قسم کا وقار تھا، سنگھار تھا۔ انوکھا ہی رکھ رکھاؤ تھا تقدیس میں — شہزاد کے ہونٹوں پہ تبسم، متبسم آنکھوں میں شرارت اور شوق میں گھلی گھلی سی گہری سوچ، حسن و

جوانی اور بھی دلکش ہو گئے تھے۔ آنکھوں میں اور ہی کشش آگئی تھی۔ دراز قامت شہزاد کھڑے یہی سوچ رہے تھے۔ تقدیس کو سامنے دیکھتے ہوتے، دنیا جہاں کی لڑکیوں میں سے نکالتے ہوئے ان کی لمبی قطار میں کھڑا کرتے ہوئے، مسکراتے ہوئے۔

"امّی حضور — فرما رہی تھیں — بہت دیر ہو گئی ہے، جا کر دونوں لڑکیوں کو لے آؤ۔" اپنے ساتھ لپٹی شبانہ کو بازو میں لیے، اس کے بالوں پہ پیار کرتے ہوئے شہزاد بڑی سنجیدگی سے بولے۔ شبانہ کے پیچھے ہی تقدیس گھرائی، گھبرائی، شرمائی سی اپنے دونوں ہاتھوں کو ملتی ہوئی، سر جھکائے کھڑی تھی۔

اور شہزاد!

اتنے سارے رنگوں کے ساتھ اس گھبراہٹ اور شرماہٹ کے رنگوں کی آمیزش سے بڑا محظوظ ہو رہے تھے۔

"بالکل گپ ہے، ایکدم غلط — جناب! آپ تو شہر سے باہر جاگیر بھی گئے ہوتے تھے۔" شبانہ بھائی کو چھوڑ کر سیدھی ہو کر تقدیس کے ساتھ شہزاد کے سامنے کھڑی ہو گئی۔ اس نے بڑی بے یقینی سے کہا — کیونکہ ابھی اتنی زیادہ دیر بھی نہیں ہوئی تھی کہ امّی حضور گھبرا جاتیں اور سفر سے آتے ہی بھائی جان کو ان کے پیچھے روانہ

کر دیتیں۔

شہزاد نے زیرِ لب ہنسی دبالی۔ آنکھیں جھکالیں اور دوسری طرف منہ پھیر کر ہنسی پر قابو پایا۔ اور سنجیدگی طاری کرنے کی بہت کوشش کی۔

"ابھی ابھی آیا ہی ہوں — کہ امّی حضور — تم دونوں پر بہت سخت ناراض ہو رہی تھیں — خوب غصّے میں تھیں۔ اُف توبہ توبہ کہہ رہی تھیں — آزاد ملکوں میں، مغربی ماحول میں گھومنے والی لڑکی نے ہماری بھولی بھالی، مشرقی لڑکی کو بھی خراب کر دیا ہے۔ بڑی آزاد ہو گئی ہے۔ اتنی رات گئے یوں سولہ سنگھار کیے دو نوجوان، خوبصورت لڑکیوں کا تنہا پھرنا انہیں بڑا ناگوار گذرا ہے"۔ خالہ جانی بھی رو رہی تھیں، انہیں بھی ڈانٹ پڑی ہے۔ نوکر بھی سب بھاگ گئے تھے"۔

سعدیہ بیگم کے غصّے کی فرضی داستان گھڑ گھڑ کر سنا رہے تھے۔ ہزار کوشش سے ہنسی ضبط کر رہے تھے، آنکھیں جھکا کر بات کر رہے تھے۔ ہونٹوں کو دانتوں میں دبا رہے تھے۔ وہ بڑے سنجیدہ بنے سفید جھوٹ بول رہے تھے ورنہ سعدیہ بیگم کے مزاج کا جو نقشہ وہ پیش کر رہے تھے وہ تو کسی نے کبھی خواب میں بھی

نہ دیکھا۔ کہاں وہ فوزیہ بیگم کو ڈانٹیں گی، تقدیس کو بُرا بھلا کہیں گی، شبانہ پہ ناراض ہوں گی۔ نوکروں کو ڈرائیں گی۔ وہ محض تقدیس کو ستانے، شبانہ کو چڑانے رلانے کے لیے کہہ رہے تھے۔ کئی دن کی جدائی کے بعد شبانہ سے لڑائی کرنے کو دل چاہ رہا تھا۔ تقدیس کو پریشان کرنے کو دل چاہ رہا تھا۔ گھبرائی گھبرائی تقدیس کو دل میں چھپانے کو آنکھوں پہ بٹھانے کو دل مچل رہا تھا۔ وہ خود بھی جانتے تھے۔ لڑکیوں کو بھی اچھی طرح علم تھا کہ سعدیہ بیگم جیسی شفیق، رحم و کریم، حلیم و فہیم خاتون، اتنی روشن خیال، وسیع دل کی مالک ــ ایسی بات کہنا تو ایک طرف سوچ بھی نہیں سکتی تھی، وہ کبھی تقدیس کو، شبانہ کو گھومنے سے روکتیں۔ ان کی خوشیوں پہ ٹوکتیں، جبکہ ان کی دونوں لڑکیاں فرشتہ صفت تھیں۔ بلند کردار، پاکیزہ خیالات و عادات کی مالک تھیں ــ یہ سب شریر شہزاد کی شرارت تھی۔ وہ ابھی ابھی زمینوں پر سے واپس آئے تھے۔ امی اور خالہ سے ملاقات کے بعد لڑکیوں کا پوچھا تو پتہ چلا کہ دعوت کے بعد بازار کا پروگرام ہے، پہلے ہوٹل گئے، وہاں سے سیدھے بازار کی طرف آگئے۔ ان دونوں کو ڈھونڈتے آہستہ آہستہ موٹر چلاتے، بارونق بازار کی رونقوں میں گاڑی گھسانے ادھر ادھر تلاشی نگاہیں

گھماتے جا رہے تھے۔ شبانہ کی گاڑی کا نمبر دیکھ کر وہیں رک گئے، دکان کے سامنے۔

"ابھی ــ کچھ زیادہ دیر تو نہیں ــ" شبانہ نے ادھر ادھر دیکھا۔ بازار کی چہل پہل رونق سے لگ رہا تھا، دن چڑھ رہا تھا، نہ کہ رات ہو گئی ہے ــ وہ بڑی بھولی تھی ۔ ہزار بار ایسا تجربہ ہو چکا تھا، لیکن پھر بھی شہزاد کی باتوں میں آ جاتی، ہمیشہ ہی اس کی بات مان جاتی ــ وہ گھبرا بھی رہی تھی۔ غصّہ بھی کھا رہی تھی۔

"آج امّی حضور کو کیا ہو گیا ہے۔ میں اکیلی بھی اس سے زیادہ دیر تک ــ رات کو بھی اکیلی آتی جاتی ہوں ۔ کسی کے آزاد ملکوں میں گھومنے پھرنے کا مجھ پر کیا اثر ہو گا ۔ آپی کو تو ہزاروں ہزار منتوں، سماجتوں سے میں خود لے کر آئی ہوں ۔ ان کو تو گھومنے پھرنے کا شوق نہیں ــ سب کو اچھی طرح معلوم ہے۔ آج تو حد ہی ہو گئی ــ کمال ہی کر دیا ــ"

وہ بڑی پریشان تھی اور بے اختیار بولے جا رہی تھی ۔ اس کو یہ بات بہت بری لگی تھی۔ غصّہ بھی آ رہا تھا، شرمندگی بھی ہو رہی تھی کہ اتنی مزیدار، اتنی خوبصورت فرح بھابی والی بات بھی بھول گئی تھی ۔ جو سب سے پہلے آتے ہی شہزاد کو بتانے لگی تھی

اور تقدیس چٹکیوں تالیوں کی مترنم آواز اور لڈی کے ساتھ گانوں کے سر تال میں کھوئی تھی۔

"ابھی تو صرف سات ہی بجے ہیں"۔ پھر شبانہ کو کچھ خیال آیا تو اپنی گھڑی دیکھتے ہوئے شہزاد کے سامنے کر دی، سنہری کلائی پہ سنہری گھڑی۔ لیکن شہزاد بڑی سنجیدہ صورت بنائے بڑی سنجیدگی سے کہہ رہے تھے۔

"بارہ بج رہے ہیں حضور"۔ دیکھ لیجئے اپنی آپی کی طرف۔" شہزاد نے ہزار ضبط کے باوجود جب آنکھیں اٹھائیں تو پورے چہرے پہ سرخ سرخ رنگ کے ساتھ آنکھوں کی ساری ہنسی پھیل گئی۔ صرف ہنسی ہی نہیں، صرف مسکراہٹ ہی نہیں۔ وہ تو زوردار پڑا جاندار قہقہہ لگا رہے تھے۔ ہنسی کے دوران' خوبصورت دانت نمایاں تھے۔ اور چہرے پہ حسن و جوانی کے روپ کے ساتھ شرارتی شرارتوں کا نور تھا۔ اور غیر ارادی طور پہ تقدیس کی نظر اپنی گھڑی پہ پڑی۔

"ہم گھڑی پہ نہیں — چہرے پہ بجنے والے بارہ کا بتا رہے تھے"۔ شہزاد نے تقدیس کے جھکے سر پہ ہاتھ رکھتے ہوئے جھک کر کہا۔ عرق عرق پیشانی، جھکی آنکھوں اور لرزتے ہونٹوں پہ مسکراہٹ پھیلی تو سارا چہرہ مسکرا دیا۔ تقدیس شہزاد کی شرارت کو سمجھتی تھی۔

اسی لیے وہ مسکرا رہی تھی، مزہ اٹھا رہی تھی۔
"جائیے۔ بھائی جان — ہم آپ سے نہیں بولیں گے۔" شبانہ نے بھی کچھ شرمندہ ہوتے ہوئے، خوش دلی سے ہنستے ہوئے کہا۔
وہ تقدیس کا گورا گورا ملائم ہاتھ پکڑ کر آگے کی طرف قدم اٹھانے لگی۔ سب سمجھ گئی تھی شہزاد مذاق کر رہے ہیں۔ اس لیے کھسیانی بھی ہو رہی تھی کہ جانتے بوجھتے ہوئے بے وقوف بن گئی۔ ان کی باتوں میں آ گئی۔ اور شہزاد اتنی دیر کی ضبط کی ہوئی ہنسی کو آزاد کرتے ہوئے، کھلے بازار اور ماحول سے بے نیاز قہقہے لگا رہے تھے کہ اپنے اپنے کاموں میں مصروف دکانداروں، اپنی اپنی دُھن میں مگن گاہکوں اور سیر سپاٹے کے لیے نکلے، بے فکرے لوگوں نے بھی مڑ مڑ کر دیکھنا شروع کر دیا۔ ان تینوں کے حسن و جوانی، اچھے لباس اچھے مذاق اور خوش دلی کو سب نے ہی تحسین و آفرین اور رشک کی نظروں سے دیکھا۔
"چلیے جناب! آج کچھ شاپنگ ہو جائے۔ امی حضور کی صحت و عافیت کی خوشی میں شبانہ کے پاس ہونے کے انعام میں کچھ لے کر دینے کا وعدہ پوری پوری طرح پورا کرنے کا وقت آ گیا ہے۔ ایسے ایسے تحفے آج لے کر دوں گا — کہ یادگار ہوں گے، عمر بھر

یاد رکھوں گی۔ تم دونوں — بلکہ میں بھی۔ بلکہ ساری دنیا ہی"۔ شہزاد شبانہ کا شانہ پکڑ کر اپنے ساتھ چلنے کے لیے کہہ رہے تھے۔

تقدیس دونوں بہن بھائی کے جھگڑے کے دوران چپکے سے جا کر موٹر میں بیٹھ چکی تھی — اور پلکیں جھپکے بغیر ادھر ہی دیکھ رہی تھی۔ چاروں طرف سے شفاف شیشے پر پڑتی روشنی — اور شن روشن چمکتے شیشے میں سے تقدیس کا روشن متبسم چہرہ صاف نظر آ رہا تھا۔ وہ سر پہ نیلی ساڑی کا پلو ڈالے ایک ہاتھ سے ٹھوڑی کے قریب سے پکڑے، دوسرا ہاتھ اسٹیئرنگ پر رکھے یوں بے حس و حرکت بیٹھی تھی کہ شیشے کے اندر فریم میں جڑی تصویر، ہونٹوں پہ مسکراہٹ اور چمکیلی آنکھوں کے گرد سیاہ پلکوں کی جھالر — حسن کا یہ انداز بڑا ہی دلکش، بڑا ہی دلفریب تھا۔

"ہم نہیں جاتے آپ کے ساتھ — لے کر کچھ بھی نہیں دیتے۔ بس ٹرخاتے رہتے ہیں، ٹالتے رہتے ہیں"۔ شبانہ ایک جھٹکے سے پرے ہٹ گئی اور منہ پھلائے روٹھی روٹھی سی تھی۔ اپنی گاڑی کا دروازہ کھولا اور جھک کر بیٹھنے لگی۔ تقدیس پہلے ہی ڈرائیونگ سیٹ پر ڈرائیو کے لیے تیار تھی۔

"چلیے آپی۔" شبانہ نے بڑی سنجیدگی سے کہا۔ آنکھوں میں بھی اور چہرے پر بھی خفگی نمایاں تھی۔ شبانہ کو تو شہزاد نے ہاتھ پکڑ کر ایک طرف کیا اور ہاتھ بڑھا کر تقدیس کا بھی نازک نازک لمبی لمبی انگلیوں اور لمبے ناخنوں پر لگی کیوٹیکس لگا ہاتھ پکڑ کر آہستہ سے باہر نکلنے کا اشارہ کیا۔ وہ خاموشی سے دانتوں میں انگلی دبائے مسکراتی رہی۔ یہ اس کی ایک خاص ہی دلنواز ادا تھی۔ اندازِ دلربائی تھی۔ نوکیلی پلکوں کے سائے دہکتے رخساروں پر پڑتی روشنیوں میں دراز دراز ہو رہے تھے۔

شہزاد کے بازو کے سہارے کھڑی تقدیس!

اور منہ پھلائے ناراض شبانہ؟

شہزاد نے نگاہوں میں شرارت اور ہونٹوں پہ ہنسی لیے، آگے کی طرف قدم بڑھائے۔

"آیئے۔" شہزاد نے پلٹ کر دیکھا۔ ان کا خیال تھا کہ دونوں پیچھے آ رہی ہیں۔

"چلو نا — ورنہ — ناراض ہو جائیں گے۔" تقدیس نے شبانہ کا ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا۔

"بھائی جان! اب کچھ لے کر بھی دیجئے نا۔" شہزاد نے اتنے

وسیع و عریض بازار کا پورا چکر لگایا۔ ساتھ میں دونوں لڑکیاں بھی تھیں۔ شبانہ کی سفید ساڑھی کی فرمائش کے باوجود بھی کچھ نہ خریدا۔ وہ بہت پتلی اور اونچی ایڑھی کا نازک ڈوریوں کا سنہری سینڈل پہنے تھی۔ تکلیف دہ جوتی اور بازاروں میں اتنا زیادہ چلنے کی عادت نہ تھی۔ تھک گئی۔ پاؤں درد کرنے لگے۔ پہلے چھالے پڑے اور پھر پھوٹنے لگے۔ واقعی بڑی تکلیف ہو رہی تھی۔ وہ بار بار شہزاد کے کندھے پر ہاتھ رکھے کبھی اس کا بازو پکڑ کر سہارا لے رہی تھی۔

"ساڑھی کے علاوہ کچھ اور بتاؤ بھی تو کیا لوگی" شہزاد نے ادھر ادھر دکانوں میں شیشے کی الماریوں میں سجی بے شمار چیزوں کو دیکھتے ہوئے بڑی لاپرواہی سے کہا۔

"وہی سفید ساڑھی پسند ہے۔ دو ساڑھیاں لے دیجئے ہم دونوں کو" شبانہ نے ہوا میں اڑتا آنچل سنبھالتے ہوئے کہا۔ اور پاؤں کی تکلیف کی وجہ سے پھر شہزاد کا بازو تھام لیا۔

شہزاد کے دائیں بائیں تقدیس اور شبانہ تھیں۔ وہ درمیان میں لاپرواہی سے، ہنستے مسکراتے چل رہے تھے۔

"نہ نہ بھئی۔ اتنی مہنگی چیزیں نہیں" شہزاد نے انگلی

سے اشارہ کیا۔ "بس جی ۔۔ اٹھنی، چونی والی کوئی چیز لے کر دے سکتا ہوں۔ مثلاً کوئی ننی سی گڑیا ۔۔ چوں چوں کرتی چڑیا ۔۔ یا پھر قسمت کی پڑیا۔" شہزاد نے تقدیس کے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے ذرا جھک کر کہا۔

شبانہ کو سچ مچ غصہ آ گیا ۔۔ بہت زیادہ غصہ ۔ چلتے چلتے پاؤں تھک گئے تھے۔ سینڈل کی پتلی پتلی ڈوریاں نازک پیروں میں دھنستی جا رہی تھی۔ چبھتی جا رہی تھیں۔ چھالے بن گئے تھے، پانی سے بھرے آبلے اس کے پیروں میں ۔۔ اور نازک تقدیس کی نازکی ۔۔ کہ جن کے آتشِ گل سے چھالے پڑ جاتے ۔۔ تو اب اس بے چاری کا کیا حال ہو سکتا ہے ۔ تکلیف واقعی بہت تھی۔ شبانہ کی طرح اس کے پاؤں کا کوئی حال نہیں تھا۔ لیکن صبر و ہمت بہت تھا اس میں ۔ اور غصہ بھی بہت کم ہی آتا۔ پھر سمجھدار بھی بہت ۔۔ شبانہ سے عمر میں بڑی بھی ۔۔ شہزاد کی عادت کو جانتی بھی تھی کہ اپنی شرارت میں سب کچھ بھول جاتے ہیں۔ اس وقت بھی ان کو خیال۔ نہ تھا کہ نازک اندام لڑکیوں کے نازک نازک پاؤں کے ساتھ نازک سینڈلوں نے کیا سلوک کیا ہے اور تکلیف سے ان پر کیا بیت رہی ہوگی۔ دونوں میں سے کسی نے بھی ان کو بتایا

نہیں — کچھ دکھایا ہی نہیں — تو وہ کیسے جان جاتے۔ اگر علم ہوتا تو وہ جان بوجھ کر یہ تکلیف نہ دیتے — اپنی پیاری بہن کو، اپنی پیاری تقدیس کو۔

"بس اب رہنے دیجئے — ہمیں کچھ بھی نہیں چاہیئے" غصے میں بھری شبانہ آنکھیں جھکائے پلٹی۔ "آجائیے آپی جی! آپ بھی" تقدیس کے شانے پر سے شہزاد کا ہاتھ ہٹاتے ہوئے بولی۔ وہ تو واقعی بہت ناراض نظر آرہی تھی۔ کچھ غصہ، کچھ پاؤں کی تکلیف آنکھوں میں آنسو آگئے۔ چہرے پہ بھی دھندلے بادل چھا گئے۔ آخر حد ہوتی ہے ہر بات کی — شہزاد بات بات پہ ستاتے بھی تو بہت تھے۔ تقدیس نے مسکرا کر شہزاد کی طرف دیکھا۔ ہونٹوں پہ خاموشی اور آنکھوں سے گفتگو۔

"ختم کیجئے اب اس شرارت کو — بے چاری کو بہت ستالیا!"

جیسے شہزاد تقدیس کی نظروں ہی نظروں میں ہدایت کو جان گئے۔ بات سمجھ میں آگئی — انہوں نے شبانہ — اپنی روٹھی — بسورتی بہن کے گرد بازو پھیلاتے ہوئے اپنے ساتھ لگالیا۔ ساتھ ہی تقدیس کھڑی تھی، شبانہ کا ہاتھ پکڑے۔

"اوہو — روٹھ گئی؟ — ہم تو ایسے ہی مذاق کر رہے تھے۔ ہماری

عادت کو جانتی ہو۔ پھر بھی روٹھ جاتی ہو"۔ شہزاد بڑے پیار سے بہن کو منا رہے تھے اور وہ بھی بڑی جلدی مان گئی۔ بھائی کے شانے پہ سر رکھے مسکرا دی۔ روٹھے روٹھے چہرے پہ مسکراہٹ بڑی پیاری لگ رہی تھی۔ پھر خوبصورت آنکھوں کی نمی تو ایسے میں اور بھی دلکش نظر آ رہی تھی۔

ایک بار پھر صلح ہو گئی۔ دن میں ہزار بار لڑائی، اور بار بار صلح ــــ یہ تو ہوتا ہی رہتا تھا ــــ ہر بار صلح ہو جاتی۔

بھولی سی لڑکی دل کی بہت صاف تھی۔ پھر بھائی سے محبت بھی اتنی زیادہ تھی کہ بس بہت ہی زیادہ۔ ان کا چڑانا، ستانا، رُلانا بھول کر ہنسنا، مسکرانا شروع کر دیتی۔

لڑائی کے بعد، صلح صفائی کے بعد تینوں ہنستے، مسکراتے، قہقہے لگاتے آگے بڑھے، پھر بازار میں گھومنے لگے۔ ایک طرف شبانہ اور دوسری طرف تقدیس اور درمیان میں سربلند، سرفراز، باوقار، بامراد شہزاد ــــ دائیں طرف چوڑیوں کی دکانیں تھیں۔ پورا بازار چوڑیوں کا تھا۔ شیشے کی بڑی بڑی الماریوں کے اندر، باہر بڑے قرینے سے، بڑے سلیقے سے رکھی تھیں۔ الماریوں کے اندر لگی ٹیوبوں کی روشنی میں رنگا رنگ سماں تھا۔ بے شمار گچھے

ڈھیروں کی صورت میں فرش پر پڑے ہیں۔ لاتعداد لچھے دیواروں پر لٹکے تھے چھتوں پر ٹنگے تھے۔ عورتوں، لڑکیوں، چھوٹی چھوٹی بچیوں کا ہجوم تھا۔ دکان بہت بڑی تھی۔ لیکن ہر دکان پہ یہی گمان ہوتا تھا کہ ساری دنیا آج یہاں ہی جمع ہو گئی ہے۔ کسی کے بھائی کی شادی تھی، کسی کی بہن کی۔ کوئی سہیلی کی شادی کی تیاری میں تھی، کوئی سہیلی کی بہن کی۔ کوئی ماں بیٹیوں کو چوڑیاں پہنوا رہی تھی۔ کہیں ساس بہو، نندوں کے درمیان بیٹھی شرما رہی تھی۔ کہیں آنے والی بہو کے لیے چوڑیاں پسند ہو رہی تھیں تو کہیں سسرال گئی بیٹی کے لیے انتخاب ہو رہا تھا۔ اور بعض بے فکری خواتین محض چوڑیاں پہننے کے شوق میں اپنی اپنی پسند کی چوڑیاں پہن رہی تھیں۔ اور اپنے مختلف رنگوں کے کپڑوں، جوڑوں اور ساڑھیوں کے ساتھ پہننے کے لیے علیحدہ ڈبوں میں پیک کروا کے ساتھ لے جا رہی تھیں۔ چھوٹی چھوٹی بچیاں اپنے ہی جھگڑوں میں پڑی تھیں کہ وہ معصوم فیصلہ ہی نہ کر پا رہی تھیں کہ کونسے رنگ کی، کونسے ڈیزائن کی چوڑیاں اچھی ہیں۔ کبھی ایک لچھے پہ ہاتھ رکھتی تو کبھی دوسرے پہ۔ کبھی دیواروں پہ لٹکی چوڑیوں کی طرف دیکھتیں تو کبھی چھت میں ٹنگی پر دل ہوتا۔

تو کبھی الماریوں کی طرف اشارہ کرتیں۔ اسقدر نمونے، ڈیزائن اور ورائیٹی تھی کہ بچیاں بے چاری تو ایک طرف بڑے بھی نسٹ پٹیا کر رہ جاتے۔

شہزاد بھی تماشہ دیکھنے کے لیے کھڑے ہو گئے۔ بڑا دلچسپ نظارہ تھا۔ قابل دید وشنید — خواتین اپنی اپنی پسند کی چوڑیاں نکالتیں — بار بار دیکھتیں، ادپر ہاتھ پھیرتیں — ساتھ والی سے مشورہ کرتیں۔ رنگ کو پرکھتی، چمک کو دیکھتیں، پھر چھوڑ دیتیں، پھر پکڑ لیتیں۔ ایک نہیں تو دوسری پہن لیتیں۔ کوئی چوڑیاں گن کر دام چکا رہی تھیں، کوئی ابھی پہن رہی تھیں۔ کچھ صرف پسند کر کے دام پوچھ کر واپس جا رہی تھیں۔ ننھی منی بچیاں تو اتنی خوش تھیں کہ جھم جھم چمکتی چوڑیوں سے زیادہ ان کے چہرے چمک رہے تھے۔ جب جلدی جلدی دونوں ہاتھوں میں، بھر بھر کے کلائیاں چوڑیاں پہن چکتی تو دونوں ہاتھ اوپر اٹھائے چہرے سے لگائے، بڑے فخر سے، بڑے ناز سے، خوشی سے بے قابو ہنستی کھلکھلاتی دکان سے باہر آ رہی تھیں۔

"چلو — آؤ — تم دونوں بھی چوڑیاں پہن لو۔" شہزاد نے اتنا دلچسپ منظر پہلی بار دیکھا تھا۔ چوڑیوں کی اہمیت اور قدر و قیمت

کا اندازہ پہلی بار ہوا تھا۔ یوں دیوانہ وار لوگ ٹوٹے پڑ رہے تھے کہ اس نظارے میں بڑی کشش نظر آئی۔ بڑا لطف آرہا تھا۔ خود بھی بڑے متاثر نظر آرہے تھے۔ اس لیے انہوں نے دعوت دے دی تھی، شبانہ اور تقدیس کو۔

"اچھا جی! میں روپہلی سفید چوڑیاں پہنوں گی۔ اور ساتھ میں وہی سفید ساڑھی بھی روپہلی بیلوں والی لے کر دیجیے گا، بھائی جان!" شبانہ فوراً راضی ہو گئی۔ خوشدلی سے آگے بڑھی۔ یہ منظر واقعی اتنا پُر لطف، پُر کشش تھا کہ ہر کوئی چوڑیاں پہننے کو تیار ہو جاتا۔

اپنی فرمائش دہراتے ہوئے شبانہ تقدیس کو ساتھ لیے پلٹ کر سر اونچا کیے اپنے دراز قامت بھائی کی طرف دیکھ رہی تھی۔

"آئیے — آئیے صاحب، تشریف لائیے — چوڑیاں پہنا دوں۔"

موٹا تازہ، سیاہ فام دکاندار، سفید کپڑوں میں سیاہ و سفید کا مالک و مختار بنا بیٹھا تھا۔ بے شمار اہل کار ادھر ادھر اس کا ہاتھ بٹا رہے تھے۔ گاہکوں کو نمٹا رہے تھے۔ شہزاد کو اندر آتا دیکھ کر سب ہی ادھر متوجہ ہو گئے۔ دکاندار نے بڑے ادب سے استقبال کیا — اور رنگا رنگ چوڑیوں کے مختلف ڈیزائن

کے بڑے ڈھیروں ڈھیر، چھن چھن کرتے لچھے گھسیٹ گھسیٹ کر اپنے سامنے رکھنے لگا۔ وہ سرخ قالین پر سفید گدی رکھے اس کے اوپر بیٹھا تھا۔

"اسے بھیا۔ اب کیا صاحب کو چوڑیاں پہناؤ گے"۔ شہزاد نے ہنستے ہوئے کہا۔ اور شبانہ اور تقدیس کو لے کر اندر آ چکے تھے۔

"سرکار — بندہ تو خواتین کے لیے عرض کر رہا تھا۔ معاف کیجئے جناب! آپ کی شان میں گستاخی کی مجال ہے؟" دکاندار نے کھسیانہ پن سے ہنستے ہوئے خواہ مخواہ ہی دانت نکال دیئے۔ دراصل وہ ایسے خوبصورت گاہکوں کی آمد پہ خوش ہو رہا تھا۔ وہ شہزاد کے دلکش حسن و شباب کو، تقدیس و شبانہ کے بے داغ حسن، خوبصورت لباس و انداز کو بڑی تعریفی نظروں سے دیکھتا ہوا اپنی چوڑیاں اور بھی قریب کرنے لگا۔ تقدیس کا توصیفی، ملکوتی حسن، چہرے پہ نگاہوں میں ایسی آبدار چمک کہ نگاہ ہی نہ ٹھہرتی تھی۔ قدرت کی فیاضی پہ حیران اور دل ہی دل میں آنکھوں ہی آنکھوں سے صدقے قربان ہو رہا تھا۔

"بڑا عمدہ مال ہے صاحب"۔ صاف ستھرے، بڑے مہذب بڑے

مؤدب دکاندار نے بڑی تہذیب سے کہا۔

"چھوٹے — ابے — کرسیاں صاف کر — دیکھتا نہیں بیگم صاحبہ کھڑی ہیں۔" اس نے تقدیس کے ماتھے پہ جھم جھم جھمکتی بندیا، گہری لپ اسٹک پر گہری نظر ڈالتے ہوتے کہا۔

"تشریف رکھیئے جناب!" آٹھ دس سال کے صاف ستھرے ملازم لڑکے نے کندھے پہ پڑے جھاڑن سے سیاہ رنگ کا صوفہ صاف کرتے ہوتے ادب سے کہا، اور بڑی تہذیب سے ایک طرف کھڑے ہو کر باپ سے پوچھا۔

"بابا — کیا لاؤں — ٹھنڈا یا گرم۔" اسے معلوم تھا کہ اس قسم کے گاہکوں کو ابا ضرور کچھ نہ کچھ پیش کیا کرتا تھا، اور اس کو تو ویسے بھی یہ خوبصورت لوگ بہت پیارے لگ رہے تھے۔ خاص طور پہ دلہن کو تو جھک کر دیکھ رہا تھا۔

"نہیں — نہیں بھئی — شکریہ — ہم ابھی پانی پی کر آرہے ہیں۔" شہزاد نے ہاتھ کے اشارے سے منع کرتے ہوئے کہا۔ لیکن لڑکا شہزاد کے بجائے باپ کا اشارہ سمجھ کر جا رہا تھا اور مڑ مڑ کر ان لوگوں کو ہی دیکھ رہا تھا۔

"سفید سنہری کام والی چوڑیاں نکال دو۔" شبانہ نے بیٹھتے

ہوئے کہا۔ تقدیس بھی ساتھ ہی بیٹھی تھی۔ شہزاد رنگ برنگ چوڑیوں سے، رنگیں بہاریں بکھیرتی، جگمگ جگمگ، جگمگاتی چوڑیوں سے بھری الماریوں کے درمیان میں کھڑے تھے، اور موٹر کی چابی کا چھلہ انگلی میں ڈالے گھما رہے تھے۔

دکاندار نے شبانہ کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں دبا کر ماپ کا اندازہ لگایا، اور اپنے کارندوں کو کہنے کے بجائے خود ہی اپنی گدّی گھسیٹ کر تھوڑا گھوم کر شبانہ کے سامنے اس کے اور تقدیس کے پاؤں کے قریب آ بیٹھا تھا۔ بڑے ماہرانہ انداز میں گوری گوری کلائی میں شبانہ کی پسند کی اس کی مرضی کے مطابق درجن بھر چوڑیاں ڈال دیں۔

"اور دوسرے بازو کے لیے؟" شبانہ کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھ رہا تھا لیکن وہ پیچھے ہٹ گئی تھی وہ اتنی ہی پہننا چاہتی تھی۔

"اور کیا نکالوں ــ سرکار! کامدانی کی سُرخ روپہلی، سنہری چوڑیاں بڑی شاندار ہیں جناب ــ ایکدم فسٹ کلاس"۔ اپنی دائیں ہاتھ کی دو انگلیوں سے چھوٹا سا دائرہ بناتے ہوئے دونوں آنکھیں بند کر کے بولا۔ اس کا انداز بڑا مسرور بڑا مسحور سا تھا۔

تقدیس کی دمکتی پیشانی پہ چمکتی بندیا۔ سُرخ ہونٹوں پہ سرخی دہکتے رخسار، پل پل گرتی، اٹھتی پلکیں، عمدہ لباس۔ شاندار زیورات پہ نظر ڈالتے ہوئے پہلے تقدیس اور پھر پلیٹ کر سرا و نچا کر کے شہزاد سے پوچھا — کہ تقدیس تو شرمائی شرمائی، لجائی لجائی سی خاموش مگر متبسم، سر جھکائے، پلکیں گرائے، اپنی سنہری ڈوریوں کے سینڈل میں گورے گورے، خوبصورت رنگ کی ناخن پالش لگے پاؤں پہ نظریں جمائے تھی۔ حوروں کی طرح پُرنور، پاکیزہ، دلکش، چہرے پہ بڑی دلفریب بڑی دل آویز مسکراہٹ تھی۔ دل کی گھبراہٹ کا عکس اور پسینے کے شبنمی موتی، حسن و معصومیت میں اور بھی اضافہ کر رہے تھے۔

بال بچوں والا، درمیانی عمر کا دکاندار یہی سمجھا کہ نئی نویلی شرمیلی دُلہن کچھ نہ بتائے گی۔ اپنے سوہنے، من موہنے پرنیم کی مرضی مان جائے گی۔ تقدیس کے انداز بھی تو ایسے ہی تھے۔

”ہاں — ہاں — سُرخ روپہلی چوڑیاں پہنا دو“ شہزاد نے متبسم لبوں کو ذرا دباتے ہوئے تقدیس کی طرف دیکھا — اور تقدیس نے بے بسی سے شرمیہ چہرے پہ نظر ڈالی — بے چینی سے پہلو بدل کر رہ گئی۔

"سرخ نہیں — شہزاد —" دل نے کہا۔ لیکن سر جھکائے خاموش رہ گئی — تقدیس انکار نہ کر سکی۔

"اور ڈالوں سرکار —" درجن بھر چمکتی چمکتی چوڑیاں، تقدیس کی ملائم، گلابی کلائی پر گنتے ہوئے خالص تاجرانہ انداز میں تقدیس سے پوچھا۔

"نہیں — بس —" تقدیس نے اپنا ہاتھ پیچھے کرتے ہوئے سر کے اشارے سے کہا — اور اپنی گھڑی چوڑیوں کے آگے باندھنے لگی۔ جو دکاندار نے اتار کر ان کے دوسرے ہاتھ میں دے دی تھی۔

"ایسی ہی — اتنی ہی آگے اور ڈال دو، اور دوسری بازو میں بھی برابر کر دو۔" شہزاد دکاندار سے کہہ رہے تھے اور ہنسی روکنے کے لیے کھانسنے لگے۔ بلکہ منہ پھیر کے باہر دیکھنے لگے۔ پھر دروازے سے باہر آ گئے۔ کھانسی کے بہانے منہ پر رومال رکھے ہنس رہے تھے کہ ہنسی روکے نہ رک رہی تھی۔ ڈھیروں ڈھیر چوڑیاں پہنتی تقدیس کی لاچاری دیکھ کر مزہ آ رہا تھا۔ خاموش تھی کہ فطری حجاب اور شہزاد کی دل شکنی کے خیال نے زبان کھولنے نہ دی۔ شبانہ بھی بڑی خوشی خوشی، بڑی دلچسپی اور شوق بڑے انداز میں نگاہوں میں پیار

بھرسے یہ منظر دیکھ رہی تھی۔ بڑا ہی خوبصورت بڑا ہی اچھا لگ رہا تھا۔ دکاندار کی منگوائی ہوئی کوک کی بوتل پینے کے بعد ہاتھ میں تھی۔

"بھائی جان —— آج فرح بھابی نے ——" ایکدم شوخی میں چہکتے ہوئے شبانہ نے شہزاد سے کچھ کہنا چاہا۔ فرح بھابی کی آج شام کی شرارت اور پھر ساری کارروائی بتانا چاہی۔ وہ تو آتے ہی شہزاد کو دیکھتے ہی —— بلکہ بن دیکھے ہی —— شام والا سارا قصہ، اپنے گانے بجانے، اپنے شغل اور خوشی منانے کا سارا قصہ سنانے لگے تھی۔ لیکن شہزاد نے آتے ہی اپنی عادت کے مطابق ستانا شروع کر دیا۔ شبانہ کو غصہ آ گیا۔ لڑائی ہوئی، پھر صلح صفائی ہوئی غرض اس طرح وہ اتنی مزیدار بات بھائی جان کو بتا ہی نہ سکی۔

"خاموش"۔ شہزاد نے اپنے ہونٹوں پہ انگلی رکھتے ہوئے اشارہ کیا۔ خوبصورت بڑی بڑی آنکھوں میں شرارت بھری تھی۔ شوخیوں کے نور سے چور تھیں۔ وہ چوڑیاں پہننے کا یہ منظر۔ اتنا خوبصورت، گلرنگ، گلریز، بہار بر بہار نظارہ بڑی محویت سے دیکھ رہے تھے۔

تقدیس کا انداز کئی کئی رنگ بکھیرتا، سرخ و گلابی چہرہ، نہ

جانے وہاں کیا کچھ تھا جو شہزاد دل میں لبائے، آنکھوں میں چھپائے کھڑے تھے کہ اس میں کوئی دخل اندازی مناسب نہ تھی۔

"سہاگ بندھن ہیں جی چوڑیاں — آج دلہن حضور سے بسم اللہ ہوئی ہے، بڑی برکت ہوگی ہمارے مال میں" دو دو درجن چوڑیاں دونوں بازوؤں میں ڈال کر دکاندار طلائی بازو بند آگے ڈال رہا تھا۔ وہ داد طلب نظروں سے دیکھتے ہوئے اپنے مال کے ساتھ ساتھ شہزاد کے نادر مال انمول خزانے کی بھی تعریف کر رہا تھا۔

"اللہ پاک سہاگ کی خیر رکھے۔ یہ چاند سورج کی جوڑی سلامت رہے — دلہن حضور! چوڑیاں پہن کر رکھا کیجئے۔ یہ تو سہاگ بندھن ہوتی ہیں۔ سرخ چوڑیاں — پر آج کل کی لڑکیاں —— انگریزی فیشن میں آکر کہاں — پہنتی ہیں؟"

ایک بڑی بی جو عمر اور حلیے سے دکاندار کی والدہ یا ساس لگ رہی تھیں — باقی گاہکوں کے ہجوم سے فارغ ہو کر سلیپر گھسیٹتی ادھر آگئیں — اپنے بڑے امیر کبیر، بڑے رئیس، حسین و جمیل بڑے وجیع و شکیل گاہکوں کی طرف — اڑسی کٹائی کا دھاری دار، چوڑی دار پاجامہ۔ ڈھیلا ڈھالا کرتہ، اوپر آگے سے کھلی صدری پہنے تھیں۔ ململ کے چنے کاسنی دوپٹے پر اس عمر میں بھی سفید

گوٹہ لگا تھا، پان چباتی قریب آئیں - دونوں ہاتھوں میں چوڑیاں اور انگوٹھیاں پہنے تھیں - کانوں میں بالیاں بھی جھول رہی تھیں - جلدی جلدی پہلے تقدیس اور پھر شبانہ کی بلائیں لیں، سر پہ پیار کیا اور پھر شہزاد کی طرف بڑھیں، ایڑیاں اونچی کیے، گڑیا سی بڑھیا اپنے آگے جھکے دراز قامت شہزاد کی بلائیں لے رہی تھیں - ان کے سر کو چوم رہی تھیں -

"بٹیا آپ بھی خیال رکھا کریں - اماں سے بھی کہنا، دلہن کو، بہو کو چوڑیوں کے بغیر نہ رکھا کریں ۔" سر پہ ہاتھ پھیرتے ہوتے بڑی بی شہزاد کو سمجھا رہی تھیں -

اور !

تقدیس کا گلابی چہرہ اور بھی سرخ سرخ ہوتا جا رہا تھا - پسینے کے قطرے، یہ شبنم کے موتی اور بھی چمک اٹھے تھے - سر اور بھی جھک گیا تھا - شرم کے مارے برا ہی حال تھا - دکاندار اور اس کی والدہ کی باتوں پر — کچھ کہہ بھی نہ سکتی تھی، چپ ہی رہی، بس سنتی رہی - من ہی من پھوٹتی پھلجڑیاں، یہ موتی، یہ تارے چنتی رہی - شہزاد اور شبانہ ہنستے رہے - خوش ہوتے رہے - خوش تھے وہ دونوں بہت خوش - اور تقدیس ان دونوں سے

نظریں چراتی، چوڑیوں کو آنچل میں چھپاتی، جھکی جھکی سی بڑے پیارے انداز میں اُٹھ کر باہر آ گئی۔ شبانہ بھی ساتھ ساتھ دونوں گاڑی میں آ کر بیٹھی تھیں۔ شہزاد بھی چوڑیوں کی قیمت ادا کر کے آئے اور اپنی موٹر کے پاس کھڑے تھے۔

شبانہ کی کار آہستہ چلتی جب ان کے قریب سے گذری تو تقدیس کی طرف کے کھُلے شیشے میں اندر مُنہ کر کے بولے۔

"دکاندار کیا کہہ رہا تھا۔ بڑی بی کا پیغام گھر جا کر دے دیجئے گا۔" مسکراتے گنگناتے ہوئے کہہ رہے تھے، شرارت اور مسرت سے بھرپور، خوشیوں کے نور سے یہ چہرہ چمک رہا تھا۔ چہرے پہ کئی روشنیاں، کئی رنگ پھیل رہے تھے۔

"اور کیا کرو سولہ سنگھار۔" گاڑی کے اندر ہاتھ ڈال کر تقدیس کے سر کو محبت سے جھٹکا دیتے ہوئے قہقہہ لگا رہے تھے۔

"آپی پیاری — کتنی پیاری باتیں کرتے ہیں یہ لوگ — پہلے فرح بھابی نے — اب چوڑیوں کی دکان پہ — آج میں بڑی خوش ہوں — بڑی خوش — سچ — آج ہی امی حضور کو ابھی جاتے ہی ساری باتیں بتاؤں گی۔" شبانہ تقدیس کو اپنے بازو کے حلقے

میں لیے تھی۔ بازار تھا ورنہ لیٹ کر نہ جانے کتنے پیار کر ڈالتی۔ بڑی خوش نظر آرہی تھی۔ سٹیرنگ سنبھالے نظریں سامنے جائے تھی کہ بازار میں ہجوم بہت زیادہ تھا۔ گاڑی بڑی احتیاط اور آہستہ رفتار سے چلانا پڑ رہی تھی۔ ذرا دور سامنے بتیوں والا چوک بھی آرہا تھا اور دوسری طرف کی ٹریفک رُکی ہوئی تھی۔ تقدیس کا سارا وجود گھبراہٹ میں، شرم و حجاب میں لرز رہا تھا۔ پسینے آرہے تھے۔ دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ کانوں میں فرح بھابی کی باتیں، لڑکیوں کا گانا، ناچنا، ہنسنا ہنسانا، فقرہ بازی، چھیڑ چھاڑ، دکاندار اور اس کی ماں کی باتیں گونج رہی تھیں۔

پھر شبانہ اور شہزاد کے خوشیوں سے چور، مسرتوں کے نور سے بھرپور کندن کی طرح چمکتے چہرے گھوم رہے تھے — وہ آنکھیں بند کیے اپنی سیٹ کے نرم سہارے پہ سر رکھے تھیں۔

بوجھل سنہری پردہ ہٹا کر تقدیس اور شبانہ، شانہ بہ شانہ ڈرائینگ روم میں داخل ہوئیں۔ پردوں کے ساتھ کے سنہری مخملیں صوفے، ریشمی نرم گدیاں، قیمتی فرنیچر، چینی چاندی، پیتل کی آرائشی اشیاء، مجسمے، کھلونے، قدرتی مناظر کے فریم، افرادِ خانہ

کی تصاویر فریم میں لگی مختلف مناسب جگہوں پہ پڑی تھیں۔ کئی اقسام کے بڑے خوبصورت مصنوعی پھول جو بالکل اصلی لگتے تھے گلدانوں میں لگے تھے۔ موسم کے تازہ پھول اپنی تروتازگی اور چاروں طرف مہکتی خوشبو سے اپنی زندگی اور زندہ دلی کا ثبوت دے رہے تھے، گلدانوں میں لگے مسکرا رہے تھے۔ پھولوں سے زیادہ تروتازہ، زندہ دل، زندگی سے بھرپور تبسّم اور چہروں پہ گلرنگ نور لیے" دونوں لڑکیاں سعدیہ بیگم کے پاس پہنچ گئیں۔ ہنستی مسکراتی لڑکیاں، مہکتی تقدیس، چہکتی شبانہ۔

سنہری مخملیں دیوان پہ سعدیہ بیگم مخمل کے گاؤ تکیے کے سہارے بیٹھی تھیں۔ چاندی کا پاندان سامنے کھلا پڑا تھا۔ اپنے ہاتھ سے پان بنا رہی تھیں۔ وہ ہوشیار رنگ کے قیمتی مگر سادہ لباس میں تھیں سلور رنگ کا بڑا قیمتی سلیم شاہی جوتا نیچے سنہری قالین پہ دیوان کے قریب پڑا تھا۔

آداب تسلیم کے بعد شبانہ نے امّی کی منگوائی ہوئی تمام اشیاء کے بنڈل پیکٹ، بڑے چھوٹے بے شمار ڈبے ان کے سامنے رکھوا دیئے تھے۔

"بڑی دیر کر دی بیٹے۔" سعدیہ بیگم نے بڑی میٹھی، بڑی ملائم،

بڑی نرم آواز میں پوچھا۔ کتنی محبّت بھری، کتنی شفقت بھری نظروں سے دیکھ رہی تھیں۔

"امّی حضور! دراصل بازار میں بھائی جان مل گئے تھے۔ پہلے تو بہت ستایا، مجھے تو رُلایا بھی، پھر ہمیں دونوں کو چوڑیاں پہنوائی ہیں۔" میری سفید — آپی کی سرخ۔" شبانہ اپنا سینڈل اُتار چکی تھی۔ پاؤں میں تکلیف بہت زیادہ تھی۔ اس لیے اب دیوان کے قریب گھٹنوں کے بل کھڑی تھی۔ اپنا چوڑیوں والا بازو سعدیہ بیگم کے گھٹنے پہ رکھتے ہوتے خوشیوں سے چھکی خوبصورت چہرہ چمک رہا تھا، اور چمکیلی چوڑیاں اس چمکتے چہرے کے عکس سے اور بھی چمکنے لگیں اور چہرہ چوڑیوں سے بھی زیادہ چمک اُٹھا۔

"تقدیس بیٹی — لائیے تو آپ کی چوڑیاں بھی دیکھوں!" سعدیہ بیگم نے اپنے پیچھے خاموش کھڑی تقدیس کا ہاتھ پکڑتے ہوتے اپنے سامنے دیوان پہ بٹھا لیا۔ شبانہ چوڑیوں والے بازو کے ساتھ ہی اپنا سر بھی امّی کی گود میں رکھے ہوتے تھی۔ اور تقدیس دونوں ہاتھوں پہ چوڑیوں کے اوپر ساڑھی کا پلّو لپیٹے تھی۔

"بہت پیاری — بہت خوبصورت ہیں — اللہ مبارک کرے۔" سعدیہ بیگم نے پلو ہٹا کر چوڑیوں پر ہاتھ پھیرتے ہوتے کہا۔ انہیں

دونوں لڑکیوں کی چوڑیاں بہت پسند آئی تھیں۔ خاص طور پہ تقدیس کی کلائیوں میں بھری بھری، ڈھیروں ڈھیر چوڑیاں، کونسے جذبے جاگ اٹھے۔ دل میں کونسی خواہش مچلنے لگی تھی کہ اس کے دونوں ہاتھ اوپر اٹھا کر چوڑیوں کو چوم لیا۔ پھر آنکھوں سے گالوں سے لگانے لگیں۔ بے خودی میں تقدیس کو بھی دو تین بار سینے سے لگا لگا کر چوم چوم لیا۔

شبانہ یہ منظر دیکھ رہی تھی۔

اور تقدیس!

آنکھیں بند کئے بھی خالہ کے چہرے پہ جذبوں کی یلغار، محبتوں کی پھوار اور مسرتوں کی بھرمار دیکھ رہی تھی۔ ان کی خواہشوں کو ان کے جذبوں کو دل میں محسوس کر رہی تھی۔ سب سمجھ رہی تھی۔

"امّی حضور! آج بڑا مزہ آیا۔" شبانہ نے امّی کو والہانہ انداز میں تقدیس کو پیار کرتے دیکھ کر فرح بھابی والی بات، دکاندار اور اس کی ماں والی ساری بات بتانا چاہی۔ آتے ہی امّی کے سامان کی دیکھ بھال، پڑتال کی وجہ سے بھول گئی تھی۔

فوزیہ بیگم قرمزی رنگ کے سوٹ میں ہمرنگ دوپٹہ گلے میں ڈالے اندر آئیں۔ وہ رات کے کھانے کے لیے خانساماں کو خاص ہدایت

دے کر آتی تھیں۔ ایک آدھ چیز اپنے ہاتھ سے بنانے اور کچھ اپنی نگرانی میں بنوانے کے لیے باورچی خانے میں گئی تھی کہ ظفر نیازی تھوڑی دیر میں آنے والے تھے۔ وہ پندرہ دن کی چھٹی پر آ رہے تھے۔ کام کی زیادتی کی وجہ سے طبیعت کچھ خراب تھی۔ سستی اور کمزوری محسوس کرتے تھے۔ اس لیے سعدیہ بیگم کے بار بار کے اصرار اور پیار بھری ہدایت پر آرام کی غرض سے رخصت لے لی تھی۔

شبانہ نے جلدی سے کھڑی ہو کر خوشی خوشی اپنی چوڑیاں دکھائیں۔ پھر تقدیس کے دونوں بازو فوزیہ بیگم کے سامنے کر دیئے۔ فوزیہ بیگم نے بڑے شوق سے دیکھیں۔ بڑی تعریف کی دونوں کی چوڑیوں کی۔ تھیں بھی واقعی بہت پیاری، بڑی خوبصورت۔

"بڑی اچھی ہیں بھئی آپ دونوں کی چوڑیاں — لیکن ایک بات ہے کہ دونوں نے ایک جیسی کیوں نہ پہنیں۔ جبکہ کپڑے ایک جیسے تھے۔ شبانہ آپ نے بھی سرخ ہی پہن لی ہوتیں۔"

فوزیہ بیگم اور سعدیہ بیگم بچپن سے جب بھی کوئی چیز خرید کر لاتیں یا منگواتیں دونوں لڑکیوں کو ہمیشہ ایک جیسی چیز — دونوں میں تین سال کا فرق تھا لیکن ماپ تقریباً ایک سا ہی تھا۔ دونوں ہی نازک نازک سی۔ یہ تین سال کی چھوٹائی بڑائی کا اتنا پتہ ہی نہ

چلتا تھا۔

"خالہ جانی! ہم نے اپنی پسند سے پہنی ہیں اور ایسی ہی سفید ساڑھی بھی لا کر دینے کا وعدہ کیا ہے بھائی جان نے"۔ اور آپی کو بھائی جان نے اپنی مرضی اور پسند کی چوڑیاں پہنوائی ہیں۔ یہ دیکھئے ڈھیر ساری — ساری ساری باہنیں بھر گئی ہیں"۔ شبانہ بڑی بشاش تھی۔

"امی حضور۔ خالہ جانی — آج فرح بھابی نے"۔ شبانہ بڑی شوخی سے بڑی خوشی سے کہتی، چہکتی کمرے کے درمیان میں کھڑی فرح بھابی کا مذاق — اور دکاندار والی بات دہرانے لگی تھی۔ "آپی آپ بتایئے نا بھائی جان نے بھی تو تاکید کی تھی"۔

تقدیس کی تو جان ہی نکل گئی۔ جلدی سے جوتی بدلنے کا بہانہ بنا کر باہر چلدی۔ وہ پہلے ہی شبانہ سے نظر نہ ملا رہی تھی اور وہ اب سب کے سامنے کہنے پر بلکہ خود اس سے ہی کہلوانے پر تلی ہوئی تھی۔ جلدی میں دروازے سے نکلتی تقدیس اور دروازے کے اندر آتے شہزاد پردہ اٹھاتے ہوئے دونوں آمنے سامنے ٹکرا گئے۔ اور شہزاد بڑی محبت سے ان کے دونوں کندھوں پہ ہاتھ رکھے، پکڑ کر واپس لے آئے۔ خوش باش ہنستے مسکراتے تو ہمیشہ ہی رہتے

لیکن اس وقت چہرے سے بے حد، بے انتہا خوشیاں پھوٹ رہی تھیں۔ آنکھوں میں کہکشاں اُتری ہوئی تھی۔ چہرے پہ جیسے چاند کی روشن کرنوں کی افشاں چمک رہی تھی۔

"یہاں بیٹھیے — بزرگوں کے پاس"۔ شہزاد مسکرا رہے تھے اور تقدیس مومی گڑیا کی طرح سر جھکائے، پلکیں آنکھوں پہ گرائے خاموش بیٹھی، اپنے آنچل کو انگلی پر لپیٹتی رہی، کھولتی رہی۔

شہزاد نے بڑے ادب سے جھک کر پہلے امّی اور پھر خالہ کو سلام کیا، جواب میں پیار اور دُعائیں مِل رہی تھیں۔ بڑی اچھی اور بڑی پُرخلوص دُعائیں۔

"امی حضورؒ — خالہ جانی — دیکھئے تو آپی کی سُرخ بندیا کتنی پیاری لگ رہی ہے، فرح بھابی نے لگائی تھی — اور کہتی تھیں — اور چوڑیوں کی دکان — شبانہ دلی مسرت سے بڑی خوشی میں نوخیز ڈالی کی طرح لہکتی، جھومتی بولی — وہ تقدیس کے سامنے قالین پہ دوزانو بیٹھی تھی۔

"یہ لیجیے محترمہ —" شہزاد نے اپنے پیچھے کھڑے مؤدب ملازم کے ہاتھ سے ریشمی کاغذ میں لپٹا پیکٹ کھولتے ہوئے شبانہ کی گود میں جھک کر آہستہ سے ڈال دیا۔ قبل اس کے کہ شبانہ فرح

بھابی اور چوڑیوں والے کی بات دہراتی، شام والی ساری روئیداد اتنے خوبصورت اتنے رنگین واقعات جھوم جھوم کر سناتی۔ شہزاد کی لائی ہوئی اپنی پسند کی وہی سفید ساڑھی پا کر بہت خوش ہوئی۔ جلدی جلدی، خوشی خوشی ساڑھی کھول کر، پھیلا کر، اپنے ساتھ لگا کر امّی اور خالہ کو دکھا رہی تھی۔ نرم نرم ریشم پہ ہاتھ پھیرتی تو پھسل پھسل جاتے۔ تقدیس تو پہلے ہی بازار میں دیکھ چکی تھی۔ بلکہ دونوں کی مشترکہ پسند تھی۔ سفید ریشم پہ سنہری زرتار کی آڑی بیلیں اور بیلوں کے بڑے خوبصورت پھول، بڑی قیمتی، بڑی نفیس ساڑھی تھی۔

"ہماری پسند ہے — دیکھئے تو کتنی خوبصورت — ہائے بڑی پیاری۔" شبانہ بڑی خوشی سے، بڑے فخر سے بکھری ساڑھی کو سمیٹ کر اپنے گالوں سے لگا رہی تھی۔ اس کے نرم نرم ریشمی گالوں کی طرح نرم نرم ریشمی ساڑھی ہے "سجتی تو میں نے سرخ چوڑیاں نہیں بلکہ سفید پہنی تھیں — خالہ جانی — !

"میرے بھائی جان — آپ کتنے اچھے ہیں، کتنے پیارے ہیں۔ سچ میرے پیارے بھائی جان۔" شبانہ وہیں قالین پہ گھٹنوں کے بل کھڑی قریب کھڑے بھائی کی ٹانگوں سے چمٹی اوپر دیکھ رہی تھی اور شہزاد اس کے بالوں پہ ہاتھ پھیرتے مسکرا رہے تھے۔ بہن کو اتنا

خوشی دیکھ کر بہت خوش تھے۔ جھک کر دوبارہ اس کی اُجلی پیشانی کو چُوم رہے تھے۔ سینکڑوں اچھی سے اچھی ساڑھیاں، ڈھیروں ملبوسات، بے شمار لاتعداد سِلے بن سِلے کپڑے ہونے کے باوجود بھی وہ بھائی کی لائی، اپنی پسند کی ساڑھی دیکھ کر خوش تھی —— بے پناہ خوش۔ خوشی سے اُچھل رہی تھی۔ بچوں کی طرح بے ساختہ، چھوٹے چھوٹے قہقہے لگا رہی تھی۔

"اوہ۔ بھائی جان! دوسری ساڑھی کہاں ہے۔ کیا آپی کے لیے نہیں لائے؟" شبانہ کو ذرا ہوش آیا تو —— ایکدم یاد آگیا کہ اس نے تو دو ساڑھیاں لانے کو کہا تھا۔

شہزاد نے سر کے اشارے سے انکار کرتے ہوئے آنکھ سے اشارہ کیا، خاموشی رہنے کا۔

"بھائی جان —— یہ کیا ہے"۔ شہزاد کے ہاتھ میں ایک اور کافی بڑا سا پیکٹ دیکھ کر شبانہ کی توجّہ ادھر ہو گئی۔ بڑے اشتیاق سے پوچھ رہی تھی۔ پیکٹ پہ بندھا سُرخ ربن شہزاد کھڑے کھول رہے تھے۔ وہ شبانہ کو جواب دینے کے بجائے سعدیہ بیگم سے مخاطب ہوئے۔

"امّی حضور! یہ آپ کی بیٹی کے خیال سے لایا ہوں۔ سُرخ ساڑھی

بھلے وقتوں پہ کام آئے گی۔" شہزاد پیکٹ کے اوپر سے ڈوری بڑی احتیاط، بڑے لاڈ کے ساتھ کھولتے ہوئے دُور سامنے دیوار کے ساتھ ٹی وی کے پاس صوفے پر بیٹھ گئے۔ فوزیہ بیگم کو بھی ہاتھ پکڑ کر ساتھ لے گئے تھے، اپنے پاس بٹھا لیا۔ وہ بڑے شوق سے منتظر تھیں۔ سنہری کاغذ میں لپٹا پیکٹ اپنی گود میں رکھ کر تھوڑا سا کاغذ اٹھایا۔ جھم جھم کرتی سُرخ ساڑھی، بڑی بھاری، بڑی بڑھیا، بڑی قیمتی — فوزیہ بیگم کو نظر آئی۔ شبانہ بھی قریب کھڑی تھی۔ خالہ کے کندھے پہ ہاتھ رکھے، جھک کر بڑے شوق سے کاغذ کے اندر کی چیز کو دیکھنے کی کوشش کر رہی تھیں۔ تقدیس کی نظریں بھی ادھر ہی تھیں لیکن سعدیہ بیگم پہلے تو دیکھ رہی تھیں شہزاد کے ہاتھوں کی طرف آہستہ آہستہ کھلتے پیکٹ کی طرف — لیکن اب وہ بڑی گہری سوچ میں ڈوبی، افسردہ، بڑی رنجیدہ، خاموش خاموش نظر آرہی تھیں۔ وہ ساڑھی یا شہزاد کی طرف متوجہ نہ تھیں۔ سوچوں میں غرق ڈوبی ڈوبی سی آواز ابھری — خاصی لرزش تھی۔ جیسے وہ سردی سے کپکپا رہی ہیں۔

"شہزاد — بیٹے —" انہوں نے بڑی سنجیدگی سے کچھ سوچتے سوچتے کچھ کہنا چاہا۔ کچھ پوچھنا چاہا۔ بات کرنے کا انداز سوالیہ سا تھا۔ چہرے پہ گھبراہٹ تھی۔ آنکھوں میں بے چینی تھی۔ ہونٹوں پہ

سوال — اور ہمیشہ کی خنداں پیشانی پہ باریک باریک سلوٹیں۔ لیکن بہن اور بھانجی کی موجودگی میں بس شہزاد کو مخاطب کر کے رہ گئیں۔ پکار کر ہی چپ ہو گئیں۔ دل کچھ عجیب ہی انداز سے دھڑک رہا تھا۔ افسردگی میں کبھی ڈوبنے لگتا۔ کبھی غصّے میں زور زور سے دھڑکنے لگتا۔ وہ سوچ رہی تھی — اکثر شہزاد کے انداز سے، شرارتوں سے، شوخ باتوں سے، اشاروں، کنایوں سے، تقدیس سے لگاؤ کا اظہار ہوتا تھا۔ محبّت کی پیار کی پھوار برستی لگتی تھی۔ وہ تو محض شرارت کی حد تک محدود ہے۔ وہ محض عادتاً شرارت کرتے رہتے تھے۔ اس میں حقیقت کچھ بھی نہیں تھی۔ شبانہ کو چڑاتے تو ساتھ میں تقدیس کو بھی ستاتے۔

جو بات وہ سمجھ رہی تھیں — وہ — تو — وہ — تو — انہوں نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر تھامنے کی کوشش کی لیکن پھر ہاتھ روک لیے۔ وہ کسی کمزوری کا اظہار نہیں کرنا چاہتی تھیں — سارے سہانے خواب، نشیلے رسیلے سپنے ادھورے رہ گئے۔ خون خون ہو گئے تھے۔ ارمانوں کا خون، امیدوں کا خون، سرخ سرخ خون، سرخ سرخ ساڑھی — سرخیاں ان کی آنکھوں کے آگے گھوم رہی تھیں، چکّر لگا رہی تھیں، اور ان کا سر چکرا رہا تھا۔ اپنی سوچوں میں

انہیں یہ بھی تو احساس نہ تھا کہ ان کے بیٹے کی خوشی ہے۔ ان کی بیٹی کی خوشیوں کے لیے ۔ اپنی بہن کے لیے ، شبانہ بیٹی کے لیے شہزاد سُرخ ساڑھی لائے ہیں۔ ایک ہی بات بار بار ذہن میں آ رہی تھی۔ شبانہ کو اس کی پسند کی ساڑھی لادی۔ ایک اور بھی اٹھا لاتے۔ لیکن کیا خیال کرے گی فوزیہ۔ تقدیس کیا سوچتی ہو گی۔ معصوم سی بچی انہیں شبانہ پیاری تھی ، ان کی بیٹی تھی۔ ان کی دنیا تھی بن باپ کی بچی۔ ان کی اپنی بڑی چہیتی بڑی لاڈلی ، نازوں نخروں کی پالی۔

لیکن !

تقدیس بھی تو انہیں شبانہ کی طرح عزیز تھی۔ عزیز از جان تھی۔ انہیں حقیقت میں بڑا دُکھ ہو رہا تھا ، رنج ہو رہا تھا۔ بڑی رنجیدہ ، بڑی افسردہ تھیں۔ اپنے شرارتی بیٹے کی لاپرواہی پر ، لااُبالی طبعیت پر — !

اور !

شہزاد — اپنی امّی کے صبح اُمید کی طرح اُجلے اُجلے چہرے پر نااُمیدیوں ، مایوسیوں کے بادلوں کی چھاؤں چپکے چپکے دیکھ رہے تھے۔ ان کے خیالات ، ان کے دل کے حالات ان کے سنجیدہ مگر افسردہ چہرے پر باآسانی پڑھ رہے تھے۔ وہ پھر بھی ہنستے ، کھکھلاتے رہے قہقہے لگاتے رہے۔ جیسے اور کوئی احساس ہی نہیں۔ شہزاد نظاہر

شرارتی لاپرواہ، ہر وقت اچھل کود، چھیڑ چھاڑ، مار دھاڑ کرنیوالے شہزاد ہی نہیں تھے - وہ تو بڑے حساس، بڑے ذمہ دار انسان تھے سب جانتے تھے — انہیں سب کچھ علم تھا - وہ تو ہمیشہ ہی امّی کی نگاہ سمجھتے تھے - زبان سے نہ بھی کہیں — انہیں امّی کی بات سنائی دے جاتی تھی - کانوں میں پہنچے بغیر دل میں اُتر جاتی تھی، اور اس کو دل سے لگا کر رکھتے تھے - ذہن میں بسا کر رکھتے تھے، چھپا کر رکھتے تھے - اپنی امّی حضور کی خواہش ان کے لیے حکم کی، فرمان کی حیثیت رکھتی تھی - جی جان سے قربان تھے - ہر کہا مانتے، ہر حکم ہر آنکھوں پہ لیتے!

ماں کو بیٹے پہ بڑا مان اور بیٹے کو ماں کے مان و ارمان سب کا دھیان — اسی لیے شہزاد نے امّی کے پکارنے کے باوجود بھی توجہ نہ دی - جان بُوجھ کر لاپرواہ بن گئے — انجان بن گئے - کچھ پُوچھا ہی نہیں، جیسے کچھ سُنا ہی نہیں - پورے حواسوں سے چوکس ہوتے ہوئے بھی اس وقت بے حس بنے رہے - بے نیاز، ہنستے ہنستے بڑے مصروف تھے - چہرہ دمک رہا تھا -

"یہ بھی بہت خوبصورت ہے ": نوزیہ بیگم نے کہا، منّا سا طلائی جڑاؤ ٹیکہ، جس کے درمیان میں ہیرے جڑے تھے اور کناروں پہ

دائرے کی صورت میں سفید بڑے چمکدار آبدار موتیوں کی جھالر جھول رہی تھی۔ شہزاد پتلون کی جیب میں سے لمبی، پتلی، سُرخ، مخمل کی ڈبیہ نکال کر فوزیہ بیگم کے سامنے جھکے کھڑے تھے۔

ثبانہ نے بھی دیکھا۔ اپنے ہاتھ میں پکڑ کر دیکھا۔ امّی کو بھی دکھایا۔ سب نے دونوں چیزیں بہت پسند کی تھیں۔ خوب تعریفیں ہو رہی تھیں۔ سعدیہ بیگم بھی دل میں مچلتے ارمانوں کو دبا رہی تھی۔ دل پر ہاتھ پھیرتے ہوئے آہستہ آہستہ تھپک تھپک کر سہلا سہلا کر سلا رہی تھیں۔ بڑی خوش دلی سے انہوں نے بھی تعریف کی۔ لیکن تھکی تھکی سی، نڈھال نڈھال سی ہو کر دیوار سے تکیہ لگا کر، سہارا لگا کر لیٹ گئیں۔ نہ جانے کیوں؟ سب کے ہوتے ہوئے جوان، جہاں بیٹے کے مضبوط سہارے کے ہوتے ہوئے وہ اپنے آپ کو بے سہارا محسوس کر رہی تھیں۔

"کیا۔ آپ کو بھی پسند ہے حضور؟" شہزاد خاموش مگر متبسم، جھلمل جھلمل کرتی، چم چم چمکتی، تقدیس کے دائیں جانب آکر ذرا سا جھکتے ہوئے پوچھ رہے تھے۔ ان کے دائیں ہاتھ میں جڑاؤ ٹیکے کی سُرخ ڈبیہ اور دوسری طرف بغل میں سُرخ ساڑھی کا بنڈل تھا۔ اسی طرح سنہری کاغذ میں لپٹا ہوا۔

تقدیس نے بڑے دلنواز انداز میں مسکرا کر شبانہ کی طرف دیکھا۔ تبسم میں شوخی، شرارت اور چھیڑ سی تھی۔ لبوں پہ ہر بریہ مسکراہٹ بڑی بڑی خوبصورت چمکتی آنکھوں میں بھی مسکراہٹ تھی۔ بڑی دل نواز ہنستی مسکراتی چمک ــ کیونکہ شہزاد ــ سرخ ساڑھی طلائی ٹیکہ ــ اپنی بہن کے لیے لائے تھے، شبانہ کے لیے لائے تھے۔ سرخ ساڑھی ظاہر ہے شادی کے موقع کے لیے، لیکن شبانہ سب کچھ دیکھ کر بڑی خوشدلی سے تعریف کر کے اپنی پسند کے گانوں کے ریکارڈ چن چن کر ریڈیو گرام پر لگا رہی تھی۔ ابھی ابھی بازار سے خرید کر لائی تھی۔ موسیقی اور گانے کی دھنوں سے کمرے میں اور بھی رونق سی ہو گئی۔

"جی"۔ تقدیس نے شہزاد کی طرف چہرہ کرتے ہوئے لمبی لمبی نوکیلی سیاہ پلکوں کی چلمن اٹھاتے ہوئے، بجلیاں گراتے ہوئے، گردن کو ذرا ساخم دیتے ہوئے اشارے سے سر کی جنبش سے اقرار میں کہا۔ شبانہ نے بڑا خوبصورت گانا لگایا تھا۔ ساز کی آواز اونچی کر دی تھی۔ وہ ریڈیو گرام کا سہارا لیے ساڑھی کا پلو ٹھیک کر رہی تھی۔ اور دھیان گانے میں تھا۔ ساتھ ساتھ گنگناتی ادھر ہی دیکھ رہی تھی۔ فوزیہ بیگم شہزاد سے چند قدم کے فاصلے پر قریب ہی کھڑی تھیں۔ ان کا ہاتھ پکڑ

ساتھ ہی لے آئے تھے۔ شہزاد کی خوش دلی سے لطف اندوز ہو رہی تھیں۔ سعدیہ بیگم لڑکیوں کی لائی ہوئی خریداری کی ساری چیزیں سنبھالنے کے لیے ملازم کو ہدایت دے رہی تھیں، وہ لے کر چلا گیا تو وہیں تکیے پر نیم دراز تھیں۔ کبھی آنکھیں کھولتیں، کبھی بند کرتیں، کبھی سوتیں، کبھی جاگتیں۔

"صرف ـــ جی ـــ سے کام نہیں چلے گا۔ کہیے ـــ بہت اچھا ہے ـــ بہت پیارا ہے، بہت پسند ہے۔ آپ کی پسند میری پسند ہے"۔ شہزاد ایک ایک لفظ پر زور دے کر کہہ رہے تھے۔ بڑی احتیاط سے، بڑی آہستگی سے ساڑھی والا پیکٹ تقدیس کے پیچھے رکھ دیا۔ اسی طرح جُھمکے، طلائی ٹیکہ مخمل کی ڈبیہ میں سے نکال کر تقدیس کے سامنے کیے ہنس رہے تھے۔ تقدیس چہرہ اُوپر کیے اُن کی طرف دیکھتے ہوئے بےساختہ ہنس دی۔ دونوں گالوں میں بڑے پیارے پیارے بھنور پڑنے لگے۔ سفید آبدار، چمکدار، موتیوں کی دوہری لڑی چمکنے لگی۔ تقدیس کے دانتوں کی دوہری لڑی ـــ سُرخ سرخ ہونٹوں میں سے چمکتے دانت، شہزاد نے بایاں ہاتھ اپنی طرف دیکھتی، ہنستی، کھلکھلاتی تقدیس کے سر پہ رکھا۔ اور دوسرے ہاتھ سے پکڑا طلائی ٹیکہ ـــ تقدیس

کی شفاف پیشانی پہ جھولنے لگا۔ سرخ سرخ سہاگ بندی سے ذرا سا اوپر۔

شہزاد نے ایکدم بڑے طریقے سے، بڑے سلیقے سے تقدیس کے بالوں پہ ٹیکہ لگا دیا۔ سچے موتیوں کی دوہری سفید لڑی میں آویزاں — تقدیس کی بڑی پاکیزہ، بڑی روشن، نورانی پیشانی پہ تقدیس کے مقدس نور سے منور تھا۔

اب شہزاد نے تقدیس کے پیچھے تخت پر پڑی ساڑی دل و جان سے، بڑے ارمان سے قربان ہوتے ہوئے بڑے چاؤ، بڑے رکھ رکھاؤ سے، بصد احتیاط، جھکی جھکی تقدیس کے سر پہ پھیلا دی، تقدیس اس میں چھپا دی۔ وہ دونوں گلابی گلابی نازک نازک ہاتھوں میں گلابی نہیں شہابی، حجاب و شباب کی سرخی سے سرخ ہوتا چہرہ چھپائے بیٹھی تھی۔ سرخ، گلابی، زرد، سفید گلاب کی ڈھیروں ڈھیروں نازک پتیاں ساڑی کی تہوں میں سے نکل کر بکھر گئیں۔ کومل سی تقدیس پھولوں کے بوجھ سے جھکی ڈالی کی طرح جھک گئی۔ جھکتی گئی۔ جمالوں کی پڑیا، منی سی گڑیا۔

"ائی حضور! آپ کی بیٹی — تقدیس — نے آپ کو بتایا نہیں کہ آج چوڑیوں والا کیا کہہ رہا تھا۔ اس کی اماں نے کیا کیا ہدایات دی

بھتیں دلہن حضور کو۔" شہزاد نے خوشیوں سے چُور، مسرّتوں سے بھرپور، قہقہہ لگایا۔

"دراصل آپی کی بندیا" شبانہ گدے دار کرسی پہ اچھل کر بولی۔ وہ ابھی ریڈیو گرام کے قریب ہی بیٹھی تھی۔

"ہونہہ — شبانہ — آپی نہیں" شہزاد نے اس کی بات درمیان میں کاٹ دی۔ وہ خوش تھے — بہت خوش۔

"تو — کیا — بھائی جان" شبانہ بے تابانہ کھڑی ہو گئی۔

"بھابی — بھابی جان" شہزاد بڑے مسحور، بڑے مخمور، بڑے مسرور، بڑے سرشار سے بولے آنکھوں سے خوشیاں پھوٹ رہی تھی۔ چہرے پہ بہار تھی۔ شفق رنگ بہار۔ بڑی گلرنگ بہار، بڑی ترنگ میں تھے۔

"سچ بھائی جان" شبانہ جوشِ مسرت سے دوڑ کر بھائی سے لپٹ گئی۔ اچھل کر بھائی کے گلے میں باہیں ڈال دیں۔ پیار کر لیا۔ نثار ہو ہو گئی اور شہزاد نے اپنی اور سب کی اس انمول خوشی کی گھڑیوں میں چھوٹی، بڑی چہیتی بہن کو باہوں میں سمیٹ لیا۔ سینے سے لگا لیا۔ اپنے ساتھ لپٹا لیا۔ زور سے چپکا لیا۔ گالوں کو بالوں کو چوم چوم لیا — شبانہ کو — جو شہزاد کی بہن ہی نہیں، بڑی پیاری بیٹی بھی تھی — انہیں بھائی کے پیار کے ساتھ باپ کا پیار بھی دینا تھا۔ شریر بھائی کے روپ میں ستاتے، چڑاتے، تنگ

کرنے تو روتی، دھوتی شبانہ کو پدرانہ شفقت کے ٹھنڈے سایوں سارے جہاں کی ساری کی ساری خوشیوں کے ڈھیر بھی لگا دیتے —
"میں اپنی گڑیا کو بھی سرخ چوڑیاں پہناؤں گا۔ سونے کی ڈھیروں ڈھیر چوڑیوں سے باہنیں بھر دوں گا۔ سونے چاندی کے زیوروں میں تول دوں گا اپنی بہن کو، اپنی بیٹی، اپنی چندا کو۔" شہزاد شبانہ کو سینے سے لگائے اس کے چہرے پہ ہاتھ پھیرتے ہوئے بڑے جذباتی ہو رہے تھے۔ انہیں بڑے بھائی کے ناطے سے، باپ کی حیثیت سے اپنی ساری ذمہ داریوں کا احساس تھا۔ جہاں اپنی خوشیوں میں جھوم رہے تھے، وہاں کوئل کی طرح ہر وقت کوکتی، چڑیوں کی طرح چہکتی شبانہ کے مستقبل کے خواب بھی نگاہوں میں گھوم رہے تھے۔

شبانہ نے ہنستے ہوئے خالہ جان کو اب بتایا تھا کہ "بھائی جان نے اس لیے مجھے سرخ چوڑیاں نہیں پہنائی تھیں۔"

سعدیہ بیگم اور فوزیہ بیگم دونوں ہی حیران تھیں۔ اس صورتِ حال سے بالکل انجان تھیں۔ سخت حیرانی میں، بالکل انجانی، انہونی خوشی میں — پہلے تو خاموش ہی رہ گئیں — دونوں بہنیں ایک دوسرے کو دیکھتی ہی رہ گئیں۔ خواب سا لگ رہا تھا۔ عجیب سے احساسات تھے، انوکھے سے جذبات تھے۔ یقین، بے یقینی کا عالم تھا۔ خاموش بیٹھے دیکھتے دیکھتے جب

ہوش میں آئیں تو خوشیوں کے جذبوں سے مدہوش سی ہو کر دونوں بہنیں لپٹ گئیں۔ کتنی ہی دیر تک گلے ملتی رہیں۔ سعدیہ بیگم بڑی بہن کی حیثیت سے اور فوزیہ بیگم چھوٹی بہن — ایک بیٹے کی ماں اور دوسری بیٹی کی — اب تو سمدھنیں گلے مل رہی تھیں۔ شہزاد کی ساس، دوسری تقدیس کی ساس۔

سعدیہ بیگم نے سُرخ ساڑھی میں لپٹی لپٹائی، شرم و حیا اور پھولوں کی نازک پتیوں کے بوجھ سے دوہری ہوئی جاتی تقدیس کو باہوں میں بھر لیا۔ سینے سے لگا لیا۔ خوشیوں سے زور زور سے دھڑکتے دل سے چپٹا لیا — دلہن کو، اپنی بیٹی کو، اپنی بہو کو — عرق آلود جھینپا چہرہ، یخ بستہ پیشانی بار بار چوم لی۔ تیز ہوا کے زور سے لرزتی کانپتی سرخ سرخ گلاب کی پتی کی طرح تقدیس سُرخ ساڑھی میں گھبراہٹ میں تھر تھر کانپ رہی تھی۔ ٹھنڈی ہوئی جا رہی تھی۔ سب کچھ ایکدم جو ہو گیا تھا۔

"شرارتی شہزاد!"

دھڑکتے دل سے آواز اٹھتی تھی!

لبوں پہ آ کر رُک جاتی تھی!

"میری بچی — میری جان"۔

سعدیہ بیگم اس کے ٹھنڈے ہاتھوں کو اپنے چہرے سے لگا رہی تھیں۔ ہاتھوں میں دبا دبا کر گرم کر رہی تھیں۔ کلیجے سے لگائے پیار کر رہی تھیں، اور وہ نازک سی پھولوں کی بیل کی طرح بڑے درخت کے ساتھ، سرسبز بڑے مضبوط درخت کے سائے میں، زمانے کے طوفانوں سے محفوظ، تیز و تند ہواؤں سے محفوظ رہنے کے لیے سعدیہ بیگم سے لپٹی رہی۔ سمٹی رہی۔ ان کے ساتھ مضبوط سایہ دار درخت کے ساتھ نازک سی بیل کی طرح لپٹی رہی۔

"امی حضور! اب بہورانی کو خالی خالی پیار و دلار میں، نرے لاڈ لاڈ میں ہی نہ ٹرخائیے۔ رونمائی دیجئے ہماری پیاری دلہن حضور کو" شہزاد نے چھوٹی سی مخمل کی سرخ ڈبیہ کھولتے ہوئے اپنی امی کے سامنے کر دی۔

"ٹیکے کے ساتھ کی ہیرے جڑی انگوٹھی" سعدیہ بیگم نے سارے جہاں کا پیار آنکھوں میں بھرے اپنے شرارتی بیٹے کی طرف بڑی پیاری نظروں سے دیکھا۔ بے ساختہ مسکرا دیں۔ زور سے ہنس دیں۔ خود بخود ہنسی آ رہی تھی۔ دل ہنس رہا تھا، من ہنس رہا تھا۔ جیسے ساری کائنات ہنس رہی تھی، شہزاد کی شرارت پر!

شہزاد ہنس رہے تھے۔

اسی طرح تقدیسی کو سینے سے لگائے اپنے سامنے جھکے شہزاد کو

بھی دوسرے بازو میں سمیٹ کر لپٹا لیا۔ تقدیس کے ساتھ ہی اپنے سینے
سے لگا لیا۔ دونوں باہنوں میں بیٹے بہو کو بھرے، چہرے پہ رنگ و
نور، خوشیوں کی، سرور کی چاندنی سجائے سعدیہ بیگم، شہزاد کی مسکراتی
پیشانی چوم رہی تھیں۔ تقدیس اسی طرح سانس روکے، پلکیں جھکائے
آنکھیں بند کیے سعدیہ بیگم کے ساتھ لگی تھی۔ شہزاد بھی تو ساتھ ہی تھے
امّی حضور کی باہنوں میں۔ قریب بہت قریب تقدیس کے بہت قریب
بالکل ساتھ، چپکے سے ایک چٹکی بھر لی۔ ان کے ہاتھ پر زور سے دباؤ
ڈالا۔ اس وقت امّی کا لحاظ کر رہے تھے ورنہ شرارت کی رگ ہر وقت
پھڑکی رہتی تھی، ہر وقت آمادہ و تیار۔

پھر سعدیہ بیگم نے بڑی محبّت سے، بڑی عقیدت سے، بڑی
مسرّت سے سرخ ڈبیہ میں سے انگوٹھی نکالی، پہلے آنکھوں سے
لگائی، ہونٹوں سے لگائی، کتنی دیر آنکھیں بند کیے دعائیں پڑھتی
رہیں، انگوٹھی پہ پھونکتی رہیں۔ بڑے پاکیزہ، بڑے سنجیدہ، بڑے مقدس
چہرے پر امیدوں کی کلیاں کھل رہی تھیں، ارمانوں کا نور چمک رہا تھا۔
لبوں میں مسکراہٹوں کے پھول بکھرے تھے۔ کافی دیر کے بعد ہزاروں
دعائیں سے، ڈھیروں ارمانوں سے بے شمار منتوں سے، مرادوں سے
تقدیس کی نازک انگلی میں ڈال دی۔ شبانہ تو خوشی کے مارے دیوانی

ہوئی جارہی تھی۔ اپنا آپ جیسے قابو میں ہی نہ تھا۔ بھائی کو چھوڑتی تو تقدیس کو لپٹ جاتی۔ کبھی خالہ کے گلے میں باہنیں ڈال دیتی تو کبھی امّی کے سینے سے لگ جاتی۔ بھولی بھالی سی لڑکی بھائی اور آپی کے ملن پر دیوانی ہوئی جارہی تھی۔ خوشی میں ہنستی کھلکھلاتی، قہقہے لگاتی، تالیاں بجاتی، گنگناتی، ٹھمک ٹھمک کرناچتی گاتی۔

"آپی — میری آپی — پیاری بھابی، بھائی جان"۔ شبانہ دیوانہ وار بھر تقدیس کو باہوں میں لیے تھی۔ خوشی سے بے حال نہال دنثار ہورہی تھی۔

"میری پگلی سی بہن"۔ شہزاد کو بہن پہ بہت پیار آرہا تھا۔ اس کی خوشی پہ، اس کے بھولپن پہ قربان ہو ہو جارہے تھے۔ اس کے بالوں کو بار بار پیار کررہے تھے۔ اس کے گالوں کو چوم چوم رہے تھے۔

خوش باش شہزاد خوشیوں کی پُر شباب بہار میں تروتازہ پھول کی طرح کھلے جارہے تھے۔ ان کے حسین چہرے پہ چودھویں کے چاند کی سی اُجلی اُجلی، نکھری نکھری چاندنی پھیلی تھی۔ امّی اور خالہ کے ہونٹوں پہ بے ساختہ مسکراہٹ اور آنکھوں کی چمک دیکھ کر بڑے مطمئن، بڑے پُرسکون تھے۔ بڑا جانفزا سکون، بڑا روح افزا اطمینان نصیب ہو، ہا

تھا۔ اور ابھی تھوڑی دیر پہلے اپنی امّی حضور کا اداس اداس چہرہ بھی یاد آرہا تھا۔ کہ وہ تقدیس کے لیے کچھ نہ لانے پر کیسی حیران و پریشان تھیں۔ کتنی افسردہ کتنی رنجیدہ ہو رہی تھیں۔ اور اب کتنی خوش، بے انتہا خوش، بے بہا خوش کہ شہزاد تو تقدیس کے لیے ان کی پیاری بیٹی کے لیے کیا کچھ نہ لائے تھے۔ سب کچھ، بہت کچھ، امّی حضور کی چہیتی کو۔۔۔ سب کچھ ہار دیا تھا اس کے سامنے اور سب کچھ جیت لیا تھا، بہت کچھ پا لیا تھا۔ خزانوں کے منہ کھل گئے تھے، گنجینوں کے پہاڑ مل گئے تھے۔ ان خوشیوں کے لمحات میں سب کی آنکھوں میں خوشیوں کی بہاروں کے ساتھ ساتھ ۔۔۔ آنسوؤں کی پھواروں میں، بھی سب بھیگے جا رہے تھے۔

سعدیہ بیگم وہیں دیوان پر اور فوزیہ بیگم قالین پر سجدہ ریز تھیں۔ آنسو بہہ رہے تھے۔ سسکیاں اٹھ رہی تھیں۔ دونوں بہنیں خدا کے حضور سجدہ شکر ادا کر رہی تھیں۔ خدا کے حضور عاجزی سے جھکی اپنے بچوں کی خیر و عافیت کے لیے دعائیں مانگ رہی تھیں۔ ہنستے کھیلتے شہزاد کے دل میں بھی ایک خلش سی تھی۔ کھٹک سی تھی۔ ایک تیز دھار پھانس سی دل کے آر پار تھی کہ اس خوشی کے ساتھ ساتھ طاہر نیازی کی عدم موجودگی سب کو محسوس ہو رہی تھی۔

"کاش — اے کاش — آج آبا حضور زندہ ہوتے"! اُن کے دل سے آواز نکلی — آنکھیں دھواں سی ہو رہی تھیں ۔"کاروانِ حیات میں چلنا ہو تو، دنیا کے ساتھ ساتھ جینا ہو تو آنسو پینا ہی پڑتے ہیں"۔ شبانہ کو روتا دیکھ کر انھوں نے ایک عزم سے کہا۔

شہزاد کو اداس، امّی اور خالہ کو روتا دیکھ کر وہ بھی رو رہی تھی اور شہزاد سخت پریشانی، دل کی جلن کے باوجود مُسکرا دیتے۔ کانٹوں میں گھرے پھول کی طرح مسکرا دیتے۔

"پگلی لڑکی — اپنی بھابی دُلہن کا مکھڑا تو دکھاؤ سب کو"۔ شہزاد نے مُنہ پھیر کر آنسو پیتے ہوئے، اپنے آپ کو مضبوط کرتے ہوئے، بڑے عزم و حوصلہ سے شبانہ کو کہا۔ لبھورتی شبانہ کا دھیان سُرخ ساڑھی میں چھپی چھپی، جھکی جھکی تقدیس کی طرف کروایا۔

امّی حضور اور خالہ جانی تو جھلمل جھلمل، چمکتے دوپٹے اوڑھ کر واقعی شادی والے گھر میں آئی مہمان لگ رہی تھیں۔ شہزاد سعدیہ بیگم کے لیے موتیا اور فوزیہ بیگم کے لیے قرمزی دوپٹے لے کر آئے تھے۔ جاتے ہوئے ان کے جوڑوں کے رنگ خاص طور پر نوٹ کر کے گئے تھے۔ سنہری زری کی تاروں سے خوبصورت

کٹاؤ کے کام کے دوپٹے، درمیان میں آڑھی آڑی پھولوں کی بیلیں، بڑے بھاری دوپٹے لائے تھے، اپنی امی اور اپنی تقدیس کی امی کے لیے۔

اوہ — میں تو بھول ہی گئی — خالہ دیکھئے ہماری دُلہن بھابی — امی حضور — بھائی جان دیکھئے ہماری بھائی جان کی دُلہن حضور، کتنی سُندر سُندر، کتنی پیاری پیاری"۔ دونوں ہاتھوں سے آنسو پونچھ کر جلدی سے خوش خوش شہناز ایک ہاتھ سے تقدیس کی تھوڑی پکڑے دوسرے ہاتھ سے گھونگھٹ اٹھائے کھڑی تھی، سنہری بارڈروں والی سُرخ ساڑھی کا کنارا پکڑے کھڑی تھی۔

سنہری بارڈروں اور جگہ جگہ سنہری پھولوں والی گہری نیلی ساڑھی چُست بلاؤز، بڑے خوبصورت خطوط و نقوش، بڑے دل آویز نوخیز بناؤ کٹاؤ، بلاؤز کا گول گلا، لمبی گردن میں جڑاؤ، گلوبند، کانوں میں جھُومتی جھمکا بالیاں۔ بالیوں کے بڑے جھمکے کے نیچے دائرے میں سفید موتیوں کی جھُولتی جھالر، ویسے ہی سفید موتیوں کی جھُولتی جھالر والا ہیروں جڑا ٹیکہ روشن روشن، اُجلی اُجلی پیشانی پہ، جوڑے پہ لپٹی مالا کی تین لڑیاں، ڈھلک کر پیشانی پہ بائیں ابرو سے ذرا اوپر جھومر کی طرح جھوم رہی تھیں۔گلابی

گلابی چہرہ، سرخ سرخ رخساروں پہ افشاں کی طرح چمکتا پسینہ، گہری گہری لپ اسٹک، دونوں نرم نرم، ملائم ملائم گلابی ہاتھ، نازک نازک انگلیوں کے لمبے ناخنوں پہ لگی خوبصورت نیل پالش، دونوں ہاتھ بے خودی میں گود میں رکھے تھے۔ انگلی میں ہیرے کی انگوٹھی اور دونوں کلائیوں میں ڈھیر ڈھیر ساری سُرخ چوڑیاں، ایک ہاتھ میں چوڑیوں کے آگے مالا کے ساتھ کا بازو بند، دوسرے ہاتھ میں سنہری گھڑی، سر پہ پھیلی سُرخ ساڑھی میں خوبصورت، صحت مند سُرخ، گلابی، روشن روشن چاند سا چہرہ۔ بند آنکھوں پہ لرزتی لرزتی دراز پلکوں کی نوک پہ آنسوؤں کے موتی، چمکی نوکیلی گھاس پہ شبنم کے موتیوں کی طرح چمک رہے تھے — دہکتے رخساروں پہ، چمکتی پیشانی پہ پسینے کے قطرے افشاں کی طرح چمک رہے تھے۔ واقعی بڑی ہی پیاری، بہت ہی خوبصورت لگ رہی تھی شبانہ کی دُلہن بھابی، شہزاد کی دُلہن بیگم، سعدیہ بیگم کی بہورانی، فوزیہ بیگم کی نورِ نظر، ظفر نیازی کی لختِ جگر۔ تقدیس، فوزیہ بیگم نے بھی، شہزاد کو، شرارتی شہزاد کو، اپنے داماد کو بہت پیار کیا، گلے لگا لگا کر۔

"بھائی جان — آپ بھی یہاں بیٹھئے"، میں ابھی کیمرہ لے کر

آئی۔" اس کو ایکدم یاد آیا تو، شبانہ شہزاد کو تقدیس کے ساتھ فوزیہ بیگم اور سعدیہ بیگم کے درمیان میں بٹھا کر بھاگتی ہوئی اور اچھلتی کودتی ہوئی کیمرہ لے آئی ۔۔ اور بے شمار، لاتعداد، ڈھیروں ہی رنگین تصویریں لے ڈالیں ۔۔ اس کو یہ پہلے معلوم ہی نہ تھا کہ شہزاد کھڑکی میں متحرک تصویریں لینے والا کیمرہ فٹ کروا کے گئے تھے ۔۔ اور ایک ایک لمحہ کی چلتی پھرتی تصویریں بن رہی تھیں۔ ہلکی ہلکی بڑی خوشگوار ہوا چل رہی تھی۔ ریشمی پردے لہرا رہے تھے، اور کمرے میں بکھرے بکھرے تازہ گلاب کی پتیوں سے مل کر ہوا سارے کمرے کو مہکا رہی تھی۔ تازہ گلاب کی مہک تھی، بڑی جانفزا مہک ۔۔ گلابوں کی، سرخ، سفید، زرد، گلابی گلابوں کی مہک ۔ سعدیہ بیگم کے ارمانوں کے گلاب، فوزیہ بیگم کے سوتے جاگتے میں دیکھے حسین سپنوں کی، آج پورے ہوتے خوابوں کے گلاب، طاہر نیازی اور ظفر نیازی کے وعدوں کے، وچنوں کے، عہدو پیمانوں کے گلاب، شہزاد اور تقدیس کے سہرے کی مالاؤں کے مہکتے گلاب، ہر طرف، چاروں طرف گلاب ہی گلاب تھے۔ شبانہ کی خوشیوں کے گلاب"۔۔ وہ خوشیوں کے دوش پہ اُڑ رہی تھی۔ خوشبوئیں ہوا کے دوش

ہیرا اور شبانہ دونوں دونوں ہاتھوں سے ان خوشیوں کو، ان خوشبوؤں کو سمیٹ رہی تھی، اپنے آنچل میں لپیٹ رہی تھی۔ دلی خوشی و مسرت سے چہرہ بھی مہکتے گلاب کی طرح تروتازہ تھا، شگفتہ تھا۔

شہزاد اور تقدیس کے مستقبل کے، مستقل ساتھ کی بات، پکی پکی بات — منگنی کا فیصلہ تو بہت بچپن میں — تقدیس کی پیدائش کے فوراً بعد ہی، طاہر نیازی نے گود میں اٹھا کر، گود میں بھر کر، باہوں میں بھر لی تھی۔ سعدیہ بیگم کی گود میں دے دی تھی۔ اسی وقت، اسی دن، شہزاد کے نام کی ہو گئی تھی۔ منی سی گڑیا، ٹکر ٹکر تایا حضور کو دیکھتی رہی تھی۔ خالہ حضور سے کھیلتی رہی تھی۔

بزرگوں کے اس اہم فیصلے کا تقدیس اور شبانہ کو علم نہ تھا، البتہ شہزاد کو معلوم تھا۔ دونوں ساتھ ساتھ پلتے بڑھتے رہے، اور پھر فاصلے بڑھتے رہے۔ دُوریاں مجبوریاں بنتی رہیں۔ اب جو ملن ہوا تو — تقدیس — کم سخن، بڑی سنجیدہ، بڑی شرمیلی شرمیلی، بڑی سجیلی سجیلی سی — شہزاد — بالکل برعکس، شوخ و شریر، باتونی، نٹ کھٹ، شور ہنگامہ، ہر وقت شور شرابا

مچائے رکھتے۔ جب بھی سعدیہ بیگم نے بچپن کی منگنی، ابّا حضور کی خواہش کا حوالہ دے کر رائے طلب کی، بدک جاتے، اٹھ کر چلے جاتے، کوئی اور بات شروع کر دیتے۔ امّی کی توجہ ہٹانے کے لیے شبانہ کا بہانہ بنا دیتے۔ بڑی دانائی سے اپنا دامن بچا لیتے۔

"پہلے شبانہ کا ٹھکانہ بنائیے امّی حضور!" اور یوں باتوں میں بات ٹال جاتے، گول مول کر جاتے اور خود یہ جا وہ جا۔

سعدیہ بیگم کو تقدیس اپنی شبانہ کی طرح ہی عزیز تھیں انہوں نے کبھی بھی اس کو اپنے سے الگ، شبانہ سے الگ سمجھا ہی نہ تھا۔ ایک نظر نہ آتی تو دوسری بھی ادھوری لگتی۔ جیسے دونوں ان کی دونوں آنکھیں تھیں۔ ایک بھی ان سے علیحدہ ہوتی تو جیسے بینائی کمزور ہو جاتی، ان کو دکھائی کم دینے لگتا۔

ابھی گرمیوں میں، اپنی شدید بیماری کے دنوں میں انہوں نے آخری بار، ایک بار پھر پوچھا تو شہزاد وہی ہنسی مذاق میں اڑا گئے۔ نہ ہاں میں جواب دیتے — نہ — نہ ہی کرتے۔

سعدیہ بیگم تقدیس کے لیے پریشان تھیں۔ شہزاد سے جواب کے انتظار میں بڑی سنجیدہ تھیں — اور شہزاد سنجیدہ ہوتے ہی نہ تھے، کبھی بھی اس بات کو اہمیت دیتے ہی نہ تھے۔ بڑی لاپرواہی

بے نیازی ـــــ اس معاملے سے اور تقدیس سے یوں لاتعلقی، عدم دلچسپی کا اظہار کرتے کہ سعدیہ بیگم خیالوں میں ہی ڈوب ڈوب کر رہ جاتیں کہ اس سے تو صاف ظاہر ہوتا تھا کہ شہزاد اس بات میں راضی نہیں ہیں۔ ادب لحاظ میں جواب نہیں دیتے اور شرارتاً، عادتاً، شبانہ کے ساتھ اس کو بھی ستاتے چھیڑتے تنگ کرتے رہتے ہیں ـــــ کہ یہ شرارت تو اب ان کی عادت، ان کی فطرت بن چکی تھی ـــــ!

اب یہی فکر دامن گیر تھی کہ شہزاد اور تقدیس کی طبیعتوں کا فرق ـــــ مزاجوں کا امتزاج ـــــ یہ عہدو پیمان ـــــ یہ جذبوں بھرا ارمان پورا نہیں ہونے دے گا۔ وہ اپنے ہی جیسی کوئی شوخ و چنچل، اچھلتی کودتی شریکِ حیات چاہتے ہوں گے۔ غم تھا تو یہی کہ غیروں کی لڑکی یہاں آ کر راج کرے ـــــ اور اپنی بچپن کی منگیتر، اپنی بچی، اتنی پیاری پیاری تقدیس نظروں سے اوجھل ہو جائے ـــــ غیروں میں جا بسے ـــــ دل کی آواز پر، شہزاد کے انداز دیکھتے ہوئے بھی، اپنے فیصلوں کے لیے اصرار کرتیں کہ فیصلے تکرار کر رہے تھے، انکار یا اقرار کا انتظار کر رہے تھے۔ شہزاد کے اقرار رضامندی کے بعد وہ تقدیس کی رائے بھی لے لیتیں۔

وہ بے زبان عزیز از جان بیٹی بھلا کیا انکار کرتی۔

اور!

آج!

آج تو!

سعدیہ بیگم کی ساری اُمیدیں ٹوٹ گئیں۔

سارے ارمان ــــ سارے خواب، کچے دھاگے میں بندھی مالا کی طرح ٹوٹ گئے ــــ ساری خوشیوں پر اوس ہی پڑ گئی ــــ جب شہزاد، شبانہ کے لیے پاس ہونے کا تحفہ سفید ساڑھی اور ساتھ ہی دوسری سُرخ ساڑھی بھی اُٹھا لائے ــــ تقدیس کو بہو بنانے کا خواب تو ادھورا ہی رہ گیا ــــ اور بعد میں شہزاد کے یاد دلانے پر یاد آیا کہ وہ تقدیس کو بھی تو اپنی بیٹی کہتی ہیں اور شہزاد نے بھی تو یہی کہا تھا کہ "یہ ساڑھی ان کی بیٹی کے لیے لایا ہوں!"

اب سعدیہ بیگم مسکرا دیں ــــ اپنے شریر بیٹے کے شرارتی ذہن پر۔ انہیں کیا معلوم تھا کہ ان کا نٹ کھٹ، شرارتی، شوخ بیٹا محض شرارتاً، عادتاً، مذاقاً خالہ کی بیٹی کو نہیں ستاتا، دلچسپی نہیں لیتا بلکہ یہ شرارتیں، یہ شوخیاں، یہ چھیڑ چھاڑ اور مذاق تو ان کے عمر بھر کا سنجوگ، جیون بھر کا ساتھ ہیں۔ وہ تو سچے دل

دل کی گہرائیوں سے، اپنی رضامندی سے، خوشی خوشی تقدیس کو اپنا ساتھی بنائیں گے۔ زندگی بھر کا ہم سفر، عمر بھر کی رفاقت میں لینے کے لیے یوں اتنے خوبصورت، ڈرامائی انداز میں اچانک حامی بھر لیں گے ۔۔۔ کہ تقدیس سے پوچھنے کا، اس کی مرضی، اس کی رائے لینے کا موقع ہی نہ ملا، اور پھر تقدیس جیسی مقدس، پاکیزہ خیالات کی پاکباز لڑکی، نیک اطوار لڑکی، بے زبان سی تقدیس کی راتے اپنے بزرگوں سے، اپنے شہزاد سے الگ ہو سکتی تھی۔ جبکہ پہلے دن سے وہ شہزاد سے منسوب، شہزاد کے لیے وقف تھی ۔۔۔ اور اب تو خود بھی دل و جان سے وہ شہزاد اور شہزاد ان کے تھے۔

یہ فیصلے تو دلوں نے نگاہوں کی زبانی کب سے تسلیم کر لیے تھے ۔۔۔ اسی لیے تو شہزاد کو بھروسہ تھا، پختہ یقین تھا ۔۔۔ تقدیس ان کا ایمان، ان کا ارمان، ان کا مان تھی، رومان تھی، اس اعتماد، ایمان، یقین اور بھروسوں پر بھروسہ کرتے ہوتے روشنیاں، روشنیاں تھیں۔ خوشیاں ہی خوشیاں تھیں ۔۔۔ اتنی خوشیاں ۔۔۔ اتنی خوشیاں کہ جب ظفر نیازی نے گھر میں قدم رکھا تو اس گہوارۂ مسرت و عافیت میں بڑی رنگین، بڑی حسین،

پر بہار بہاروں کی بہار، بڑے خوبصورت گاہائے رنگا رنگ کی گلرنگ نظاروں کی بہار۔

ان جانفزا بہاروں کو!

ان رنگین نظاروں کو؟

نظروں ہی نظروں میں دل میں سموتے، آنکھوں میں بساتے، "خدا بری نظروں سے بچاتے" وہ دل ہی دل میں دعائیں مانگتے رہے۔

اور شبانہ!

اچھل کر، دوڑ کر چچا سے لپٹ گئی۔

"چچا جان — منگنی ہو گئی"! وہ چھوٹے بچوں کی طرح چچا کے گلے میں باہیں ڈالے جھول رہی تھی۔

"بھائی جان کی — آپی جان کی — اب دونوں کی شادی ہوگی —" یہ دیکھئے — میری بھابی — میری دلہن بھابی — بھابی جان"! شبانہ دل و جان سے قربان ہوتی ہوئی چچا کو پکڑے تقدیس کے پاس لے آئی۔ وہ تو اس خبر سے، اس ملاپ سے بے انتہا خوش تھی۔ یہ نیا رشتہ، نیا انکشاف شبانہ کو دیوانہ کیے دے رہا تھا۔ اس کی خوشیوں کا تو کوئی ٹھکانہ ہی نہ

تھا۔ وہ تقدیس کو اپنی بہن، اپنی آپی ہی سمجھتی رہی۔ نہ جانے کیوں۔ کبھی اس بات کا خیال ہی ذہن میں نہ آیا کہ وہ آپی کو پا کر اتنی مگن تھی اپنی خوشیوں میں۔ آج شام کو فرح بھابی کی چھیڑ چھاڑ پر۔ ان کے شرارتی انداز پر بھی پہلے کچھ نہ سمجھی بلکہ ان پر ہنستی رہی۔ ان کا ہی مذاق اڑاتی رہی۔ اور اب سمجھی تو خوب سمجھی کہ "شہزاد کی دلہن۔ ان کی دیورانی ہی ہوتی۔ ان کے دیور راجہ کے من مندر کی رانی۔ کیونکہ شہزاد ان کے دیور ہی تو تھے۔ اور فرح بھابی۔ بھابی۔ سب کی بھابی۔"

اب تو وہ دل ہی دل میں فرح بھابی کو بڑا پیر بزرگ، بڑی برگزیدہ، بڑی ولی اولیاء مان گئی تھی۔ کہ ان کی پیشن گوئی، ان کا اندازہ، ان کا مذاق تو شام ہونے سے پہلے حقیقت بن گیا۔

وہ بھولی سی لڑکی کیا جانے!

اور فرح!

فرح جیسی تیز طرار خاتون پہلی نظر میں، ایک ہی نظر میں دلوں کے حال جان کر پورا افسانہ بنا سکتی تھی کہ تقدیس شہزاد کی شوخ شوخ نظروں کی زبان، ان کی محبتوں کے انعام، اپنی جھکی جھکی پلکوں

میں چھپائے تھی۔ ان کی چاہتوں کے جام اپنے، ہر دم، ہر گھڑی مسکراتے ہونٹوں پہ سجاتے تھی ـــــ سینکڑوں نہیں بلکہ ہزاروں بار تو شہزاد ان جھلمل جھلمل لرزتی جھالر سی پلکوں کو، ان پوست کی منہ بند کلیوں سی آنکھوں کو ان مسکراتے لبوں کو اپنی محبتوں کے پیام دے چکے تھے کہ یہ سب کچھ ازل سے ان کا تھا ـــــ ابد تک تقدیس ان کی تھی۔ ان کے لیے تھی۔ خدا نے اپنے ہاتھوں سے اتنا خوبصورت اتنا نازک وجود بنایا ہی اسی لیے تھا۔ تقدیس ان کی تھی ـــــ ان کی رہے گی۔ آج بھی، کل بھی ـــــ اور ہمیشہ۔"

تقدیس کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔

یہ سب تقدیس کے دل کی آواز تھی۔ دھڑکنوں کے ساز کی آواز ـــــ بڑی سُریلی، بڑی مدّھر، بڑی مترنم، بڑی دلنواز آواز، خود تقدیس کی طرح ہی۔

شہزاد نے جلدی سے پہلے مؤدبانہ کھڑے ہو کر، پھر قدرے جھک کر، بڑے ادب سے، بڑی سنجیدگی سے چچا کو سلام کیا اور چچا سے لپٹ گئے۔

ظفر نیازی اپنے اکلوتے بیٹے، چھوٹے بھائی، چہیتے بھتیجے شرارتی بچے کو بڑی قیمتی دولت کی طرح، انمول سرمائے کی طرح،

متاعِ حیاتِ عزیز کی طرح باہنوں میں سمیٹے تھے، سینے سے لگائے تھے۔ بڑے زور سے دبائے تھے۔

محبت پدری کے شفقت بھرے بوسے کندن سی پیشانی پہ لے رہے تھے۔ شہزاد کو باہنوں میں بھرے تھے، سینے سے لگائے، دل میں بسائے، نمناک نگاہیں، کمرے کی بڑی رنگین بڑی خوشگوار، خوشبودار فضاؤں میں بڑے بھائی کو ادھر ادھر ڈھونڈ رہی تھیں۔ کبھی پلٹ کر دروازے کی طرف دیکھتے کبھی کھڑکیوں کے ہوا سے ہلتے پردوں کی طرف، خالی کرسیوں اور صوفوں کی طرف کہ کہیں بھی نظر نہیں آ رہے تھے بھائی جان۔

"کاش کہ آج بھائی جان زندہ ہوتے" بڑے صبر و ضبط کے باوجود بڑی ٹھنڈی، بڑی گہری سانس نکل ہی گئی ۔۔ اور پھر ایک بار پھر شہزاد کے ماتھے پر ایک اور بوسہ لیا ۔۔ بڑا طویل بڑا گرم، جذبات کی شدت سے، جذبوں کی گرمی سے گرم بوسہ، طاہر نیازی کی طرف سے پیار کر رہے تھے شہزاد کو ــــــ کہ آج ان کی خواہش پوری ہو رہی تھی، یہ مبہم خیالات کی، خوشی اور غم کے ملے جلے جذبات کی، بے شمار جذبات کی یلغار میں وہیں

کھڑے کھڑے ڈول گئے۔ جیسے توازن برقرار نہیں رکھ سکتے تھے کہ زمین پیروں کے نیچے سے کھسک رہی تھی۔ اسی طرح شہزاد کو سینے سے لگائے، اس کے جوان سہارے سے سہارا لگائے بڑی دیر تک عالمِ خواب میں، جیسے نہ سوئے ہوئے سے، نہ جاگے ہوئے سے، خیالاتِ مبہم میں کھوئے ہوئے سے، خاموش، بڑے اداس، بڑے افسردہ ــــ کچھ بیدار ہوئے ــــــ بڑی کوشش سے برقرار ہوئے تو تقدیس کو اٹھا کر سینے سے لگا لیا۔

"میری بچی، میری جان، میرے بھائی جان کا ارمان!" ظفر نیازی بھیگے بھیگے لہجے میں آنسوؤں میں ڈوبتے ابھرتے انداز میں بڑی مشکل سے بولے۔ بھائی کے غم سے، شدّتِ گریہ سے ان سے بات نہ ہو رہی تھی۔ تقدیس بھی باپ سے لپٹ کر سسکیاں لینے لگی۔ ان مسرّتوں کی بہار میں، خوشیوں کے لمحات میں، شادمانیوں کی برسات میں، شہزاد کے والد کی یاد میں سب کے دل پہ چرکے لگ رہے تھے۔ دلی خوشی کی خوشیوں کی گھڑیوں میں، مرادوں کی باراتوں کے وقت آنسوؤں کی لڑیوں کی جھڑیاں لگی تھیں۔ سب سسک رہے تھے، آنسو گر رہے تھے۔ چہرے

بھیگ رہے تھے۔ غم کا سیلاب تھا کہ ہر کوئی تیز و تند دھاروں میں ہچکولے کھا رہا تھا — اور تقدیس کی ہچکیاں اور سسکیاں تو بلند سے بلند تر ہوتی جا رہی تھیں۔ باپ کی باہوں میں سمٹی، بڑے زور سے دونوں باہیں ان کے گرد لپٹائے، چمٹی لپٹی رو رہی تھی — سارا وجود جھٹکے کھا رہا تھا۔ نازک بدن ہچکولے کھا رہا تھا۔

"اف — اف — ہائے — میرا بازو۔" درد کی شدت سے شہزاد ملک اٹھے۔ پہلے آہستہ آہستہ اور پھر زور زور سے اپنا بازو دبانے لگے۔ آواز میں کرب تھا۔ شدت کا درد تھا۔ سب اپنے آنسو، آہیں، سسکیاں، ہچکیاں، غم و اندوہ، فکریں، پریشانی بھول گئے۔ اب تو شہزاد کی پریشانی پڑ گئی تھی۔ ظفر نیازی نے پریشان ہو کر باہوں میں سمٹی، روتی، سسکتی تقدیس کو فوراً سعدیہ بیگم کے پاس دیوان پر بٹھا دیا۔ وہ بھی گھبرا کر جلدی سے اٹھ کر کھڑی ہو گئیں۔

"الٰہی خیر — شبانہ جلدی دوڑو، جاؤ، ڈرائیور کو بھگاؤ، دو کالے بکرے صدقہ کرواؤ۔" سعدیہ بیگم نے جلدی سے شبانہ کو باہر بھگا دیا — وہ آنسو پونچھتی، بغیر کچھ سوچے سمجھے پردہ

ہٹا کر چلی گئی۔ فوزیہ بیگم کو پریشانی میں کچھ سوجھ نہیں رہا تھا۔

"لٹا دیجئے۔" جلدی سے تکیہ درست کرنے لگیں۔ "لٹا دیجئے یہاں۔" اور خود پانی لینے بھاگ گئیں۔ ظفر نیازی جلدی جلدی تیز قدم ڈاکٹر کو فون کرنے جا رہے تھے۔ سعدیہ بیگم دراز قامت اچھے جسم کے صحت مند شہزاد کو دیوان پر لٹا رہی تھیں۔ تقدیس شہزاد کے پاؤں کی طرف کھڑی تھیں۔ اسی طرح سجی سجائی دلہن دونوں ہاتھوں سے چہرے کے گرد سرخ ساڑھی کو سمیٹے ہنسی روکنے کی کوشش میں رخسار تھرک رہے تھے۔ پلکیں لرز رہی تھیں۔ سب کو پل بھر میں پریشان کر دیا تھا۔ افراتفری مچا دی تھی۔ مصیبت ہی ڈال دی تھی۔ اور خود دونوں آنکھیں تھوڑی تھوڑی کھولے تقدیس کی طرف دیکھ رہے تھے۔ خوبصورت چہرہ آنسوؤں میں بھیگا بھیگا، جگہ جگہ قطرے روشنی کی کرنوں میں چمک رہے تھے۔ بڑی بڑی پیالہ سی آنکھوں میں ساغر میں رُکی بوندوں کی طرح کچھ قطرے آنسوؤں کی صورت میں اب بھی موجود تھے۔ سُرخ ساڑھی دونوں ہاتھوں میں سمیٹے۔ سر پہ سے کھسک چکی تھی۔ وہی آرائش و زیبائش، دلہن بنی تقدیس، شہزاد چھپے

لیٹے بڑے مزے سے دیکھ رہے تھے۔ چہرہ آنسوؤں سے تر اور لبوں پہ مسکراہٹ' تقدیس کا یہ انداز ـــ وہ سب جانتی تھی کہ شریر شہزاد نے اس وقت کی سوگوار فضا، کو تبدیل کرنے کے لیے' تایا حضور کی طرف سے دھیان ہٹانے کے لیے یہ ڈرامہ کیا ہے مسکرائے بغیر نہ رہ سکی۔

شہزاد اس مسکراہٹ کو سمجھتے تھے۔

تقدیس ان کی شرارت کو سمجھتی تھی۔

پہلے بھی تو ایک دن یہی کچھ کر کے ان دونوں کو پریشان کیا تھا۔ سب بزرگوں کو اپنی اپنی پڑی تھی۔ پریشانی کے مارے بُرا حال تھا۔ اور یہ دونوں مزے سے مُسکرا رہے تھے۔ وقت کی مصلحت اور تقاضا یہی تھا کہ تقدیس کچھ نہ کہتی۔ کچھ نہ بتاتی۔ سب بھید جانتے ہوئے، شرارت سراسر، محض شرارت تھی۔

شہزاد نے شدید درد کے دورے میں ہی بڑی مشکل سے ہنسی روکتے ہوئے امّی حضور کو بتایا کہ" دوا تقدیس کے پاس ہے ـــ اس دن ڈاکٹر صاحب نے جو تجویز کی تھی، وہی استعمال کرتے ہیں ـــ اور اب مصر تھے کہ تقدیس ہی وہ دوا لا کر دیں۔ اسی سے آرام آئے گا۔

امّی — ابّو — خالہ حضور — سب تقدیس کو جا کر دوا لانے کا اصرار کر رہے ہیں — وہ بے چاری — سب جانتی تھی کہ سارا بہانہ ہے - اس وقت بڑی مشکل میں تھی -

"نہ جائے رفتن نہ پائے ماندن"

سُرخ ساڑھی کو سمیٹ کر بڑی احتیاط سے ایک طرف رکھا، اپنی نیلی ساڑھی کا پلّو سنبھالتی، کاریڈور میں کمرے سے تھوڑی دُور ہی گئی تھی کہ پیچھے شہزاد آ گئے - نہ جانے پریشان حال بزرگوں سے کیا بہانہ بنایا تھا -

خوبصورت چہرے پہ وہی لازوال مسکراہٹ ہونٹوں پہ شوخی، آنکھوں میں شرارت کی چمک اور سرخ و سفید رنگت لیے آ گئے — قریب — تقدیس کے بہت قریب -

ڈاکٹر صاحب — دوا لینے کے لیے دُور جانے کی کیا ضرورت ہے - مریض حاضر ہے — پھر رات ہے تنہائی ہے - کرنے دیجئے جو من میں آئی ہے، دل میں چھپائی ہے، من کی مرضی، من مانی" -

شہزاد نے آگے بڑھ کر ہنستے ہوئے تقدیس کے کندھے پہ ہاتھ رکھ کر وہیں روک لیا - بار بار پھسلتا آنچل اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے پیچھے کھڑے اپنی ٹھوڑی تقدیس کے شانے پر رکھ دی — دونوں

باہنوں کا ہار گردن کے گرد گلوبند کی طرح ڈال دیتے۔ بے پناہ حسن تھا۔ خدا داد رُوپ، آرائش و زیبائش ۔ لطافت و نزاکت بڑھیا لباس، قیمتی زیورات کے ساتھ جوان جذبات، جاگتے جاگتے چوکس احساسات، اور پھر عطر بیز وجود مہکتا رہا۔ سمٹتا رہا۔

تقدیس، شہزاد کی باہنوں میں تھی۔

چاہت کی پناہوں میں تھی۔

گوری گوری باہنیں شہزاد کی گردن کے گرد تھیں۔ طلائی ٹیکہ ایک طرف ڈھلکا ہوا تھا تو مالا کی ڈھیلی ڈھالی لڑیاں دوسری طرف لڑھک گئی تھیں، لٹک رہی تھیں۔

شہزاد نے اپنی بے پایاں چاہت کا، اپنی سچی محبت کا، دائمی رفاقت کا مضبوط کرنے کا بھرپور انداز میں اظہار کیا اور تقدیس نے اپنے دل کے سارے ہی ایسے جذبوں کی بھرمار کا اقرار کر لیا، کہ ___ یہ دوا تھی ___ یہ علاج تھا ___ شہزاد کے درد کا، انوکھا درد، نرالا علاج، سر اٹھایا تو سامنے فرح بھابی ہنستی مسکراتی چلی آرہی ہیں۔

"چہ خوب ___ تو یہ کرتوت ہیں سارے" تقدیس کا بازو

پکڑ کر اپنے ساتھ لے جاتے ہوئے فرح بھابی نے شہزاد کو ٹھینگا دکھایا۔ وہ وہیں دیوار کے ساتھ، ہاتھ اونچا کیے، دیوار پہ رکھے کھڑے مسکراتے رہے۔ ٹیوب کی روشنی میں تقدیس جگمگ جگمگ کر رہی تھی۔ اور شہزاد کی کائنات جگمگ جگمگ کر رہی تھی۔

"ہم نے آج شام ہی تمہاری دلہن کے ناطے اپنی دیورانی، تمہاری مہارانی کے سہاگ بندی لگا دی تھی۔" فرح نے تقدیس کا جھکا جھکا چہرہ اوپر کرتے ہوئے ٹھوڑی پکڑ کر اپنی طرف کرتے ہوئے شہزاد سے کہا۔ اور تقدیس بار بار انگلی پہ ساڑھی کا کونہ لپیٹتی کھولتی رہی۔ اس کے روپ سنگھار پہ بے حد پیار آ رہا تھا۔ دلہن بنی ۔۔ توبہ توبہ۔ قیامت کا حسن پھر پیار کا سنگھار، نظر نہ ٹھہرتی تھی اس چہرے پر۔ فرح نے تو تاب نہ لاتے ہوئے منہ دوسری طرف کرتے ہوئے تقدیس کو ساتھ لگا لیا ۔۔۔۔۔ آنکھیں بند کیے کیے اس کو پیار کرتے ہوئے لے کر کمرے میں آ گئیں۔

شبانہ جب کیمرہ لینے گئی ہے تو فرح بھابی، شمع اور دیگر بہت سی سہیلیوں کو شام والے سارے مہمانوں کو فون کر آئی، منگنی کا بتا آئی تھی۔ وہ سب خوشی خوشی، وہ سب اچھے لباس میں

اچھے اچھے، پیارے پیارے مذاق کرتی، چھیڑ چھاڑ کرتی کمرے میں موجود تھیں۔ مبارک سلامت کا شور تھا کہ خوب رونق تھی۔ کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ اسی شور شرابے میں قیامت خیز ہنگامے میں رات کا کھانا کھایا گیا — اور — پھر — تقدیس دلہن بنی درمیان میں بیٹھی تھی۔ لڑکیاں ناچتی گاتی، قہقہے لگاتی رہیں تالیاں اور ڈھولک بجاتی رہیں۔ رات بھر وہ دھما چوکڑی مچائی ہے کہ خدا کی پناہ — آس پاس نہ کہیں نیند کا خیال نہ تھکن کا احساس شادی بیاہ کے گانے گائیے، ریکارڈ لگائیے، انگریزی دیسی ہر طرح کے ڈانس، ناچ ہوئے، غرض اس منگنی کی خوب خوب خوشی منائی۔ ساتھ ساتھ انواع و اقسام کی مٹھائیوں سے مشروبات اور چائے سے تواضع بھی کروائی۔ شہزاد کے ساتھ چھیڑ چھاڑ اور مذاق کرتی رہیں۔ اُن کی ہزاروں نقلیں اُتاریں۔ سوانگ بھرے۔

شرارتی شہزاد جو خود کسی کو نہ چھوڑتے تھے۔ ہر کسی کو چھیڑتے تھے۔ لڑکیوں کے خوب قابو آئے تھے۔ انہوں نے خوب تنگ کیا تھا۔ ستایا تھا۔ اچھا جلوس نکالا تھا شہزاد کا — وہ بھی خوش تھے، بہت خوش — سب کے ساتھ پورے اُترتے تھے۔ شہزاد دوا ہے کر بالکل ٹھیک ٹھاک محفل میں برابر کے شریک تھے۔

لڑکیوں کے ساتھ مل کر گا رہے تھے۔ شرارتوں کا طوفان اٹھا رہے تھے۔ ان کا درد تو جیسے جادو کے اثر سے دور ہو گیا تھا۔ اتنا شدید اور اتنا ہی جلدی ختم ـــ سب کو حیرانی بھی تھی، اور پریشانی کے جلدی دور ہو جانے سے تسلی بھی۔ یہ تو شبانہ جانتی تھی کہ پہلے بھی ایک دفعہ ان دونوں کو ایسے ہی پریشان کیا تھا، محض شرارت تھی اور شرارت سے بڑھ کر شرارت کی بھیدی تقدیس کے اس معاملے میں تو شبانہ بھی انجان تھی۔

باب نمبر ۷

وہی خوشبو، وہی رنگت، وہی ہونٹوں پہ ہنسی
باغ میں پھول کھلے، اُن کا سراپا لے کر

گلابی گلابوں کی گلابی مسکراہٹوں میں گھری کھڑی تقدیس ہوا میں اڑتا گلابی آنچل سنبھالتی، سمٹتی نازک گلابی لبوں پر بڑی پیاری بڑی دلنواز مسکراہٹ لیے کھڑی تھی۔ بیلوں میں لگے گلاب کی طرح نہیں بلکہ تروتازہ گلاب سے بھی زیادہ شگفتہ تقدیس۔ کالی جالی کی باریک قمیض میں گورے گورے گلابی گلابی بازو جھلکتے کتنے خوبصورت لگ رہے تھے۔ دوپٹے کے ہمرنگ گلابی شلوار چمڑے کی کالی جالی کی اونچی ایڑی کی سینڈل میں گورے گورے پاؤں چمک رہے تھے۔ ناخنوں پہ لگی گلابی نیل پالش پیروں کی خوبصورتی اور چمک میں اور بھی اضافہ کر رہی تھی۔

ظفر نیازی کی ذاتی کوٹھی کے وسیع میدان کے درمیان میں سرسبز لان میں بارہ دری کے بارہ ستونوں پہ ہر ستون پہ علیحدہ رنگ کے گلاب کی بیل چڑھی تھی۔ بارہ دری کی گول چھت پر بڑھتی، پھیلتی، گھنی رنگ برنگ بیلیں سرسبز پتوں میں گھری بیلوں سے ساری چھت چھپی ہوئی تھی۔ ستون اور چھت نظر نہ آتے تھے۔ ساری بارہ دری گلاب کے پھولوں کی بنی لگتی تھی۔ گلرخ تقدیس گلابی پھولوں کے بیلوں والے ستون کے قریب بارہ دری کی پہلی سیڑھی پہ کھڑی موٹر کا انتظار کر رہی تھی۔ اس کی ذاتی گاڑی خراب ہو کر کئی دن سے ورکشاپ میں پڑی تھی ظفر نیازی اپنی سرکاری سیاہ رنگ کی لمبی گاڑی میں گئے تھے اور فوزیہ بیگم کو چھوڑنے ان کی بڑی موٹر میں ڈرائیور گیا ہوا تھا۔ وہ کسی ملنے والی خاتون کو ملنے گئی تھی۔ بیمار تھیں ان کی عیادت کے لیے گئی تھیں اس لیے تقدیس منتظر تھیں۔ وہ روزانہ آرٹ کونسل ہال جاتی تھی۔ بیرونی ممالک سے فائن آرٹس میں سند یافتہ ہونے کی وجہ سے وہاں جو کلاسیں ہوتی تھیں۔ ان میں بطور استاد روزانہ دو گھنٹے کے لیے جایا کرتی تھیں۔ اپنی تفریح ہو جاتی کچھ مصروفیت ہو جاتی اور دوسروں

کا بھلا ہو جاتا۔ بڑے گھروں کی بہو، بیٹیاں، بیگمات، تفریحاً شغلاً، بطور فیشن یا وقت گذاری کی خاطر روزانہ وہاں پہ مصوری سیکھنے کے لیے آتی تھیں۔ روپیہ پیسہ خرچنے کا اچھا بہانہ تھا اور وقت گذارنے کا بھی۔ رنگ برنگ لباس، سنگھار، فیشن دکھانے اور ایک دوسرے کے طریقے اپنانے کے بہانے یہاں بہت سی خواتین آتیں، پھر اتنی حسین و دلنشین نوعمر، نوخیز معلمہ سے تعلیم لینے کے لیے تو شاگردوں کی تعداد میں روز افزوں اضافہ ہوتا جا رہا تھا اور اس کے ساتھ ہی رشتے داری جوڑنے کی خواہش بھی بڑھتی جاتی، امیدوار بڑھتے جا رہے تھے۔ کوئی بہو، کوئی بھاوج بنانے کے سپنے دیکھنے لگی تھیں اور ہر روز ہر شام ان ہی خواتین میں سے کوئی نہ کوئی رشتہ لے کر آ جاتیں لیکن فوزیہ بیگم بڑی خوبصورتی سے بات بناتی رہیں۔ لوگوں کو ٹالتی رہیں اور لوگوں کی خواہشات کو مایوسیوں میں ڈھالتی رہیں۔

بالکل قریب بارہ دری کے پاس، گیٹ سے آتی پختہ سڑک پر گاڑی رکنے کی آواز آئی۔ ڈرائیور اتر کر دروازہ بند کرتے ہوئے تقدس کو بلانے کے لیے آ رہا تھا۔

اور تقدیس گلابی دوپٹہ درست

کرتی، اڑتے بالوں کو دونوں ہاتھوں سے سنوارتی آگے بڑھی

کہ دیر کافی ہو گئی تھی لیکن پیچھے گلابی دوپٹہ گلاب کی جھاڑیوں

میں الجھ گیا۔ ہاتھ بڑھا کر چھڑانا چاہا تو آنچل کے ساتھ ہاتھ

بھی گیا۔ نرم و ملائم نازک ہاتھ ...... نرم، گرم، بوجھل ہاتھ

کی گرفت میں تھا۔ ایک دم، اچانک ..... وہ تو بہت سخت گھبرائی

گلابی مہکتی مسکراتی جھاڑیوں کی اوٹ سے باہر آئی۔ ایک سیڑھی

اور اوپر بارہ دری میں۔

"ڈرائیور کی یہ جرأت"، کیسی انہونی، غیر یقینی بات تھی۔ پھر

بھی تقدیس ہاتھ چھڑانے کی کوشش کرتی، ڈرتی ڈرتی سامنے آئی

ڈانٹنے کے لیے الفاظ ہی ڈھونڈ رہی تھی اور ہمت بھی کر رہی

تھی، لیکن ...... ہمت، جرأت، الفاظ، احساس، سب کچھ

چھوٹتا جا رہا تھا۔ بے ہوش ہو کر گرنے ہی لگی تھی کہ ایک شرارتی

قہقہہ ساری خاموش فضاؤں میں ہواؤں کے ساتھ گونج اٹھا

شریر شہزاد نے آنچل کانٹوں سے چھڑا کر ملائم ہاتھ نرم و ملائم

آنچل دونوں اپنے ہاتھ میں مٹھی میں بند کر لیئے۔ شہزاد سفید

پتلون، سرخ اور سفید بڑے بڑے چیک کی بشرٹ میں تھے

سرخ و سفید رنگت، صحت مند چہرہ ۔ ہوا سے اڑتے پیشانی اور چہرے پہ آتے سیاہ بال ، سرخ ہونٹوں کے ساتھ ساتھ نشیلی آنکھیں بھی مسکرا رہی تھیں ۔ جھکتی، اٹھتی، پلکوں اور گلابی گلابی چہرے پہ وہی شرمیلی مسکراہٹ پھیلی تھی ۔ تقدیس منہ دوسری طرف پھیرے اپنا ہاتھ اور آنچل شہزاد کی گرفت سے چھڑاتی بڑی اچھی ، بڑی پیاری لگ رہی تھی۔ شہزاد کو" وہ تھی بھی تو ایسی ہی ۔ ان کے آنے کی خوشی میں چہرہ چمک رہا تھا۔ پلکیں لرز رہی تھیں۔ ہونٹ تھرک رہے تھے، لیکن بظاہر انداز میں لاپرواہی تھی ۔ اپنے جذبات کو چھپاتی، خوشی کے احساسات کو دباتی ، ہاتھ چھڑانے کے لیے، دوسرے ہاتھ سے جُھک کر زور لگاتی ... تو شہزاد کو اور بھی پیار آجاتا کہ ، سیاہ بال شانوں سے نیچے کمر تک ۔ریشم ، نرم و ملائم ریشم کی طرح پھیلے تھے اور کالے بالوں میں آنکھ مچولی کھیلتی چھوٹی چھوٹی طلائی بالیاں ۔ سیاہ بادلوں میں گھری بیقرار بجلیوں کی طرح چمک چمک کر چھپ جاتیں ۔حسن معصوم میں تو اضافہ ہو رہا تھا ۔لیکن یہ برق برقی رَو کی طرح شہزاد کے سارے وجود میں سرائت کرتی جا رہی تھی ۔

"ہمت دکھاؤ .... زور لگاؤ ۔ پٹھان بچی ہو" شہزاد نے زور دار قہقہہ لگاتے ہوئے بڑی شوخی سے تقدیس کے جھکے چہرے کے قریب جھکتے ہوئے کہا اور اپنی گرفت ذرا ڈھیلی کر دی ۔ ڈرائیور تقدیس کے لیے موٹر لے آیا تھا ۔ فوزیہ بیگم کو پہونچا کر ۔ شہزاد کی گاڑی اور شہزاد کو دیکھ کر بھی باوردی ڈرائیور ادب سے کھڑا حکم کا منتظر تھا ۔ اور شہزاد نے اس کو واپس بھیج دیا ۔

"کہاں جانا ہے جناب" شہزاد نے اپنی ٹھوڑی تقدیس کے کندھے پر رکھتے ہوئے پوچھا ۔

"مہربانی سے فون کروا دیجئے کہ آج آپ کی استانی جی کے سسرال والے آتے ہوتے ہیں" شہزاد جان بوجھ کر ستانے کے لیے تقدیس کو استانی جی کہا کرتے تھے ۔ اُنہوں نے واپس جانے کا کہتے ہوئے تقدیس سے کہا ۔ وہ پرانا گھریلو ملازم ۔ بہت شریف آدمی بغیر نگاہ اٹھائے الٹے قدموں واپس چلا گیا ۔

ہمارے آپ کے بزرگوں کے پروگرام تو آپ کی پیدائش ، ہماری ہوش سے بھی پہلے یعنی ازل سے ابد تک بندھنوں کو مضبوط کرنے کے ہیں اور آپ کو یہ چھوٹی سی گرفت بھی طبع نازک پہ

گراں ہے۔ نزاکت کی بھی حد ہو گئی" تقدلیس کا ہاتھ پکڑے زیر لب کہتے، ہنستے ہوتے شہزاد دو چار قدم آگے بڑھے۔ بارہ دری میں پڑی لوہے کی سفید کرسی پر جس کی نشست اور پشت پر سبز مخمل کی نرم گدیاں لگی تھیں۔ بیٹھ گئے۔ اور اپنے قریب دوسری کرسی پہ دونوں شانوں سے پکڑ کر تقدلیس کو بھی بٹھا لیا۔ بڑی خوشگوار ہوا چل رہی تھی۔ پھولوں سے آتی عطر بیز ہواؤں میں تقدلیس کے معطر وجود کی خوشبو اور اس کے عطر کی مہک بھی رچی ہوئی تھی۔

" ہاتھ چھوڑنے کے لئے تو نہیں پکڑے جاتے۔ میری جان عزیز عزیز دوست" شہزاد نے تقدلیس کے دونوں ہاتھ پکڑ کر اپنی گود میں رکھتے ہوتے اپنا ہاتھ اوپر رکھتے ہوتے کہا۔ وہ دونوں رنگ برنگ پھولوں سے ڈھکی بلکہ دیکھنے میں پھولوں کی بنی ٹوکری نما بارہ دری میں بیٹھے، چاروں طرف کھلے تازہ تازہ شگفتہ گلابوں سے بھی زیادہ خوبصورت لگ رہے تھے پھولوں پہ ان کا ہی جیسے عکس پڑ رہا تھا۔

ہ وہی خوشبو، وہی رنگت، وہی ہونٹوں پہ ہنسی

باغ میں پھول کھلے، ان کا سراپا لے کر

دیکھئے ..... بھئی ..... آپ نے پوچھا تک نہیں کہ ما بدولت کیوں آئے ہیں۔ ہماری خیریت پوچھنا تو درکنار۔ اپنے چاہنے والی، لمحہ لمحہ چاہتوں کی مالا جپنے والی ساس محترمہ اور بھابی بھاتی کو تی بڑی لاڈلی، بڑی چہیتی نند کا احوال بھی نہیں پوچھا حد ہو گئی ..... انتہا ہو گئی۔ شہزاد نے تقدیس کے چہرے پہ آتے۔ ہوا سے بکھرتے بالوں کو اپنے ہاتھ سے ہٹاتے ہوئے کہا۔ آنکھوں میں شدید شوخیاں تھیں اور شرارتی انداز میں چھیڑنے، ستانے کے لیئے کہہ رہے تھے۔

" اچھا پہلے ہاتھ چھوڑیئے" تقدیس نے بڑی ہمت کر کے بڑے ملائم شیریں لہجے میں پلکیں جھپکاتے ہوئے کہا

"ہم تو نہ ہاتھ چھوڑیں گے ... نہ ساتھ۔ ساتھ بھی ہاتھ بھی ہمارے ہیں۔"

شہزاد نے تقدیس کے دونوں ہاتھوں کو اپنی مٹھی میں بند کرتے ہوئے کہا۔

" جب سسرال والے آتے ہیں نا ... خاص طور پر دولہا میاں تو لڑکیاں یوں سر ڈھانپ کر بیٹھتی ہیں" شہزاد نے تقدیس کے سر پہ گلابی دوپٹہ پھیلا کر ذرا آگے ماتھے تک جھکا دیا۔

تقدیس پیاری پیاری آنکھیں کھولے دراز پلکوں کی اوٹ سے شہزاد کی طرف دیکھتی رہی ۔ مسکراتی رہی کچھ گھبرائی ، کچھ شرمائی ، بڑے پیارے انداز میں مسکرائی تو شہزاد کے اور بھی زیادہ من بھائی تو ہنستے ہوئے بولے

" اپنے سگے چچا ، بالکل سگی اتنی پیاری خالہ کی اکلوتی صاحبزادی جبکہ دونوں کا ردمان اپنے بزرگان کے ارمان کا ثمر ، پھر اپنی ہی منگیتر ہو ، تو ہاتھ پکڑنا نہ کوئی جرم ، نہ گناہ ، نہ خطا ، کوئی غلطی نہیں میری جان " ، تقدیس کا سر اپنے شانے پہ رکھتے ہوئے اس کو اپنے بازو کے حلقے میں لیتے ہوئے کہا

؎ دونوں انساں ہیں ، تو کیوں ، اتنے حجابوں میں ملیں

" ہم تو آج اپنی دلہن حضور ! کے ہاتھ سے چائے پئیں گے ایک پیالی ہماری ۔ ایک تمہاری ۔ بناؤ بھئی " شہزاد نے ٹرے میں بڑی شیشے کی بڑی خوبصورت پیالیاں سامنے رکھتے ہوئے کہا ۔ ملازم شہزاد کی آمد کی خبر سنتے ہی فوراً چائے موسم کے تازہ پھل بسکٹ وغیرہ لے کر وہیں بارہ دری میں حاضر ہو گیا تھا ۔ شہزاد نے اُس کو جلدی فوزیہ بیگم کو بلوانے کا کہا ۔ وہ اسی طرح ادب سے سلام کرتا ہوا واپس چلا گیا ۔ تقدیس نے کانپتے ہاتھوں سے

چائے بنائی۔ ہاتھ ٹھنڈے برف، چہرہ سخت گرم سرخ سرخ گالوں کو طلائی بالیاں چوم چوم کر جھوم رہی تھیں۔ شہزاد شفق اور برق کا یہ خوبصورت منظر دیکھتے رہے، ایک پیالی اپنے طرف کھسکالی۔ دیکھ رہے تھے۔ تقدیس کے کانپتے ہاتھوں سے پیالی چھوٹ کر ٹوٹ جائے گی۔ وہ تقدیس کی گھبراہٹ اور شرماہٹ سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ شرمیلی شرمیلی مسکراہٹ تقدیس کے مقدس سی چہرے پہ حسب معمول رقصاں اور آنکھوں میں ستاروں کی افشاں چمک رہی تھی گھبرا اس لئے رہی تھیں کہ منگنی کے بعد شہزاد پہلی بار آئے تھے۔

روشن روشن آنکھیں۔ روشن چہرہ رکھتے ہوئے بھی اتنے روشن خیال زمانے میں بھی ———— سوچ رہی تھی "اگر کوئی دیکھ لے گا" تو کیا ہو جائے گا۔ اس دن فرح بھابی نے کیا کچھ نہ دیکھ لیا تھا۔ کیا ہو گیا تھا۔ ہم بھی وہی۔ تم بھی وہی۔ منگنی کی رات والی بات یاد دلاتے ہوئے تقدیس کی گھبراہٹ دور کرنا چاہی

وہ... وہ.... تو.... فرح بھابی تھیں نا! تقدیس نے آہستہ سے کہا۔ اور شہزاد نے اس کی معصوم سی بات پہ

ہنستے ہوئے پوچھا

" سُرخ چوڑیاں کیا ہوئیں ۔ کیا ٹوٹ گئیں" شہزاد نے تقدیس کی گوری گوری ملائم کلائیوں کی طرف دیکھا ۔کہ گھڑی بھی زنجیر میں لٹکتی گلے میں پڑی ۔ سینے سے لگی تھی ۔ بڑے فخر سے بڑے ناز سے ۔

" نہیں" تقدیس نے سر کے اشارے سے کہا

" تو پھر اتار کیوں دیں" شہزاد نے پوچھا

" شرم آتی ہے" تقدیس نے آگے جھکتے ہوئے نرمی سے کہا ۔ ویسے بھی سوچنے کی بات تھی کہ ہر وقت یوں دونوں باہیں سُرخ چوڑیوں سے بھری انسان کیا لگتا ۔ ایسے تو کوئی بھی کہیں بھی نہیں کرتا ہوگا ۔ کلب جانا ۔ بازار جانا ۔ ملنے ملانے والوں نے آنا ...... اور یوں دو دو درجن چوڑیاں پہن کر پھرنا عجب سا ہی لگتا تھا ہر کسی کو ۔ ہر وقت مناسب نہ تھا ۔

" پگلی ؛ سُرخ چوڑیوں سے تو شرم آتی ہے ۔ سر یہ اپنی ساس کی پہنائی ، اپنے میاں کی لائی انگوٹھی سے کچھ نہیں ہوتا کیا ۔" ؟ شہزاد نے تقدیس کی انگوٹھی والی انگلی پکڑ کر سامنے کرتے ہوئے کہا ۔ نو ہیروں سے مرصع انگوٹھی کی چمک اتنی چمک ایسی

چمک تھی کہ نگاہ نہ ٹھہرتی تھی۔ شہزاد، تقدیس کی خوبصورت آنکھوں میں پیار محبت، خلوص چمک رہے تھے۔ ہیروں سے بھی زیادہ چمک تھی۔ ان کی آنکھوں میں "یہ وہی انگوٹھی ہے نا" شہزاد انگوٹھی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھ رہے تھے۔ صرف شرارت کی خاطر ورنہ تو وہ بھی بخوبی جانتے تھے۔ انگوٹھی کی تو اور بات ہے۔ ہر کوئی ہر وقت پہنے رکھتا ہے۔ اب دونوں ہاتھوں میں ہر وقت ہر گھڑی ڈھیر، ڈھیر چوڑیاں، وہ بھی سرخ روپہلی پہنے کوئی اچھا لگتا ہے۔ بلکہ خاصا ہی نامناسب سا۔ لیکن محض مذاق کر رہے تھے۔ چھیڑ رہے تھے تقدیس کو۔ اپنی دلہن رانی کو۔

"دلہن حضور" "کلائیاں سونی مت رکھا کیجئے" شہزاد نے چوڑیوں والی بڑی بی کا فقرہ اسی کے انداز میں دہرایا۔ بالکل وہی لہجہ بنائے نقل اتار رہے تھے۔

شہزاد تقدیس کا چہرہ اپنی طرف کرتے ہوئے بڑے رومانٹک ہو رہے تھے اور تقدیس نے گھبرا کر، شرما کر بڑے ناز سے منہ پھیر لیا۔ بڑے ہی دلکش انداز میں اور شہزاد تیر نظر کھا کے دل تھام کے رہ گئے۔ تقدیس اپنی انگلی میں پہنی انگوٹھی پہ گلابی دوپٹے کا

کو نہ لپیٹ رہی تھی ۔

" دلہن بیگم ، دلہن حضور ! سرخ چوڑیاں اتار دینے سے آپ کا القاب تو بدل نہیں جائے گا اور پھر ہمیں تو شرم بھی نہیں آتی "، شہزاد تقدیس کے سامنے آگے کو جھکے ہوئے تھے ۔ اس کے سرخ گلابی چہرے پہ رنگوں کی بہار کو دیکھ رہے تھے اس کی خوبصورت آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہہ رہے تھے ۔

" تو پھر لا دوں ؟ پہنا دوں سرخ چوڑیاں ؟" ہائے تقدیس نے اتنے خوبصورت انداز میں چمکتی آنکھوں میں شرم وحجاب بھر کے کہا کہ بس توبہ ۔ توبہ اور پھر اپنی مسکراہٹ کو چھپاتے ہونٹوں میں دبانے کے لیے جلدی سے پیالی اٹھا کر ہونٹوں سے لگالی اور شہزاد کے والہانہ ، بیتابانہ نظروں کی تاب نہ لاتے ہوئے ، لمبی لمبی کالی پلکوں کی چلمن گرالی اپنی آنکھوں پہ ۔ شہزاد نے تقدیس کے ہاتھ میں پکڑی ہونٹوں سے لگی پیالی جھکا کہ اس کے ہاتھ میں ہی اپنی طرف کرلی اس میں سے چائے پینے لگے ۔ تھوڑی تھوڑی ۔ گھونٹ ، گھونٹ " شرمیلے لوگوں کا تبرک پینے سے شائد ہمیں بھی

شرمانا آجائے۔

"مشکل" تقدیس نے سر جھکائے —— آہستہ سے کہا۔ شہزاد کی ہنستی مسکراتی شرارتی آنکھیں۔ خوبصورت چہرے پہ پھیلتے بکھرتے رنگوں کی بہار پہ نثار ہوتی رہیں۔ وہ جھکی جھکی پلکوں کی، ہوا سے لہراتے بالوں کی، گلابی گالوں کی نظروں ہی نظروں میں بلائیں لیتے رہے اور چائے کی خالی پیالی تقدیس کے سامنے پڑی تھی۔

"واقعی مشکل .... بہت مشکل" شہزاد نے تقدیس کی خوبصورت رائے سے بھی زیادہ خوبصورت انداز میں بھرپور اتفاق کیا اور بولے

"یہ دیکھئے .... کیا ہے؟" شہزاد نے چائے کے برتن ٹرالی کے نیچے کے خانے میں رکھتے ہوئے سفید پھولدار سلک پر بڑے سائز کے کاغذ پھیلا دیئے

"اگر شرمانا آجائے تو یہاں آنے کا بہانہ کہاں جائے۔ نکاح فارم ہے جناب" شہزاد پتلون کی پچھلی جیب پہ لگا قلم اتارتے ہوئے بولے

"ہم اپنی دلہن حضوری کی منظوری خود لیں گے"۔ شہزاد نے

سنہری خول اتار کر پن کے دوسرے سرے پر چڑھاتے سیاہ قلم تقدیس کے سامنے کاغذات پر رکھ لیا۔ "دستخط کر دیجئے" جیون بھر کے لیے ہم سفر بنا لیجئے۔ عمر بھر کا ساتھ نبھانے کا اقرار کر لیجئے۔ رسید لکھ دیجئے" تقدیس کی پلکیں پل بھر کے لیئے اُٹھیں۔ اُسی پل جھک گئیں۔ دونوں باہنوں میں چہرہ چھپا لیا۔ اپنا سر کرسی کے بازو پہ رکھ دیا۔ دوپٹہ تو پہلے ہی شہزاد بڑے بزرگانہ انداز میں ناصحانہ انداز میں اوڑھا چکے تھے۔ وہ مسکراتے رہے۔ خوش ہوتے رہے گنگناتے رہے۔ پھر دونوں شانوں سے پکڑ کر تقدیس کو اُونچا کیا۔ وہ اسی طرح باہنوں میں منہ چھپائے تھی۔ شہزاد نے زبردستی ہاتھ ہٹائے تو ... منظر بڑا ہی حسین تھا کانوں تک سُرخ ہوتا چہرہ، شرمیلی آنکھیں۔ گلابی گلابی ہو رہی تھیں۔ بڑی رسیلی سی مسکراہٹ لبوں پر شرابی شرابی سی گلابی گلابی سی پھیلی تھی۔ شہزاد نے بڑی نرمی سے تقدیس کا نرم ہاتھ، ہاتھ میں لیتے ہوئے دستخط کروا لیئے۔ تقدیس پھر دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپائے شرما رہی تھی۔ شکریہ ادا کر کے۔ فارم لپیٹ کر جیب میں ڈال کر، قلم پر سنہری کیپ

لگاتے ہوئے کھڑے ہو گئے اور تقدیس وہیں بیٹھی کی بیٹھی رہ گئی۔ اسبات کا بھی احساس ان کے انداز سے ہنس ہو رہا تھا کہ اب شہزاد جانے کو ہیں۔

"حد ہو گئی .... بھئی .... ہماری نہ آنے کی خوشی نہ جانے کا غم۔ کس قدر بے وقعت ہیں ہم"۔ شہزاد نے ہنستے ہوئے کہا، ہاتھ پکڑ کر اٹھا لیا۔ دونوں ساتھ ساتھ، پہلو بہ پہلو چلتے پھولوں سے ڈھکی ٹوکری نما بارہ دری میں سے اترے۔ سرسبز گھاس پر آہستہ قدم چلتے، لان کے کنارے کنارے رنگین پھولوں کی کیاریوں تختوں کے قریب سے گذرتے، بارہ دری سے برآمدے کو جاتی پختہ سڑک کے دونوں اطراف رنگ برنگ پھولوں کے سُرخ اور سفید رنگ کے گملوں کے درمیان چلتے تقدیس کے کمرے کیطرف آرہے تھے۔ وہ شہزاد کے بازو کے حلقے میں، ان کے مضبوط سہارے کے سہارے چل رہی تھیں۔ ننھی بوندوں کی پھوار پڑ رہی تھی۔ ہلکی ہلکی بڑی خوشگوار ہوا چل رہی تھی تقدیس کے بال ہوا سے اڑتے اور دوپٹہ لہرا رہا تھا۔ فضائیں عطر بیز تھیں۔ موسم بڑا سہانا تھا۔

اسی طرح خوشیوں کے جھولے جھولتے دونوں کمرے میں آ گئے

"شہزاد طاہر نیازی .... تقدیس ظفر نیازی کے ۔ نیاز چاہتے تھے سو ...... نیاز مند جناب کی بے نیازیوں ۔ کو سلام عرض کرتا ہے ."

شہزاد نے تقدیس کو نرم گدے دار کرسی پر آہستہ سے دھکیلتے ہوئے ۔ شرارت بھری آنکھوں کو بند کرتے ہوئے دونوں ہاتھ جوڑ کر ...... تقدیس کے سامنے کرتے ہوئے جھکے ہوئے تھے ۔ حسن ، حسن کے حضور ... ۔ جھک گیا تھا سنگ مرمر کی نازک سی تصویر کے آگے ۔ حسنِ مجسم اپنی تمام رعنائیاں لیئے سنگ مرمر کے بت کی طرح ہی جھکے ہوئے تھے ۔ دونوں ہی خوبصورت ، گلابی ،شہابی ۔ جیسے فضاؤں میں شہنائیاں بج رہی تھیں ۔ تقدیس شہزاد کے دونوں بند ہاتھوں کو اپنے نازک ہاتھوں میں پکڑے بیٹھی مسکرا رہی تھی ۔ شرما رہی تھی ۔ جگمگا رہی تھی اور شہزاد اس کے سامنے کی کرسی پر بیٹھ گئے ۔ فوزیہ بیگم آ گئیں ۔ گلابی دوپٹے میں لپٹا سرخ سرخ چہرہ دیکھ کر سمجھتی تھیں ،

شہزاد نے لڑکی کو خوب ستایا ہے۔ چھیڑتے رہے ہیں کیونکہ شہزاد اپنی عادت سے مجبور، شرارتوں کے نشے میں چور۔ امی اور خالہ کو بھی نہ چھوڑتے تھے۔ برابر چھیڑتے .... تو یہ .... تو تقدیس تھیں۔ فوزیہ بیگم دونوں کے چمکتے چہروں پہ محبت کی جگمگ بہاروں اور ہنستی مسکراتی پھواروں کو دیکھ کر کتنی خوش ہو رہی تھیں کہ ان کا بھی خوبصورت چہرہ چمک رہا تھا۔ آنکھوں میں خوشیوں کی جوت تھی، ہونٹوں پہ مسرت کا تبسم تھا۔

خالہ کو دیکھ کر بڑی سنجیدگی سے تعظیماً کھڑے ہو گئے، ادب سے جھک کر سلام کیا۔ خالہ نے بڑی محبت سے گلے لگا لیا۔ پیار کیا۔ وہ بڑی قیمتی سبز ساڑھی پہنے تھیں۔ بال بڑے سلیقے سے بنے تھے۔ نفیس سا جوڑا۔ سبز سنیڈل پہنے تھیں۔ دونوں باہوں میں سونے کی چوڑیاں۔ دونوں ہاتھوں کی انگلیوں میں انگوٹھیاں گلے میں سونے کی زنجیر۔ بڑے لکھ رکھاؤ اور امیرانا ٹھاٹ میں تھیں۔ حسن و روپ خدا داد تھا۔ سنگھار و سنوار نے اور بھی نکھار دیا تھا۔ مسکراہٹ سے اور بھی بہار آئی ہوئی تھی۔ دبلی پتلی، دراز قامت،

خولصورت فوزیہ بیگم تقدیس کی ہی امی لگ رہی تھیں ۔
اچانک .... اکیلے .... کیسے آ گئے ؟ آپا جان تو ٹھیک ہیں نا .. ؟ میری شبانہ کو کیوں نہیں لائے "؟ فوزیہ بیگم نے مسکراتے ہوئے ڈھیروں سوال کر ڈالے ۔

" تشریف تو رکھیے ، میری پیاری خالہ جانی ۔" شہزاد نے اپنی کرسی پہ خالہ کو بٹھایا ـــــ اور خود ان کے گلے میں باہنیں ڈالے کرسی کے ہنیڈل پر بیٹھ گئے ۔" میری پیاری خالہ جان ۔" شہزاد خالہ کو پیار کرتے ہوئے کہہ رہے تھے ۔ تقدیس گہرے سبز گھاس کے فرش کی طرح مخملیں سبز قالین پر اپنی کالی جالی کی سینڈل کی نوک سے آلڑی ترچھی لکیریں بناتی رہی ۔ اپنے گھٹنوں پہ کہنیاں رکھے ، دونوں ہتھیلیوں کی پیالی میں ٹھوڑی رکھے ، خولبصورت چہرہ سجائے بیٹھی تھی

" ہم ایک بہت ضروری کام سے آئے تھے خالہ جانی ۔ صد شکر باری تعالیٰ کہ بخیر وخوبی ، جلدی ہو گیا ۔" شہزاد نے دز دیدہ نظروں سے تقدیس پر نظر ڈالی ۔ نظروں میں اپنی مخصوص شرارت اور ہونٹوں پہ ہمیشہ کی مسکراہٹ تھی ۔ تقدیس چونک گیئں ۔ پلکیں اُٹھائیں ۔ نظریں ملائیں ۔ لیکن شہزاد پھر فوزیہ بیگم کی طرف متوجہ تھے ۔

" امی حضور ۔ تو خدا کے فضل سے ۔ آپ کی دعاؤں سے بالکل

ٹھیک ہیں اور .... اور .... شبانہ ...... وہ" شہزاد کے مسکراتے چہرے پہ غیر معمولی سنجیدگی آگئی۔ خاصے پریشان سے سر جھکائے کچھ کہتے کہتے رک گئے۔ "وہ ..... وُہ ...."

"ہاں .... ہاں .... کہو ..... کہتے کیوں نہیں .. شہزاد؟" فوزیہ بیگم نے بہت حیرانی، بڑی پریشانی سے شہزاد کے اتنے سنجیدہ چہرے کی طرف دیکھا۔ وہ سر جھکائے، ہونٹوں کو زور سے دبائے بیٹھے رہے۔

"میری بچی .... میری شبانہ .... ٹھیک تو ہے؟" فوزیہ بیگم شہزاد کی گہری خاموشی اور ادھورے فقرے سے گھبرا کر کھڑی ہوگئیں۔

"نہیں" سر کو جھکاتے انکار میں ہلا دیا شہزاد نے"

"کیا ہوگیا؟ میری بیٹی کو ... میری چندا کو؟" فوزیہ بیگم نے بڑے زور سے شہزاد کے دونوں کندھے پکڑ لیئے انہونی پریشانی سے کانپنے لگی تھیں۔ اپنے میں کھڑے ہونے کی ہمت نہ پا رہی تھیں۔

"ایکسیڈنٹ ہوگیا ہے۔ ہسپتال میں بے ہوش پڑی ہے" وہ رُک رُک کر بڑی سنجیدہ صورت بنائے۔ خاموش نظر اٹھائے

خالہ کی طرف دیکھ رہے تھے۔

"اسی لیے۔ اچانک ... تنہا .... آپ لوگوں کو لینے آیا ہوں۔" شہزاد کھڑے ہو گئے۔ فوزیہ بیگم کا تو مارے پریشانی، گھبراہٹ کے برا حال تھا۔ آنکھوں میں آنسو بھرے تھے، رنگت ایکدم زرد۔ کانپتے ہونٹ سفید ہو رہے تھے۔ تقدیس اپنے ہونٹوں پہ انگلی رکھے۔ حیران حیران نظروں سے شہزاد کی موجودہ سنجیدہ صورت اور تھوڑی دیر پہلے کی شوخیوں کا موازنہ کر رہی تھی۔

"شریر ... ہائے بڑے جھوٹے۔" دل ہی دل میں کہا لیکن ہونٹوں پہ انگلی رکھ لی۔ ہونٹ دانتوں میں دبا لیئے۔ مسکراہٹ روک لی۔ کوئی لفظ ہی نہ نکل جائے۔ کوئی بات ہی نہ کہہ دوں۔ امی کی پریشانی دیکھی نہ جاتی تھی۔ لیکن اپنے جیون ساتھی کا ساتھ دے رہی تھی۔ شرارتی انسان کا ہاں میں ہاں ملانے کے لیے خاموش تھی اور ان کی شرارت کا مزہ لے رہی تھی۔ فوزیہ بیگم تو جلدی جلدی جیسی کھڑی تھیں۔ چلنے کے لیے تیار ہو گئیں۔ تیز تیز چلتی بلکہ بھاگتی ہوئی جاکر گاڑی میں بیٹھ گئیں۔ ڈرائیور موٹر صاف کر رہا تھا۔

جلدی سے مؤادب کھڑا ہوگیا ۔ حکم کا منتظر ۔ اسی گھبراہٹ اور پریشانی میں اپنی گاڑی چھوڑ اور بارہ دری کے پاس کھڑی شہزاد کی گاڑی کی طرف جا رہی تھیں ۔ برا ہی حال تھا بے چاری کا ۔ جیسے کچھ نظر نہیں آ رہا تھا ۔ کچھ سمجھ نہیں آ رہی تھی ۔

" خالہ جانی " ، " آپ لیٹ جایئے " شہزاد نے بڑی محبت سے کہا اور پھولدار مخمل کی سرخ گدیاں اوپر نیچے دو رکھتے ہوئے ، خالہ کے سر کے نیچے رکھدیں اور بڑے آرام سے لٹا دیا ___ اور تقدلیس آگے شہزاد کے ساتھ ۔ موٹر بڑی تیز جا رہی تھی ۔ دونوں خاموش تھے اور فوزیہ بیگم اُونچی آواز میں شبانہ کی صحت و زندگی کی دعائیں مانگ رہی تھیں ۔ رو رہی تھیں ۔ آنسوؤں سے سر کے نیچے پڑی نرم گدیاں بھیگتی جا رہی تھیں ۔ آنکھیں اور چہرہ سُرخ ہو رہا تھا ۔ پپوٹے بھاری ہو رہے تھے ۔

" اف .... ہائے تھک گیا ۔ خالہ جانی ۔ کچھ دیر ستا لوں ۔ کہ سات گھنٹے مسلسل ڈرائیونگ کی ہے " شہزاد نے شہر کی حدود سے نکل کر درختوں کے سائے میں سڑک ۔ سے اتار کر گاڑی روک لی ۔

" نہ ۔ نہ بیٹے ۔ بس تو اپنی بیٹی ، اپنی شبانہ رانی کو جلدی

دیکھنا چاہتی ہوں ۔ ہائے میری بچی کیا ہو گیا تمہیں میری جان "
فوزیہ بیگم نے اٹھ کر بیٹھتے ہوئے کہا

ایک طرف لگے شیشے میں خالہ کا سوگوار چہرہ دیکھ کر بھی وہ آنسو پونچھ رہی تھیں ۔ شہزاد نے دیکھا لیکن آنکھیں بند کر لیں سیٹ کے پچھلے سہارے پر سر رکھے، خاموش تھے ۔ جیسے بڑی نیند آرہی ہے ۔ واقعی بہت تھک گئے ہیں ۔ سفر تو ابھی بہت باقی تھا ۔ فوزیہ بیگم نے شہزاد کی طبیعت کی سستی اور تھکن محسوس کی اور ان کے کہنے پر تقدیس نے ان کے ساتھ سیٹ بدل لی ۔ اب وہ گاڑی چلا رہی تھی اور خود ڈرائیور صاحب تقدیس والی سیٹ پر پڑے سوتے رہے ۔ سوتے میں کبھی تقدس کے شانے سے ٹکرا جاتا، تو کبھی حسین چہرہ تقدس کے کھلے اڑتے بالوں میں چھپ جاتا ۔ موٹی موٹی آنکھوں پر سیاہ پلکیں جھکی تھیں ۔ رخسار چمک رہے تھے ۔ ہونٹ مسکرا رہے تھے ۔ پرسکون چہرے پہ چودھویں کے چاند کی سی ٹھنڈک اور کشش اور روشنی تھی ۔

"رو کیئے ۔" شہزاد نے پلکیں اٹھائیں ۔ گلابی گلابی، شرابی، شرابی نیند سے بھری آنکھیں کھولدیں ۔ مخمور سی بوجھل آواز تھی ان کی سٹیرنگ پر تقدیس کے نرم ہاتھ پر اپنا گرم ملائم ہاتھ رکھ دیا ۔

"کیوں" تقدیس سرمئی سڑک پر سے گذر رہی تھی۔ بڑے شہر کی چوڑی سڑک کے دونوں طرف بڑے بڑے تناور، سرسبز درخت لگے تھے، دائیں طرف اینٹوں سے بنی پختہ کناروں کی نہر تھی۔ نہر کے دونوں جانب سفید اینٹوں سے بنی کیاریوں میں رنگ برنگ پھول لگائے گئے تھے، تھوڑے تھوڑے فاصلے پہ شہریوں کی سہولت کے لیئے لوہے کے سفید کٹہروں والے پل بنے تھے۔ آبی پرندے مستی میں اڑ رہے تھے۔ درخت اور پھولدار پودے ہوا میں جھوم رہے تھے۔ پانی پہ سے آتی، پھولوں سے مہکتی، ٹھنڈی ہوا، بڑی خوشگوار بڑی مزیدار تھی۔ بے شمار موٹریں۔ گاڑیاں۔ سکوٹر، بسیں ٹرک، سائیکل تیز رفتار سے بھاگے جا رہے تھے۔ نہر کے دوسری طرف والی سڑک کی سواریوں، گاڑیوں کا رُخ مخالف سمت کو تھا۔ کہ ون وے کی وجہ سے تقدیس نے سامنے سڑک پر نظریں جمائے بڑی آہستگی سے پُوچھا۔

وہ دھوپ کا سیاہ چشمہ، سنہری فریم کا بڑا قیمتی، بڑا خوبصورت نازک سا چشمہ لگائے تھے، گوری گوری رنگت پہ سیاہ چشمہ۔ جیسے شام سویرے، جیسے اندھیرے، اجالے گلے مل رہے ہوں۔

"بس ہماری مرضی" شہزاد نے ہاتھ بڑھا کر خود بریک لگا دیئے

تقدیس کے نازک پاؤں پہ بڑی آہستگی سے اپنا پاؤں رکھتے ہوئے خود گاڑی قابو کر کے روک دی ۔ سامنے چوک میں نہر کے کنارے مشروبات کی دوکان تھی، پان بھی تھے ۔ کوکا کولا منگوا کر تقدیس کو دی خود پی ۔ خالہ کے لیے بوتل پکڑ کر پلٹ کر پیچھے دیکھا، تو وہ بڑے آرام سے سو رہی تھیں ۔ چپکے سے تقدیس کو وجہ بتائے بغیر، خالہ سے اجازت لیے بغیر وہاں سے کھسک گئے ۔ دوڑ کر پل پار کیا ۔ دوسری سڑک پر سے آتی خالی ٹیکی روک کر پل بھر میں غائب ۔ اس وقت موٹر شہر کی حدود میں تھی ۔ اور شہزاد کی کوٹھی سے صرف چند گز کے فاصلے پر ... سب کچھ اتنی آہستگی سے اتنی جلدی میں ہوا کہ فوزیہ بیگم کو نیند میں کچھ بھی پتہ نہ چلا

"آہا ہا ... میری آپی .... میری خالہ جانی " جب تقدیس شہزاد کی چھوٹی آسانی موٹر ، بڑے لان کے ساتھ گھنی باڑ کے قریب سڑک پہ روک کر اتری تو فوزیہ بیگم بھی شکن آلود ، ساڑھی درست کرتی اتر آئی تھیں ، بے ترتیب بال ، پریشان حال سوجی سوجی سرخ آنکھیں گرتی پڑتی ، وہ اتنی پریشان تھیں کہ انہیں شہزاد کی غیر حاضری کا خیال ہی نہ آیا ۔ شبانہ دور سے دیکھ کر دوڑتی ہوئی خوش خوش آئی اور تقدیس سے لپٹ گئی ۔ پھر خالہ کے گلے میں باہیں

ڈال کر جھپٹ گئی اور فوزیہ بیگم شبابہ کو گلے لگائے رو رہی تھیں بار بار پیار کر رہی تھیں۔

" ہائے۔ میری خالہ جانی۔ آپ اتنا زیادہ روتی کیوں ہیں؟" شبابہ نے پریشان خالہ کا بے حال چہرہ دونوں ہاتھوں میں پکڑتے ہوئے، اپنا سر اونچا کرتے ہوئے ان کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

" وہ.... وہ...... تو..... شہزاد.... کہہ رہے تھے تمہارا حادثہ ہوگیا ہے۔ ہسپتال میں ہو۔ فوزیہ بیگم نے آنسوؤں کی روانی کے دوران بھیگے بھیگے لہجے میں کہا۔ وہ شبانہ کو صحیح سلامت پاکر بھی پریشانی میں بولیں۔ شبابہ اور سعدیہ بیگم نے بے اختیار بڑا زور دار قہقہہ لگایا۔ تقدیس بھی خالہ کے گلے لگی ہنس رہی تھی۔

" بڑا شریر ہے۔ جا ہوگئی۔ تم اس کی شرارت کی عادت جانتے ہوئے بھی باتوں میں آگئی" سعدیہ بیگم نے آنسو پونچھتی چھوٹی بہن کو ہنستے ہوئے گلے لگا لیا۔ بہت پیار کیا۔ اپنے ہاتھوں سے بال درست کرنے لگیں فوزیہ بیگم کے۔

" کیا کروں۔؟ آپا جان۔ وہ بات ہی اتنی سنجیدگی سے کر رہا تھا یوں صورت بنائی تھی کہ یقین آگیا۔" فوزیہ بیگم نے بہن

سے پلٹتے ہوئے مسکرا کر کہا

" ہر وقت نئی سے نئی شرارت سوجھتی ہے ۔ آنے دو ٹھیک کرتی ہوں اس شرارتی انسان کو ۔ خالہ کو بھی نہیں چھوڑتا " سعدیہ بیگم نے فوزیہ بیگم کو پیار کرتے ہوئے کہا

بازو کے حلقے میں لیئے لان میں آگیئں ۔ شبانہ اور تقدیس اس اچانک اور غیر متوقع ملاقات سے بڑی مسرور ، بڑی خوش باش ایک دوسرے کے گلے میں باہنیں ڈالے ساتھ ساتھ آ رہی تھیں ۔ مارچ کا مہینہ ، شام کا وقت تھا ۔ لان میں لوہے کی سفید پالش کی ہوئی جالی دار کرسیاں پڑی تھیں ۔ جن کی پشت اور نشست پر قرمزی رنگ کی مخمل کے اندر نرم گدیاں لگائی گئی تھیں ۔ سعدیہ بیگم اور شبانہ شام کی چائے پی رہی تھیں ، نمکین بسکٹ ، پیسٹریاں ، کئی قسم کی تلی ہوئی دالیں ۔ بیسن کی سویاں وغیرہ ساتھ رکھی تھیں ۔ شہزاد صبح سویرے منہ اندھیرے کے ۔ ایک ضروری کام کا کہہ کر شہر سے باہر گئے ہوئے تھے اور ابھی تک غائب تھے ۔ اب تقدیس کو شہزاد کی گاڑی سے اترتے دیکھ کر معلوم ہوا ۔ کہ فوزیہ بیگم کے پاس گئے تھے ، ان کو ستانے اور بہانے سے ساتھ لانے کے لیئے ۔ اب

چپکے سے راستے میں اتر گئے اور اپنا پروگرام تبائے بغیر غائب ہو گئے۔ دراصل جب سے شہزاد نے تقدیس کو اپنا عمر بھر کے لیے ہم سفر بنانے کا اعلان کیا تھا۔ سعدیہ بیگم نے منگنی کی انگوٹھی پہنائی تھی۔ تقدیس خالہ کے گھر نہیں آتی تھی۔ شاید صرف شہزاد کو ستانے کے لیئے، وہ ہزار منت سماجت کرتے۔ کئی بہانے لگاتے لیکن وہ صاف بچ نکلتی، اسی طرح چھ مہینے کا عرصہ اسی میں گذر گیا۔ شہزاد کی بے تابیاں انتہا کو پہونچ گئیں۔ پیمانہ صبر لبریز ہو گیا۔ اگرچہ خود تو اکثر ہی ان کے ہاں جاتے۔ کئی کئی دن رہتے۔ تقدیس کو گھنٹوں ساتھ لیئے سیریں کرتے تفریح کرواتے۔ تنہائیوں میں بھی بزرگوں کی موجودگی میں بھی اس کے ناز اٹھاتے کبھی چڑاتے، ستاتے کبھی پیار سے دلار سے بہلاتے امی حضور بھی آتیں۔ شبانہ کو بھی لاتے۔ جتنا تقدیس نخرے کرتی اتنا ہی ان کی وارفتگی میں دیوانگی میں اضافہ ہوتا جاتا۔ نہ جانے تقدیس نے کیوں ایسی قسم کھائی تھی کہ شہزاد کی ہر تدبیر ہر ترکیب فیل ہو جاتی اسی لیے انہوں نے آج شبانہ کا بہانہ، سراسر جھوٹا بہانہ بنایا تھا کہ فوزیہ بیگم تو حد درجہ پریشان ہو کر جائیں گی ہی اور تقدیس کچھ

نہ بدلے گی اور یوں کہتے دعا گے ہیں چلے آئیں گے سرکار بندھے۔
اب بھی تقدیس کو شہزاد کی شرارت اور بات کی اصل حقیقت کا علم تھا۔ چاہتی تو رک جاتی، امّی کو اصل بات بتا دیتی۔

لیکن آخر شہزاد تو شہزاد تھے، ان کے اپنے، سچے سپنے، خوابوں کی تعبیر، ان کی تقدیر، شہزاد —— تقدیس ان کا ارمان تھی تو —— وہ —— تقدیس کا ایمان —— ان پر ہزاروں خوشیاں قربان، ان کی دلی خواہش و خوشی کے لیے تقدیس دل و جان سے بے دام غلام۔

اور!

اس وقت شہزاد کی آنکھ کے اشارے پہ کہ فوزیہ بیگم کو اصل بات پتہ نہ چلے، تقدیس زیرِلب ہنسی دبائے، عارض پہ پلکیں جھکائے خاموش کھڑی رہی۔ شہزاد خالہ جانی سے مذاق کر رہے تھے۔ ان کو تنگ کر رہے تھے، ستانے پہ آمادہ تھے۔

اس وقت رنگ برنگ موسمی پھولوں کی بہاریں، خوشرنگ گل و گلزار، سرسبز لان میں چائے کے دوران ہنسی مذاق ہو رہا تھا، قہقہے لگ رہے تھے، شہزاد کی شرارت سے سب مزہ لے رہے تھے۔

اگرچہ سعدیہ بیگم نے محبت سے شرارتی بیٹے کو ڈانٹا،
فوزیہ بیگم نے پیار بھرے انداز میں صدقے قربان جاتے ہوئے
شکوہ کیا، اور شبانہ نے تو والہانہ انداز میں بھائی جان کا شکریہ
ادا کیا۔ ان کو تو بھائی کی شاندار، بامراد شرارت پہ بڑی خوشی تھی۔
اس کامیابی کے نتیجہ میں آپی جان — اور خالہ جانی مل گئی تھیں۔

"الٹا زمانہ آگیا ہے — ایک بہنوں، بہنوں کے ملاپ کرواؤ،
اوپر سے ان کی ڈانٹ بھی کھاؤ۔" شہزاد منہ پھلا تے مصنوعی سنجیدگی
سے بولے۔ گرم گرم سموسے، تازہ رس گلے، خاص طور پہ تقدیس
اور خالہ جان کے لیے لائے تھے کہ ان دونوں نے دوپہر کا
کھانا جو نہیں کھایا تھا۔ خود بھی خوشیوں میں پھولے نہ سمائے،
ابھی تک بغیر کچھ کھائے پیئے گھوم رہے تھے۔ سب ہنسی خوشی،
سموسے، رس گلے کھاتے اڑاتے رہے۔

تقدیس کی پلیٹ میں سموسے کے بعد شبانہ نے اب دو رس گلے
ڈال دیئے۔ وہ شبانہ اور سعدیہ بیگم کے درمیان کرسی پہ سر جھکائے
بیٹھی تھی۔

"اب کہاں چلے؟" سعدیہ بیگم نے شہزاد کو کرسی پیچھے کھسکا
کر اٹھتے ہوئے دیکھ کر پوچھا۔

"امّی حضور! یہ بڑی عجیب سی بات ہے ــــ کہ ــــ آپ اپنی ــــ بہو ــــ بیٹی کو تو کچھ بھی نہیں کہتیں ــــ جدھر منہ اٹھایا رات دن گھومتی، پھرتی رہتی ہیں ــــ اور مجھ سے، اتنے جوان جہان ــــ عقلمند ــــ دانا ــــ اتنے سمجھدار بیٹے کے گھر میں بھی اُٹھنے بیٹھنے پر نظر رہتی ہے آپ کی ـ" شہزاد ہنستے ہوئے کہہ رہے تھے اور سعدیہ بیگم کے پیچھے ان کی کرسی کے سہارے کا سہارا لیے جھکے کھڑے تھے۔ اور "بہو" کہتے ہوئے تقدیس کے سر پہ ہاتھ رکھ کے دبایا۔ وہ سٹیل کے چمکدار کانٹے اور چھری کی مدد سے رس گلوں سے کھیل رہی تھی۔

شہزاد تھوڑا اور جھکے اور تقدیس کا ہاتھ کانٹے سمیت اپنے ہاتھ میں لے کر رس گلہ اپنے منہ میں ڈال لیا۔ وہ تقدیس کی کرسی کے پیچھے سے اس پر جھکے ہوئے تھے کہ تقدیس کا سر ان کے سینے سے چھو رہا تھا۔ دائیں بائیں سے دونوں ہاتھ لا کر تقدیس کی پلیٹ اٹھائے دوسرا رس گلہ بھی گول کر گئے۔

"امی حضور ــــ خالہ جانی ــــ ہم نے سنا تھا کہ منگنی کی رسم میں دلہن اپنے پیار سے دولہا کو اپنے ہاتھوں سے مٹھائی کھلاتی ہے۔ لیکن ہماری دلہن بیگم کو تو اپنے آپ سے ہی فرصت

نہیں ۔ شہزاد ہنستے ہوئے تقدیس کی کرسی کے بازو پہ اٹک گئے اور ان کی کرسی کی پشت پر سے بازو پھیلائے دوسری طرف ان کے کندھے پہ ہاتھ رکھے اپنے ہاتھ سے ان کے منہ میں مٹھائی ڈالنے کی ضد کر رہے تھے۔

تقدیس جھجک رہی تھی ۔ دونوں ہاتھ ہونٹوں پہ رکھے تھی ۔ اور شہزاد لبخند تھے ۔ آخر تقدیس ہار گئی ۔ شہزاد کی خواہش اور سب کے پیار سے بھرے اصرار پہ اپنا دایاں ہاتھ شہزاد کے سامنے پھیلا دیا، مٹھائی لینے کے لیے، لیکن وہ اس کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیے دوسرے ہاتھ سے مٹھائی زبردستی کھلا کر رہے۔ تقدیس ان کی نوازشوں کی بارشوں میں بھیگی بھیگی، خوشیوں کی پھوار میں سرشار سی مسکراتی رہی ، رس گلہ منہ میں رکھے آہستہ آہستہ کھاتی رہی ۔

شہزاد اور تقدیس کے خوشیوں کے نور سے منور چہرے، سکون و عافیت کی پُرسکون چاندنی کی طرح روشن چہرے دیکھ کر سب ہی بہت خوش تھے ۔ سب ہی اس نور سے، اس روشنی سے نکھرے نکھرے اجلے اجلے منور منور، نظر آ رہے تھے ۔

"میرے لعل، میرے چاند — کہیں آرام سے بیٹھو، اٹھو، تو کوئی رسمیں بھی کرے ، سارے رواج ، ساری رونقیں، کوئی ڈھنگ

طریقے سے پوری کرے۔ ہر وقت اودھم، افراتفری، ہڑبونگ مچانے والوں کا تو بہی حشر ہوتا ہے۔" سعدیہ بیگم بڑی محبت سے شریر بیٹے کے بازو پہ ہاتھ رکھے کہہ رہی تھیں کہ وہ تقدیس کی کرسی کے بازو پہ اپنی والدہ کے قریب ہی بیٹھے تھے۔

یہ حقیقت تھی کہ شہزاد نے باقاعدگی منگنی کروانے کا، کوئی تقریب منانے کا موقع ہی کب دیا تھا۔ ان کے اپنے ہی رسم و رواج تھے، اپنے ہی انداز تھے، سب سے الگ، سب سے جدُا۔

"بھائی جان! آج صبح ہمیں بھی ساتھ لے جاتے۔" شبانہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔ وہ سر اُٹھائے بھائی کی طرف دیکھ رہی تھی۔

"جی ہاں! آپ کو لے جاتے تو ہماری قیمت، وقعت کم ہو جاتی ہے۔ کوئی پوچھتا ہی نہیں، جیسے جانتے نہیں، پہچانتے نہیں، لوگوں کی نگاہیں ہی بدل جاتی ہیں، انجانی سی۔" شہزاد ہنستے ہوئے کہہ رہے تھے۔ "اور۔۔۔ پھر ان سب کی آمد بھی تو تمہاری وجہ سے ہوئی ہے۔۔۔ تم چلی جاتی تو یہ جھوٹ کیسے کھلتا۔ ویسے ایک بات ہے شبانہ! کہ جان کو تم سے

محبت بہت ہے ۔ تمہارے حادثے کا سُن کر تو خالہ جان کو کچھ سُوجھ ہی نہیں رہا تھا۔ فوراً رونا شروع کر دیا۔ بُرا حال ہو گیا تھا۔ اور ادھر میرا بُرا حال تھا، ہنسی ضبط کرتے کرتے۔"

شہزاد اب خالہ کو ستا رہے تھے، چھیڑ رہے تھے۔ اور وہ شرمندہ سی ہنس رہی تھیں کہ اِس شرارتی کی باتوں میں آ گئیں، دھوکہ کھا گئیں۔

"سچ! میری پیاری خالہ جان — روتے ہوئے بڑی پیاری لگ رہی تھیں۔ سُرخ سرخ چہرہ، بکھرے بکھرے بال، موٹی موٹی آنکھوں میں آنسو اور گلابی ڈورے — کسی فلم کی خوبصورت ہیروئن —" شہزاد ہنستے ہوتے فوزیہ بیگم کو چھیڑنے میں مزہ لے رہے تھے۔

"اپنے بچوں سے سب کو ہی محبّت ہوتی ہے۔ میں بچّی کی تکلیف کا سن کر کیسے نہ گھبراتی، تم تو شرارتی ہو۔ آئندہ کے لیے تمہاری بات کا اعتبار نہیں رہا۔" فوزیہ بیگم بھی ہنس رہی تھیں۔

"خالہ جانی — ہمارا بات ذرا غور سے سُنیئے گا۔ ہماری امّی حضور تقدیس کو ہمیشہ بیٹی کہتی تھیں، اور مجھ سے بار بار اصرار

تھا، ان کے لیے کہ ان کی زندگی بھر کی رفاقت کا اقرار کر لوں۔
اور یہ محترمہ ہماری دلہن بیگم اور امّی حضور کی دلہن بیٹی بن جائیں۔
دل میں بہو بنانے کا منصوبہ اور منہ سے بیٹی — یہ بھی خوب رہی۔
آپ بھی شبانہ کو بیٹی کہتی ہیں — بڑی پیاری بیٹی ہے آپ کی۔
تو آپ بھی جلدی سے ایک بیٹا حاضر کیجئے۔ خوب صورت، خوب سیرت، شہزاد کا شہزادہ گلفام، تاکہ یہ بیٹی کے روپ میں بہو والا ایک منصوبہ اور پورا ہو جائے۔"

شہزاد انتہائی شوخی میں ہنستے ہوئے کہہ رہے تھے۔ تقدیس کی کرسی کے اوپر جھکے ہوئے تھے، وہ فوزیہ بیگم سے اسی طرح پُر تکلف باتیں کرتے۔ جیسے وہ ان سے عمر میں بڑی خالہ نہیں بلکہ ہم عمر دوست ہیں، بے تکلف ساتھی ہیں۔

"توبہ ہے — تم تو سخت شریر ہو، نہ جانے کیا کیا کچھ سوچتے رہتے ہو" فوزیہ بیگم نے کانوں پہ ہاتھ رکھتے ہوئے ہنس کر کہا۔ سب خوش تھے، ہنس رہے تھے۔ خالہ بھانجے کی باتیں دلچسپی سے سن رہے تھے۔

"امّی حضور! ان کو یہاں لانے کے علاوہ بھی تو ایک بڑا اہم کام تھا۔" شہزاد نے پتلون کی جیب میں ہاتھ ڈالا،

تقدیس گھبرا گئی - چونک کر شہزاد کی طرف نظریں اٹھائیں، وہ تو باتوں میں، شرارتوں میں، سب سے ملاقاتوں میں بھولی بیٹھی تھی۔

"ہمیں بھی تو معلوم ہو؟" سعدیہ بیگم نے بڑے اشتیاق سے اپنے نوجوان بیٹے کے نوبہار چہرے پہ نثار ہوتے ہوئے پوچھا۔ وہ ان کے ہاتھوں کی طرف دیکھ رہی تھیں۔

"بتا دوں — دکھا دوں؟" شہزاد نے تقدیس کی ادھ کھلی، شرمیلی شرمیلی، نشیلی نشیلی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پوچھا۔ وہ تقدیس کے سامنے میز کے پرلی طرف فوزیہ بیگم کے ساتھ سعدیہ بیگم کے پہلو میں اپنی کرسی پہ آ بیٹھے تھے۔ تقدیس ابھی شیشے کی سفید پھولدار پیالی پکڑے آہستہ آہستہ چائے کے گھونٹ پی رہی تھی۔ چہرہ ایکدم سرخ ہو گیا۔ سیاہ پلکیں لرزنے لگیں کہ شہزاد ان سے دستخط لینے کا واقعہ سناتے ہوئے فارم میز پر پھیلا رہے تھے، امی اور خالہ کو دکھا رہے تھے۔

تقدیس جلدی سے پیالی میز پر رکھ کر دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپائے جھک گئی، سب سے چھپ گئی۔ سعدیہ بیگم اپنے بازوؤں میں تقدیس کو سمیٹے بار بار پیار کر رہی تھیں۔

"شہزاد بیٹے — ایسا تو ہم عمر سہیلیاں، بہنیں بھی لڑکی کو

تنگ نہیں کرتیں، جتنا تم ستاتے ہو۔ سب کام دُولہا میاں خود ہی کرتے پھرتے ہیں ___ بہت چھیڑتے ہو میری بیٹی کو۔" سعدیہ بیگم نے محبّت سے شہزاد کے سر پہ چپت لگائے ہوئے ہنس کر کہا۔

"میری پیاری امّی جان! اب تو بیٹی نہ کہا کیجئے ___ آپ کے لاڈلے بیٹے کے نام کی انگوٹھی پہنے لڑکی ___ آپ کی بہو بیگم، بہورانی، ہماری دلہن بیگم کہا کیجئے۔" شہزاد نے کاغذ سمیٹ کر اٹھتے ہوئے کہا۔

"آنے تو دو اپنے چچا جان کو، تمہیں ٹھیک کرواتی ہوں۔ ان سے کہوں گی کہ یہ ہماری بچّی کو بہت تنگ کرتے ہیں ___ مت دیکھئے ان کو اپنی بیٹی۔"

"خالہ جان! میری پیاری خالہ جانی!

"جب لڑکا لڑکی راضی تو کیا کریں گے ظفر نیازی"

شہزاد نے خالہ کے گلے میں باہیں ڈال دیں۔ پیچھے کھڑے ہوئے جھک کر ان کے سر پہ اپنی ٹھوڑی رکھے شریر انداز میں کہا۔ "قاضی کی جگہ نیازی کا پیوند لگاتے یہ سب نے شہزاد کی طبعی ذہانت، برجستگی اور شوخی پر بے ساختہ قہقہہ لگایا۔ اور

تقدیس ہزار ضبط کے باوجود بھی اپنی ہنسی ضبط نہ کر سکی، کھلکھلا کر ہنس دی۔ شہزاد ادھر ادھر کی بظاہر بے معنی، بے سرو پا مگر بڑی ذومعنی باتیں کرتے رہے۔ ہنستے رہے، ہنساتے رہے۔ موسم بڑا سہانا، ماحول بڑا خوشگوار تھا۔ گل و گلزار، پر بہار اور چہروں پہ خوشیوں کا نکھار تھا۔

"آج ہماری دلہن بیگم کی اتنی پکّی قسم کھٹاک سے ٹوٹ گئی ہے۔ یہ قسم کھائے بیٹھی تھیں کہ ہم گھوڑا سجا کر، سہرا لگا کر، باجے بجا کر پھلجڑیاں چلا کر بارات لے کر ان کو لینے جائیں، سرخ کپڑوں میں دلہن بنا کر روایتی انداز میں رخصت کروا کے لائیں، لیکن ہماری بہادری دیکھئے کہ نہ صرف دلہن بیگم بلکہ دلہن کی ماں کو بھی اٹھا لائے۔" شہزاد بڑی ترنگ میں کھڑے کہہ رہے تھے۔

"اب یہ تو ٹھہریں کنجوس، مکھی چوس، قسم ٹوٹنے کا کفارہ کیا ادا کریں گی ــــ البتہ ہم ان کی طرف سے آج رات کا کھانا بڑے عالی شان ہوٹل میں جناب کے شایان شان بڑی آن سے بڑے مان سے بڑی شان سے دے رہے ہیں۔ آرڈر بک کروا آیا ہوں ــــ ذرا سب لوگ، خاص طور پہ مہمانِ خصوصی بڑے ٹھاٹ باٹھ سے تیار ہو جائیں کہ آج کی رات بڑی رنگین بڑی حسین ہوگی کہ

ہم سب ایک مدّت کے بعد پھر ایک ساتھ ہیں"۔ شہزاد سب کو تیار ہونے کی تاکید کرتے ہوئے اپنے کمرے کی طرف چل دیئے۔ صبح سویرے کے اُٹھے تھے۔ تمام دن بھی چین سے نہ بیٹھے تھے، اب تھکن اور سستی محسوس کر رہے تھے۔ نیند آ رہی تھی۔ آرام کے خیال سے اپنے کمرے میں آ گئے۔

تقدیس کو بھی سعدیہ بیگم نے شبانہ کے ساتھ آرام کرنے کے لیے بھیج دیا۔ وہ بھی تو ان کی نازک اندام بہو، نازوں پلی بیٹی، اتنی دور سے کار چلا کر آئی تھی۔ کچھ دیر سو جائے تو طبیعت بحال ہو جائے گی۔ خود بھی دونوں بہنیں اندر آ گئی تھیں۔ شام کے سائے گہرے ہو گئے تھے۔ رات کی سیاہی پھیل رہی تھی۔ چراغ جگمگانے لگے تھے۔

شاندار مقامی ہوٹل میں شہزاد نے عشائیہ کا اہتمام کیا تھا۔ وہ سیاہ ڈنر سوٹ میں بڑے وسیع بڑے باوقار، بڑے حسین لگ رہے تھے۔

تقدیس کو شبانہ نے خاص طور پر وہ روپہلی سفید ساڑی پہنوائی تھی جو شہزاد نے شبانہ کی فرمائش پر ایف اے میں کامیابی پر لا کر دی تھی۔ بہت بڑھیا، بڑی قیمتی ساڑھی تھی، کیونکہ

تقدیس شہزاد کی جلد بازی کی وجہ سے خالی ہاتھ آئی تھی۔
سفید ساڑھی میں زینے سے اُترتی تقدیس برقی ٹیوب کی روشنیوں میں شب مہتاب میں نازک نازک سی مہتابی کرن کی طرح چمک رہی تھی۔ اُجلے اُجلے چہرے پہ خوب صورت بڑی بڑی آنکھیں۔

؎ شب ماہ میں پھول جیسے کنول کے

منی منی سی طلائی بالیاں جھوم جھوم کر گلابی عارض کی بلائیں لے رہی تھیں۔ دہکتے رخسار اور نرم گالوں پہ مسکراتے ہوئے پڑتے بھنور سے حسن و معصومیت اور دلکشی کو بڑھا رہے تھے۔ گلے میں طلائی زنجیر میں گھڑی پڑی تھی — جھولتی جھومتی گھڑی نازک بدن کی حسین رفعتوں پر بڑے فخر سے چمک رہے تھے۔ گھڑی میں لگے ہیروں کی چمک سے زیادہ چمکدار تقدیس کی آنکھوں میں چمک تھی۔ حسن میں وقار تھا، رعب تھا — کہ شہزاد سامنے کھڑے ہی رہ گئے تھے۔ بار بار ہزار کی دیکھی ہوئی تقدیس کا ہر روپ ہر انداز ہی جدا ہوتا — بالکل نیا بالکل نرالا۔
شبانہ گلابی کپڑوں میں نازک سی گلاب کی ڈلی کی طرح

لہکتی چہکتی ساتھ ساتھ آ رہی تھی۔ فوزیہ بیگم قرمزی رنگ کی ساڑھی میں خاصی سمارٹ، بڑی خوبصورت، پورے بناؤ سنگھار میں ان کا حسن بھی خوب چمک رہا تھا۔ سعدیہ بیگم ہلکے رنگ کی بڑی عمدہ، بڑی نفیس ساڑھی میں بزرگانہ وقار کا شاہکار نظر آ رہی تھیں۔ چہرے پہ ماتا کا نور، پاکیزگی اور تقدس کا نکھار تھا۔ امّی حضور اور خالہ جانی کے درمیان کھڑے شہزاد، تقدیس اور شبانہ کے منتظر تھے۔ وقت کافی ہو گیا تھا۔ دیر ہو رہی تھی، اس لیے جلدی جلدی سب خوشی خوشی روانہ ہو گئے۔

شبانہ سعدیہ بیگم کی بڑی گاڑی چلا رہی تھیں کہ شہزاد کی، اُن کے پیارے بھائی جان کی صبح کی تھکان جاتی رہے۔ تقدیس درمیان میں شہزاد اور شبانہ دائیں بائیں تھیں۔ دونوں خواتین پچھلی نشست پر مستقبل کے حسین خوابوں کی تعبیروں کی تصویر دیکھ رہی تھیں۔ شہزاد کی شرارتوں، خوش گپیوں، لطیفوں، چٹکلوں کے ساتھ ساتھ، چھیڑ چھاڑ کے دوران مزیدار کھانا کھایا، کھانے کے بعد انگلش فلم دیکھ کر واپس لوٹے ـــــ تو ـــــ ظفر نیازی کی کالی گاڑی پورچ میں کھڑی نظر آئی۔ ان کی آمد کا جان کر شہزاد کی جان جانے لگی۔ ان کی

شرارت کی وجہ سے چچا جان کو جو پریشانی اٹھانا پڑی اس کی پشیمانی ہو رہی تھی کہ وہ سرکاری کام کے سلسلے میں وزراء کی میٹنگ میں دوسرے شہر گئے ہوئے تھے وہاں سے واپسی پر شبانہ کے حادثے کا سنتے ہی فوری آ گئے تھے کہ ان کو شبانہ کسی سے کم عزیز تو نہ تھی۔ بڑا پیار تھا ان کو شبانہ سے — بہت چاہتے تھے اس کو۔

اور شہزاد اب چچا کو سامنے موجود پا کر جب کوئی راہ فرار کی نہ ملی اور کوئی بہانہ بن نہ پایا تو ادب سے جھک گئے — چچا کو سلام کیا — انہوں نے بھی بڑی محبت، بڑی شفقت سے شرارتی بیٹے کو سینے سے لگا لیا۔ پیار کیا، سر پہ ہاتھ رکھا۔

شبانہ کا ابھی بچپن نہیں گیا تھا۔ خاصی بڑی ہو کر بھی بالکل منی گڑیا سی بچی کی طرح دوڑ کر چچا کے گلے سے لٹک جاتی — اب بھی ان کی گردن میں دونوں باہیں ڈالے، جھولتی بڑے لاڈ سے، بڑے مان سے آج کی ساری روئیداد ان کو سنا رہی تھی۔ وہ ہنس رہے تھے۔ شہزاد کی شرارت کا لطف لے رہے تھے۔ سب کی خوشیوں کا مزہ لے رہے تھے — شبانہ کو پیار کرتے، اس کی زبانی کہانی سنتے رہے۔ قریب ہی

تقدیس بھی کھڑی تھی ۔ اُجلی اُجلی نکھری نکھری، ٹھنڈی ٹھنڈی سکون بخش چاندنی سی بیٹی — تقدیس کو گلے لگا کر پیار کیا۔ اس کے روشن چہرے پہ خوشیوں کی بہار تھی — اور اس بہار کی وجہ سے ہر ایک چیز پہ نکھار تھا، سنوار تھا۔ وہ سب کو خوش باش دیکھ کر بہت خوش نظر آ رہے تھے۔

ظفر نیازی صدارتی کابینہ کے ہنگامی اجلاس سے فارغ ہو کر جب شام کو واپس گھر آئے تو بیوی، بیٹی کو نہ پایا — شہزاد کی اچانک آمد، شبانہ کے حادثہ کی خبر سن کر اسی وقت اپنی سرکاری کالی بڑی سی گاڑی میں ادھر کے لیے روانہ ہو گئے — شبانہ کو دیکھنے کے لیے — اپنے مرحوم بھائی کی چہیتی، ان کی اپنی لاڈلی بچی کی تکلیف کا سن کر کیسے رہ سکتے تھے — !

باب ۸

ع بہار آئی کھلے گل زیب صحنِ بوستاں ہو کر
عنادل نے مچائی دھوم سرگرم خواں ہو کر

شبانہ اور شہزاد کے کالج میں موسمِ بہار کی تعطیلات تھیں۔ ایک تو بہار کا سہانا سماں، پھر چھٹیوں میں فراغت اور فرصت نے شب و روز اور بھی رنگین کر دیئے تھے۔ فوزیہ بیگم اور تقدیس بھی آئی ہوئی تھیں۔

سارا دن اودھم، ہنگامہ، فارغ البالی، کھلنڈرے نٹ کھٹ شہزاد کی شرارتیں، تقدیس اور شبانہ کے ساتھ چھیڑ چھاڑ، ہنسی مذاق، لطیفے چٹکلے، قہقہے زندگی کی خوشیوں کا، مسرتوں کا ٹھاٹھیں مارتا سمندر تھا کہ جس کا کوئی اور، چھور ہی نہ تھا۔ اسی میں اُچھلتے کودتے، تیرتے، ڈوبتے، ابھرتے، غوطے لگاتے ہشاش بشاش تھے۔ گویا ہر روز، روزِ عید، ہر شب، شب برات۔ ان

چھٹیوں میں شہزاد ہمیشہ جاگیر پہ آجاتے۔ امّی حضور اور چھوٹی بہن بھی ساتھ ہوتیں — اور اب جب سے چچا جان وطن واپس آ گئے تھے، اگر ان کے پاس وقت ہوتا، فرصت ہوتی تو وہ بھی آجاتے نہیں تو بیوی بیٹی کو ضرور بھجوا دیتے۔ شہزاد جاکر ان دونوں کو لے آتے۔

طاہر نیازی (شہزاد کے والد) ان کے باپ دادا کے وقتوں کی قدیم طرز کی خاصی وسیع و عریض کوٹھی یہاں رہائش کے لیے موجود تھی۔ اس میں شہزاد کی محنت سے ہر قسم کی جدید آسائش و آرائش، سالانہ مرمت، ہر وقت کی ملازمین کی دیکھ بھال کی وجہ سے اس کی قدامت، کچھ اتنی محسوس نہ ہوتی تھی۔ زندگی کی تمام سہولتیں، ہر آرام وہاں موجود نہ تھا بلکہ یہاں تو جنگل میں منگل کا سماں تھا۔ شہروں، بستیوں سے سینکڑوں میل دُور دیہات میں کھیتوں کے درمیان، پہاڑوں کے دامن میں یہ صاف ستھری کوٹھی دیکھنے والوں کو حیران کر دیتی تھی۔

ان دنوں میں پورے سال کے حساب کتاب کی پڑتال، کام کاج کی دیکھ بھال اکاؤنٹنٹ کی مدد سے منیجر کی نگرانی میں سعدیہ بیگم خود کرتیں، اور شہزاد کو پوری طرح چھٹی ہوتی۔ کبھی کبھار اپنی مرضی

سے اپنے تفریحی پروگراموں کی مصروفیات سے فرصت کے لمحات میں امّی حضور کے پاس آ بیٹھتے ان کی مدد کے لیے، معاملات کو خود سمجھنے کے لیے آئندہ کی آسانی اور سہولت کی غرض سے، لیکن اس مرتبہ تو شہزاد کو کوئی ہوش نہ تھا، کہیں ہاتھ ہی نہ آتے۔ تینوں مل کر صبح کے نکلے شام کو گھر آتے، کبھی نہر کے کنارے، کبھی پہاڑوں کی چوٹیوں پر، ڈھلوانوں پر، کبھی باغوں اور کبھی سرسبز کھیتوں میں۔

ان کی پُربہار زندگی موسم بہار سے پوری طرح لُطف اندوز ہو رہی تھی۔ سارا سارا دن تفریحی پروگرام بنتے۔ دوپہر کا کھانا تو ایک دن بھی گھر نہ کھاتے، کبھی گھر سے ساتھ لے جاتے، کبھی ملازمین تازہ گرم کھانا پہنچا آتے۔ کبھی راستے میں بازار سے، پوری آبادی میں اکلوتے، چھوٹے سے ہوٹل سے جس پر کھانا تو عام سا ہی ہوتا تھا تکے، کباب، نان، چھولے، دال روٹی وغیرہ۔ لیکن گاؤں میں اس ہوٹل کو بڑی اہمیت دی جاتی تھی۔ بڑا اونچا سمجھا جاتا تھا کہ شہروں کے امیر کبیر لوگوں کے لیے کرسیوں، میزوں کا بھی انتظام تھا۔ شہری ہنگامہ خیز زندگی سے پُرسکون ماحول کی تلاش میں آنے والے کیلئے یہاں خوب انتظام تھا۔ ورنہ تو چھوٹے سے چھپّر

میں لکڑی کے بنچ پہ یا بڑے بڑے گھنی چھاؤں والے بوڑھے درختوں
کے نیچے بڑی بڑی جہازی سائز کی چارپائیوں پر بیٹھ کر دال روٹی سے
کھائی جاتی تھی۔ غریب تو پیٹ بھرنے کے لیے کھانا کھاتے تھے
اور امیروں کے ہاں یہ بھی ایک پکنک شمار ہوتی تھی کہ سب مل کر
اس ہوٹل کی موٹی موٹی روٹیاں اور بارہ مصالحوں والی، گھلی گھلی
لٹی سی دال کھاتے، شہروں میں جا کر دوسروں کو بتاتے اور
یوں فیشن زدہ، چھریوں کانٹوں کی مدد سے کھانے والے لوگوں
کے نزدیک یہ بھی فیشن و تفریح شمار ہونے لگی تھی، موٹریں بھر
بھر کے آتیں۔ خدا کی قدرت کہ اس بارہ مسالوں والی دال کی
شہرت اور صفتیں تھیں کہ توبہ ــــ اور ــــ اسی بہانے
غریب آدمی کا بھلا ہو گیا اس کی تجارت چمک گئی، غریبوں
مزدوروں کو روٹی کے ساتھ دال مفت دیتا تھا، اور موٹروں
والے، کوٹ پتلون پہنے، ساڑھیوں والی خواتین، ساتھ لیے
آتے تو ایک پلیٹ دال کے خواہ ہی دس، پانچ روپے
دے جاتے۔ مفت ہاتھ آئے تو برا کیا ہے۔ ہوٹل والے
کے وارے نیارے تھے ــــ اسی لئے اس نے اپنے ان
گاہکوں کے لیے، دو صاف ستھرے کمرے، لکڑی کی صاف

سنہری پالش کی ہوئی سادہ سی کرسیاں اور میزیں بنوا لی تھیں۔
اب تو کڑاہی گوشت اور قیمے کے پراٹھے بھی بنانے لگا تھا کیونکہ
اب ان کی بھی بڑی مانگ تھی۔ اسی طرح شہزاد اور اس کے
دونوں حسین ساتھی دوپہر کا کھانا اکثر ہی یہاں کھاتے۔
" دال روٹی، کڑاہی گوشت، قیمے کے تنوری پراٹھے "
بڑا مزہ آتا، انگلیاں چاٹتے، چٹخارے لیتے تھے۔ اس پرسکون
بے فکرے ماحول میں سب ہی بہت خوش تھے ـــــ صبح کہیں
شام کہیں ـــــ آج یہاں ـــــ تو ـــــ کل وہاں کبھی کبھار سعدیہ
بیگم اور فوزیہ بیگم کو بھی شہزاد زبردستی ساتھ کھینچ لاتے۔
انہیں اپنے عزیز بچّوں کو پُرمسرت زندگی کی رنگینیوں میں ڈوبے
دیکھ کر خوشی تو بہت ہوتی ـــــ مزہ تو بہت آتا ـــ لیکن وہ نوجوانوں
کی صحبت میں، خوش گپیوں، شرارتوں، چھیڑ چھاڑ، مار دھاڑ میں
اپنے بزرگانہ رکھ رکھاؤ کی وجہ سے زیادہ دیر رہنا مناسب نہ سمجھتی
تھیں۔ فرح بھابی، شمع اور بچّے بھی ساتھ چند روز کے لئے
آجاتیں۔ بچّوں کی وجہ سے اور بھی زیادہ رونق ہوجاتی، خاص
طور پر تقدیس اس بے تکلف، سادہ ماحول اور زندگی میں خوب
لطف لے رہی تھی۔ کہ اس نے بڑے پُرتکلف، غیرملکی ماحول میں

پرورش پائی تھی۔

اچانک شبانہ کی دوست عذرا کی شادی ٹھہر گئی۔ دولہا ملک سے باہر جا رہا تھا۔ بیوی کو ساتھ لے جانا چاہتا تھا اس لیے جلدی جلدی سارے کام ہو گئے، شبانہ کو دعوتی کارڈ موصول ہوا۔ تقدیس کا نام دعوت نامے میں نہ تھا۔ اب تو بڑی مجبوری بن گئی تھی۔ تقدیس جا نہیں سکتی تھی۔ اور شبانہ رہ نہیں سکتی تھی کہ عذرا ان کے گروپ کی ایک اہم فرد تھی، سب کی بڑی گہری دوست پھر اس قدر اصرار اور تاکید سے بلایا تھا کہ شبانہ کا جانا ضروری تھا آخر جانے ہی بن پڑی۔ شہزاد اور تقدیس کے ساتھ شہر کے فیشن ایبل علاقہ کے جدید طرز سے بڑے آراستہ بازار میں شبانہ نے بڑی لمبی چوڑی خریداری کی۔ اپنے لیے ساڑھیاں، جوڑے سینڈلیں پھر عذرا کے لیے شادی کا قیمتی سا تحفہ ــــــ سرخ، سبز، سنہرے کاغذوں میں لپیٹ کر سنہری ڈوریوں سے باندھ کر دوکاندار نے شادی کا تحفہ تیار کر دیا۔ پھر گھر سے کچھ ضروری سامان، ضرورت کی اشیاء لے کر شبانہ، عذرا کے گھر پہنچ گئی۔ اور ــــ شہزاد ــــ تقدیس کو لیے، شہر کے بارونق، نوتعمیر جدید فیشن ایبل علاقہ کے شاندار سینما ہاؤس میں آ گئے۔ دنیا کی

حسین ترین عورت "قلوپطرہ" کے نام پہ عالمی شہرت یافتہ انگریزی فلم دیکھنے کے لیے ـــــــ تقدیس کے بہت انکار کے باوجود شہزاد کا پیار بھرا اصرار جیت گیا۔ خوبصورت قدرتی مناظر کے ساتھ، جذبات میں ہلچل مچانے والی قربتوں اور صحبتوں کی تصاویر انگریزی لباس کی تراش خراش، آرائش و زیبائش میں عریانی کا عنصر اس حد تک شامل تھا کہ تقدیس جیسی مقدّس صنفِ لطیف تو گھبرا گئی ـــــــ قلوپطرہ کے غیر مردوں کے ساتھ بے تکلفی کے ایسے مناظر تھے کہ تقدیس نے تو واقعی آنکھیں بند کر لیں۔

"یہاں سے چلیئے ـــــــ کہاں فضولیات میں آ گئے ہیں" آخر تنگ آ کر تقدیس نے بے دلی سے کہا۔ وہ کب سے پہلو بدل بدل کر بے چین ہو رہی تھی۔ لیکن اپنی عادت سے مجبور کچھ کہنے کی ہمت نہ کر رہی تھی۔

"یہ فضولیات نہیں میرے حضور! یہ تو آپ جیسے ٹھنڈے مزاج، یخ بستہ جذبات لوگوں کو گرم کرنے، شدت سکھانے کے اسباق ہیں" شہزاد، تقدیس کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیے دباتے ہوئے کہہ رہے تھے۔

تقدیس حسبِ عادت بہت گھبرائی، شرمائی، کچھ کہنا چاہا۔ قوتِ

گویائی نے ساتھ نہ دیا ـــــ ایک تو پکچر ویسی ـــــ اُوپر سے شہزاد کی جذباتی کیفیت ـــــ بے ہوش سی مدہوش سی ـــــ شہزاد کی قربت میں آنکھیں بند کیے ـــ سانس روکے رہ گئی ـــ وقفہ ہوا روشنیاں جل اٹھیں ـــ شہزاد نے گھنٹی بجائی ـــ آئس کریم منگوانے کے لیے۔

تقدیس خاموش سر جھکائے ـــ اپنے سبز ڈوپٹے کے آنچل کو ہاتھوں میں دبائے۔ ہاتھ ملتی رہی ـــ اپنی ہی انگلیاں مسلتی رہی ـــ دانتوں میں ہونٹوں کو دبائے بیٹھی رہی ـــ شہزاد کا نرم گرم لمس، مضبوط گرفت، مہکتی سانسوں کا ٹکراؤ، اپنے آپ سے ان کی خوشبو آرہی تھی، ان کی قربت، ان کی محبّت کا احساس مل رہا تھا ـــ کبھی گھبراتی اور کبھی ایک عجیب سی لذّت، پُرلطف کیف، نشہ سا حواس پہ چھا جاتا، کھوئی کھوئی سی وقت کے مدوجزر میں ڈوبتی اُبھرتی رہی ـــ آئس کریم آگئی تو اسی طرح خاموش، خاموش روٹھے روٹھے انداز میں کھاتی رہی ـــ عجیب ہی مزہ تھا۔ عجیب ہی کیفیت ـــــ ایک طرف شہزاد کے جذبات کی گرمی ـــــ اور دوسری آئس کریم کی ٹھنڈک ـــ یہ اُتار یہ چڑھاؤ ـــ یہ گرمی یہ سردی یہ ٹھنڈک ـــــ سوچوں میں ہی ڈوبی تھی۔

"اگر کوئی شکوہ ہے؟ شکایت ہے! تو زبان سے کہئیے۔ ان بے زبان خاموشیوں کو زبان دیجئے" شہزاد تقدیس کے قریب ہو کر اپنی آئس کریم کھاتے ہوئے کہہ رہے تھے۔ وہ بھی اس سردی گرمی کا ہی سوچ رہے تھے۔ اس تکلفات کی پڑیا، شرمیلی گڑیا کے متعلق سوچ رہے تھے۔ یہ اپنے بچپن کے ساتھی چچا کے لڑکے، خالہ کے بیٹے سے نہیں کھلتی اور ____ ایک وہ عورت ہے ____ جوان ہے ____ حسین ہے ____ دلکش ہے نوخیز ہے ____ ادائیں قیامت خیز ہیں ____ عریانی جذبات انگیز ہے غیر ذر۔ غیر مردوں سے کتنی بے تکلفی بے ساختہ بے تکلف انداز میں محبت کا ڈرامہ کھیل رہی ہے ... وہ بیٹھے یہی سوچتے رہے۔ تولتے رہے۔ مشرق اور مغرب کی تہذیب کو ____ موازنہ کرتے رہے۔

"موازنہ ____________ مقابلہ" مغرب کا مشرق کے ساتھ۔

اور پھر اپنی تقدیس ____ اپنے مشرق کی بیٹی تقدیس۔ کی مشرقیت پر فخر سے سر بلند ہو گیا، اس کے تقدس، اس کے وقار کو سجدہ کرنے کو دل چاہنے لگا۔

دراصل تقدیس مغربی ممالک میں پلی بڑھی تھی۔ وہاں کا ماحول،

وہاں کی فضا ـــــ آزادی ـــــ بربادی کی حد تک آزادی - انگریزی تہذیب کے آداب و اطوار سے اسے چڑ سی ہو گئی تھی ـــــ کہ غیر ملکوں میں تو لڑکے، لڑکیوں کے انداز ایسے خراب، ایسے خطرناک، ایسے خوفناک ہوتے ہیں کہ خدا کی پناہ - یہی وجہ تھی کہ مقدس تعدیس اصل مشرقی تہذیب کے تقدس کا شاہکار تھی - وہ خالصتاً مشرقی دوشیزہ تھی - مغرب میں رہ کر بھی وہ مشرقی تھی مشرق سے نکلتے سورج کی طرح پاک صاف، شفاف، باوقار، چمکدار - اس کے دل و دماغ میں اپنی تہذیب ـــــ شرم و حجاب ـــــ وہاں کے شب و روز دیکھ کر دن بدن اور بھی زیادہ اور بھی پختہ ہوتی جاتی تھی ـــــ اگرچہ وہ فطرتاً کم گو ـــــ خاموش طبع تھی لیکن مزاج میں شگفتگی ـــــ حجاب آلود مسکراہٹ کا نکھار حسین چہرے کا روپ تھا - سنگھار تھا ـــــ یہی تو مشرق کی بیٹی کا زیور، قیمتی زیور کہلاتا ہے -

ـــــ دو دن سے شبانہ کی طبیعت خراب تھی - غدرا کی شادی سے واپس آئی ـــــ تو زکام بخار وہاں سے ساتھ لائی ـــــ آواز نہ نکل رہی تھی - گلا بالکل بند تھا - آنکھ ناک سے پانی جاری - سر میں چکر، بڑا بھاری بھاری ہو رہا تھا

آنکھیں سوجی، ناک چھلی ہوئی۔ آنکھیں چہرہ سُرخ۔ بخار بھی بہت تیز تھا۔ ایسے بُرے حالوں شبانہ بستر میں سر باندھے پڑی تھی۔ شہر سے دو تین بار ڈاکٹر آکر دوا تجویز کر گیا تھا۔ تقدیس اس کی بیماری سے فکرمند۔ تیمارداری کی فکر میں رہتی۔ شہزاد بھی بہت پریشان تھے۔ ہر وقت دوا علاج۔ آرام۔ پرہیز۔ ہر بات کا ایک اچھے بھائی کی طرح خیال کرتے۔ بے چاری کمزور بھی کافی ہوگئی تھی۔

ایک تو چھوٹی بہن بیمار ــــــ اُوپر سے روزمرہ کے کاموں میں رُکاوٹ ــــ پریشانی اور زیادہ تھی۔ کیونکہ چھٹیاں ختم ہو رہی تھیں اور وہ ان دنوں میں زیادہ سے زیادہ تفریح اور بے فکری میں وقت گزارہ کرتے تھے۔ اسی طرح چار پانچ دن گزر گئے۔

مطلع ابرآلود تھا۔ ہوا بڑی خوشگوار چل رہی تھی۔ دیہاتی علاقے کی سرسبز فضا، سرمئی بادلوں کی گردش اور جھک جھک کر نیچے آنے اور چاروں اطراف میں چھا جانے کی وجہ سے اور بھی حسین ہوگئی تھی۔ پانی سے بھرے گھرے سیاہ بادل برسنے کو تیار تھے۔ کالی گھٹائیں چھائیں اور شہزاد باہر نہ جائیں۔

ے کافر ہے جو ایسے موسم میں رُخ نہ کرے مے خانوں کا

شہزاد جھوم جھوم کر گاتے گنگناتے اندر آئے - کہ آج اتنے خوبصورت موسم میں سیر کو ضرور نکلنا چاہیئے - اگرچہ شبانہ پہلے سے بہتر تھی لیکن کمزوری اور سر میں شدید درد ابھی باقی تھا - بڑی مجبوری تھی ـــــ لیکن ـــــ بھائی کے شوق ـــــ بلکہ جنون کی حد تک اس موسم کے شیدائی ـــــ ان کی پسندیدگی اور اتنے پیارے بھائی کی خواہش کی خاطر سر پر دوپٹہ باندھے ـــــ بستر سے اُٹھ کھڑی ہوئی ـــــ سیر کو جانے کے لیے تیار ـــــ کہ تقدیس شبانہ کے بغیر نہ جاتی تھی - اور - شہزاد اپنے شوق کی انتہا میں اتنی لاڈلی ـــــ اتنی پیاری بہن کی حالت بھول گئے - بس فوراً ہی خوش ہو گئے - لیکن ـــــ فوزیہ بیگم نے شبانہ کو روک دیا - سعدیہ بیگم اپنے کام میں مصروف تھیں - ابھی حساب کتاب جاری تھے - تقدیس جانے پہ تیار نہ ہوتی اور شبانہ کا جانا ناممکن تھا - اب ـــــ شہزاد ـــــ بڑے خاموش سے ـــــ روٹھے ہوئے سے کھڑے تھے - باہر کی طرح اندر بھی مطلع ابر آلود تھا ـــــ لیکن فوزیہ بیگم کی مصلحت نے معاملہ طے کر دیا -

شہزاد نیلی پتلون دھاری دار ٹی شرٹ پہنے ، اپنی بندوق پکڑے

شکار کی تلاش میں بڑے چوکس، اِدھر اُدھر درختوں میں دیکھ رہے تھے۔ تقدیس گہرے سبز رنگ کی ساڑھی، سفید سینڈل پہنے تھی۔ چمڑے کا بڑا بیگ کندھے پہ ڈالے شکار کی تلاش میں ساتھ ساتھ تھی۔ برسات کے اس شرابی موسم میں یہ ساغر و مینا کی جوڑی ــــــ تقدیس اور شہزاد ــــــ سرسبز کھیتوں، پتلی پگڈنڈیوں، گھنے درختوں کے نیچے سے گزرتے جھاڑیوں سے کانٹوں سے پتھروں سے بچتے، الجھتے، ٹھہرتے چلتے دُور بہت دُور نکل آئے تھے۔ تقدیس بڑی بڑی آنکھیں پھیلا کر انگلی سے نشاندھی کرتی ــــــ اور شہزاد فوراً نشانہ لیتے فائر کرتے۔ چڑیاں، کبوتر، فاختہ، مرغابیاں زمین پر گرتے لوٹتے دونوں شکاری دوڑتے، شہزاد تیز دھار چاقو سے تکبیر پڑھ کر ذبح کرتے۔ پروں میں لپٹے اور تقدیس اٹھا اٹھا کر بیگ میں ڈالتی جاتی ــــ صبح سے دوپہر ــــ دوپہر سے شام ہونے کو آئی ــــ دونوں اپنی دھن میں اتنے مگن کہ کوئی اور لگن باقی ہی نہ تھی۔ دنیا کو، دنیا والوں کو، اپنے آپ کو بھلائے ہوئے تھے۔ نہ کھانے کا ہوش نہ پینے کا خیال۔ تقدیس سے نازک اندام، بالکل کومل، ہوا سے لہکتے، نازک پھولوں

کی ڈالی کی طرح مہکتے وجود کے لیے شکار کا بوجھل بیگ اب سنبھالنا مشکل ہو رہا تھا۔ دُبلی پتلی سی لڑکی ہوا کے چلنے سے ڈگمگا جائے، اتنا بوجھ کیونکر سہار سکتی تھی۔ بیگ اب کندھوں کی بجائے زمین پہ تھا اور تقدیس دونوں ہاتھوں سے گھسیٹتی ساتھ چل رہی تھی۔ شام کی سیاہی گہری ہوتی جا رہی تھی۔ دن بھر تھوڑی تھوڑی بارش ہوتی رہی تھی لیکن اب تو زور پکڑ لیا تھا۔ موسلادھار بارش تھمنے کا نام ہی نہ لے رہی تھی رکنے کا کوئی ارادہ ہی نہ تھا۔ شہزاد تو ایسی برساتوں کے عادی تھے، لیکن تقدیس کے لیے یہ رات —— یہ برسات پہلا موقع تھا۔ اونچے نیچے، کچے راستے، باریک ڈوریوں کے سفید سینڈل۔ اتنا بوجھل بیگ —— نہ چل سکے —— نہ چھوڑ سکے —— شہزاد کی خوشی کے لیے خاموش چل رہی تھی —— کہ وہ تو پانی میں شرابور بھی بڑے خوش بڑے بشاش نظر آ رہے تھے۔ ایک دم تقدیس کی جوتی ٹوٹ گئی۔ چاروں طرف جل تھل پانی روانی سے بہہ رہا تھا۔ بڑے بڑے درختوں کے، پودوں کے، جھاڑیوں کے دھلے دھلے سرسبز پتوں سے پانی دھاروں ٹپک رہا تھا۔ اُوپر سے بارش کا زور،

سائیں سائیں کرتی ہواؤں کا شور۔ نہ کوئی ٹھہرنے کی جگہ نہ رکنے کا ٹھکانہ — اسی طرح بارش میں چل رہے تھے۔ آبادی سے اور خاص طور پہ اپنی آبائی کوٹھی سے دونوں بہت دور نکل آئے تھے۔ ایک کندھے پہ بندوق۔ دوسرے پہ شکار سے بھرا بیگ۔ گلے میں کارتوسوں کی پیٹی۔ ایک ہاتھ میں تقدیس کی سفید سینڈل اور دوسرے میں خود تقدیس شہزاد کے بازو کے حلقے میں سمٹی —— دونوں ہاتھوں سے ساڑھی سنبھالتی شہزاد کے سہارے سے چل رہی تھی۔ گورے گورے نازک بڑے نرم پاؤں نرم قالینوں کے عادی پاؤں کچّے راستوں پہ کیچڑ سے لت پت، ستیاناس ہو رہے تھے۔ اور شہزاد خوبصورت موسم میں خوبصورت ساتھی کے ساتھ بڑے مسرور بڑے مخمور سے منزل کی طرف رواں تھے۔ اپنے گھر کی طرف آ رہے تھے۔

کافی دور۔ کافی دیر چلنے کے بعد اینٹوں کی بنی پختہ سڑک پر پہنچے۔ یہاں سے بستی کی آبادی شروع ہوتی تھی۔ سارے گاؤں میں چاروں طرف ڈرائیور موٹریں۔ جیپیں اور گھوڑے لے کر دونوں بچّوں کی تلاش میں سرگرداں تھے۔ اتنی شدید

زور دار ۔ دھواں دھار بارش میں سعدیہ بیگم کو بہت فکر لگی تھی شہزاد بیمار نہ پڑ جائیں ۔ تقدیس بھیگ گئی ہو گی ۔ سردی نہ لگ جائے ۔ جوں جوں بارش کا زور بڑھتا جاتا گھر والوں کے دلوں میں ہول بڑھتے جاتے ۔ ہزاروں وہم، سینکڑوں خوف سر اٹھا رہے تھے ۔ لیکن نڈر، بہادر، جوان شہزاد نے ایک بھی سواری لینے سے انکار کر دیا ۔

؎ اگر آسانیاں ہوں، زندگی دشوار بن جائے

شہزاد اس پر لطف، حسین سفر کو حسین ساتھی کے ساتھ اور بھی خوبصورت اور دیرپا بنانا چاہتے تھے ۔ اس سحر کو توڑ کر سارا مزہ چھوڑ کر وہ موٹر میں کیوں بیٹھ جاتے ۔

آگے شہزاد اور ان کے بازو کے سہارے میں تقدیس پانی میں شہر ابور گیٹ میں داخل ہوئے ۔ پیچھے آہستہ چلتی موٹریں جیپیں اور سعدیہ بیگم کی بڑی سفید گاڑی ۔ رات پوری طرح ہو چکی تھی ۔ بجلیاں جل رہی تھیں ۔ سعدیہ بیگم چھوٹی بہن کو ساتھ لیے پریشانی کے عالم میں اس طوفانی موسم میں برآمدے میں کھڑی تھیں ۔ پانی زور کا برس رہا تھا ۔ ہوا منہ زور چل رہی تھی ۔ بجلی رہ رہ کر چمک رہی تھی ۔ زبردست گرج اور بادلوں

کی کڑک سے دل دہل رہا تھا۔ لیکن ایسے طوفانی موسم میں شہزاد کے چودھویں کے چاند کی طرح پُرسکون چہرے پہ ٹھنڈی چاندنی کی طرح تبسم تھا۔ مسرت کی چمک تھی۔ آنکھوں میں خمار تھا ——— گھبرایا، شرمایا، ہم سفر، رفیقِ زندگی باعثِ راحت تھا۔ سبز ساڑھی میں بھیگی بھیگی تقدیس کی مہک سے مہکا بھیگا موسم اور بھی خوبصورت ہو گیا تھا۔ بھیگے بالوں سے اٹھتی خوشبو میں ایک عجیب سا کیف تھا، نشہ تھا۔ سرور تھا۔ سکون و اطمینان تھا۔

"یہ لیجئے ——— آپ کے بیٹے، بہو کی دن بھر کی کمائی" شہزاد نے شکار سے بھرا بوجھل بیگ کندھے سے اُتار کر سعدیہ بیگم کے پاؤں کے قریب رکھتے ہوئے کہا۔" اور یہ آپ کی نازک اندام بیٹی کی نازک مزاج جوتی" تقدیس کی سینڈل بھی فرش پہ رکھتے ہوئے بولے۔

"شہزاد بیٹے ——— ذرا تقدیس کی حالت تو دیکھو" پانی میں سرتاپا شرابور، سکڑی، سمیٹی تقدیس ۔ گیلی مہین ساڑھی نیز سرد ہوا کی وجہ سے وہ شہزاد کے قریب کھڑی سردی سے ٹھٹھرتی تھر تھر کانپ رہی تھی ۔ سعدیہ بیگم لپٹا لپٹا کر پیار کر رہی

تھیں۔ گیلے بالوں کو تولیے سے خشک کر کے سر لپیٹ دیا تھا۔ خوبصورت بالوں سے، کپڑوں سے ٹپکتے پانی کے قطرے موسم بہار کی بارش میں تقدیس سبز ساڑھی میں لپٹی خود بھی موسم بہار کی برسات کا ایک خوبصورت، بڑا رنگین سرسبز نظارہ نظر آ رہی تھی۔

فوزیہ بیگم کے اشارے پر ملازم پرندوں کے شکار والا بیگ اٹھا کر لے چلا۔ لیکن شہزاد نے پاؤں صاف کرتے ہوئے اپنی بندوق مع کارتوس پکڑا دی اور بولے۔

"شکار ہم خود بنائیں گے۔ خود پکائیں گے اور سب کو کھلائیں گے۔"

اور بیگ اٹھا کر برآمدے میں دوسری طرف جہاں سے منظر زیادہ خوبصورت اور دلکش نظر آ رہا تھا۔ لے چلے۔ لیکن سعدیہ بیگم نے بڑی محبت سے کپڑے تبدیل کرنے اور کچھ دیر آرام کرنے چائے کافی پینے کی ہدایت کی۔ ورنہ وہ تو اسی طرح گیلے کپڑوں میں خود بھی اور پانی میں غرق تقدیس کو ساتھ لیے جا رہے تھے۔ تھوڑی دیر کے بعد تقدیس پوری آستین، بند گلے کی پھولدار قمیص شلوار اور فیروزی دوپٹہ گلے میں ڈالے آگئی۔ بال بجلی کے ڈرائیر کی مدد سے سکھا کر سنوار کر تر و تازہ اور بشاش نظر آ رہی تھی۔ سعدیہ بیگم نے پھولدار

ریشمی باڈروں والا گلابی کمبل اس کے گرد اچھی طرح لپیٹ کر وہیں صوفے پر زبردستی لٹا دیا۔ اگرچہ تقدیس یقین دلاتی رہی کہ وہ بالکل ٹھیک ہے اور کمبل کی یا لیٹنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے اتنے میں شہزاد نہا دھو کر سفید شلوار قمیض پہلے اُجلے اُجلے نکھرے نکھرے سے امیدوں کے اُجالے کی طرح متبسم سب کے پاس آ گئے۔ فوزیہ بیگم نے اُن کے لیے بھی کافی کی پیالی بنائی۔ دوپٹے کے لیے پلٹ کر دیکھا تو وہ بڑے اطمینان سے کافی کی پیالی منہ سے لگائے بڑے مزے میں سامنے کھڑے تھے۔ وہ تقدیس کے ہاتھ سے کافی کی پیالی لے کر پہلے ہی پی رہے تھے۔

"امی حضور! مجھے ایک بات کی سمجھ نہیں آتی کہ آپ لوگ لڑکیوں کا زیادہ خیال کرتی ہیں جبکہ باقی ساری مشرقی دنیا میں لڑکوں کی خاطریں ہوتی ہیں۔ ان کے آرام و آسائش، خوراک لباس غرض ہر بات میں لڑکیوں پر فوقیت دی جاتی ہے لیکن ہماری قسمت کہ ہمارے ہاں لڑکیوں کو اولیت اور مردوں کو درجہ دوم ملتا ہے۔" کافی کی پیالی خالی کر کے ٹرالی میں رکھتے ہوئے انہوں نے تقدیس کے گرد لپٹا کمبل کھینچ کر اپنے گرد

لپیٹ لیا۔ تقدیس سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔

"آپ لیٹ جائیے، آرام کر لیجئے" تقدیس صوفے پر سے اُٹھ کر کھڑی تھی۔

"بیٹے! تقدیس بیمار نہ ہو جائیں۔ ان کو آپ کی طرح بارشوں میں بھیگنے کی عادت نہیں" سعدیہ بیگم تقدیس سے کمبل چھین لینے پر کہہ رہی تھیں۔ شہزاد کو سمجھا رہی تھیں۔

"امی حضور! اب تو ان کو یہ سب عادتیں سیکھنا پڑیں گی۔ اپنی عادتیں بدلنا پڑیں گی" شہزاد ہنستے ہوئے کہہ رہے تھے۔ ہمیشہ کی طرح اس وقت بھی اپنی شرارت کی عادت سے مجبور ستانے کے موڈ میں تھے۔ لیکن نازک نازک، کومل سی تقدیس پر رحم بھی آ رہا تھا۔

؎ کہیں یہ پیکرِ تصویر، یہ کاغذی پیرہن واقعی بیمار نہ پڑ جائے۔ اس لیے تقدیس کو بھی اپنے ساتھ کمبل میں سمیٹ لیا۔ وہ تقدیس کے ساتھ سعدیہ بیگم کے قدموں کے قریب صوفے سے ٹیک لگائے قالین پہ بیٹھے تھے۔

؎ ہم سے کھل جاؤ، بوقتِ مے پرستی ایک دن
ورنہ ہم چھیڑیں گے رکھ کے، عذرِ مستی ایک دن

شہزاد تقدیس کے شانے پہ سر رکھے گنگناتے رہے اور وہ زیر لب مسکراتی رہی۔

"شہزاد ـــــ اس کی آنکھ لگی ہے۔ طبیعت بڑی خراب ہے۔ مت ستانا، جگانا اس کو جا کر" فوزیہ بیگم نے شہزاد کو وہیں روکتے ہوئے کہا۔ اپنی تفریحات سے ذرا فرصت ملی تو بیمار شبانہ کا خیال آیا اور اسی وقت اُٹھ کر بہن کو دیکھنے، پوچھنے چلے۔ ڈاکٹر دوا تبدیل کر کے گیا تھا۔ جس کی وجہ سے اب کچھ سکون تھا اور نیند آگئی تھی۔ اور ـــــ پھر ـــــ رات گئے تک شہزاد نے شکار کو صاف کیا ـــــ بنایا ـــــ تیار کیا۔ تقدیس بھی ساتھ ہاتھ بٹا رہی تھی۔ جب کہ دو ملازم بھی مدد کر رہے تھے۔ امّی اور خالہ بھی تماشہ دیکھ رہی تھیں۔ رات کے کھانے پر شہزاد اور تقدیس کے ہاتھ کا بھنا ہوا گوشت بڑا مزیدار تھا۔ کھانا شبانہ کے کمرے میں کھایا جا رہا تھا۔ وہ بھی تکیوں کے سہارے سے بیٹھی کئی دن کے بعد سب کے ساتھ کھانا کھا رہی تھی اور شہزاد بڑے زور شور سے سارا دن کی کارگزاری۔ دلچسپ واقعات بڑے دلچسپ بڑے خوبصورت انداز میں سنا رہے تھے۔ غرض شہزاد

کی زندہ دلی کی بدولت دن بڑے پُرلطف اور راتیں بڑی سہانی گزر رہی تھیں۔

باب ۹

؎ دل والوں کے پیار کی دنیا، ڈوب گئی جن نینوں میں
لوگ بھی کچھ اندازہ کرلیں ، ان نینوں کی گہرائی کا

شبانہ کے کالج میں بیڈمینٹن کا فائنل میچ تھا۔ اپنے کالج کی بیڈمینٹن کی بہترین کھلاڑی ۔ پریکٹس کے لیے روزانہ شام کو دیر سے آتی ۔ آج کل تو ہفتہ بھر سے دوسرے کالجوں کی لڑکیوں کے ساتھ انٹر کالج مقابلہ جات ہو رہے تھے۔ تقدیس بھی روزانہ تیار ہو کر شام کو شبانہ کے کالج آجاتی اور پھر فراغت کے بعد دونوں بہنیں ۔ آئس کریم، کولڈ ڈرنک ۔ پان وغیرہ کا مزہ لیتی واپس گھر آجاتیں ۔ تقدیس کی تفریح ۔ آؤٹنگ بھی ہو جاتی اور شبانہ کی خوشی بھی ــــــــــ تقدیس سفید زمین پر سُرخ دائروں والا سادہ مگر قیمتی سوٹ پہنے ۔ سفید چنا ہوا دوپٹہ گلے میں ڈالے کالج جانے کے لئے تیار ہو رہی تھی۔

جھک کر سینڈل کی بکل بند کر رہی تھی ۔ اٹھ کر سیدھی ہوئی تو شہزاد سے ٹکرا گئی ۔ سر اُن کے سینے سے جا لگا ۔ وہ چُپ چاپ ان کے پیچھے آکر کھڑے ان کی آنکھوں پر ہاتھ رکھنے کے لیے جھکے تھے ۔ کئی دنوں سے کالج کی کرکٹ ٹیم کے ساتھ میچ کھیلنے کے لیے شہر سے باہر گئے ہوئے تھے ۔ ابھی ابھی پندرہ دن کے بعد واپس آئے تو ملازموں سے معلوم ہوا کہ گھر میں سوائے تقدیس کے اور کوئی بھی نہیں اور وہ بھی جانے کی تیاری میں ہیں ۔ ڈرائیور موٹر لیے تیار کھڑا تھا ۔ شبانہ کے کالج جانا تھا تقدیس کو ۔

دراز قامت، کھلاڑی شہزاد دو دو سیڑھیاں ایک ساتھ پھلانگتے تقدیس کے کمرے میں آئے ۔ سفید پتلون، سفید سپورٹس شرٹ ۔ سفر کی وجہ سے کپڑے کچھ میلے سے بے استری سے ۔ بال بے ترتیب ۔ گریبان کھلا ۔ چھوٹی آستین پورے سپورٹس مین ۔ پکّے کھلاڑی لگ رہے تھے ۔ کرکٹ کے کھلاڑیوں والی سفید ٹوپی ہاتھ میں پکڑے تھے ۔

" جب کوئی دور دیس سے آئے تو ـــــ اس کو " خوش آمدید" کہتے ہیں ۔ اُٹھ کر ـــــ دوڑ کر گلے لگ جاتے ہیں ـــــ دلہن

رانی اپنے پیا کے "

شہزاد، تقدیس کے گرد دونوں بازوؤں کا حلقہ بنائے ان کے شانے پہ ٹھوڑی رکھے تھے۔ بڑی گرمجوشی سے۔ بڑے تپاک سے اپنی تمام تر محبت کا اظہار کر رہے تھے۔ تقدیس گھبرائی ــــ شرمائی ــــ مسکرائی تو ــــ شہزاد کی جان میں جان آئی ــــ سفر کی تھکن ــــ ساری کوفت ــــ اتنے دن کی بے آرامی ــــ بے چینی ۔ پل بھر میں دور ہو گئی ۔ وہ تو تقدیس پہ ۔ تقدیس کے ایک تبسم پہ قربان جا رہے تھے ۔ نہال ہو رہے تھے ۔

" آپ ــــ اس سادہ لباس میں شبانہ کے کالج جائیں گی " شہزاد نے تقدیس کو الماری میں لگے بڑے آئینے کے سامنے کرتے ہوئے کہا۔ وہ ان کے دونوں شانوں پہ ہاتھ رکھے کھڑے تھے ۔ " لوگ کیا کہیں گے ۔ شبانہ کی سہیلیاں کیا خیال کریں گی ۔ اس کی پروفیسرز کیا سوچیں گی۔ کہ شبانہ کی بھابی کے پاس اچھے لباس نہیں ہیں "

شہزاد تقدیس کا چنا ہوا سفید دوپٹہ نیچے قالین پر سے گرا پڑا اٹھا کر ۔ دونوں ہاتھوں میں گولہ سا بنا کر گیند کی

طرح اچھال رہے تھے۔ جوتی پہننے کے دوران جب تقدیس جھکی ہیں تو ہلکا پھلکا سا ڈوپٹہ نیچے گر گیا تھا جس کا ان کو پتہ ہی نہ چلا۔ اب وہ دوپٹے کے بغیر کھڑی تھی۔ چھوٹی آستین کی۔ چوڑے چوکور گلے کی۔ خوبصورت تراش خراش والی چست قمیض میں خوبصورت بدن کے دلکش نشیب و فراز اور بھی حسین لگ رہے تھے۔ اور شہزاد ان کو بازو سے پکڑے الماری میں سے اپنی پسند اور تقدیس کی شان اور حسن کے شایان لباس تلاش کر رہے تھے۔

"سُرخ ساڑھی پہنئے ــــــ دُلہن حضور!" شہزاد نے الماری میں سے ہینگر میں لگی ساڑھی نکالتے ہوئے کہا۔ یہ شہزاد نے منگنی کی رات بڑے ہی شوق سے بڑی محبت سے، خلوص و ارمان سے تقدیس کی نذر کی تھی ــــ ابھی تک شہزاد کے بار بار اصرار کے باوجود بھی تقدیس نے پہن کر نہ دکھائی تھی۔ بس شرم سی آتی تھی۔ حجاب تھا کچھ چاہتے ہوئے بھی شہزاد کی خواہش کا احترام کرتے ہوئے بھی رہ جاتی۔

اور ــــ آج ــــ اب

سرخ ساڑھی میں تقدیس سنگھار میز کے سامنے گدی دار گھومنے والی گول کرسی پہ بیٹھی تھی۔ شہزاد برش ہاتھ میں پکڑے ——— اپنی پسند بتاتے رہے ——— اور وہ ان کی مرضی سے ——— خواہش سے ——— ان کی پسند سے بالوں کو سنوار کر سمیٹ کر جوڑا بنا رہی تھی۔ اس کا بے داغ حسن۔ فرشتوں کی طرح مقدس۔ پریوں کی طرح حسین چہرہ کسی مصنوعی آرائش کا محتاج نہ تھا۔ قدرتی گلابی، شہابی رنگت سرخ ہونٹ، باریک ابرو۔ غزالی آنکھیں ——— لیکن شہزاد کے کہنے پہ سنگھار ہو رہا تھا۔ وہ خود تقدیس کی ٹھوڑی پکڑے۔ اپنے سامنے۔ چہرہ اوپر کیے ان کے ہونٹوں پہ لپ اسٹک لگا رہے تھے۔ تقدیس آنکھیں بند کیے شہزاد کے سامنے بیٹھی تھی۔ ایک ہاتھ سے شہزاد کا ہاتھ پکڑے تھی۔ دوسرا ہاتھ کندھے پہ ڈھلکتے آنچل پر تھا۔ اپنے شہزاد کے لیے ——— اپنے پیار کے لیے ——— اپنے پریتم کے لیے ——— ان کی خوشی کے لیے ——— سرخ ساڑھی سرخ بلاؤز ——— طلائی زیورات ——— پورا سنگھار ——— نوک پلک تیار عروس نو کی طرح سجی سنواری تقدیس کے روپ پہ نظر

نہ ٹھہر رہی تھی

گھبرا کر شہزاد وہاں سے ہٹ گئے۔ دل تھام تھام کر رہ گئے۔ کچھ ہوش وحواس برقرار ہوئے تو نہا دھو کر۔ بن ٹھن کر۔ صاف ستھرے اُجلے نکھرے تیار ہو کر آ گئے سجاوٹ۔ بانکپن تو ان کے حُسن کا خاصہ تھا۔ ان کی اپنی فطرت تھی ان کی عادت تھی۔ گہرے بڑے سیاہی مائل سبز سُوٹ پہ ہم رنگ ٹائی لگائی تھی۔ خوبصورت شفاف چہرے پہ صحت کی سرخی، چمک دمک اور تبسم کے اُجالے پھیلے تھے کشادہ پیشانی، سلیقے سے سنوارے ہوئے بال۔ کوٹ کے اوپر کی جیب میں سے آدھا باہر رومال۔ گالوں پہ لال آنکھوں میں خمار۔ مسکراتی شوخیاں۔ ہنستی شرارتیں۔

دونوں ساتھ ساتھ چلتے زینہ اُتر کر موٹر تک آئے۔ مؤدب ملازم نے سلام کیا۔ دروازہ کھولدیا موٹر کا۔ پہلے تقدیس اور پھر شہزاد، اگلی سیٹ پر دونوں بیٹھ گئے تھے۔ ڈرائیور اشارہ پا کر دروازہ بند کر کے پرے ہٹ گیا۔ اور شہزاد گاڑی نکال کر لے گئے۔ سب سے پہلے تو شہر کے اسی بارونق چوڑیوں کے بازار میں آئے۔ جہاں سے ایک مرتبہ

پہلے تقدیس کو سُرخ چوڑیاں پہنائی تھیں - وہ آج کل خالہ حضور کے ہاں آئی ہوئی تھیں اور وہ چوڑیاں ایک دن شہزاد کی شرارتوں کے دوران ان کے ہاتھ سے چھوٹ کر میز پر گری اور چھن چھنا کر سب ہی ٹوٹ گئی تھیں - اب دوبارہ چوڑیاں پہنائی جا رہی تھیں -

تقدیس کو لے کر شہزاد مقامی ہوٹل میں آئے - کشادہ سیڑھیاں چڑھتے سفید جالی دار کٹہرے پہ ہاتھ رکھتے - ایک بازو سے تقدیس کو سہارا دیتے - بڑے نفیس آراستہ کمرے میں آگئے - تیسری منزل میں کمرے کے دروازوں دریچوں پہ کھڑکیوں پر پھولدار جالی دار مہین پردے لہرا رہے تھے - سفید بہت سفید مکلف وردی - سُرخ پگڑی باندھے بیرا ادب سے کھڑا تھا - شیشے کی طرح شفاف میز - گدی دار نرم کرسیاں - میز پر پڑے موسم کے تازہ پھول - پھولوں کی مہک سے کمرا مہک رہا تھا - ہوا چل رہی تھی - پردے لہرا رہے تھے - اُوپر سے شہر کا منظر بڑا اچھا نظر آ رہا تھا موٹریں - بسیں - ٹرک - گاڑیاں - سکوٹر - آٹو رکشے - سائیکل سوار - پیدل - جیسے ساری دنیا ادھر سے ادھر بھاگی پھر رہی

تھی۔ اپنے اپنے کاموں میں مصروف۔ اپنی اپنی دھن میں اپنی لگن میں مگن۔ زندگی ایک ہنگامہ۔ ایک ہلچل۔ ایک شور و غوغا کا طوفان نظر آ رہی تھی۔

سُرخ ساڑھی میں تقدیس کے حسن میں ایک انوکھا نکھار تھا۔ وہ جانفزا بہار تھی۔ بڑی پُر بہار، بہار، وہ خود ہی فضائے بہار، جان بہار تھی۔ کہ بہاروں کا نکھار، بہاروں کا سنگھار۔ تقدیس کے حُسن اور سنگھار سے تھا۔ اسی گل و گلزار انداز میں متبسم تقدیس اپنے خیالوں میں کھوئی۔ حسب عادت خاموش شہزاد کے پیار میں ڈوبی کھڑی، کھڑکی کے ساتھ لگی اس متحرک منظر کو دیکھ رہی تھی۔ اس کے پیچھے قریب ہی کھڑے شہزاد بھی ادھر ہی متوجہ تھے۔

شہزاد نے میز کرسیاں کھڑکی کے سامنے رکھوالی تھیں۔ یہاں سے وہ لوگوں کا نظارہ کر رہے تھے۔ اور وہ دوسرے لوگوں کو نظر آ رہے تھے۔ چائے کے ساتھ شہزاد نے بہت سی چیزیں بھی منگوائی تھیں۔

تقدیس نے پیالی میں چائے بنا کر ان کے سامنے رکھ دی دوسری اپنے سامنے۔ پندرہ دن کی کوفت اٹھائی

تھی ۔ اب بھی سفر سے آئے تھے ۔ پھر دوپہر کا کھانا بھی نہیں کھایا تھا ۔ تقدیس بڑی عنائت سے بڑی اپنائیت سے ایک ایک چیز ان کو کھانے کے لیے کہہ رہی تھی ۔ خود اپنے ہاتھ سے ان کے سامنے رکھتی ۔ شہزاد ان عنایات پر مہربانیوں پر خوش بہت خوش ہو رہے تھے ۔ کہ یہ خاموش محبت، بے لوث خلوص ۔ تقدیس کے دل کی گہرائیوں کا پیار ۔ پیار کا گہرا سمندر ۔ انتھاہ گہرائیاں ۔ بے پناہ پیار ——— شہزاد پہ بے قراری سے نثار تھا ۔ کہ شہزاد کے لیے تو تقدیس کی یہ جھکی جھکی تبسم ریز نظریں سرمایۂ راحت تھیں ۔ یہ ادھ کھلے ہونٹوں پہ رکا رکا تبسم سرمایۂ حیات تھا ۔ یہ دراز پلکوں کے سائے میں دہکتے عارض کے گلاب ان کی کائنات تھے ۔

چائے سے فراغت ہوئی تو شہزاد نے پکچر چلنے کی دعوت دی لیکن تقدیس شبانہ کے پاس کالج جانا چاہتی تھی ۔ اس کے ساتھ وعدہ کیا تھا ۔ وہ انتظار کرتی ہو گی ۔ تقدیس کو بھی فائنل دیکھنے کا شوق تھا ۔ اس لیے نرم لہجے میں اپنا پروگرام دہرا دیا ۔ ” شبانہ کو ساتھ لے کر پکچر دیکھیں گے ۔“ انہوں نے شہزاد سے بھی وعدہ کر لیا ۔

آہستہ آہستہ شہزاد موٹر چلا رہے تھے۔ شبانہ کے کالج کی طرف جا رہے تھے۔ بیرونی بڑے گیٹ کے قریب آکر موٹر روک لی۔ تقدیس شہزاد کے ساتھ اگلی سیٹ پر بیٹھی تھی۔ ساڑھی کا پلو درست کرتے ہوئے۔ پرس سنبھالا۔ اترنے کے لیے تیار تھی۔ دروازے پہ ہاتھ رکھا ہی تھا کہ شہزاد نے شرارت کی۔ ایک دم تیز بہت تیز گاڑی بھگا کر لے گئے۔ وہ حیرانی سے ان کا ہنستا مسکراتا چہرہ دیکھ کر رہ گئی۔ اس وقت ہیپی بڑے زوروں پر تھا۔ لڑکیوں کی بے پناہ تالیوں اور چیخوں کی آوازیں باہر آرہی تھیں۔ دور سے سنائی دے رہی تھیں۔ اب اتنی دُور آجانے پر بھی کانوں میں گونج رہی تھیں۔ گاڑی بڑی تیز جا رہی تھی۔ کشادہ سڑکیں۔ دو رویہ سرسبز بلند قامت درخت۔ بلند و بالا عمارات۔ بارونق بازار۔ شہری آبادی تیزی سے پیچھے بھاگے جا رہے تھے۔

دریا کے پُل پر موٹر کھڑی کیے دروازہ کھولے شہزاد تقدیس کے باہر آنے کے منتظر تھے۔ یہ بھی تو شہزاد کا پیار ہی تھا کہ تقدیس کو وہ ہر دم، ہر گھڑی اپنے ساتھ دیکھنا چاہتے تھے۔ جھک کر۔ ہاتھ پکڑ۔ وہ ان کو باہر آنے میں

مدد دے رہے تھے۔

"شبانہ کے کالج کیوں نہیں گئے؟۔ وہ منتظر ہو گی" پلکیں جھپکاتے ہوئے نرم و ملائم مگر شاکی لہجے میں تقدیس نے شہزاد کی طرف دیکھتے ہوئے شکوہ کیا۔

"آپ تو شبانہ کے لیے روزانہ ہی کالج جاتی ہیں۔ آج اس کے بھائی کے لیے بھی تھوڑا وقت نکال دیجئے تو کیا عنائت نہ ہو گی" شہزاد نے بڑے پیار سے بڑے پیارے انداز میں کہا۔ تقدیس چپ چاپ سر جھکا کر رہ گئی۔ اس کو بار بار شبانہ کا خیال آ رہا تھا کہ کتنی محبت سے، بڑی چاہت سے تاکید کر کے گئی تھی۔ اس کو اپنی جیت کا یقین تھا۔ انعام ملنا تھا۔ بار بار وقت پر پہنچ جانے کا کہہ رہی تھی۔ انتظار کرتی ہو گی۔ ناراض ہوتی ہو گی۔ مجھ سے ناراض ہو جائے گی۔ تقدیس درمیان میں پھنسی تھی۔ ادھر شبانہ کا خیال اُدھر اس کے بھائی کا پیار بھرا اصرار۔

"اچھا بھئی ــــ ایک غزل ــــ پیاری سی غزل ــــ اپنی پیاری سی ــــ مدھ بھری آواز میں سنا دیجئے ــــ ابھی

واپس لے جاؤں گا"

"وعدہ ___ پکّا ___ وعدہ"

شہزاد نے تقدیس کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیتے ہوئے وعدہ کرلیا۔ دونوں پُل پر کٹہرے کے ساتھ ساتھ چلتے دوسرے سرے پہ پہنچ گئے۔ پل کے اُوپر سے موٹریں۔ بسیں۔ دیگر سواریاں گزرتی تھیں۔ درمیان میں نیچے مضبوط لوہے کے جالی دار دو طرفہ جنگلے کے درمیان میں ریل کی پٹری بچھی تھی۔ اُوپر بسیں۔ درمیان میں ریل گاڑی ___ اور نیچے پانی میں کشتیاں چل رہی تھیں دریا کا پاٹ بہت چوڑا تھا۔ پانی بھی بہت زیادہ تھا۔ خوب زور شور سے بہہ رہا تھا۔ اچھل اچھل کر کناروں سے باہر آرہا تھا۔ لہروں کے ساتھ واپس جارہا تھا۔ پُل کے نیچے ،، اتنے بڑے بڑے پختہ ستونوں سے ٹکراتا۔ بڑے زور کا شور مچاتا۔ جھاگ اُڑاتا پانی۔ بھنور میں بھنور پڑ رہے تھے۔ چھوٹے چھوٹے۔ بڑے بڑے دائرے دائروں میں دائرے بن رہے تھے۔ حدِ نگاہ تک پانی ہی پانی تھا۔ دراز قامت کھجور کے درخت دریا کے دونوں

طرف گھنے جنگل کی صورت میں لگے تھے ۔ کھجوروں کے سبز گچھے لٹک رہے تھے ۔ دریا کے قریب ہی برگد کے گھنے، بوڑھے، سایہ دار درختوں کے نیچے ۔ سارے میں پورا شہر آباد تھا ۔ بے شمار دوکانیں ۔ کھانے پینے کی چیزوں کی ۔ دیگر ضرورت کی چیزوں کی ۔ کئی لوگ پکنک منانے کے لئے آئے ہوئے تھے ۔ جگہ جگہ ٹولیاں بیٹھی تھیں ۔ بڑی رونق بڑی چہل پہل تھی ۔ لوگ کشتیوں میں سیر کر رہے تھے ۔ ادھر سے ادھر آتی جاتی کشتیاں ۔ پانی کی سطح پہ تیرتی ۔ غوطے لگاتی بطخیں ۔ کناروں پہ بیٹھے سارس ۔ ہوا میں اڑتی مرغابیاں ۔ شفاف پانی کے اندر بہتی ۔ چمکتی مچھلیاں ۔ ہلکے ہلکے دودھیا بادلوں کے گاہے گاہے چھانے اور پھر چلے جانے سے ۔ موسم اور بھی سہانا ہو گیا تھا ۔ ہوا بڑی خوشگوار چل رہی تھی ۔ اتنے خوبصورت موسم میں اتنے حسین منظر میں حسین و خوش نصیب جوڑے کی شمولیت تو اور بھی قیامت تھی ۔ کہ آسمان جھک جھک کر ۔ دریا کا پانی موجوں کی صورت میں اٹھ اٹھ کر ۔ درخت جھوم جھوم کر ۔ ہوائیں ان کے

دامن سے ٹکرا کر بلائیں لے رہی تھیں۔ یہ حسین نظارے بھی ان دونوں کو رشک کی نظروں سے دیکھ رہے تھے اور ــــ پھر ــــ تقدیس کی آواز ــــ مترنم آواز غزل سناتے کا دلکش انداز ــــ ایسا انداز ــــ کہ ــــ پرندوں کو پرواز بھول گئی ــــ ہوائیں ٹھہر گئیں ــــ جیسے پانی رک گیا ــــ جیسے آسمان اور بھی جھک گیا ــــ گویا کائنات کی حرکات بند ہوگئیں ــــ جیسے دنیا کے سارے کارخانے خاموش ہو گئے ــــ ایسا سوز ــــ ایسا جادو ــــ ایسا سحر تھا ــــ خود شہزاد ــــ شہزاد بھی پل کے آہنی کٹہرے پہ دونوں ہاتھ رکھے بے خود سے کھڑے رہ گئے۔ غزل ختم ہو بھی گئی وہ پھر بھی مدہوش ہی رہے۔

تقدیس زرد رنگ کی بڑی خوبصورت قیمتی ساڑھی میں بڑی پیاری لگ رہی تھی۔ بالوں کو سمیٹ کر بڑے دلکش انداز میں بڑی سادگی سے جوڑا بنا رکھا تھا۔ ہیرے کے سفید موتیوں کے ٹاپس کانوں میں ڈالے اور طلائی زنجیر گلے میں پڑی تھی جس میں سفید آبدار موتی پہ شہزاد کا نام سنہری حروف سے لکھا تھا۔ یہ ہیرے کے

ٹاپس اور زنجیر خاص طور پر شہزاد نے تقدیس کے لیے بنوائی تھی۔ اپنے ہاتھوں سے تقدیس کو پہنائی تھی۔ سفید سینڈل سفید پرس آرٹ کونسل جانے کے لیے تیار ہو کر نکلی رات دیر تک پینٹنگ کرتی رہی تھی۔ ایک تصویر شروع کی تھی مکمل کرنے میں وقت کا پتہ ہی نہ چلا۔ تمام رات ہی گزر گئی۔ صبح کے ہنگامے بیدار ہو رہے تھے اور تقدیس کو ادھوری نیند کا خمار سا تھا۔ آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ شب بیداری کے باعث بڑی بڑی کٹورا سی آنکھوں میں سرخ سرخ ڈورے تھے نیند تھی۔ وہ تھکی تھکی تھی۔ طبیعت بوجھل۔ چہرا زرد، بدن ٹوٹتا سا۔ ہلکا بخار محسوس ہو رہا تھا۔ زرد ساڑھی میں تھکا تھکا زرد چہرہ جیسے دن بھر کی مسافت کے بعد سورج کی کرن شام کے وقت تھکی تھکی سی آہستہ آہستہ اپنی آرام گاہ کی طرف جا رہی ہو۔ اس سادگی میں۔اس سستی میں طبیعت کی خرابی میں بھی تقدیس کے حسن میں کیا غضب کا بانکپن ہے کیسا اچھوتا سنگھار تھا ——— یہ کوئی شہزاد کی نظر سے دیکھتا کوئی ان کے دل کی دھڑکنوں کی آواز کے سازوں کی زبان سمجھتا۔ برآمدے کے ستونوں پہ چڑھی موتیا اور چنبیلی کی بیلوں

کے قریب کھڑے شہزاد دیکھتے ہی رہ گئے۔ تقدیس ہر رنگ میں ہر روپ میں حسین تھی۔ ہر ہر انداز دل نشین تھا۔ لیکن حسن جو نظارہ آج دے رہا تھا۔ اس کی تو کچھ بات ہی اور تھی۔

سورج کی تھکی، تھکی کرن کی طرح آہستہ آہستہ سیڑھیاں اُترتی تقدیس۔

"اس سادگی پہ کون نہ مر جائے اے خُدا" تقدیس کے سامنے جُھکتے ہوئے۔ ان سوئی سوئی۔ کھوئی کھوئی مخمور آنکھوں میں۔ مے سے بھرے شیشے کے پیالوں میں جھانکتے ہوئے شہزاد نے کہا۔ وہ سرخ قمیض اور سفید پتلون پہنے تھے ڈرائیور کا بیٹا اچانک بیمار ہو گیا تھا۔ وہ دو دن سے چُھٹی پہ تھا۔ اس لیے تقدیس کو خود ہی گاڑی لے کر جانا تھا۔

وہ فن مصوری کی ماہر ——— بیرون ملک سے اعلیٰ سند یافتہ۔ آرٹس کالج والوں کے بہت مجبور کرنے پر۔ کچھ اپنی فراغت اور تنہائی کو دور کرنے کے لیے روزانہ دو گھنٹے کے لیے کالج چلی جاتیں۔ وہاں پر افسران کی بیویاں۔ بیٹیاں اپنی وقت گزاری کے لیے آتی تھیں۔ مصوری کی کلاس

ہوتی تھی ۔ اور تقدیس استاد کے فرائض انجام دیا کرتیں ۔
پھر ہر روز تقریبات ۔ تفریحات کے اہتمام ہوتے ۔ دعوتوں
اور پارٹیوں کے انتظام وہاں ہوتے ۔ غرض فارغ البال
بے فکر امیروں کے وقت گزارنے کا اچھا طریقہ تھا۔ اس
وقت شہزاد ، جائیداد کے کسی قدیم جھگڑے کے سلسلے
میں سپریم کورٹ کے کسی بڑے جج کے پاس مشورے کے
لیے آئے ۔ وہ طاہر نیازی کے ہم جماعت اور دوست
تھے ۔ اُدھر سے فراغت پاتے ہی سیدھے ادھر آئے ۔
انہیں معلوم تھا کہ یہ وقت تقدیس کے کالج جانے کا ہے
حسب عادت شرارت سوجھی اور چھپ کے پھولوں کی آڑ
لے کر کھڑے ہو گئے ۔ صبح ہی ہوائی جہاز سے واپسی ٹکٹ
پر آئے تھے ۔ گھر پہ ہی ابا حضور کے دوست سے ملاقات
کی ۔ جلدی جانا تھا ۔ کہ شام کو وہ کالج کی ٹیم کے ساتھ
دورے پہ جا رہے تھے ۔ کرکٹ کے کھلاڑی تھے ۔ اس
وقت ٹیکسی میں آئے تھے ۔ اور اب تقدیس کی گاڑی چلاتے
ان کے ساتھ ائیرپورٹ کی طرف جا رہے تھے ۔ سب کا
حال احوال پوچھ رہے تھے ۔ اپنا سب کا بتا رہے تھے ۔

معطر معطر، عطر بنیر تقدیس کے ساتھ سے سرشار تھے۔ وقت بہت کم تھا مجبوری بہت زیادہ تھی۔ نہ چاہتے ہوئے بھی جلدی جلدی تقدیس سے رخصت ہوئے۔ جہاز تیار تھا مسافر سیڑھیاں چڑھ رہے تھے۔ شہزاد سب سے آخر میں چڑھنے لگے۔ اور آخری سیڑھی تک مڑ مڑ کر ہاتھ ہلاتے رہے۔ الوداع کہتے رہے۔ ظفر نیازی شہر سے باہر گئے ہوئے تھے۔ فوزیہ بیگم کسی کے ہاں بیمار پرسی کے لیے گئی تھیں اس لیے ان سے مل نہ سکے ——— تقدیس آرٹس کالج میں ڈیوٹی کے بعد آہستہ رفتار سے کار چلاتی جا رہی تھی۔ ایک تو پہلے ہی طبیعت سست تھی۔ بخار بھی تھا۔ اور ستم بالائے ستم کہ شہزاد آ کر چلے گئے۔ دل اور بھی اداس ہو گیا۔ اور شہزاد جاتے جاتے کہہ گئے۔

" گھر جا کر اپنے حسن کا صدقہ اُتاریئے۔

بار بار یہی فقرہ کانوں میں گونج رہا تھا۔ شہزاد نے جاتے جاتے جھک کر۔ تقدیس کی مخمور آنکھوں میں جھانک کر بڑی شرارت سے ہنستے ہوئے۔ بڑی اپنائیت سے تقدیس کا ہاتھ سہلاتے ہوئے اپنی آنکھوں سے لگاتے ہوئے کہا

تھا - ساری توجہ - سارا دھیان شہزاد کی طرف تھا - موٹر تیز
چلانے کی عادت نہ تھی - جیسی پُر سکون طبیعت - ٹھنڈا مزاج
ویسے ہی سبک رفتار سے گاڑی چلا رہی تھیں ـــــ راستے
میں تنہا، حسین، نوجوان لڑکی کو دیکھ کر موٹر میں اکیلی جاتی
پا کر چند من چلے لڑکوں نے گھیر لیا - کیونکہ وزرا کی نئی کوٹھیاں
پرانی شہری آبادی سے کافی فاصلے پر چھاؤنی کے راستے میں
تھیں ۔ درمیان میں زیر تعمیر کوٹھیوں اور خالی پلاٹوں کا خاصا
بڑا سنسان علاقہ آتا تھا - اسی علاقے میں پختہ سرمئی سڑک پہ
تقدیس کی گاڑی تنہا جا رہی تھی - شیطان، بے ایمان لڑکوں
سے بھری سُرخ بڑی سی موٹر - تقدیس کی موٹر کے ساتھ کبھی
آگے آ جاتی - کبھی پیچھے چلی جاتی - پھر آگے سامنے کی طرف
چلنے لگتی ۔ تقدیس جدھر سے راستہ بناتی، آگے آجاتے، آگے
نکلنا چاہتی تو راستہ روک لیتے - آوازیں کستے - قہقہے لگاتے
تالیاں، سیٹیاں بجاتے - چیخیں مارتے، سخت بدتمیزی کے
موڈ میں تھے - اچھے اچھے باعزت گھرانوں کے لڑکوں نے
یہ چلن سیکھ لیا تھا - یہ لوفرپن شروع کر دیا تھا - لڑکیوں کو
پریشان کرتے، خوب مزہ لیتے - ذرا خطرہ دیکھتے تو بھاگ

کھڑے ہونے - سکول، کالج اور یونیورسٹی کی لڑکیاں تو
سب اس موٹر کو خوب پہچانتی تھیں - بڑی مشہور تھی -
یہ موٹر - لیکن تقدیس - ایسی باتوں سے ناواقف تھی - ہمیشہ
ڈرائیور کے ساتھ آتی جاتی - اکیلے آنے کا یہ پہلا اتفاق تھا - پھر
اس قسم کی غنڈہ گردی نہ کبھی دیکھی نہ سنی تھی - کہ ان کا حلقۂ احباب
ایسا نہ تھا - لڑکوں کی خباثت سے تنگ آکر بریک لگا دی - پیچھے
عمارتی سامان سے بھرا ہوا ٹرک - سامنے اومنی بس - لڑکے
تو ٹرک اور اومنی بس کو دیکھتے ہی موٹر بھگا لے گئے - لیکن
تقدیس کی بے موقع بریک سے پیچھے سے آتا ٹرک ڈرائیور
اپنے ٹرک کو کنٹرول نہ کر سکا - بڑے زور کی بریک لگائی
لیکن پھر بھی بڑی کوشش کے باوجود بچاؤ نہ ہو سکا - تقدیس
کی گاڑی کا پچھلا حصہ اور ٹرک کا انجن - ٹکر ہوگئی دونوں
کی - ڈرائیور اور ٹرک تو بچ گیا - لیکن تقدیس بے ہوش
تھیں - ان کو چوٹ تو زیادہ نہ آئی تھی - کیوں کہ ٹرک کی
رفتار ڈرائیور کافی کم کر چکا تھا - ٹکراؤ ہلکا سا تھا - ورنہ
تو اتنے بڑے بجری سے بھرے ٹرک کے آگے چھوٹی
سی اس ڈبیہ سی گاڑی کی کیا حیثیت تھی - لیکن خوف و ہراس

اور صدمے سے ہی کمزور دل تقدیس بے ہوش ہوگئیں۔ اِدھر بس رُک گئی۔ اُدھر ٹرک کھڑا تھا۔ گاڑی کے گرد ہجوم جمع ہو گیا۔ او مِنی بس کی پوری سواریاں اُتر کے اِدھر اُدھر جمع ہوگئیں۔ ایسے میں ٹرک ڈرائیور نے ہمت کی اور فوری طور پر تقدیس کو قریب کے سرکاری ہسپتال میں پہنچا دیا۔ کہ وہ روزانہ ادھر سے سامان لے کر گزرتے اور ظفر نیازی کی موٹر کو پہچانتے تھے۔ روزانہ صاحبزادی ڈرائیور کے ساتھ آتی جاتی تھی۔

ایک آدمی دوڑتا ہوا کوٹھی پہنچا۔ فوزیہ بیگم کو اطلاع ملی تو پہلے تو سخت پریشانی اور گھبراہٹ میں رونے تڑپنے لگیں۔ گر گر کر بے ہوش ہونے لگیں۔ کہ بچّوں کے معاملے میں ان کا دل بڑا کمزور تھا۔ شہزاد نے مذاق میں شبانہ کے حادثے کی خبر دی تھی تو جان نکل گئی تھی۔ اب تو حقیقت میں ان کی بیٹی ان کی تقدیس کو چوٹیں آئی تھیں گھریلو پُرانے وفادار ملازموں نے بیگم صاحبہ کو سنبھال لیا ہر طرح سے دلجوئی کی۔ سعدیہ بیگم کو بھی فون کر دیا گیا۔ صاحب کو بھی فون کر دیا۔ شام تک سب پہونچ گئے

تھے۔ صدقہ و خیرات کا سلسلہ جاری تھا۔ دعاؤں پہ زور
دوا علاج بھی ہو رہا تھا۔

جب فوزیہ بیگم اپنی دو ہمسائیوں اور ملازموں کے ساتھ ہسپتال پہنچی ہیں تو تقدیس بے ہوش پڑی تھیں۔ سر پہ معمولی چوٹیں تھیں۔ پاؤں کی ہڈی پہ زیادہ چوٹ آئی تھی۔ ایکسرے کے بعد پلستر لگا دیا گیا۔ نازک نازک تقدیس کا دل بھی نازک تھا۔ حادثے کے خوف اور پاؤں کے درد کی وجہ سے ہوش میں نہ آ رہی تھی۔

شبانہ کالج کی لڑکیوں کے ساتھ تاریخی مقامات کی سیر کے لیے گئی ہوئی تھی۔ اصل ٹھکانہ معلوم نہ تھا کہ کہاں ہو گی۔ وہ لوگ گھومتی پھرتی تھیں کبھی ایک جگہ کبھی دوسری جگہ۔ آج یہاں تو کل وہاں۔ اس لیے ان کو اطلاع دینا مشکل تھا۔ شہزاد صبح ہی تقدیس کو الوداع کہتے، اپنی کرکٹ ٹیم کے ساتھ یونیورسٹی کے باہمی مقابلوں کے لیے گئے تھے۔ کوئی ایک ماہ کا پروگرام تھا ان کا۔ فون پہ بات نہ ہو سکی۔ تار بروقت نہ مل سکی۔ انتظار کرتے کرتے ہار کے تیسرے دن ہوائی جہاز کے

ذریعے سیکرٹری کو بھیجا گیا ــــ اور ــــ شہزاد ــــ سب کچھ چھوڑ چھاڑ ــــ کھیل ــــ مقابلے ــــ بھول کے واپس آ گئے پریشان بھی بہت ہوئے کہ تقدیس کو چوٹ آئی تھی۔ پاؤں پہ پلستر لگا تھا۔ سر پہ پٹی بندھی تھی۔ سب کے دل بہت اُداس تھے۔ شہزاد کے آ جانے سے سب کی ڈھارس بندھ گئی۔ ہمت پیدا ہو گئی۔ فرداً فرداً سب ہر طرح کا خیال کرتے۔ امّی، خالہ، چچا جان! سب ہی صدقے، قربان، واری جا رہے تھے۔ دل وجان نثار کیے ہوئے تھے۔ لیکن شہزاد کے دل کو سب سے زیادہ تکلیف تھی۔ ان کی تقدیس ان کی غیر موجودگی کی وجہ سے زخمی ہو گئی تھیں۔

"ہماری نظر لگی ہے۔ اس دن اپنے حُسن سوگوار کا صدقہ جو نہیں اُتارا تھا" شہزاد پھر بھی بڑی زندہ دلی سے کہہ رہے تھے ــــ اور ــــ پھر ــــ ڈاکٹروں سے مشورے کے بعد ــــ ان سے باقاعدہ اجازت لے کر۔ ایمبولینس میں بڑے آرام سے، بڑی احتیاط سے تقدیس کو لے کر گھر آ گئے۔ تقدیس کو ان کی خوابگاہ میں بستر پہ لٹا دیا۔

اور خود چوبیس گھنٹے کے تیمار دار بن گئے - دو نرسیں بھی۔ تقدیس کی خدمت کے لیے رکھی تھیں - ایک کی ڈیوٹی دن کی اور دوسری رات کو آتی تھی - لیکن شہزاد سے زیادہ اپنی تقدیس کی تیمار داری و نرسنگ اور کون کر سکتا تھا - تیمار داری کے ساتھ ساتھ دل بہلانے کے لیے شرارتیں بھی کرتے - شوخیاں بھی - لطیفہ گوئی - بذلہ سنجی - زندہ دلی تو ان کی فطرت تھی - چونکہ تقدیس کو پاؤں ہلانے کی ڈاکٹر کی طرف سے اجازت نہ تھی - اور شہزاد مسیحا بنے تھے خود ہاتھ منہ دھلاتے - بال سنوارتے - ناشتہ کھانا کھلاتے سینکڑوں اُردو انگریزی کے رسالے - کتابیں - اخبار بازار سے اُٹھا لائے تھے - لیٹے تھک جاتیں - تنگ آجاتیں تو ننھی سی گڑیا کی طرح گود میں اُٹھا کر دوسرے کمرے میں لے جاتے - وہیل چیئر پہ بٹھا کر برآمدے میں گھماتے نیچے لان میں لے جاتے - باغ کی سیر کرواتے تھے - ویسے عموماً سب تقدیس کے کمرے میں آجاتے یہیں پر محفل جمتی تھی - اور شہزاد تو تن من سے تقدیس کی دیکھ بھال میں لگے تھے - چھوٹی چھوٹی باتوں کا خیال

رکھتے ___ اور ___ سعدیہ بیگم ___ تو حیران تھیں ___
سخت حیران ___ کہ اتنے نٹ کھٹ ___ غیر سنجیدہ
شرارتی، شوخ لڑکے میں اتنی سنجیدگی ___ اتنی متانت
تقدیس کی خدمت گذاری ۔ تیمارداری ۔ یہ تو تقدیس کا اتنا
خدمت گذار شوہر ثابت ہوا ___ اور ___ اپنے
اس وقت ___ کے خیالات کا خیال کرتیں ___ جب
وہ تقدیس کو شہزاد کے لیے مانگنے کا تذکرہ کرتیں ___
تو ___ کیسا ٹال جاتے ۔ جیسے ان کو کوئی دلچسپی نہیں
کوئی لگاؤ نہیں ___ ذرا بھر بھی کشش نہیں تقدیس
میں ان کے لیے ___ دونوں بہنیں جب بھی یاد
کرتیں تو خوب ہنستی اور حیران ہوتیں کہ کیسا بے وقوف
بنایا ہے ہم سب کو ___ اوپر ___ اوپر سے لاپرواہ
اندر سے اتنا گہرا ___ بڑا بے ایمان ___ شرارتی ۔
تقدیس ویسے تو اب ہر طرح سے ٹھیک
تھی ۔ پاؤں کے پلستر کی وجہ سے ابھی آزادانہ چل پھر
نہیں سکتی تھی ۔ ابھی چوٹ لگے پندرہ دن گذرے تھے
تقدیس قرمزی رنگ کا سوٹ پہنے تھی ۔ قرمزی مہین

ڈوپٹہ گود میں پڑا تھا۔ پاؤں پہ پلستر لگا تھا۔ تکیوں کے سہارے سے پلنگ کے سہارے کے ساتھ بیٹھی تھیں۔ دونوں ٹانگیں لمبی کیے تھی ۔ کہ دوسری ٹانگ ابھی آسانی سے آگے پیچھے نہیں ہو سکتی تھی۔ پیچھے کھڑے شہزاد بڑی نرمی سے آہستہ آہستہ تقدیس کے بالوں میں برش کر رہے تھے۔ تقدیس کے آرام کے لیے اپنا چین، سکون آرام سب حرام کیے ہوئے تھے۔ تقدیس کے بالوں کو سنوارنا خوب آگیا تھا۔ بڑے سلیقے سے بڑے طریقے سے ریشمی ریشمی سیاہ ملائم بالوں کی دو ڈھیلی ڈھیلی چوٹیاں بنا کر سامنے کی طرف ڈالدی تھیں۔ تاکہ لیٹنے میں سہولت رہے۔ صبح کے نو بجے تو دونوں کا ناشتہ ملازم قیمتی ٹرالی میں لیے آگیا۔ اپنے ہاتھوں سے کتنی محبت سے کتنی عقیدت سے ناشتہ کرواتے رہے۔ خود ابھی کچھ نہ کھایا۔ تقدیس اصرار کرتی رہی۔ بار بار انکار کرتی رہی۔ شرمندہ ہوتی رہی۔ لیکن وہ پلنگ کے کنارے پہ بیٹھے۔ سرخ پیالی پرچ ہاتھ میں پکڑے گھونٹ گھونٹ چائے تقدیس کو پلا رہے تھے۔ وہ ہزار انکار کرتی لیکن اس کی ایک

نہ چلنے دیتے۔

"میرے پاؤں میں چوٹ ہے اور آپ تو مجھے ہاتھ بھی نہیں ہلانے دیتے۔" تقدیس بڑے ناز سے مسکراتے ہوئے شہزاد کی طرف دیکھ کر کہہ رہی تھی۔

"تمہارے ناخن میں بھی درد ہو۔ تمہارا ایک بال بھی دکھے تو میرے دل کو دکھ ہوتا ہے۔ اب تو تمہارا حادثہ ہوا ہے۔ پاؤں کی ہڈی میں چوٹ ہے۔ میری اپنی تقدیس" شہزاد تقدیس کی پیشانی پہ آئے ہوئے بالوں کو ہاتھ سے پرے ہٹاتے ہوئے بڑی اپنائیت سے بڑی محبت سے کہہ رہے تھے۔

"آہا ——— میری آپی جان ——— کی ——— شان ——— میرے پیارے بھائی جان خوب ناز اٹھا رہے ہیں۔ بڑے لاڈ ہو رہے ہیں۔" گول گھیرے کی مردانہ کف کالر والی سرخ قمیض اور چیک کی پتلون پہنے شبانہ کمرے میں آئی۔ سیاہ لمبی ڈوری کا پرس کندھے پہ جھول رہا تھا۔ ریشم ریشم سے بال کھلے تھے۔ بکھرے بکھرے تھے۔ کچھ چہرے پہ آئے تھے۔ دونوں ہاتھوں

سے اپنے بال سمیٹتے ہوئے شبانہ نے اپنے بھائی کو تقدیس کو اپنے ہاتھ سے چائے پلاتے ناز اٹھاتے دیکھ کر کہا تھا۔ شہزاد کئی دنوں کی بچھڑی بہن کو دیکھ کر جلدی سے کھڑے ہو گئے۔ خوشی میں۔

"اوہ ـــــ میری پیاری بھابی ـــــ بھیا کے دل کی چابی۔" شبانہ لہک لہک کر گاتے ہوئے تقدیس سے لپٹ گئی۔ پیار دلار کے بعد بھائی کے گلے میں باہیں ڈال دیں۔ انہوں نے بھی دونوں باہوں میں سمیٹ کر چھوٹی بہن کو خوب پیار کیا۔ اس کا پیار لیا۔ اپنے آنے کی خوشی میں۔ کئی دن کے بعد سب سے ملنے کی خوشی میں اس کو اور کوئی ہوش نہ تھا۔ اچانک تقدیس کے پلستر لگے پاؤں کو دیکھا تو جیسے خوشی بھول گئی۔ بس جان ہی تو نکل گئی۔ پھر تکیوں کا سہارا دیکھا تو حواس جاتے رہے۔

"یہ کیا ـــــ؟ آپ کو کیا ہو گیا ـــــ؟ ہائے میری آپی جان۔" تقدیس سے لپٹ کر رونا شروع کر دیا۔ بس روئے جا رہی تھی۔ "میری آپی۔ میری آپی

آپ کو چوٹ لگ گئی ۔ ہائے میری جان ۔" تقدیس پیار کرتی رہی ۔ بہلاتی رہی ۔ شہزاد سمجھاتے رہے ۔ ہنساتے رہے ۔ لیکن وہ بڑی سخت ناراض تھی ۔ روٹھی ہوئی تھی ۔ سب پہ غصّہ آ رہا تھا ۔ امی حضور سے ، خالہ جانی سے ، چچا جان سے ۔ سب سے ہی شکوہ تھا ۔ اس کو کیوں نہیں بتایا ۔ اطلاع کیوں نہیں دی ۔ بڑی منت سماجت کے بعد ـــــ بڑی مشکلوں سے صلح ہوئی ۔

وہ ابھی کالج کی لڑکیوں کے ساتھ تفریحی دورہ سے واپس آئی تھی ۔ اپنے گھر جانے کی بجائے اپنی پروفیسر صاحبہ سے اجازت لے کر خالہ کے ہاں راستے میں اُتر آئی تھی کہ کل آپی کو لے کر مزے میں جائیں گے ۔ خالہ جان بھی ساتھ ہونگی ۔ اپنی سیر کی کہانیاں سناؤں گی ۔ واقعات بتاؤں گی ۔ تصویریں دکھاؤں گی ۔ تحائف دوں گی ۔ بھائی جان بھی وہاں ہوں گے ۔ خوب مزہ آئے گا ـــ لیکن یہاں تو معاملہ ہی گڑبڑ تھا ۔ جبر غصّہ ۔ ناراضگی دُور ہوا شکوے گلے دُھل گئے تو شبانہ پھر اپنی موج میں آ گئی ـــ نہ نہائی دھوئی ـــ نہ کپڑے تبدیل کیے ۔

نہ کھانے پینے کا ہوش ۔ اتنا بڑا سارا اٹیچی کیس دھکیلتی (اس کے نیچے بڑے بڑے پہیئے لگے تھے) خود لاکمرے سامنے قالین پہ بیٹھ گئی ۔ جگہ جگہ سے خریدے ہوئے تحائف نکال نکال کر دے رہی تھی ۔ کپڑے ۔ جوتے ۔ پرفیوم زیورات ۔ ڈھیروں چیزیں اٹھائی لائی تھی ۔ تقدیس کے لیے ۔ بھائی جان کے لیے ۔ امّی حضور ۔ خالہ جانی ۔ چچا جان سب کے لیے اتنا بڑا اٹیچی کیس خالی کر دیا — ساتھ ساتھ اتنے روز کی تفریح کے دلچسپ واقعات مزے لے لے کر سنا رہی تھی ۔ مختلف مناظر کی آنکھوں دیکھی تصویریں بنا رہی تھی ۔ بے شمار تصویریں پھیلاتے سب کو دکھا رہی تھی ۔ شہزاد اس کی تصویروں کا مذاق اُڑا رہے تھے ۔ اس کی سہیلیوں کے حلیے بنا رہے تھے اس کو سنا رہے تھے ۔ چڑا رہے تھے اور تھوڑی ہی دیر کے بعد ساری جُدائیاں ۔ اُداسیاں بھُول بھال کر دونوں بہن بھائی کی لڑائی ہو گئی — اور شبانہ پھر ناراض ہو کر وہاں سے باہر آگئی ۔ وہ اپنی سہیلیوں کے متعلق کچھ نہیں سُن سکتی تھی ۔

ماہ دسمبر کا وسط تھا۔ پہاڑوں پہ برفباری کی خبریں مل رہی تھیں ۔ اور میدانی علاقے میں بارشوں کا سلسلہ شروع تھا ۔ اس وجہ سے سردی زوروں پہ تھی ۔ پھر طوفانی سرد ہواؤں کی وجہ سے موسم کی شدّت میں اضافہ ہوگیا تھا ۔ غریب اپنی کوٹھریوں میں بند اور امیر لوگ اپنے نرم گرم بستروں میں سردی سے بچنے کی کوشش میں تھے ۔

رات کے گیارہ بج رہے تھے ۔ شبانہ کے گروپ کی سب سہیلیاں ، پاس پڑوس کی خواتین ، ملنے جلنے والے احباب اور دیگر سب افراد خانہ وسیع ڈرائنگ روم میں جمع تھے کہ امراء کے گھروں میں یہ بھی ایک رسم چل نکلی تھی — ایک تقریب سی ہوتی ۔ تہوار ہی بن گیا تھا ۔ کہ کوئی اچھی مشہور فلم منگوالی جاتی ۔ ایک دوسرے کے گھروں میں باقاعدہ تقریبات کی صورت میں بلاوا بھیجا جاتا ۔ رات کا کھانا ۔ چائے ۔ کافی ۔ مشروبات سے تواضع بھی کی جاتی ۔ اچھی خاصی دعوت ہوتی ۔ خوب رونق ہوتی ۔ بڑی چہل پہل ہو جاتی ——— اس وقت بھی بڑی خوبصورت رنگین فلم چل رہی تھی ۔ گرم چائے کا دور

چل رہا تھا۔ چلغوزے۔ مونگ پھلی اور خشک میوہ جات مزے لے لے کر اُڑائے جا رہے تھے۔ کھانے پینے میں بھی مزا آ رہا تھا۔ مل بیٹھنے کا مزا بھی خوب تھا۔ اور فلم بھی بڑی اچھّی۔ بڑی مزیدار بڑی شاندار تھی۔ ایک دوسرے کی دید کے بہانے بھی مل جاتے۔ تفریح بھی ہو جاتی۔

" ہائے شہزاد۔ میرے بیٹے۔ اتنی دیر۔" سعدیہ بیگم نے اپنے سامنے احتراماً جھکے شہزاد کی بلائیں لے کر۔ گلے لگا کر۔ ماتھا چوم کر حیرانی سے کہا۔

" میری پیاری امّی جان ــ! یہ تو ہوتا ہی رہتا ہے کاموں میں دیر سویر ہو ہی جاتی ہے۔" شہزاد نے ماں کے مقدّس ہاتھوں کو آنکھوں سے لگا کر چومتے ہوئے کہا۔

" میری جان ــ احتیاط پھر بھی اچھّی ہوتی ہے۔ دیر ہو جائے تو رُک جایا کرو۔ اگلے دن صبح ــ دن کے وقت سفر کر لیا کرو۔" سعدیہ بیگم اپنے قریب تخت پر بیٹھے شہزاد کی کمر پہ ہاتھ پھیرتے ہوئے۔ ان کے بکھرے بالوں کو درست کرتے ہوئے کہہ رہی تھیں۔ ان کو

اپنے بیٹے سے اپنے شہزاد سے بڑی محبت تھی۔ ہر وقت ان کی صحت و عافیت کے ساتھ درازیٔ عمر۔ بامراد۔ سرفراز زندگی کی دعائیں مانگا کرتیں۔

فوزیہ بیگم کو مؤدبانہ اشارے سے سلام کیا۔ شبانہ سے خیریت بھی پوچھی۔ ٹھینگا بھی دکھایا۔ وہ دونوں مہمان خواتین کے درمیان میں گھری بیٹھی تھیں۔ آداب مہمانداری اور خواتین کا احترام ملحوظ خاطر تھا۔ اس لیے شہزاد اشاروں سے کام لے رہے تھے۔ شبانہ کے قریب تقدیس پلکیں جھکائے۔ نظریں چرائے بیٹھی تھی۔ سب کچھ جانتے ہوئے بھی انجان بنی تھی۔ کہ اتنے سارے لوگوں میں شہزاد سے آنکھ ملانے کی ہمت نہ تھی۔ ان بند پلکوں کو ان جھکی نظروں کو شہزاد نظروں ہی نظروں میں کیسے کوئی پیام دیتے۔ کیسے سلام کہتے۔ کس طرح احوال پوچھتے۔ حال دل بتاتے۔ بہر حال دور سے ہی شرماتی لجاتی۔ مسکراتی تقدیس ان کے قلب و روح کے لیے تسکین کا باعث تھی۔ سکون بخش تھی۔ شہزاد ابھی جاگیر پہ سے آ رہے تھے۔ چیک کا کوٹ اور گہرے رنگ کی پتلون پہنے

تھے ۔ راستے میں ایک ویگن اور سکوٹر والے کا ایکسیڈنٹ ہو گیا تھا ۔ ٹریفک رک گئی تھی ۔ لوگوں میں افراتفری پڑ گئی تھی ۔ زخمیوں کے سامان کی لوٹ مار شروع ہو گئی تھی ۔ خون کے سمندر میں پڑے زخمی کراہ رہے تھے لوگوں کا ہجوم تھا لیکن سب تماشہ دیکھ رہے تھے ۔ کوئی مدد کے لیے آگے نہ آتا تھا ۔ شہزاد آگے بڑھے ۔ بڑی ذمہ داری سے زخمیوں کو ہسپتال پہونچایا ۔ تھوڑی بہت طبّی امداد کے بعد دوسرے مسافروں کو بس میں بھجوایا ۔ اس کام میں کافی دیر ہو گئی ۔ یہی وجہ تھی کہ شام کو بروقت گھر پہونچنے کے بجائے اتنی رات کو آئے تھے ۔ ان کی عادت تھی کہ ہمیشہ اچانک آتے ، اور جاتے ہوئے گھر والوں کو اپنی واپسی کا صحیح وقت کبھی بتا کر نہ جاتے ، بلکہ مقررہ وقت سے ایک دن بعد کا پروگرام سناتے کیوں کہ سفروں میں ۔ مصروفیات میں عموماً کوئی مجبوری ہو جاتی ، دیر ہو جاتی ہے ۔ اور دیر ہو جاتی تو اپنی والدہ کی عادت جانتے تھے ہزاروں وہم کر کے خود بھی گھبرائیں باقی سب کو بھی پریشان کرتیں ۔ یہی وجہ تھی کہ ہمیشہ

روانگی کے وقت بیٹے کی پیشانی چوم کر پوچھتیں ــــ کس دن ــــ؟ کس وقت آؤ گے بیٹے ۔"

" امّی حضور! بس جلدی ہی ۔ کام ختم ہو جائے گا ۔ تو قدمبوسی کے لیے حاضر ہو جاؤں گا ۔ میری پیاری پیاری امّی جان ۔" شہزاد ہر دفعہ جانے سے پہلے جُھک کر ماں کے دونوں ہاتھ آنکھوں سے لگاتے ۔ ہونٹوں سے لگاتے اور پھر ہنستے ہوئے رخصت ہو جاتے ۔

شبانہ کبھی موقع پہ ہوتی ۔ کبھی کالج گئی ہوتی ۔ لیکن الوداعی ملاقات ضرور ہوتی دونوں کی ــــ بہن بھائی کی ــــ لڑائی بھی ہوتی ــــ تو بھی بھائی کے گلے میں باہیں ڈال کر لپٹ جاتی ۔ شہزاد بھی پیاری سی بہن کو ساتھ لپٹا لیتے ۔ پیار کرتے ــــ اور جاتے جاتے ایک مکّہ بھی لگا جاتے

فلم ختم ہو گئی ۔ مہمان رخصت ہونے لگے ۔ سب کی موٹریں روانہ ہو گئیں ــــ صرف شمع اور فرح بھابی رہ گئی تھیں ــــ کہ ان کا گھر بھی بہت دُور تھا ۔ اس لیے فلم کے بعد جس دن تنویر بھائی شہر سے باہر دورے پہ گئے ہوں ــــ تو ــــ یہ دونوں نند بھاوج رات ادھر ہی رہ

جاتی تھیں۔

مہمانوں کے جانے کے بعد شہزاد خالہ جانی کے قریب آئے۔ سلام و پیار اور دعاؤں کے بعد شبانہ کے ساتھ صوفے پر گھرنے کے انداز میں بیٹھ گئے۔ شبانہ بھی وہیں بھائی سے لپٹ گئی۔ ان کے دوسری طرف تقدیس تھی یعنی وہ شبانہ اور تقدیس کے درمیان میں تھے۔ شہزاد ادھر کو کھسک گئے تو وہ ذرا اور پرے ہٹ گئی۔ شہزاد نے ان کے گرد بازو کا حلقہ بناتے ہوئے اپنے قریب کر لیا۔ خود بھی قریب آ گئے۔

"خالہ جانی! کیا ہمیں کبھی کوئی چھوت کی بیماری لگ جاتی ہے کہ آپ کی بیٹی صاحبہ ——— دور دور رہتی ہیں جیسے مریضوں سے پرے رہا جاتا ہے۔ اگر باقی لوگ محفوظ رہ سکتے ہیں تو کیا ان کو ہی میری بیماری لگ جائے گی۔" شہزاد تقدیس کو بازو کے حلقے میں لیے فوزیہ بیگم سے پوچھ رہے تھے اور وہ جواب میں ہنس رہی تھیں۔

سفر کی تھکاوٹ دور کرنے کے لیے اٹھے ہیں تو پہلے فرح بھابی کو چھیڑا۔ پھر شمع کا کان مروڑا۔ ایک

کو تھپڑ مارا۔ دوسری کو مکّہ رسید کیا۔ نہ شبانہ کو معاف کیا نہ تقدیس کو چھوڑا۔ تھوڑی دیر کے بعد گہرے بھورے کا گرم شلوار کا قمیض کا سوٹ پہنے۔ اوپر سے ہم رنگ بڑی بڑی جیبوں والا۔ آگے سے کھُلا۔ موٹے موٹے بٹنوں والا۔ تکون گلے کا سویٹر پہنے واپس آئے۔ سویٹر کی دونوں جیبوں میں ہاتھ ڈالے چلے آرہے تھے۔ صاف شفاف۔ تازہ دم۔ اگرچہ شرارتوں کے لیے ان میں ہمیشہ ہی دم خم ہوتا تھا۔

" اچھا بھئی ــــــ تم جاؤ۔ ہم ابھی آتے ہیں۔" کھانے کے کمرے میں ان کے لیے گرم کھانا لگا کر ملازم اطلاع دینے آیا تھا اور وہ اس کو واپس بھیج رہے تھے۔

" آج تو ہم کھانا یہیں کھائیں گے۔ گھر کی بیگمات کے ہاتھوں سے۔ نہ کہ ملازموں کی مدد سے ــــ" شہزاد زیرِ لب تبسم دبائے۔ آنکھوں میں شوخیوں کے رنگ سجائے فوزیہ بیگم کے قریب کھڑے کہہ رہے تھے۔

" بیگمات کا بہانہ کیوں لگاتے ہو ــــــ صاف کیوں نہیں کہتے کہ اپنی بیگم صاحبہ سے فرمائش کر رہے ہو۔"

فرح بھابی نے وہیں بیٹھے سویٹر بنتے ہوئے ہنس کر کہا وہ تقدیس کی طرف اشارہ کر رہی تھیں۔

شہزاد ہنستے رہے۔ فوزیہ بیگم کو نہ اٹھنے دیا۔ شبانہ کو جانے سے روک لیا۔ آخرکار تقدیس اپنے گرد سفید گرم شال لپیٹتے اٹھیں تو ـــــ شہزاد نے نعرہ لگایا۔

"فرح بھابی ـــــ زندہ باد ـــــ زندہ باد ـــــ ہمارے دل کا حال تو ہماری بھابی یوں جان لیتی ہیں۔ جیسے کوئی نجومی ـ پیشانی پڑھ کر۔" شہزاد نے فرح بھابی کو دونوں شانوں سے پکڑ کر شاباش دیتے ہوئے۔ نعرہ لگایا۔

کھانے کے کمرے میں پہونچ کر تقدیس اپنے ہاتھوں سے ٹرالی میں برتن رکھ رہی تھیں۔ ان کے لیے کھانا لانے کے لیے ـــــ کہ چپکے سے پیچھے آ کھڑے ہوئے۔

"اوہ ـــــ یاد آیا ـــــ" تقدیس کے ڈرائنگ روم سے جانے کے بعد اچانک شہزاد کو نہ جانے کیا یاد آ گیا۔ کوئی چیز۔ کوئی کام ـــ بہرحال فوراً ہی وہ سب سے اجازت لے کر۔ معذرت کرتے تقدیس کے پاس

پہونچ گئے۔

"ہمیں بھوک کھانوں کی تو نہیں۔ تھکن، کوفت، سفر کی تو نہیں۔ بے چینی، وہاں کی بے آرامیوں کی۔ شب بیداریوں کی تو نہیں" شہزاد دبے پاؤں آکر۔ تقدیس کی آنکھوں پر ہاتھ رکھے۔ دوسرا بازو ان کی گردن کے گرد ڈالے۔ ان کو اپنے سینے سے لگائے۔ مسکرا رہے تھے لہجے میں عقیدت تھی۔ محبت تھی۔ اپنائیت تھی۔

تقدیس سنہری دھاریوں والے سفید شیشے کے جگ میں پانی ڈال کر ٹرالی میں رکھنے لگی تھی۔ دوسرے ہاتھ میں ویسا ہی بڑا خوبصورت نازک سا گلاس تھا۔ کہ پیچھے سے آکر شہزاد نے حملہ کر دیا۔ ان کے ہاتھوں سے جگ اور گلاس لے کر ایک طرف رکھ دیا۔ ٹرالی ایک طرف دھکیل دی۔ دیوار پہ لگے بڑے خوبصورت سفید شیشے کے رنگین پھولوں والے گلوب میں لگے بلب کے نیچے تیز روشنیوں میں تقدیس کو اپنے سامنے چھوٹی میز پر بٹھا لیا۔

"ہم اتنی دور سے ـــــ اتنی دیر سے ـــــ کتنے دنوں کے بعد ـــــ جدائیوں کی ـــــ تنہائیوں کی آگ

میں جلتے۔تڑپتے آئے ہیں ۔ اور یہاں سلام دُعا تو کیا ___ ایک پیاری سی ___ محبت بھری نظر بھی ہمارے مقدر میں نہیں ___؟" تقدیس کا روشن روشن چہرہ دونوں ہاتھوں میں لیتے ہوئے شہزاد گھٹنوں کے بل ان کے سامنے جھکے ہوئے تھے ۔ سفید کپڑوں میں، بامراد، امیدوں کی صبح کی طرح پُرنور تقدیس نے بڑے دلکش انداز میں گلابی عارض پہ جھکی دراز پلکیں اُٹھائیں ۔ مسکرا کر ۔ شرما کر ۔ تھوڑا سا گردن کو جھکا کر اس محبت کے دیوتا کی طرف دیکھا ___ ان نگاہوں کی چمک سے کمرے کی روشنیوں میں جیسے اور بھی اضافہ ہو گیا ۔ ہر چیز روشن ۔ ہر چیز چمکتی، جگمگاتی ___ یہ دہکتے، دمکتے رخسار ۔ یہ مہکتے گیسو ۔ چمکدار آنکھوں پہ سحر آفرین گرتی اٹھتی پلکیں ۔ یہ تھرکتے، لرزتے باریک ہونٹ ۔ یہ مسکراتی نظریں ۔ شرماتی تقدیس ___ ایسے مسحور کن ۔ شرابی ماحول میں شہزاد نشے میں آ گئے

" ان آنکھوں سے پی لوں گا ۔ تو تمام عمر اس نشے میں جی لوں گا ۔ ان آنکھوں کے تصوّر میں ۔ ان زلفوں کے سحر میں تو میں مر مر کے بھی جی لوں گا ۔ میری جان ___ میرا

ایمان ـــــ تقدیس ـ تم ہو ـ تم ہو ـــــ مجسم غزل ـ غزالی آنکھیں ـ سامنے ہوں ـــــ تو غزل کہنے کو جی چاہتا ہے۔" شہزاد شاعری کے موڈ میں تھے ـ

سفید کپڑوں پہ سفید شال چہرے کے گرد لپیٹے تقدیس معصوم فرشتہ سی لگ رہی تھیں ـ بڑی مقدس، مقدس روحانی نورانی سی مخلوق ـ کبھی پلکیں اُٹھاتی ـ کبھی جھکاتی ـ کبھی دھوپ ـ کبھی شام ـ بڑا دلکش منظر تھا ـــــ اور ـــــ فرشتہ سیرت ـ فرشتہ صورت شہزاد نشے میں چور ـ ایسی مخمور فضاؤں میں مسحور سے ـ بہکے جا رہے تھے ـ اپنی پاک صاف ـ پُرخلوص محبت کے پھول ـ اپنی ازلی، ابدی محبت کا خزانہ تقدیس کی آنکھوں کی گالوں کی اور سیاہ بالوں کی نذر کر رہے تھے ـــــ اور ـــــ بڑے سگھڑاپے سے پُرخلوص ـ محبت بھرے انداز میں ایک ایک چیز میز پر رکھتی تقدیس ـــــ ان کے لیے بڑی اپنائیت سے کھانا لگاتی تقدیس ان کے دل میں اترتی جا رہی تھی ـ پھر دونوں ساتھ ساتھ بیٹھے اور کھانا شروع ہوا اپنے ہاتھ میں پکڑ کر تقدیس کے ہاتھوں سے بڑے

رمان سے ۔ بڑے مان سے نوالے اپنے منہ میں لے رہے تھے ۔ کبھی ایک لقمہ اپنے ہاتھ سے تقدیس کو کھلاتے ۔ ہنستے مسکراتے ۔ شاداں فرحاں دونوں وہیں دیر تک بیٹھے رہے ۔ کھانا تو واجبی سا ہی کھایا ۔ وہ گاؤں میں اپنے پندرہ روزہ قیام کی کہانیاں سناتے رہے واقعات بتاتے رہے ۔ مختلف الجھے مسائل وہ وہاں کیسے سلجھاتے رہے ۔ معاملات کو نمٹاتے رہے ۔ تقدیس سب کچھ ہمہ تن گوش سنتی رہی ۔ دھیمے دھیمے لہجے میں یہاں کی باتیں بتاتی رہی ۔

" ابھی تمہارا کام ختم نہیں ہوا ۔ کھوئی چیز نہیں ملی کیا ؟" فرح بھابی ہنستی ہوئی کمرے میں آ رہی تھیں ۔ " بڑے سخت بے ایمان ہو ۔ پکّے شیطان ہو ۔ جھوٹے بہانے لگاتے ہو ۔" فرح بھابی نے شہزاد کا کان پکڑ لیا ۔

" سچ بھابی ـــــ جھوٹا بہانہ نہیں تھا ۔" شہزاد نے بھابی کا نرم ہاتھ اپنے ہاتھ میں دبا لیا ۔

" بھابی ۔ میرا کام بھی ہو گیا ۔ میری گم گشتہ ۔ چیز ۔ میری حیات ـــــ میری کائنات ـــــ میرا ایمان ـــــ میری

جان ــــ غرض کیا کچھ کہوں - میرا سب کچھ مجھے مل گیا ہے میری پیاری بھابی جان ــــ" شہزاد فرح کا ہاتھ دباتے ہوئے نشے میں بولتے چلے گئے -

جب فرح بھابی کمرے میں آئی ہیں تو شہزاد جھکے تھے تقدیس کے سامنے اور ــــ ان کے ہاتھ سے لقمہ لے رہے تھے - انہوں نے فرح بھابی کی آواز سن کر فوراً ہاتھ چھوڑ دیا - لقمہ پلیٹ میں جلدی سے رکھ دیا -

" شرع میں کیا شرم ــــ؟ معلوم بھی ہے یہ بھابی صاحبہ خود ہمارے تنویر بھائی کے کتنے ناز اٹھاتی ہیں ہزاروں نخرے سہتی ہیں -" شہزاد نے تقدیس کو لقمہ پلیٹ میں رکھتے دیکھ کر کہا -

" جی ہاں - ہم بال بچوں والے لوگ ــــ یہ ناز نخرے اُلٹے سیدھے لاڈ ــــ چونچلے کہاں کر سکتے ہیں ــــ اتنی ذمہ داریاں - پھر بچوں کی لڑائیاں چھڑاتے - ان کے ہاتھ منہ دھلاتے ہی کہیں ہوش نہیں آتا -" فرح بھابی ہنستے ہوئے کہہ رہی تھیں - " یہ سب پہلے کی باتیں ہیں - بعد میں سارے ہوش ٹھکانے ہو جاتے ہیں ــــ" اپنے

تجربات کی روشنی میں ان دونوں محبت کے متوالوں کو وہ مستقبل کا حال دکھا رہی تھیں۔ خوابوں کی خیالوں کی دنیا سے حقیقت کی دُنیا میں واپس لا رہی تھیں۔

"ہم تو ایسے ہی ناز اٹھوائیں گے۔ خدمتیں کروائیں گے ان کے ہاتھوں سے کھانے کھائیں گے۔ چاہے ہماری دلہن رانی کے ببیں۔ چالیس بچے ہو جائیں۔۔۔ سب فرح بھابی کو پارسل کرتے جائیں گے۔ امّی حضور کو۔ خالہ جانی کو بھجواتے جائیں گے۔۔۔ اور۔۔۔ ہم خود پھر فارغ البال اسی طرح عیش اُڑائیں گے۔" شہزاد نے تقدیس کا جھکا ہوا اونچا کرتے ہوئے۔ شرم سے سُرخ چہرہ اپنی طرف گھماتے ہوئے کہا۔ وہ تقدیس کی مُنی سی تھوڑی کے نیچے انگلی رکھے تھے۔ بڑی شرارت اور شوخی تھی شہزاد کے لہجے میں۔ چہرے پہ، آنکھوں میں۔ اور تقدیس پلکیں جھکائے۔ ہونٹوں کو دانتوں میں دبائے خاموش تھی۔ سخت سردی کے باوجود بھی پیشانی پہ پسینے کے موتی چمک رہے تھے۔

"دیکھنا تو سہی۔ سب بَل نکل جائیں گے۔ دو بچے

ہی کانوں کے کیڑے نکالنے کے لیے کافی نہیں۔" فرح بھابی تقدیس کے ساتھ والی کرسی پہ بیٹھی تھیں۔ وہ چپکے سے فرح بھابی کے ساتھ اُٹھ کر جانے لگی ——— تو شہزاد نے تقدیس کے بجائے بھابی کا ہاتھ پکڑ لیا۔

"بھابی!۔ یہ ظلم ہے۔ ناانصافی ہے۔" شہزاد تقدیس کو وہاں سے لے جانے پر فرح سے شکائت کر رہے تھے اور تقدیس بڑی مضبوطی سے دونوں ہاتھوں سے فرح کا بازو پکڑے تھیں۔

"چلو بھاگ جاؤ۔ بہت عیاشی کر چکے۔" فرح بھابی نے شہزاد سے ہاتھ چھڑاتے ہوئے ٹھینگا دکھایا۔ اور تقدیس کو اپنے ساتھ لیے مُڑ گئیں:۔

باب ۱۰

اس درجہ وہ پیارے ہیں۔ کچھ کہتے نہیں بنتی
کیا اور کہا جائے، جب اور بھی پیار آئے

شبانہ کالج کی بیڈمنٹن ٹیم کے ساتھ قومی کھیلوں کے مقابلوں میں شمولیت کے لیے جا رہی تھیں۔ دس دن کا پروگرام تھا۔ کالج کی طرف سے ریل گاڑی سے جانے کا بندوبست ہوا تھا۔ کافی طالبات اور بھی جا رہی تھیں۔ کالج کے ملازم اور لڑکیوں کے گھریلو ملازم سب جلدی جلدی سامان گاڑی میں رکھ رہے تھے۔ شبانہ کے ملازم نے قلیوں کی مدد سے شبانہ کا اٹیچی کیس اور بستربند گاڑی میں رکھوا دیا۔ دوسری طالبات بھی بھاگم بھاگ اپنا اپنا سامان رکھوانے کی فکر میں تھیں۔ کیونکہ طالبات کافی تھیں اس لیے سامان بھی زیادہ تھا۔ کالج کے نوکر ساتھ لگے تھے۔ شبانہ

کا ملازم بھی بہت مصروف تھا - غرض کافی ہنگامہ تھا۔ بڑی افراتفری - شوروغل مچا تھا - چڑھنے والے مسافر اپنی جلدی میں تھے - اور اترنے والے اپنی پریشانی میں - ہر کسی کو یہی خوف تھا کہ کہیں گاڑی نہ چل دے - ایک تو سٹیشن کی ہلچل - گہما گہمی - سواریوں کے اترنے چڑھنے کی گڑ بڑ۔ نفسا نفسی کا عالم تھا - ایسے میں شہزاد کی گپیں - جھوٹی سچی کہانیاں - نہ جانے کہاں کہاں کے قصے سنا رہے تھے - کہ وہ تقدیس کو ساتھ لیے شبانہ کو رخصت کرنے کے لیے آئے ہوئے تھے - گاڑی حرکت میں آگئی - کسی کو پتہ ہی نہ چلا - شبانہ کے ساتھ شہزاد اور تقدیس بھی گاڑی کے ڈبے میں بیٹھے ہوئے تھے کہ جب گاڑی چلے گی تو - چلنے سے پہلے دونوں اُتر جائیں گے - ابھی گاڑی چلی ہی تھی کہ شہزاد شبانہ کے سر پر ہاتھ پھیرتے ، اس کے بالوں پہ پیار کرتے - اُٹھ کھڑے ہوئے - الوداع کہہ کے چلتی گاڑی سے چھلانگ لگا دی - پیچھے دیکھتے ہیں تو تقدیس گاڑی کے دروازے میں کھڑی - چلتی گاڑی سے اُترنے کی ہمت کہاں سے لائے - اور شبانہ نے بھی دوڑ

کر اس کو پیچھے سے پکڑ لیا۔ کہیں گھبرا کر جلدی میں کود ہی نہ جائیں یا جھٹکے سے خدانخواستہ ——— نیچے ہی نہ جا پڑیں۔ شہزاد کے اترتے ہی گاڑی نے رفتار پکڑ لی تھی۔ ایک دم تیز سے تیز ہوتی گئی۔ وہ گاڑی کے ساتھ ساتھ پلیٹ فارم پر بھاگتے رہے۔ ہاتھ ہلاتے رہے۔ کچھ کہتے رہے۔ زور زور سے آوازیں دیتے تسلی کرواتے رہے۔ لیکن گاڑی کے شور میں کچھ بھی سنائی نہ دے رہا تھا۔ کھٹ کھٹ کرتی ٹرین پل بھر میں آنکھوں سے اوجھل ہو گئی۔ دونوں ملازم بھی تیز رفتاری سے گاڑی کے ساتھ ساتھ شہزاد کے پیچھے بھاگ رہے تھے۔ بہت پریشان تھے۔ گاڑی چلی گئی تو شہزاد کو ہوش آیا۔ فوراً اپنی گاڑی سنبھالی اور موٹر بھگاتے۔ ٹرین کے ساتھ جا رہے تھے۔ دروازے میں کھڑی تقدیس اور شبانہ کو ہاتھ ہلا رہے ہیں۔ جواب میں وہ دونوں ہاتھ ہلا رہی ہیں۔ کالے پہ سنہری پھولوں کی بیلوں والی تقدیس کی میکسی کا بڑا گھیر پھیل کر دور سے نظر آ رہا تھا۔ سنہری سکارف ہوا میں لہرا رہا تھا۔ شبانہ کے جامنی کپڑے دور سے نظر آ

رہے تھے ۔ ریلوے لائن اور پختہ سرحدی سڑک دونوں
متوازی گزرتی تھیں ۔ شہزاد کو دونوں لڑکیاں اور لڑکیوں
کو شہزاد نظر آتے رہے ۔ تسلی رہی ۔ رفتہ رفتہ سڑک
اور پٹری میں وقفہ آتا گیا ۔ متوازی خطوط ٹیڑھے ہوتے
گئے ۔ دونوں دور ہوتی گئیں ۔ پہاڑوں کی وجہ سے دریا
کی وجہ سے فاصلے بڑھتے گئے ۔ بہت چوڑا دریا راستے
میں آتا تھا ۔ پہاڑوں کو کاٹ کر راستہ بنا کر ۔ اس چوڑے
دریا پر لوہے کا بڑا پُل بنایا گیا تھا ۔ سڑک اوپر اور
نیچے لوہے کے کٹہروں کے درمیان میں اینٹ، پتھر
بجری اور لوہے کی چادروں سے یہ بڑے بڑے جناتی
ستونوں پر سے ریلوے لائن گزرتی تھی ۔ نیچے سے
ریل گاڑی اور اوپر سے موٹریں، بسیں گزرتی تھیں ۔
شہزاد بڑی تیز رفتاری سے موٹر چلا رہے تھے ۔ پہلے گاڑی
کے ساتھ اور اب آگے نکل گئے ۔ فاصلے بڑھتے گئے ۔
دوریاں پڑتی گئیں ۔ جب شہزاد کی موٹر پُل کے اُوپر سے
گزر رہی تھی ۔ اور ٹرین پُل کے جالی دار آہنی کٹہروں
میں سے ۔ ایک بڑا خوفناک زوردار شور تھا ۔ پھر شہزاد

نظر نہیں آ رہے تھے - ایسے میں تقدیس اور شبانہ کا بے قراری اور گھبراہٹ سے برا حال تھا - ادھر شہزاد بھی موٹر سے سر نکال نکال کر باہر دیکھ رہے تھے - اگرچہ موسم بڑا خوبصورت اور دریا کے کناروں اور پانی کا منظر اتنا دلکش اتنا حسین تھا - کہ بڑے آرام سے بڑے سکون سے کھڑے دیکھتے ہی رہنے کے قابل - لیکن اس وقت ان حسینوں کو حسین مناظر سے تو کوئی دلچسپی نہ تھی - انہیں تو اپنی ہی فکر تھی - ایک دوسرے کے لیے پریشان تھے دونوں لڑکیاں پل میں سے گزرتی گاڑی کے شور اور اندھیرے سے گھبرا کر آمنے سامنے نشستوں پر خاموش بیٹھی تھیں - رنگ زرد - آنکھوں میں آنسو - اور ہونٹ لرز رہے تھے - خود بھی کانپ رہی تھیں -

" اوہ —— آپی جی —— بھائی جان " گاڑی اگلے سٹیشن کی حدود میں داخل ہو کر آہستہ رفتار ہو رہی تھی شبانہ نے کھڑکی میں سے باہر جھانکتے ہوئے کہا - شہزاد ٹرین کے پہونچنے سے پہلے پلیٹ فارم پر کھڑے تھے اور دونوں کو پہچان کر اپنی سفید ٹوپی دور سے ہلا رہے

تھے ۔ گاڑی کھڑی ہوئی تو اُچھل کر ایک بار پھر ٹرین میں تھے ۔ شبانہ کے پاس ۔ تقدیس کے قریب ۔ خوش باش ۔ تر و تازہ ۔ ہنستے مسکراتے ۔ وہ اس ہنگامی صورت حال میں بھی مزہ لے رہے تھے ۔ تھوڑی سی وقتی گھبراہٹ کے بعد اب مطمئن تھے ۔ تقدیس اور شبانہ کی نقلیں اُتار رہے تھے ۔ ان کی پریشانی کا مذاق اُڑا رہے تھے ۔ شریر انسان ——— اتنے میں ٹرین کو پھر جھٹکا لگا ۔

" بھائی جان ۔ خدا کے لئے جلدی سے اُتر جائیے آپی کو لے کر ۔ گاڑی پھر چل دے گی ۔" شبانہ تو سخت گھبرا گئی ۔ یوں بار بار چلتی گاڑی سے بھائی کا اُترنا انہیں سخت خوف آتا تھا ۔ ہر طرح کے خطرے کا امکان تھا ۔

" اللہ تعالیٰ میرے بھائی کو ہمیشہ اپنے حفظ و امان میں رکھے ۔" شبانہ نے دونوں ہاتھ اُٹھا کر دل سے دُعا مانگی ۔

اور اس دفعہ شہزاد تقدیس کو اپنے بازو کے حلقے میں لیے پلیٹ فارم پہ کود گئے ۔ اور وہ بھی اپنی دونوں باہیں بڑی مضبوطی سے ان کی کمر کے گرد ڈالے تھی ۔

ٹرین پہلے آہستہ اور پھر تیز چلنے لگی ۔ دونوں دیر تک بڑی دور تک شبانہ کو ہاتھ ہلاتے ۔ الوداع کہتے رہے اور شبانہ کا جامنی آنچل بھی دور تک نظر آتا رہا ۔ لہراتا رہا ۔

شہزاد نے وعدہ کیا تھا کہ کھیلوں کے اختتام پہ وہ دونوں آجائیں گے ۔ پھر اپنے وطن کا اتنا پیارا ۔ اتنا بڑا شہر ۔ عروس البلاد ۔ عالمی بندرگاہ ۔ وسیع و عریض سمندر ۔ ہر جگہ کی خوب سیر کروائیں گے ———— شبانہ کی کامیابیوں کی خبریں اخباروں میں پڑھ پڑھ کر بہت خوش ہوئے ۔

تقدیس کو لے کر پروگرام سے دو دن پہلے ہی پہونچ گئے ۔ ان کی شبانہ نے شاندار کامیابی حاصل کی تھی ۔ طلائی تمغہ جیت لیا تھا ۔ کھیلوں کے آخری دن شام کو مقابلے ختم ہو گئے ۔ تقسیم انعامات کے بعد شام کو شاندار ڈنر تھا ۔ تمام کھلاڑی طالبات ۔ طالبات کی نگران ۔ دیگر افسران سب کا ۔ شام کو تقسیم انعامات کی تقریب میں شبانہ کے مہمانوں میں شہزاد اور تقدیس بھی شامل تھے ۔ شبانہ کو تمغہ ملا تھا اس کو شاباش دے کر ۔ اور اس خوشی میں اپنی طرف

سے اور تقدیس کی طرف سے بہت سے تحائف ۔ کئی انعامات لے کر دینے کا وعدہ کر کے چلے گئے ۔ کیوں کہ رات کے کھانے کے بعد موسیقی وغیرہ کا بھی پروگرام تھا طالبات نے کچھ ورائٹی پروگرام تیار کیے تھے ۔ ان میں باہر کے مہمان مدعو نہ تھے ۔ اس لیے پروگرام کے بعد آ کر لے جانے کا وعدہ کر لیا تھا ۔ شہزاد نے اپنی چھوٹی بہن سے ۔ وہ اپنے ایک قریبی دوست کے ہاں ٹھہرے ہوئے تھے ۔ اور شبانہ کی ادھر سے فراغت کے بعد اگلے دن اس کے بیوی بچّوں کے ساتھ مل کر سمندر کے کنارے پکنک کا پروگرام بنایا تھا ۔

شبانہ کا ڈنر اور ورائٹی پروگرام ختم ہو جائے ۔ اسی انتظار میں شہزاد تقدیس کو ساتھ لیے آہستہ آہستہ گاڑی چلاتے سڑکوں پر چکّر لگا رہے تھے ۔ کھانا بھی ابھی ہوٹل میں کھا کر کافی پی کر آئے تھے ۔ بازار کی طرف نکل آئے ۔ وسیع و عریض ۔ بلند قامت دوکانیں ۔ آراستہ و پیراستہ دوکانیں ۔ روشنیوں کا سیلاب ۔ برقی قمقموں کی بہتات ۔ بڑا بارونق بازار لوگوں کا ہجوم ۔ بڑی چہل پہل ۔ اتنی رات گئے لوگ بڑی

بے فکری سے خریداری کرتے پھر رہے تھے - ان کے چہروں پہ سکون اور انداز کے اطمینان سے ظاہر ہوتا تھا کہ رات نہیں بڑھ رہی بلکہ دن چڑھ رہا تھا - دن چڑھا ہوا تھا - خلق خدا بیکار - فارغ البال ادھر سے ادھر پھرتی سیر کر رہی تھی - اتنی بھیڑ تھی - اتنا ہجوم تھا - اتنا رش تھا کہ جیسے سب کو آج ہی - سارے شہر کو ابھی خریداری کرنی ہے - جیسے ساری دنیا ہی گھروں سے باہر نکل آئی ہے - وقت کم ہے اور خریداری زیادہ کرنی ہے جیسے بازار صرف آج رات ہی کھلے رہیں گے اور اس کے بعد کل سے صبح ہوتے ہی سارے کام بند ہو جائیں گے - سارا بازار خاموش ہو جائے گا - ساری دوکانیں اُٹھ جائیں گی - اس افراتفری بھاگم دوڑ سے ایسا ہی ظاہر ہوتا تھا - حالاں کہ بڑے شہروں کا یہ روزمرہ کا معمول تھا خریداری کا یہی اصول تھا - شہزاد بھی شبانہ کے انتظار میں وقت گزاری کے لیے بازار میں نکل آئے - دوکانوں پہ گھومنے لگے - تقدیس ساتھ تھی - کئی ساڑھیاں خرید لیں - عطریات - زیورات خرید لیے - سینکڑوں تو

وہاں چیزیں تھیں ۔ بہرحال غیر ارادی طور پر بھی ہزاروں کا سامان خرید کر موٹر میں رکھوا لیا ۔ ابھی شاپنگ تو شبانہ کے ساتھ کرنے کا وعدہ تھا ۔ پھر اسی طرح اس روشنیوں کے شہر میں گھومتے چکر لگاتے ۔ سمندر کے کنارے پہ آ گئے ۔

چاندنی رات ۔ وسیع سمندر کا کنارا ۔ پھر تقدیس کا ساتھ ۔ ٹھنڈی ٹھنڈی جاں بخش چاندنی میں ۔ خوش گوار مست ہوا میں مستی سے گنگناتے ۔ تقدیس کے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے ٹہلتے رہے ۔ جھومتے رہے ۔ گاتے رہے ۔ ٹھنڈی گیلی ۔ چمکیلی ریت پر لیٹ گئے ۔ دونوں ہاتھ سر کے نیچے رکھے سیدھے لیٹے تھے ۔ سمندر کے کنارے پہ شہزاد اور شہزاد کے قریب تقدیس بڑے خوبصورت فیروزی کپڑوں میں دوزانو بیٹھی تھی ۔ لمبے سیاہ بال کمر اور شانوں پہ بکھرے تھے ۔ ہوا سے اُڑتے تھے ۔ بار بار سنبھالنے کے باوجود بھی فیروزی دوپٹہ ہوا سے مچل رہا تھا ۔ کبھی بکھرے بالوں کو دونوں ہاتھوں سے سمیٹتی تو کبھی اُڑتے دوپٹے کو پکڑتی ۔ ساحل سمندر پہ روشنیوں

کا ایک الگ سمندر تھا۔ نور کا سیلاب تھا۔ پھر چار سو چاندنی پھیلی تھی۔ شریر شہزاد خاموش آنکھیں بند کیئے بے حس وحرکت۔ پڑے تھے۔ دراز پلکیں عارض پہ سایہ کر رہی تھیں۔ اور بھرے بھرے گداز ہونٹوں پہ بڑا پُرسکون۔ بڑا دلفریب۔ بڑا دلنشیں تبسم تھا جس کی وجہ سے حسین چہرہ اور بھی دلکش ہوگیا تھا۔ کہ مسکراہٹ چار سو پھیلی چاند کی چاندنی کی طرح چاند سے چہرے پہ پھیلی تھی۔ ایک طرف شہزاد کا سکون اور دوسری طرف سمندر کی پرشور لہریں بے قرار ہو ہو کر۔ اُٹھ اُٹھ کر باہر آرہی تھیں۔ پانی کا تیزی سے کناروں سے باہر آنا پھر آہستہ آہستہ مست خرامی سے واپس کناروں میں سمٹ جانا۔۔ پانی کا شور لہروں کا زور۔ ایسے میں فیروزی کپڑوں میں سمٹی سمندر کی ایک فیروزی لہر کی طرح نازک سی تقدیس کبھی بے قرار لہروں کو دیکھتی۔ کبھی نکھری بکھری پھیلی چاندنی کو تو کبھی چاند کی طرح پُرسکون مسکراتے چہرے کی بلائیں۔ نگاہوں ہی نگاہوں میں لیتی۔ شریر شہزاد کی بند پلکوں کو دیکھتی رہی۔ جن کے نیچے سارے جہان کی خوشیاں

اور شوخیاں چھپی تھیں۔

" اگر ایسے میں ایک بڑی ساری ـــــ بہت بڑی ساری طوفانی لہر ہمارے اوپر سے گزر جائے پھر واپس سمندر میں جاتے تو میں ایسے ہی لیٹے لیٹے اس کے ساتھ بہتا چلا جاؤں ـــــ اور تم ـــــ یہاں ـ یہیں ریت پہ ـــــ ویران ـــــ بیابان ـــــ اتنی سنسان جگہ میں اکیلی رہ جاؤ ـــــ تو ـــــ ؟" شہزاد اسی طرح آرام سے لیٹے آنکھیں نیم وا کیے سوچوں میں ڈوبی تقدیس کے حسین چہرے کو دیکھتے ہوئے آہستہ آہستہ بول رہے تھے ۔ تقدیس ان کی خاموشی کی وجہ سوچ رہی تھی اور شہزاد تقدیس کو ستانے کی ترکیب نکال کر بہانے سے اپنے قریب بہت قریب لانے کی سوچ رہے تھے

" نہیں نہیں ـــــ" تقدیس نے اس خوفناک تصوّر سے ہی لرزتے ہوئے اپنے دونوں کانوں پہ ہاتھ رکھ لیے ۔ خوفزدہ نظریں ۔ بڑی بڑی کٹورا سی آنکھیں پھیلا کر چاروں طرف دیکھا ـ دُور ـــــ دُور تک ـ حدنگاہ تک نیلا پانی ـــــ اور پانی پہ ـــــ پھیلی چاندنی

بڑا سناٹا ــ بڑی خاموشی ــ بس اُچھلتے کودتے ــ جھاگ اُڑاتے پانی کا شور ــ منہ زور ہوا کا زور ــ ساحل سمندر کی مخصوص تیز ہوائیں ــ کہ اکیلے میں تو تقدیس کا دل ہی بند ہو جاتا ـــــ سہم کر ـــــ کھسک کر شہزاد کے قریب آگئی اور شہزاد ہونٹوں میں ہنسی دبائے ــ نظروں کو پلکوں میں چھپائے ــ سہمی سہمی تقدیس کو دیکھتے رہے ــ وہ اپنے بکھرے بالوں کو سمیٹ کر ہوا میں میں اُڑتے مچلتے دوپٹے سے باندھ کر سمیٹ چکی تھی ــ سیاہ بالوں کے سمٹ جانے کی وجہ سے اس کا روشن چہرہ اندھیری رات میں روشن ستارے کی طرح چمک رہا تھا ــ اور کانوں میں پڑے طلائی ستارے جھوم جھوم رہے تھے ــ ہوا کی مدد سے بار بار گردن کو گالوں کو چوم رہے تھے ــ اور ـــــ اتنے میں سمندر کی لہر ـــــ بڑی سی ـــــ سیلاب کی صورت میں ـــــ ڈھیروں پانی کی ـــــ اتنی اونچی لہر اُٹھ رہی تھی ــ بڑھ رہی تھی ــ کنارے کی طرف ـــــ کنارے پہ پڑے شہزاد کی طرف ـــــ شہزاد کے ساتھ بیٹھی تقدیس کی طرف ـــــ معصوم تقدیس کی جان

نکلی جا رہی تھی۔ کہیں شہزاد کو لہر ساتھ نہ لے جائے —— تقدیس کو یہی ڈر تھا۔

"میں لہروں کے ساتھ ساتھ بہتا چلا جاؤں —— اور تم یہاں —— تنہا —— بالکل —— تنہا —— رہ جاؤ —— ویران —— سنسان —— بیابان میں —— تو ——؟"

تقدیس کو اور کسی بات کا ہوش نہ رہا —— رفتہ رفتہ اٹھتی لہر ان دونوں کے اوپر سے گزر گئی دوبارہ —— اسی انداز میں واپس کناروں میں چلی گئی —— سمندر میں سمٹ گئی —— پانی میں شرابور شہزاد —— بھیگی ہوئی تقدیس بھی سمٹ گئی۔ چمٹ گئی۔ زور سے لپٹی رہی —— خوف کے مارے برا حال —— سانسوں کی رفتار غیر ہموار —— دل کی دھڑکن قابو سے باہر —— اور شہزاد کی شرارت کامیاب —— کہ ان کی کائنات —— ان کی متاع حیات —— جان عزیز —— عزیز از جان تقدیس ان کے بازوؤں میں تھی۔ اسی طرح آنکھیں بند کیے ٹھنڈی ریت پر بڑے مطمئن بڑے پرسکون لیٹے تھے۔ جیسے زندگی بھر کا سکون —— چین اور اطمینان —— سارے

بہان کی دولت سمٹ آئی ان کی بانہوں میں ــ ان کے سینے
پہ ـــــ ان قیمتی لمحات میں تقدیس، شہزاد کی شرارت
اور لہروں کے اتار چڑھاؤ سے ڈرتی موسم اور وقت۔
اور شہزاد کی محبت کے نشے میں مدہوش سی خاموش سی
بلکہ بے ہوش سی پڑی رہی بڑی دیر تک ـــــ خوبصورت
شہزاد ــ جو ــ ان کا مقدر ـــ ان کی زندگی کا سرمایہ۔
ان کی خوشیوں کا خزانہ ان کے سکون و راحت واطمینان
کا گنجینہ ـــــ ایسے خوبصورت لمحات میں ـــــ دو
خوبصورت دلوں کے ملاپ میں ـــــ فضاؤں میں ـــــ
ہواؤں میں نشہ بھرتا جارہا تھا ـ سمندر کا ڈھیروں ڈھیر
نیلا پانی ـــــ پانی نہیں ـــــ شراب نایاب ـــــ گلابی شراب
اسی شراب میں ـ دو محبت کے متوالوں کا وجود ڈوبا جا
رہا تھا۔ بھیگا جا رہا تھا ـ ایسے میں پیار کی نرم نرم پھوار
پڑنے لگی ـ کائنات جھوم اُٹھی ـ چاروں طرف مترنم ساز
بجنے لگے ـ ہر سو موسیقیاں بکھر گئیں ـ ہوائیں گیت گانے
لگیں ـ فضائیں نغمے سُنانے لگیں ـ لہریں جھوم جھوم کر
کناروں سے سر ٹکرانے لگیں ـ کہ دو محبت بھرے دل۔

چاہنے والے دل سو بار نہیں - بلکہ ہزار بار بھی اس عارضی دنیا میں - اس عالمِ ناپائیدار میں ملتے رہیں گے - بچھڑتے رہیں گے - پھر ملتے رہیں گے - مر مر کے جیتے رہیں گے - ان کے پیار کے پیمانے چھلکتے رہیں گے - محبت کے گلاب مہکتے رہیں گے - ارمانوں کے گلزار کھلتے رہیں گے - اور اسی پیار کے نشے میں - شراب میں ڈوبتے اُبھرتے - اُبھرتے ڈوبتے رہیں گے - پیار محبت کی ہوائیں چلتی رہیں گی - محبتیں بڑھتی، پھولتی، پھلتی رہیں گی -

ایسے میں بھی انہیں شبانہ ـــــــ اپنی پیاری پیاری ہنستی کھیلتی گڑیا سی بہن شبانہ یاد تھی - ان کی تقریبات سے فراغت کا انتظار تھا - وقت دیکھا تو کافی دیر ہو گئی تھی - فوراً روانہ ہو گئے -

شبانہ اپنا سامان سمیٹے سہیلیوں کے جھرمٹ میں سب سے نمایاں تھی - ان دونوں کی منتظر شبانہ دیکھتے ہی دوڑ کر آ گئی

سارا راستہ تقریب کے واقعات خوشی خوشی سناتی رہی۔

بڑے مزے لے لے کر چہک رہی تھی - شہزاد اور تقدیس
بڑی دلچسپی سے بڑے شوق سے اس کی باتیں سُن رہے
تھے ۔ اگلے دن اپنے دوست کے خاندان کے ساتھ
شبانہ کی خاطر ساحل سمندر پہ تمام دن پکنک میں گزارا ۔
ایک دو دن تمام دن شہر گھوم کر دیکھا - دونوں لڑکیوں
کو دکھایا ۔ حسبِ وعدہ شبانہ کو کامیابی پہ انعامات لے کر
دیئے ۔ ڈھیر ساری شاپنگ کروائی ـــــ امّی حضور کے
لیے ۔ خالہ جانی کے لیے ۔ چچا جان کے لیے ۔ تینوں
نے علیحدہ علیحدہ اچھی - عمدہ - قیمتی چیزیں خریدیں ۔
ڈھیر سارے تحائف ۔ ان لوگوں نے تحفوں کے لیے
اپنے نوکروں کو بھی یاد رکھا ۔ سب نے سب کے لیے
کچھ نہ کچھ ضرور خریدا ۔ ہوائی جہاز سے واپسی ہوئی ۔
تینوں بچّوں کو لینے کے لیے ۔ امّی حضور ۔ خالہ جانی
چچا جان ائیر پورٹ میں موجود تھے ۔

باب ۱۱

اے موج بلا، ان کو بھی ذرا، دو چار تھپیڑے ہلکے سے
کچھ لوگ ابھی تک ساحل سے طوفان کا نظارہ کرتے ہیں

ظفر نیازی کی وسیع و عریض، بڑی شاندار، سرسبز درختوں میں گھری، قدرے بلندی پہ سُرخ رنگ کی دو منزلہ کوٹھی۔ چابکدست مالیوں کی فن کاری کا نمونہ تھی۔ باغ۔ درخت پھول۔ پودے۔ پورا گلزار جنت الفردوس کا نظارہ تھا۔ ماہر فن معماروں کی ماہرانہ تراش، خراش، رنگ روغن، صفائی ستھرائی، آرائش و زیبائش۔ کوٹھی کیا ایک شیش محل نظر آتی تھی ـــــ اور ـــــ آج ـــــ تو ـــــ عروسِ نو کی طرح جھلمل جھلمل کرتی کوٹھی کی شان ہی کچھ اور تھی۔ سامنے کی طرف کوٹھی کی پیشانی پہ زیادہ طاقت کے برقی بلب۔ ٹیوب دائرے کی صورت میں روشن تھے۔ روشنیوں

کے دائرے کے گرداگرد رنگ برنگ چھوٹے بڑے قمقموں کے ہار۔ سہرے ۔ جھالریں اور لڑیاں لگی تھیں۔ یہ جلتے بجھتے رنگ برنگ چراغ ۔ یہ روشن روشن دیپ بڑا خولصورت منظر پیش کر رہے تھے ۔ لوہے کے دونوں بڑے بڑے گیٹ سفید جالی سے بنائے گئے تھے اوپر لوہے کی موٹی جالی دار محرابی تاریں لگا کر ، اس پر سُرخ پھولوں کی گھنی بیلیں چڑھی تھیں ۔ سُرخ پھولوں اور گہرے سبز پتوں کی بیلوں پر بہار تھی ۔ مختلف رنگ کے کاغذوں کی جھنڈیوں ، پھولوں ، غباروں ، رنگین بلبوں اور برقی ٹیوبوں کی سجاوٹ سے بڑے خولصورت آرائشی دروازے ، بلندقامت دروازے بنے تھے ۔ جن پر برقی قمقموں سے خوش آمدید لکھا گیا تھا ۔ گیٹ سے لے کر بیرونی برآمدہ کے سامنے پورچ تک پختہ سڑک کے دو رویہ لگی سبز باڑ میں ۔ تمام بڑے چھوٹے درختوں پر ۔ ہر پودے کے پتے پتے پر ، ٹہنی ٹہنی پہ لگی روشنیاں ، یہ قمقمے ، اتنے بے شمار پھولوں کے گملوں میں ہر ایک کے گرد چھوٹے بلبوں کا ہار لپٹا تھا ۔ پتوں

میں۔ سے پھولوں پہ سے جھانکتی جھلکتی یہ روشنیاں۔ اتنی بڑی، دو منزلہ کوٹھی کی دیواروں کا، چھتوں کا ذرہ ذرہ، کونہ کونہ رنگین چھوٹے بلبوں کی روشنیوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ پوری کوٹھی کا رنگ ہی بدلا ہوا تھا۔ اتنے خوبصورت آرائشی منظر میں ہلکی ہلکی مست ہوا، پھولوں کی خوشبوؤں۔ سے بھری عطر بیز ہوا چل رہی تھی۔ ٹھنڈی ٹھنڈی خوشنما چاندنی۔ ہوائیں بڑی خوشگوار، فضائیں بڑی دلفریب، پرمست، بہار آفریں۔ بہاروں پر بہاریں آئی تھیں۔ گل وگلزار پہ، حسین نظاروں کو بہاروں نے اپنے دامن میں سمیٹ لیا تھا۔

کیونکہ

ظفر نیازی کی اکلوتی، بڑی لاڈلی، بڑی پیاری، بڑی چہیتی بیٹی کی مہندی رات تھی۔ سعدیہ بیگم اپنے بیٹے شہزادوں جیسے شہزاد کی بارات لے کر آ رہی تھیں۔ شبانہ اپنی بھابی کے لیے مہندی لے کر آ رہی تھیں۔ شہزاد اپنے اور اپنی تقدیس کے ارمانوں کا روپ سجائے۔ اپنی اور تقدیس کی زندگی میں مسرتوں کو، خوشیوں کو بھرنے

آ رہے تھے۔

بہت بڑی ـــــــــ بڑی شاندار۔ دعوت طعام کا انتظام تھا۔

اپنے ہم پلہ۔ امیر و کبیر۔ ٹھاٹھ دار مہمان مدعو تھے بڑی چھوٹی بے شمار گاڑیاں، موٹریں۔ کاریں، باڑ کے ساتھ ساتھ دونوں طرف قطاروں میں کھڑی تھیں جن میں زیادہ تعداد بڑی بڑی کالی سرکاری گاڑیوں کی بھی تھی۔ کہ ظفر نیازی کے ہم کار، وزراء، ارکان اسمبلی، ممبران پارلیمنٹ حتیٰ کہ وزیراعظم خود تشریف فرما تھے۔ دیگر معززینِ شہر بھی اس خوشی میں شامل تھے۔ آتش بازیاں پھلجڑیاں چھوڑی جا رہی تھیں۔ بتاشے، پٹاخے چھوٹ رہے تھے۔ لڑکے والوں کی طرف سے سہرا گاتے، باجے بجاتے، بینڈ باجے والوں نے سہرا ڈالے آنے والے کی اطلاع دی۔ نغمہ شادی کی دھنیں آہستہ آہستہ قریب آتی جارہی تھیں اور خوشی و شادمانی سے دلوں کی دھڑکنیں تیز اور چہروں پہ خوشیوں کا نور بڑھتا جا رہا تھا۔

"بارات آگئی، بارات آگئی۔"

ننھی منّی معصوم بچیاں ۔ نوجوان لڑکیاں ۔ مہمان خواتین بھاری بھاری قیمتی لباس سنبھالتی ۔ اُوپر کی منزل سے دیکھ کر دوڑتی ہوئی نیچے آگئیں ۔ وسیع و عریض بیرونی برآمدے میں ۔ ظفر نیازی کے دوست احباب ۔ ساتھی مرد اصحاب بھی ان کے ساتھ بارات کے استقبال کے لیے موجود تھے روشنیوں میں جگمگ کرتے برآمدے کی پہلی سیڑھی پہ فوزیہ بیگم زرتار نارنجی ساڑھی میں بھاری زیورات پہنے خوبصورت چہرے پہ خوشیوں کے گلنار سجائے کھڑی تھیں ۔ ان کے پہلو میں ظفر نیازی سیاہ ڈنر سوٹ میں تھے ۔ دونوں میاں بیوی ڈھیروں ڈھیر پھولوں کے ہاروں کی سینکڑوں لڑیاں ہاتھوں میں لیے ۔ خوبصورت چہروں پر، بڑی دل آویز مسکراہٹ اور دلی مسرت کی چمک تھی ۔ اور پھولوں کی مہک سے تمام فضا مہکی جا رہی تھی ۔

شبانہ مہندی کا بڑا بھاری ۔ جھولدار غرارہ سوٹ پہنے تھی ۔ مہندی رنگ کے دوپٹے پر بہت عمدہ سنہری زرتار جالی بنا تھا ۔ چھوٹے پھولوں کی اور پتیوں کی بیلیں تھیں ۔ اور بیلوں کے درمیان میں جگہ جگہ پھول بنے تھے ۔۔۔

دوپٹے کے چاروں طرف کرن، کناری سے چوڑی چوڑی بیل لگی تھی۔ قمیض کے دامن پہ۔ غرارے کے جھول کے ساتھ بھی ایسی ہی بیل ٹکی تھی۔ سنہری تاروں والی سلیم شاہی غرارے کے جھول میں سے کبھی نکلتی، کبھی چھپتی، سُرخ موتیا۔ گلاب کے پھولوں، ہاروں اور گجروں میں لہکتی شاہانہ مست خرام صبا کی طرح لہکتی، سرشار سی آہستہ آہستہ چلی آ رہی تھی۔ رنگ برنگ قمقموں کی بھرمار سے جگمگاتی دو رویہ سبز باڑھ کے ساتھ ساتھ کھڑی بے شمار موٹروں کی قطاروں کے درمیان میں گذر رہی تھی۔ گلابی، گلابی، خوبصورت نکھرا چہرہ خوشیوں کے نور سے منور تھا۔ آنکھوں سے خوشیوں کی کرنیں پھوٹ رہی تھیں۔ ہونٹوں پہ دلنواز تبسم تھا۔ دمکتی پیشانی پہ چھوٹا سا طلائی ٹیکہ سنہری زنجیر میں جھوم رہا تھا۔ سر کے گرد لپٹے پھولوں کے ہاروں کے ساتھ ساتھ، یہ بڑے بڑے طلائی جھمکے کانوں میں جھول رہے تھے۔ پھولوں کے ہاروں، گجروں سے ڈھکے، سجے سجائے، سفید گھوڑے کی سرخ، سنہری مخملیں زین پہ سنہری شیروانی پہنے، سفید آرا تنگ پاجامہ۔ سنہری سلیم شاہی جوتا پہنے۔ موتیا اور گلاب

کے پھولوں، کلیوں اور سنہری تاروں، کرن کناری کے
مہکتے، چمکتے سہرے میں روشن مکھڑا چھپائے۔ بہت سے
ہار پہنے، شبانہ کے ساتھ کا سبز زرتار دوپٹہ، سر کے گرد
لپٹے سہرے کے دائرے میں بندھا تھا۔ سرخ کارچوبی چھتر
کے سائے میں شہزاد، شہزادوں کی شان سے بیٹھے تھے۔
شبانہ بھائی کے گھوڑے کی لگام پکڑے آگے آگے تھی۔ پیچھے
دو، دو کی قطاروں میں اس کی ہم جماعت سہیلیاں، شبانہ کی
طرح کے لباس میں تھیں۔ یہ سعدیہ بیگم نے شہزاد کی
بہنوں کی حیثیت سے سب لڑکیوں کے لیے بنوائے تھے۔
ان میں سب سے آگے شمع اور فرح بھابی تھیں۔ مہندی
رنگ کے غرارہ سوٹ، بھاری زرتار، کامدار دوپٹے۔۔۔
دونوں ہاتھوں میں چاندی کے چمکتے طشت میں گھلی مہندی
کے اوپر موم بتیاں جل رہی تھیں۔ برآمدے کے قریب آ کر
شبانہ رُک گئی۔ روشن موم بتیوں والے مہندی کے تھال
دونوں ہاتھوں میں پکڑے، لڑکیوں نے شہزاد کے گرد دائرہ
بنا لیا۔ وہ مہندی کے گیت گا رہی تھیں۔ سہرے سنا رہی
تھیں۔ شہزاد کے پیچھے سفید بڑی موٹر رُکی۔ سعدیہ بیگم

سادہ، مگر بہت عمدہ، قیمتی سفید لباس میں بڑے وقار سے بڑی شان سے باہر آئیں — پچھلی موٹروں سے ان کی ملنے والی بیگمات، رنگ برنگ، بڑے قیمتی، شاندار کپڑوں میں اُتر رہی تھیں۔ فوزیہ بیگم نے آگے بڑھ کر بڑی بہن، اپنی سمدھن، تقدیس کی ساس کی حیثیت سے ان کے گلے میں کرن کے، پھولوں کے ہار پہنائے۔ گوٹے کناری والا بڑا بھاری نارنج رنگ کا دوپٹہ اپنے دونوں ہاتھوں سے پھیلا کر ان کو اوڑھا دیا — کہ رواج کے مطابق بیٹے کی شادی پہ بہنیں دولہا کی ماں کو ایسا دوپٹہ تحفہ میں دیتی تھیں۔ دونوں بہنیں بے اختیار لپٹ گئیں، گلے مل رہی تھیں۔ اتنی بڑی خوشی کے موقع پہ خوشیوں کی برسات میں آنسوؤں کی جھڑی لگ گئی۔ ہزار ضبط کے باوجود بھی وہ دونوں رو رہی تھیں۔ ظفر نیازی کی نمناک آنکھیں بھاوج کے آس پاس، دُور و نزدیک، بھٹک کر رہ گئیں۔ بڑے بھائی کی کمی، عدم موجودگی۔ ایک اتنا بڑا خلا تھا۔ بڑے بھائی متلاشی نگاہوں کو کہیں نظر نہ آئے۔ موت کے ظالم ہاتھوں کی ڈالی جدائیاں —— ناقابلِ برداشت تھیں۔

ظفر نیازی نے برآمدے کے ستون کا سہارا لے لیا۔ کہ ان کے محبوب ترین، اتنے پیارے، چاہنے والے بھائی کا سہارا تو خدا کو پیارا ہو چکا تھا۔ بصد مشکل، ہزار کوششِ ضبط سے دل پہ پتھر رکھ کے قدم بڑھائے، بڑے بوجھل پاؤں تھے کہ اُٹھ ہی نہ رہے تھے، بیوہ بھاوج کے گلے میں کانپتے ہاتھوں سے ہار ڈال دیئے۔ سعدیہ بیگم نے دونوں بازو پھیلا دیئے، باہوں میں سمیٹ کر اپنے سینے سے لگا لیا وہ بھی لپٹے ہوئے تھے۔ وہ ان کے دیور ہی نہیں۔ خالہ زاد چھوٹے بھائی۔ چھوٹی بہن کے رشتے سے عزیز بہنوئی ان کی پیاری تقدیس کے والد، ان کے اکلوتے، چہیتے بیٹے کے سسر بھی تھے۔ بڑے بھائی تھے۔ ان سب کے۔ آپس میں بہت سے رشتے تھے۔ بہت سے رابطے تھے محبتوں کے، چاہتوں کے، ہر ہر سانس کے ساتھ طاہر نیازی کی یاد تھی، دل سے ان کے لیے پکار تھی۔ آنکھوں میں آنسو چمک رہے تھے، رخسار آنسوؤں سے بھیگے ہوئے تھے دل میں، لبوں پہ خوش آئند خوشیوں کے لیے بھرپور دعائیں تھیں۔ اس امیدوں کے چمن کے پھولنے پھلنے کی

دعائیں تھیں۔

سعدیہ بیگم بڑی بہن جو تھیں ۔

دونوں طرف سے شادی میں شمولیت کے لیے ہفتہ بھر سے ظفر نیازی کی کوٹھی کے عقبی، بڑے آراستہ، خوب پیراستہ حصّے میں مقیم تھیں۔ اس وقت بھی اس کی سجاوٹ کا وہی عالم تھا۔ جیسے ظفر نیازی کی کوٹھی کا سامنا حصّہ تھا۔ پچھلی طرف سے بھی وہی بہار تھی ۔ کہ جانِ بہار تقدیس کی آمد آمد کی تیاری تھی ۔ تقدیس دلہن بن کر شہزاد کے ساتھ یہاں آنے والی تھی ۔ دن رات اکٹھے گزرتے، شب و روز عید و شب برات کا سماں تھا۔ خوشیاں ہی خوشیاں ـــــ

تقدیس کے لیے ان کے مشورے، ان کی خواہش ۔ بلکہ شہزاد کی پسند سے ایک ایک چیز بنائی جا رہی تھی ۔ دنیا جہان کی نعمتیں جمع کر دینا چاہتی تھیں ۔ وہ تقدیس کے لیے سعدیہ بیگم ۔ عزت دار ۔ سرمایہ دار اور بڑی جی دار تھیں ۔ روپیہ پانی کی طرح بے دریغ خرچ کر رہی تھیں ۔ ساری تیاری تو تقدیس کو اپنے پاس، اپنے گھر لے جا کر اپنی اور ان کی شہزاد کی، شبانہ کی، سب کی پسند کی چیزوں کے ڈھیر لگا دیئے

تھے ۔ فوزیہ بیگم بھی ساتھ ساتھ تھیں ۔ ظفر نیازی نے خواہشات کا بھی احترام تھا ۔ کہ تقدیس ان کی بہو ہی نہیں ۔ بڑی لاڈلی بیٹی بھی تو تھیں ۔ اس وقت ــــــ زمانے کے رواج کے مطابق تقدیس کی ساس ۔ دولہا کی امّی کی حیثیت سے شہزاد کی دلہن کے لیے مہندی لے کر آئی تھیں ۔ کتنی رونق ۔ کتنی چہل پہل تھی ۔ سارے ارمان ۔ سارے شوق پورے کرنا چاہتی تھیں ۔ شوخ رنگوں کے غرارے ۔ میکسی ، گوٹہ کناری والے کپڑے پہنے ننھی مُنّی بچیاں ، پھولوں کی نازک پتیاں باراتیوں پہ دونوں ہاتھوں سے برسا رہی تھیں ۔ گیت گا رہی تھیں ۔ ان کے سامنے بڑے بڑے ٹوکروں میں پھولوں کی پتیوں کے ڈھیر لگے ہوئے تھے ۔

ننھی ننھی پریاں محوِ رقص تھیں ۔ ان کے پائلوں کی جھنکار سے ، گلنار چہروں کی مہکار سے ، قلب و روح کے گلزار سرشار تھے ۔ رنگ و نور کی برسات میں ــــ خوشیوں کی ۔ مسرت و شادمانی کی ــــ انبساط کی بارش ہو رہی تھی ۔

مہندی رات کے کھانے کے لیے شہر کے عالیشان ہوٹل

میں بڑا زبردست انتظام تھا۔ یہ اہتمام ظفر نیازی کی طرف سے تھا۔ بارات کے استقبال اور مہندی لگانے کی رسم ادا کرنے کے بعد سب نے موٹروں میں بھر بھر کر ہوٹل چلے جانا تھا۔ اور کھانے کے بعد پھر گھر واپس آکر، خوشی منانے کا لڑکیوں کا بہت وسیع پروگرام تھا۔ رت جگا منا رہی تھیں آج کی رات ـــ سعدیہ بیگم کے استقبال کے بعد اب ظفر نیازی، فوزیہ بیگم، سعدیہ بیگم کو اپنے درمیان میں ساتھ لیے ـــ سب مہمان بھی ـــ شہزاد کے استقبال کے لیے آگے بڑھے ـــ اس کو اپنے ہاتھ سے گھوڑے سے اتارنے کے لئے ـــ اپنے ساتھ ساتھ لانے کے لئے۔ شبانہ بڑے ناز سے اسی طرح گھوڑے کی باگ تھامے سب کی منتظر تھی۔

گھوڑوں کی ٹاپوں کی آواز پر سب نے پلٹ کر دیکھا۔ نگاہوں میں سوال تھا ـــ کیا ہوا ـــ ؟" جھگڑا ہو گیا ـــ سرکار ـــ کئی آدمی مارے گئے ـــ اور فصلوں کو آگ لگا دی دشمنوں نے "۔ شہزاد کی بہت بڑی آبائی جاگیر کے نگرانِ اعلیٰ معمر آدمی نے اپنا سُرخ رنگ کا صحت مند

گھوڑا قریب لاتے ہوئے شہزاد سے کہا۔ سانس پھول رہا تھا۔ رنگ فق اور خوف سے تھر تھر کانپ رہا تھا۔ بات نہیں ہو رہی تھی اس سے۔ بڑی مشکل سے کہہ رہا تھا آٹھ گھوڑ سوار اور بھی اس کے ساتھ تھے۔ سب کے گلے میں کارتوس کی پیٹیاں اور کندھوں پہ بندوق تھی۔

"چلو جلدی" ــــــــــ شہزاد نے چہرے پہ سے سہرا اٹھا کر سر کے گرد لپیٹ لیا۔ گھوڑا موڑا ــ اور باقی گھوڑ سوار بھی مڑ گئے۔ شہزاد کے لیے راستہ بنایا ــ اور سب روانہ ہو گئے ــ مہندی رنگ کے لباس پہنے۔ مہندی کے تھال میں جلتی موم بتیاں لیے۔ گاتی، گنگناتی لڑکیاں سہم کر حیران و پریشان ایک طرف سمٹ گئیں۔ تھال ہاتھوں سے گر گئے۔ مہندی گر گئی۔ موم بتیاں بجھ گئیں۔

"بھائی جان ــــ بھائی جان ــــ مت جائیے میرے بھائی جان ــ"

شہزاد نے جھک کر شبانہ کے سر پہ ہاتھ پھیرتے ہوئے بڑے پیار سے۔ بڑی نرمی سے۔ آہستہ سے اس کے

ہاتھوں سے گھوڑے کی لگام چھڑانا چاہی۔ اس نے دونوں ہاتھوں کی گرفت مضبوط کر دی۔

"نہیں ـــــ نہیں ـ" وہ بے اختیار رونے لگی۔ چیخیں مار رہی تھی۔ "بھائی جان ـــــ ہائے میرے پیارے بھائی جان۔ نہ جائیے ـ ہائے ـ ہمیں نہیں چاہیئے۔ ایسی جاگیرداری۔ ایسی دولت ـ" وہ تیز رفتار گھوڑے کے پیچھے بھاگ رہی تھی۔ چلا رہی تھی ـ اپنے ہی بڑے جھول کے غرارے میں اُلجھ کر گر پڑی ـ بے ہوش ہو گئی ـ سب اس کو اٹھانے کے لیے دوڑے ـ سعدیہ بیگم اور فوزیہ بیگم ـــــ حیران و پریشان ایک دوسرے کو پکڑے کھڑی رہ گئیں ـ اتنی جلدی معاملہ سمجھ ہی نہ آیا ـ ظفر نیازی دور تک شہزاد کو آوازیں دیتے رہے ـ لیکن اتنے بہت سے گھوڑوں کے قدموں کے شور میں ہوا کے گھوڑے پہ سوار شہزاد، گھوڑا دوڑاتے باقی سب سواروں سے آگے نکل گئے ـ ان کا سبز زرتار دوپٹہ پھولوں کے سہرے کی لڑیاں، پیچھے سے ہوا میں لہراتی نظر آ رہی تھیں ـ

شبانہ گری ـــ تو ـــ بے ہوش ہوگئی ـــ سب کے ہوش اڑ گئے - پُرجوش خوشیوں کی بھرپور بہار پہ پریشانیوں کی اوس پڑ گئی - پل بھر میں ہرا بھرا گلشن اُجڑ گیا - پھول بکھر گئے - کلیاں مرجھا گئیں -

ظفر نیازی سوچتے رہ گئے کہ شہزاد لمحہ بھر کو رکتے - سوچ کر غور سے فیصلہ کیا جاتا - بڑے سے بڑا آدمی - ہر شعبے کے افسران - وزراء سب یہاں موجود تھے - باہمی مشورہ کیا جاتا - صورت حال کے مطابق قدم اٹھایا جاتا - پولیس کی بھاری جمعیت ساتھ لے لی جاتی - دشمن سے مناسب طریقے سے نمٹا جاتا ـــ لیکن ـــ شہزاد ـــ جوان خون ایک دم جوش میں آگیا - سرپٹ گھوڑا بھگاتے آنکھوں سے اوجھل ہو گئے ـــ نہ وقت دیکھا ـــ نہ ـــ وقت کی نزاکت دیکھی ـــ

"اوہ ـــ مینجر صاحب ! آپ دو منٹ یہاں ٹھہریئے مَیں ابھی آیا!" کافی دور آئے تو شہزاد نے گھوڑا روک کر رخ موڑتے ہوئے کہا ـــ کیوں کہ عجلت میں وہ نہتے ہی آ گئے تھے - بندوق لانا بھول گئے تھے - واپس سرپٹ

گھوڑا دوڑاتے ۔ اپنی رہائش گاہ میں پچھلے گیٹ سے داخل ہوئے ۔ برآمدے کے قریب گھوڑے سے چھلانگ لگائی اور برآمدے کے ستون سے گھوڑا باندھ کر بھاگتے ہوئے اندر گئے ۔ کارتوس کی پیٹی گلے میں ڈالتے ، بندوق پکڑے اسی تیزی سے کمرے سے نکلے ۔ وسیع برآمدہ پار کر کے ۔ آڑی پیٹی گلے میں ڈالے بندوق کندھے پہ لگائے ، گھوڑا کھولنے کے لیے برآمدے کے ستون کے قریب جھکے ۔ اُچھل کر چڑھنے کے لیے برآمدے کی سیڑھی کے سامنے گھوڑا کھڑا کیا ۔ نگاہ گھما کر ادھر ادھر دیکھا ۔ چہرہ اُوپر اُٹھایا ۔ چودھویں کا چاند مسکرا رہا تھا ۔ ٹھنڈی جانفزا چاندنی چارسو پھیلی تھی ۔ خوشگوار ہوا چل رہی تھی ۔ برآمدے سے لے کر گیٹ تک جاتی سڑک کے دونوں جانب پھولوں والے سفید گملے قطاروں میں رکھے تھے ۔ گملوں کے پیچھے سڑک کے ساتھ ساتھ سرسبز سرو کے درخت خاموش، خاموش ۔ اُجلی ، اُجلی چاندنی میں اُداس اُداس نظر آرہے تھے اور سرو قد تقدیس سرو کے درخت کے ساتھ مالیوں کے زرد لباس میں بہار

کے کسی اُداس لمحے کی طرح اُداس کھڑی تھی ۔ مسلا مسلا لباس بے ترتیب ، الجھے ، بکھرے بال ، دوپٹے کی قید سے آزاد ہونے کے لیے ہوا میں مچل رہے تھے ۔ دوپٹہ بھی کچھ سر پہ تھا ۔ باقی بے خیالی میں زمین پر پڑا تھا ۔ زرد کپڑوں نے اُداس چہرے کی رنگت اور بھی زرد کر دی تھی ۔ ہر وقت مسکراتی ، چمکتی آنکھوں میں خاموش اُداسیاں آنسوؤں میں تیرتی اُداسیاں ۔ مسکراتے لب ایک دوسرے میں پیوست دیکھ کر شہزاد رُک گئے ۔ ہاتھ وہیں رُک گئے سب کچھ بھول گئے —— ذمہ داریاں —— فرض بزرگوں کی روحوں سے کیے گئے وعدے —— کچھ بھی یاد نہ رہا —— ایک دم —— سوگوار —— ان کی محبت —— ان کا پیار —— سوگوار تقدیس کھڑی تھی —— ان کے پاؤں کی زنجیر بن گئی —— تقدیس —— جیسے نقاش فطرت نے —— فنکارِ قدرت نے —— چنبیلی کی ڈھیر ساری —— بے شمار کلیوں کو اس طریقے سے اکٹھا کیا تھا —— اس سلیقے سے سجایا تھا کہ کومل سی تقدیس کا نازک سرو قد سراپا وجود میں آگیا ۔ کچھ دیر کھڑے قدرت

کی اس تخلیق کو دیکھتے رہے ۔ سوچتے رہے ۔ سجی سنوری ہنستی مسکراتی، بجلیاں گراتی تقدیس اگر حسین تھی تو اس کا حُسنِ سوگوار —— یہ خاموشیاں —— یہ اُداسیاں —— یہ روپ بھی بڑا ہی دلنشیں تھا ۔ انہیں سوچوں میں ڈوبے آہستہ آہستہ گھوڑے کی لگام پکڑے قریب آئے ۔ قربت میں تقدیس کے بدن سے اُٹھتی ابٹن میں چنبیلی کے پھولوں کی خوشبو سے تو گمان پہ حقیقت کا گمان ہونے لگا ۔ کہ تقدیس سچ مچ ہی تو چنبیلی کی کلی لگ رہی تھی ۔ مرجھایا مرجھایا پھول ۔ بن کھلی کلی —— شہزاد کا دل مچلا —— دماغ نے بغاوت کی —— سوچوں نے رخ بدلا ۔

”تقدیس کو اُٹھا کر اپنے سامنے گھوڑے پہ بٹھالیں — اور — دُور — بہت — دُور —— دنیا کی نظروں سے بچالیں —— جہاں پریشانیاں نہ ہوں —— دشمنیاں نہ ہوں —— چین ہی چین —— سکون ہو —— اطمینان ہو — جہاں شہزاد ہوں —— ان کا پیار ہو —— ان کی تقدیس ہو —— سرسبز وادیوں میں —— برف پوش پہاڑوں پہ —— گلرنگ نظاروں کی جنت میں چلے

جائیں ــــ تقدیس کے ساتھ ـــــــــ

"دلہن حضور! مابدولت بہت جلد حاضر ہو جائیں گے۔ انتظار کیجئے گا ـــــ ہمارا ـــــ انتظار"

شہزاد انتہائی پریشانی میں بھی بڑی کوشش سے مسکرائے تقدیس کے شانے پہ ہاتھ رکھتے ہوئے بولے۔ ٹھنڈے ٹھنڈے یخ بستہ ہاتھوں کو، نرم ملائم ہاتھوں کو اپنے گرم ہاتھ میں لے لیا۔ وہ بے حس و حرکت کھڑی رہی۔ رو رو کر سوجی ہوئی سرخ آنکھیں ـــــ شہزاد کو وہ دن یاد آگیا۔ جب تقدیس زرد ساڑھی میں اداس اداس، بے خواب سی، آنکھوں میں گلابی ڈورے۔ کتنی پیاری لگ رہی تھی۔ ان کو اتنی پیاری لگی تھی۔ کہ ان کی ہی نظر لگ گئی تھی ـــــ آج پھر تقدیس نے زرد کپڑے پہنے تھے۔ روپ کا انداز ہی کچھ اور تھا ـــــ لیکن پریشانی آگئی تھی ـــــ اس دن تقدیس کا حادثہ ہو گیا تھا۔ آج رنگ میں بھنگ ہو گیا۔ دھوم دھام سے آتی بارات رک گئی۔ خوشیوں کی بساط الٹ گئی۔ انہوں نے ذہن میں واقعات کو دہراتے ہوئے کہا۔

"آئندہ زرد کپڑے نہ پہننا ـــــــ میری دوست!" شہزاد جھکے۔ غم و غصّہ سے۔ پریشانی کی وجہ سے جلتی، تپتی، سُرخ سُرخ، گرم گرم آنکھوں سے ٹھنڈے ہاتھوں کو لگا لیا۔ گالوں سے لگا رہے تھے۔ ہونٹوں سے لگا لیا۔ تقدیس کے نرم و ملائم ہاتھوں کو۔

حسین شہزاد سنہری شیروانی۔ سفید پاجامہ اور چمک دار سلیم شاہی جوتا پہنے تھے۔ پھولوں کی لڑیوں سے سر کے گرد لپٹا سبز زرتار دوپٹہ پشت اور چوڑے شانوں پہ پھیلا تھا ـــــــ گلے میں ڈھیروں تازہ موتیا گلاب کے کرن کناری کے ہار پہنے۔ سفید سجے سجائے گھوڑے کی باگ ہاتھ میں پکڑے، دوسرے سے تقدیس کے ہاتھوں کو جھک کر آنکھوں سے لگاتے شہزاد جھکے ہوئے تھے۔ جیسے باز بہادر ـــــ روپ متی کے حضور عقیدت کا نذرانہ پیش کر رہا ہو۔

تقدیس کی دراز پلکیں اُٹھیں۔ دو ستارے ٹوٹے۔ اور شہزاد کے ہاتھوں پہ گرے۔ جیسے بجلی کوند گئی۔ جیسے برق دوڑ گئی شہزاد کے بدن میں۔ وہ بے تاب ہو گئے۔ بیقرار

تڑپ ہی تو گئے ۔ ان کی تقدیس کے آنسو ۔ جس کی ہر گھڑی مسکراتی ، بجلیاں گراتی آنکھوں کو چوم زندگی بھر ، مر مر کے جینے کے دعوے کیا کرتے تھے ۔ ہمیشہ ساتھ رہنے کے ساتھ جینے کے وعدے کئے تھے ۔ آج وہ تقدیس رو رہی تھی ۔ جس کے ناخن میں درد ہو تو شہزاد کے دل پہ چوٹ لگتی تھی ۔ وہ تقدیس کی ذرا سی تکلیف پہ اس کے پاؤں کے نیچے آنکھیں بچھاتے تھے ۔ تقدیس کے پاؤں میں چوٹ آئی تھی اور شہزاد اس کو سر آنکھوں پر لیے رکھتے تھے ۔ دل و جان سے قربان تھے ۔ آج اس وقت تقدیس کی آنکھوں میں آنسو ــــــــــــــ؟

ساری زمہ دلرباں ــ بزرگوں کے ساتھ وعدے ۔ زمانے میں دعویداریاں ۔ موقع کی نزاکت ۔ اس وقت کی پریشانی سب بھول گئے ۔ پریشانی تھی تو صرف ایک کہ ان کی تقدیس پریشان تھی ۔ ہوش و حواس قابو میں نہ رہے ۔

بھڑکتے جذبات سے بے قابو ہو گئے ۔ شہزاد نے تقدیس کو ، اپنی متاعِ عزیز کو سینے سے لگا لیا ۔ ٹھنڈا ، بے جان ، نازک سا وجود ، شہزاد کے کشادہ سینے پہ تڑپتے ہوئے

اس کی وسعتوں میں جذب ہو جاتے کو بے قرار ۔ ان کی
محبت ۔ ان کی چاہت ۔ ان کی حیات ۔ ان کی کائنات ۔ پیاری
پیاری بے زبان، بے جان تقدیس، دل میں ہزاروں جان لیوا
توہمات کے طوفان لیے ۔ قریب ترین قربتوں کے سینکڑوں
ارمان لیے، جدائیوں کے خوف سے، بچھڑنے کے لمحے میں
تڑپ رہی تھی ۔ سسک رہی تھی ۔ ان کی گردن کے گرد اپنی
گوری گوری باہیں لپٹائے اتنی زور سے چمٹی تھی کہ شہزاد کی
مضبوط گرفت بھی اس کے مقابلے میں ڈھیلی تھی ۔ اس کو اصل
صورت حال کا علم ہو گیا تھا ۔ وہ اوپر کی منزل میں اپنے
کمرے کی کھڑکی میں سے بارات آنے کا نظارہ دیکھ رہی تھی
بعد کے واقعات دیکھے ۔ ہجوم میں سے کسی نے جا کر
اس افراتفری کی وجہ بھی بتا دی ۔ دل سخت گھبرایا ۔ دم گھٹنے
لگا ۔ سانس رکنے لگا تو ادھر کھلی فضا میں آگئی تھی ۔ گھبرائی
تو تنہائی میں نکل آئی ۔

شہزاد بڑی دیر اپنے پیار کی دولت کو باہوں میں سمیٹے،
بڑے قیمتی خزانے کی طرح سینے سے لگائے کھڑے رہے ۔ دنیا
و مافیا سے بے خبر ۔ نگاہ اٹھا کر دیکھا تو چاروں طرف ۔ سرسبز

درختوں پہ - وسیع لان میں روشوں پہ - کیاریوں، گملوں میں لگے رنگ برنگ پھولوں پہ چاندنی پھیلی تھی - ہلکی ہلکی خوشگوار ہوا تقدیس کی بیقراریوں پہ نثار ہو ہو کر اس کے کانوں میں سرگوشیاں کر رہی تھیں -

ے پھولوں سے لپٹی ہے مگر کتنی حیا سے
یہ چاندنی شائد تیرے آنچل سے چھنی ہے

کہ تقدیس بھی تو سر پہ آنچل اوڑھے، چاند سے زیادہ حسین، چاندنی سے زیادہ اُجلے شہزاد کی باہوں میں ان سے لپٹی تھی - پھولوں کی طرح نرم و نازک تقدیس - شہزاد نے تقدیس کی بند پلکوں پہ لرزتے ستاروں کو چوم لیا ——— اپنی پلکوں پہ اپنی آنکھوں پہ ہاتھ رکھ لیے - ہونٹوں کو دانتوں میں دبا لیا — سوچوں کو ذہن سے جھٹک دیا — ارمانوں کو دل میں دبا لیا — تمام باغی جذبوں کا سر کچل دیا ——— اور خود سر بلند کر لیا -

جذبات محبت و عقیدت - پیار کے ارمان و سب پیمان باپ دادا کی عزت و غیرت - ان کی سونپی ہوئی ذمہ داریوں فرائض پہ - اپنی خاندانی روایات پہ - اپنے بزرگوں کے

مقدس لہو کے صدقے میں ـــــ اپنی عزت پہ ـــــ
پٹھان خاندان کی آن پہ قربان ہو گئے ـــــ اپنی اور
تقدیس کی تمام تر وقتی کمزوریوں پر قابو پا لیا ـــــ بڑی
مردانگی سے بڑی ہمت سے جرأت کر کے وہاں سے
چل دیئے ـــــ تقدیس کو الوداع کہتے ہوئے ـــــ آنے کا
وعدہ کرتے ہوئے ـــــ انتظار کرنے کا وعدہ لیتے ہوئے
شہزادہ تیز رفتار گھوڑا بھگاتے، اپنے منتظر ساتھیوں سے
جا ملے اور پھر ان سے آگے نکل گئے۔ اور ـ تقدیس
بے سہارا تقدیس ـــــ وہیں درخت کا سہارا لیے کھڑی
رہ گئی ـــــ تن تنہا ـــــ سپردِ خدا ـــــ

مہمان خواتین بہت بڑے ہال نما ڈرائنگ روم میں دبیز
قالین پہ بیٹھی تھیں ـ سر جھکائے ـ سروں پہ دوپٹے
اوڑھے ـ مرد بھی خاموش تھے ـ آنکھوں میں آنسو اور
ہونٹوں پہ آہیں تھیں ـ اتنی نفاست سے سجایا ہوا ڈرائنگ
روم، بڑی محنت سے بڑی کاوش سے بڑے ذوق سے
آراستہ و پیراستہ ڈرائنگ روم ـ جس میں سینکڑوں خوبصورت
اشیاء سجاوٹ کا قیمتی سامان، ہر چیز اپنی اپنی جگہ تھی۔ سجی

ہوئی تھی، وہی کل والے قرینے تھے۔ لیکن کسی چیز میں وہ کشش باقی نہ تھا۔ پھولدار بوجھل ریشمی پردے گرے تھے۔ اور کمرے میں بڑی سوگوار، پورے ماحول پہ بوجھل خاموشی چھائی تھی۔ شوخ و شنگ شبانہ کی اٹھلاتی نغمے گاتی، چنچل سہیلیاں ساکت و صامد بیٹھی تھیں۔ دلوں کا غم آنکھوں کی راہ خون کے آنسو بن کر ٹپک رہا تھا جیسے خوشی کے لمحات میں بے پناہ خوشی تھی۔ اب غم کے مارے ان کا بُرا حال تھا۔ بے پناہ غم و اندوہ کے بوجھ تلے سب کچھ دب گیا تھا۔

"ہائے ــــ بھائی جان! میرے بھائی جان ــ میں کیا کروں ــ کہاں جاؤں ــــ؟" شبانہ کی دلدوز چیخیں دلوں کو چیر رہی تھیں۔ بے قراری آہ زاری، برقانی خاموشیوں کو توڑتی، چیرتی آسمان تک جا رہی تھی ــــ اُف ــــ یہ فلک شگاف چیخیں تھیں کہ خدا کی پناہ۔ وہ ابھی تک اسی مہندی رنگ کے غرارہ سوٹ میں تھی ــ اتنا خوبصورت، بڑا قیمتی، اتنے شوق سے ارمانوں سے بھائی کی شادی کے لیے بنایا دوپٹہ میلا، مسلا قالین پہ بکھرا پڑا تھا۔ شبانہ کی

چاہتوں کا محبتوں کا خزانہ لٹ گیا تھا۔ عین فصلِ بہار میں خوشیوں کی بہار میں جب مسرتوں پہ شباب تھا، سد، خوشیاں، مسکراہٹیں، قہقہے، گیت، نغمے، حسرتوں میں بدل گئے۔ مسرتوں کو مایوسیوں، ناامیدیوں اور نامرادیوں نے گھیر لیا تھا۔ شبانہ۔ اکلوتے۔ اتنا چاہنے والے۔ چہیتے بھائی کی وفات پر۔ شہزاد کی موت کی خبر سُن کر بے تحاشہ رو رہی تھی۔ ماہیِ بے آب کی طرح تڑپ رہی تھی۔ چیخ رہی تھی۔ چلا رہی تھی۔ اپنے بھائی کو بلا رہی تھی۔ چچا کے سینے سے لگی زاروقطار رو رہی تھی بے قرار ہو رہی تھی۔ اس کو کچھ سوجھ نہیں رہا تھا۔ اس کو کچھ نظر نہیں آرہا تھا۔ وہ بھائی کو ڈھونڈتی۔ پکارتی تھی۔ خدا سے فریاد کرتی تو سارا کمرہ ہچکیوں اور سسکیوں سے گونجنے لگتا۔ اس کی بے قراری۔ آہ زاری دیکھی نہ جاتی تھی۔ محفل میں ہر آنکھ اشکبار تھی۔ ہر دل بے قرار تھا۔ سب ہی تڑپ رہے تھے۔

تازہ موتیا اور گلاب۔ تروتازہ پھولوں کے ہاروں سے کل بہاروں پہ بہار تھی۔ وہ آج مرجھا کر، ہاروں سے

ٹوٹ کر مرجھا کر تمام کمرے میں بکھرے پڑے تھے ۔ اور اداسیوں، ویرانیوں کی، سوگوار خزاؤں کی داستان سنا رہے تھے ۔ موتیا اور گلاب کی مرجھائی ہوئی پتیاں، ادھ کھلی کلیاں ٹوٹی ہوئی ڈنڈیاں ۔ مسلی، کچلی مرجھاتی ہوئی ادھ کھلی کلیاں وہ کلیاں —— آرزوؤں اور امیدوں کی ان گنت، انمول کلیاں، جو سعدیہ بیگم نے اپنے جوان بیٹے کے سہرے کے لیے ۲۵ برس میں چن چن کر مالائیں بنائیں تھیں ۔ ان ارمانوں کی ۔ حسین سپنوں کی مالاؤں سے کلیوں —— سے پھولوں سے اپنے بیٹے کے لیے سہرا سجایا تھا ۔ وہ مالائیں ٹوٹ گئیں ۔ بکھر گئیں ۔ کلیاں مرجھا گئیں ۔ کمھلا گئیں —— اور —— تقدیس ۔ انہیں ارمانوں، آرزوؤں امیدوں کی کلی ۔ مسلی، کچلی، مرجھائی زرد کلی کی طرح نیم جان پڑی تھی ۔ سعدیہ بیگم کی شفیق آغوش میں منہ چھپائے سسک رہی تھی ۔ مایوں کا زرد لباس ابھی زیب تن تھا ۔ سسکیوں سے نازک بدن، کومل وجود خزاں رسیدہ زرد پتے کی طرح لرز رہا تھا ۔ سعدیہ بیگم تقدیس کے اُلجھے اُلجھے بالوں پہ اپنے کانپتے ہاتھ آہستہ آہستہ

پھر سنتے ہوئے رہ رہ کر اپنی پرنم آنکھوں کو خشک کرتیں خشک لبوں پہ بار بار زبان پھیرتیں ۔ لب ہل رہے تھے دعائیں پڑھ رہی تھیں ۔ درود شریف پڑھ رہی تھیں ۔ چاروں قُل پڑھ رہی تھیں ۔ خدا کے ناموں کا ورد کر رہی تھیں ۔ قریب ہی فوزیہ بیگم دیوار کے سہارے سے بیٹھی دونوں ہاتھوں میں سر پکڑے ۔ قیمتی موتی، تارے آنکھوں سے بے دریغ گر رہے تھے ۔ رخساروں پہ بہہ رہے ، دامن میں جا رہے تھے ۔ ہونٹوں میں ہونٹ دبا ، دبا کر ضبط کرنے کی کوشش میں تھیں۔ لیکن ہزار ضبط کے باوجود سسکی نکل جاتی ــــ ضبط کیسا ــــ ؟ صبر کیسا ــــ ؟ جوان بیٹے ۔ عزیز بھانجے ، شرارتی دوست ، چھوٹے بھائی ، ہونے والے داماد ۔ اتنے پیارے شہزاد کی موت پہ کس طرح ؟ کس کو ؟ صبر آسکتا تھا ۔ دل ڈوبتا جا رہا تھا ۔ آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا رہا تھا ۔

ظفر نیازی بے ہوش شبانہ کا سر گود میں رکھے صوفے پہ بیٹھ گئے ۔ تھوڑی دیر کے بعد غشی طاری ہو

جاتی - ہوش میں آتی تو تڑپ تڑپ کر، بلک کر روتی — مچل مچل کر ہاتھوں سے نکلی جاتی تھی - ظفر نیازی کی تو کمر ہی دوہری ہوگئی تھی - خوب صحت مند، جوان و رعنا ایکدم بوڑھے نظر آنے لگے تھے - شہزاد ان کے بیٹے ان کے بھتیجے — چھوٹے بھائی - داماد تھے - بڑے بھائی کی نرینہ اولاد - واحد اولاد - اکلوتا بیٹا - باپ دادا اور خود ان کے بعد خاندان کا واحد نام لیوا - پورے خاندان کے چشم و چراغ - جس سے آئندہ ان کے خاندان کی شان کا چراغ روشن ہونا تھا - شہزاد کے والد، دادا سب چراغوں کی روشنی، پرانی خاندانی دشمنیوں نے ہی گل کی تھی - پٹھان خاندانوں کی پشتوں سے چلتی دشمنیوں کا نشانہ اب ایسا پھول تھا - جو اچانک، الجھانے میں ڈالی سے ٹوٹ گیا تھا - گر گیا تھا - سرسبز ڈالی پہ یہ بہاروں میں جھومتا - تروتازہ ہنستا مسکراتا پھول - گلچینِ اجل کی نادانی سے ٹوٹ گیا - عین جوانی میں، پُربہار گلزار، پُرشباب گلشنِ مسرت ویران ہوگیا تھا - شہزاد کی اتنی دھوم دھام سے شادی کی خبر سُن کر دشمن حسد کی آگ میں جل اُٹھے

ان میں بے چینی پھیل گئی ۔ انہوں نے گاؤں پر حملہ کر دیا
کئی آدمی مارے گئے ۔ کئی زخمی ہوئے ۔ غریب کسانوں
کی مزارعوں کی جوان بیٹیاں اٹھا کر لے گئے ۔ بچوں، بوڑھوں
کو اذیتیں دیں ۔ عورتوں کی بے حرمتی کی ۔ پکی فصلوں کو
کھیتوں کو، کھلیانوں کو آگ لگا دی ۔ اور اب شہزاد خان کی
آبائی کوٹھی کی طرف بڑھ رہے تھے ۔ ان کا خیال تھا کہ شادی وہاں
پر ہو رہی ہے ۔ وہ اس گھر کو گھر والوں کو آگ لگانا چاہتے تھے۔
مار ڈالنا چاہتے تھے ۔ گاؤں میں لگی آگ کے شعلے شہزاد اور
اس کے خوش باش گھرانے کی خوشیوں کے سجے سجائے پنڈال
کو اپنی لپیٹ میں لے گئے ۔ ہر چیز جل کر خاک ہو گئی ۔ راکھ
ہو گئی ۔ کچھ نہ بچا۔ کچھ نہ رہا ۔ کہ دل جل رہے تھے ۔ کہ
شہزاد چلے گئے تھے ۔ فوراً گھوڑا بھگا دیا ۔ وہ یہ سب کچھ
سن کر کیسے رہ سکتے تھے ۔ ایک باغیرت انسان، خوددار پٹھان
کہ گاؤں کی عورتیں ان کی بہن بیٹیاں تھیں ۔ بزرگ ان کے
بزرگوں کی جگہ اور گاؤں کے بچے انہیں بہت عزیز تھے ۔
اپنے سے بھی عزیز، اپنی خوشیوں سے اپنی جان سے بھی
زیادہ عزیز تھے ۔ ان کے گاؤں میں ۔ لوگوں کے گھروں

میں ماتم پڑا ہو - وہ سب پریشان ہوں اور شہزاد اپنی
سہاگ رات منائیں - یہ کیسے ہو سکتا تھا - دوسروں کے
لیے انہوں نے سب کچھ چھوڑ دیا - قربانی دے دی -
قربان ہو گئے - اپنے گاؤں والوں کی جان و عزّت کے
لیے — اپنے خاندان کی آن کے لیے - ان کے نزدیک
زندگی کا مقصد اس شمع کی طرح تھا - جو خود تو آگ کے شعلوں
میں جلتی، پگھلتی ہے لیکن دوسروں کو روشنی پہونچاتی ہے۔
خود دکھ اٹھاتی ہے تکلیف سہتی ہے لیکن سب کے گھروں
میں اجالے بکھر جاتے ہیں - وہ کہا کرتے تھے -

؎ شمع کی طرح جیئں، بزم گہ عالم میں
خود جلیں، دیدۂ اغیار کو بینا کر دیں

شہزاد کی اس قربانی، وفات ناگہانی پہ شبانہ دیوانی ہو
رہی تھی - تقدیس نیم جان پڑی، امی، خالہ اور ظفر نیازی سے
سب ہی پریشان تھے ملنے جلنے والے بہت افسردہ تھے
غم زدہ تھے - شبانہ کی دوست شمع اس وقت سے رو
رہی تھی - اس خوشیوں بھرے گھر کی ویرانی پہ اس کے
آنسو روانی سے بہہ رہے تھے - شمع کی آنکھوں سے

ٹپ ٹپ آنسو گر رہے تھے اور وہ سرخ سرخ سلگتی آنکھیں لیے سارے کمرے میں اگر بتیاں سلگاتی پھر رہی تھی ۔ فرح بھابی کی آنکھیں رونے سے سوج گئیں تھیں ۔ ہر وقت چہکتی فرح بھابی گم سُم سی بیٹھی تھیں ۔ اپنا سُرخ کامدار ، سنہری زرتار جال جال والا دوپٹہ پکڑے سوچوں میں ڈوبی تھیں ۔ یہ دوپٹہ تقدیس کو مہندی کی رسم پر لانے کے لیے وہ لیکر آئی تھیں ۔ کہ گوٹہ ، ٹھپہ لگا سرخ دوپٹہ جب وہ تقدیس پر ڈالیں گی تو کیسے نرم ڈال کی طرح وہ جھک جائے گی ، شرمائے گی ــــــــ وہ دوپٹے کو ہاتھوں میں مسل رہی تھیں ۔ گود میں رکھے دوپٹے پر آہستہ آہستہ ہاتھ پھیرتی آنسو بہا رہی تھیں ــــ نہ جانے کیوں خوشیاں آتے آتے ہمارے مقدر سے پلٹ گئیں ۔ وہ لمحات یاد آرہے تھے جب بارات میں آنے سے پہلے وہ سب تقدیس کے مایوں والے کمرے میں ہنسی خوشی گانے گاتی ، قہقہے لگاتی ، شور مچاتی تھیں ۔ بڑی رونق لگی تھی ــــ اور مہندی لگانے کے بعد تو بڑا زبردست پروگرام تھا ۔ رت جگا ہوتا تھا ۔ سب نے تقدیس کے

کمرے میں اودھم مچاتا تھا۔ شہزاد کے ساتھ مل کر شوخیوں میں شرارتوں میں وقت گزارتا تھا۔ سب نے تقدیس کو چھیڑنا، ستانا اور اس نے چھپ چھپ کے مسکرانا اور مسکرا کر شرمانا تھا۔ سب تقدیس کے کمرے میں بیٹھی گیت گا رہی تھیں ۔ اور شہزاد کھڑکیوں سے دروازوں سے جھانکتے ۔ تقدیس کو اشارے کرتے، بلاتے ۔ سب لڑکیاں پکڑ کر ان کو باہر نکال دیتیں ۔ کہ وہ داؤ لگا کر شرارتی انداز میں اندر آجاتے ———— وہ کل کے واقعات یاد کر کے روئے جا رہی تھیں ۔ آنسوؤں کی جھڑی لگی تھی ۔ اتنی بہت سی خوشیوں کی امیدیں لگانے کے بعد خالی ہاتھ بیٹھی تھیں ۔ بار بار ہاتھ دوپٹے پر پڑتے اور دل چاہتا کہ روتی سسکتی تقدیس پہ ڈوپٹہ ڈال دیں ۔ وہ شرمائے، ہنسے، مسکرائے اور ایسے میں شہزاد آجائیں ۔ کہیں سے ———— ہنستے مسکراتے شرارتی شہزاد کے چلے جانے سے ۔ سب حواس باختہ تھے ۔ کسی کو بھی اپنا اپنا ہوش نہ رہا تھا، سوچ سمجھ کی ساری صلاحیتیں ختم ہو گئی تھیں ۔ دل و دماغ بلکہ تمام وجود ہی

جیسے مفلوج ہو گئے تھے ۔ جو جہاں کھڑا تھا ، وہیں کھڑا رہ گیا ۔ جس کو جہاں جگہ ملی وہیں بیٹھ گیا ۔ عجیب سا ماحول تھا ۔ سب کا بُرا ہی حال تھا ۔ کافی دیر کے بعد جب ہوش و حواس کچھ بجا ہوئے تو ۔ حالات کی کچھ سمجھ آئی ۔ دماغ نے کام کرنا شروع کیا تو ـــــ ظفر نیازی کے دوست احباب نے وقت کی نزاکت کے تحت سب کچھ سنبھال لیا عقل و سمجھ کی رہنمائی میں ہمت بندھی ـــــ اور پولیس کے سب سے بڑے افسر نے سارا معاملہ اپنے ہاتھوں میں لے لیا ۔ باقی بھی سب پڑھے لکھے ، اونچے طبقے کے افسران ہی وہاں آئے ہوئے تھے ۔ ظفر نیازی کے فون کاٹ دیئے گئے تھے ۔ پاس پڑوس کے فون بھی کام نہ کر رہے تھے ۔ ڈی ۔ آئی ۔ جی کے حکم پر باوردی پولیس کی بہت بڑی تعداد ۔ جیپوں میں ، ٹرکوں میں بھر کے روانہ ہو گئی ـــ علاقہ پولیس سے بھی فون پہ رابطہ قائم ہو گیا ۔ پولیس والے اپنے افسر سے کانپ رہے تھے اور ظفر نیازی غم و اندوہ سے ۔ بُرا حال تھا ان کا ۔ وہ دوسروں کا سہارا لیے تھے ۔ اپنے دوستوں کے ساتھ

بیٹھے - ان کی گاڑی سب سے آگے آگے جا رہی تھی - شہزاد اور اُن کے ساتھیوں کے تعاقب میں - لیکن تیز رفتار گھوڑوں اور گھوڑ سواروں کا دور دور تک کہیں نام و نشان نظر نہیں آ رہا تھا - ایک تو وقت کافی گذر چکا تھا - دوسرے صدمے اور پریشانی کی وجہ سے ایک چوراہے پر آ کر راستہ کھو گیا - ظفر نیازی تو اپنے آپ کو - ساری دنیا کو بھولے ہوتے تھے تو راستہ بھولنا ایسے میں بہت ممکن تھا اور راستہ بھی وہ — جس سے وہ خود بھی اچھی طرح واقف نہ تھے — بچپن میں والد صاحب یا بڑے بھائی کے ساتھ کبھی جاگیر پہ آتے تھے - پھر حصول تعلیم کے لیے کئی سال ملک سے باہر رہے - پڑھائی کے بعد ملازمتیں بھی غیر ملکوں میں ہی کرتے رہے — اور اب بھی سرکاری مصروفیات کی وجہ سے فرصت نہ ملتی - کئی گھنٹے کی مسلسل کوشش کے بعد ناکامی ہوئی - تو پلٹ کے گھر واپس پہنچے — شہزاد کے ذاتی ڈرائیور کو ساتھ لیا کر وہ ہمیشہ شہزاد کے ساتھ جاتا تھا —— لیکن قدرت کو کچھ اور منظور تھا - جیسے تقدیر نے ساتھ چھوڑ دیا -

نہ معلوم کیا ہونے والا تھا ۔ نہ جانے کون سے گناہوں کی سزا تھی ۔ کہ چودھویں کا چاند گہرے بادلوں میں چھپ گیا ۔ چاروں طرف گھٹا ٹوپ اندھیرے چھا گئے ۔ بڑے زور کی طوفانی آندھی چلنے لگی ۔ بادل زور سے گرج رہے تھے ۔ شہزاد کا ذاتی ڈرائیور ظفر نیازی کی گاڑی چلا رہا تھا اگرچہ اپنے مالک کی پریشانی سے ۔۔۔ اس کی پریشانی کم تو نہ تھی ۔ وہ شہزاد کا بچپن کا ساتھی ، باپ دادا سے ان کا آبائی ملازم تھا ۔ میٹرک پاس کرنے کے بعد سے شہزاد کی گاڑی چلا رہا تھا ۔ ان راستوں سے خوب واقف تھا ۔ لیکن اس وقت جیسے اس کی بینائی ساتھ نہ دے رہی تھی ۔ گاڑی چلانا بھول گیا تھا ۔

بڑی بے بسی کے عالم میں جب سب لوگ گاؤں پہنچے تو ، سنسان سناٹے اور ہیبت ناک اندھیرے خوفناک منظر پیش کر رہے تھے ۔ اِدھر اُدھر خاکستری راکھ اُڑ رہی تھی ۔ کبھی کبھی کوئی چنگاری چمک اٹھتی ۔ ہوا سے اُڑتی اور کہیں اور جا کر آگ لگا دیتی ۔ بادل کی گھن گرج میں بجلی اس طرح کوندی کہ جیسے گر پڑی ۔ دل دہل کر

رہ گئے - اور بجلی کے زور دار دھماکے کے ساتھ زور دار، چمکدار روشنی میں بہت سی لاشیں، خون کے، تازہ انسانی خون کے سمندر میں تیرتی نظر آ رہی تھیں - پولیس والوں نے، ظفر نیازی کے دوستوں نے، خود ظفر نیازی نے ٹارچ ڈال ڈال کر ایک ایک چہرہ دیکھا - شہزاد کے دشمنوں کی لاشیں تھیں - ان کے گاؤں کے لوگ تھے ان کی جاگیر کے ملازمین تھے - مزارعین تھے - کسان تھے غرض بے شمار، لاتعداد لوگ مارے جا چکے تھے - یہاں کی صورت حال سے معلوم ہو رہا تھا کہ مقابلہ زبردست ہوا ہے - خونریز لڑائی ہوئی تھی - کھیت، کھلیان، دوکانیں مکان - سب جل چکے تھے - اب باوردی - مسلح پولیس نے سارے گاؤں کو گھیرے میں لے لیا - گاؤں کی سڑکوں کی ناکہ بندی کر دی - ساتھ کے دیہات کی، دشمنوں کے گھروں کی، دیہاتی مکانوں کی تلاشی لی - مکینوں سے باز پرس کی - لیکن سب بے سود - گوہر مقصود نہ ملنا تھا - نہ مل سکا - ایک جگہ لڑائی کے مقام پہ شہزاد کا سفید ذاتی گھوڑا - ہاروں، پھولوں، سہروں، مالاؤں سے لدا، سجا

سجایا گھوڑا ــــــ خون میں لت پت مُردہ پڑا تھا - ایک طرف سبز زرتار دوپٹہ، سُرخ کارچوبی چھتر میں اُلجھا، کچھ خون میں ڈوبا، کچھ ہوا میں اُڑتا نظر آیا - شہزاد کا سہرا، سہرے کی لڑیاں - موتیا اور گلاب کے پھولوں کی پتیاں لہو پہ جم کے رہ گئی تھیں - ادھر ادھر تلاش کرتے آگے بڑھے تو گھوڑے کی مخملیں زین پڑی تھی - لیکن اس شاہانہ شان کے شہسوار کی کوئی خبر نہ تھی - شہزادوں جیسے شہزاد کا کچھ اتہ پتہ نہ تھا - بارش بڑے طوفانی انداز میں برس رہی تھی - ایسے میں شہزاد کہاں نظر آتے، وہ غائب تھے - کہ یہ بادل، بارش زوردار برسات تو ان کی پسند کے موسم تھے - اور وہ ہمیشہ کی طرح غائب ــــــ جب کامیابی کی کوئی صورت نظر نہ آئی تو ــــ ظفر نیازی کی ہمت بالکل جواب دے گئی - گرتے جاتے تھے دل ڈوب رہا تھا، ہاتھ پاؤں بے حس ہوتے جاتے تھے - جیسے جسم میں جان باقی نہیں - ان کو تو اپنا سانس رکتا ہوا محسوس ہو رہا تھا - سینے میں دم گھٹ رہا تھا - جیسے دل بند ہو رہا تھا - ان کے دوست امتیاز حسین کا جواں سال بیٹا اعجاز حسین ڈاکٹری کے آخری سال میں تھا - وہ بھی سب کے ساتھ آیا تھا - ظفر نیازی

کو ہر طرح سے سہارا دے رہا تھا ۔ دوا بھی دیتا ۔ انجکشن بھی لگاتا رہا ۔ دلاسے بھی تسلیاں بھی ــــــ لیکن جب دل کی آس ہی ٹوٹ جائے ۔ امیدیں ہی ساتھ چھوڑ دیں ۔ مقدر پہ اندھیرے چھا جائیں ۔ جستجو نامراد رہے ۔ دعاؤں میں اثر نہ رہے تو دواؤں کی تاثیر کہاں ــ لفظی دلاسوں سے تسکین ۔ کب ہوتی ہے ۔ سب کچھ بے کار تھا ۔ سب کچھ بے سود تھا گھٹا ٹوپ اندھیروں نے کروٹ بدلی ۔ بارش رک گئی ۔ بادل چھٹ رہے تھے ۔ ہوا کے زور میں ۔ بادلوں کی گرج کے شور میں کچھ کمی آ گئی تھی ۔ مایوسیوں کی گھٹاؤں میں امیدوں کے روشن دیپ جل اٹھے ۔ دور سے کسی زخمی کے کراہنے کی کمزور آواز نے سب کو چونکا دیا ۔ ظفر نیازی ساری کمزوریاں بھول گئے ۔ دل مضبوط ہو گیا ایک دم ۔ سب کو چھوڑ کے تیزی سے دوڑے ۔ آواز کی سمت میں دوڑتے ہوئے قریب آئے ۔ ان کے ساتھی بھی ادھر ہی آ گئے ــ کسی زندہ شخص کی آواز تو آئی ۔ کوئی آس تو بندھی ــ کوئی کچھ تو بتائے گا ۔ کچھ پتہ تو چلے گا ۔

شہزاد کا ضعیف العمر مینجر شدید زخمی حالت میں نیم بے

ہوشی کے عالم میں بھی مالک کو پہچان گیا تھا۔ اٹھنے کی کوشش کی تو ٹانگ میں گولی کا زخم، بازو سے خون بہہ رہا تھا۔۔۔ زخموں کی تکلیف برداشت کرتے ہوئے اس نے بتایا۔ کہ شہزاد گولیوں کی بوچھاڑ میں مقابلہ کرتے بہت آگے نکل گئے۔ دشمن بھاگ کھڑا ہوا۔ میں بھی ساتھ تھا۔ میں نے ان کو گھوڑے سے گرتے دیکھا۔ پھر گھوڑا بھی ان کے اوپر آ گرا۔ دشمن شہزاد کے خون کا پیاسا تھا۔ اور یہ سارا خون خرابہ اسی لئے کروایا گیا تھا۔ میں زخمی ہو کر پڑا تھا۔ مجھے گھسیٹ کر یہاں پھینک گئے۔ اور خود میت سمیت غائب ہو گئے۔" مینجر نے بڑی مشکل سے بیان دیا اور بے ہوش ہو گیا۔ اعجاز حسین اگر ساتھ نہ ہوتے تو ظفر نیازی کب سے گر چکے ہوتے، انہوں نے ہر طرح خیال رکھا۔ بالکل ایک بیٹے کی طرح۔ اپنے باپ کی جگہ سمجھتے ہوئے۔ نوعمر تھے، جواں سال تھے، باہمت تھے، اپنے بزرگ کو، اپنے والد کے دوست کو، چچا جان کو تقدیر کے فیصلوں پہ صبر کی تلقین کرتے رہے، اور کر بھی کیا سکتے تھے، ڈاکٹر بن رہے تھے تسلیاں دینا گرتوں کو سنبھالنا خوب جانتے تھے۔ عورتیں

حالت بڑی خراب تھی - بہر حال اس وقت ڈاکٹر اعجاز کی موجودگی بڑی کارآمد، بڑی اہم اور مفید تھی -

آخر اعجاز کی ہمت سے مینجر اور دوسرے زخمیوں کو پولیس کی گاڑیوں میں ڈال کر ہسپتال بھجوادیا گیا - اسی کالج کے ہسپتال میں جہاں خود زیر تعلیم تھے - پولیس والوں نے لاشوں کو دفن کر دیا - بڑے بڑے گڑھے کھودے، سینکڑوں لاشیں تھیں - ایک گڑھے میں کئی کئی لاشیں ڈال دیں، مٹی ڈالی اور کام ختم -

ظفر نیازی بڑے دانا، دوراندیش، معاملہ فہم انسان تھے صدمے کی شدت سے اس وقت اگرچہ تمام صلاحیتیں جواب دے گئی تھیں - پھر بھی ان کی عقل و دانش بیدار تھی - موقع کی نزاکت اور وقت کی مصلحت کے تحت، مجرموں کی تلاش میں خفیہ پولیس لگا دی - مقدمہ درج ہو چکا تھا - افسران بالا کی سرپرستی کے باوجود پولیس کے عملے کے وارے نیارے تھے - دونوں طرف سے دونوں ہاتھوں سے خوب روپیہ بٹورتے، کھاتے، اڑاتے رہے اور معاملہ طویل ہوتا گیا - وقت گزرتا گیا لیکن گوہر گم گشتہ، شہزاد کی کوئی خبر نہ ملی

سکی، کوئی بھی معلوم نہ کر سکا - کوئی پتہ نہ چل سکا -

ظفر نیازی کی دنیا اُجڑ گئی تھی - کائنات لٹ گئی تھی --- حیات ہی ختم ہو گئی تھی - زندہ ہوتے ہوئے بھی مردہ ہو گئے تھے - پریشانیوں اور پشیمانیوں کے سوا کچھ بھی باقی نہ تھا - اس وقت کو روتے تھے کہ آگے بڑھ کے شہزاد کو روک لیتے، پکڑ لیتے - دشمن کی شیطانی کو، اس کو دبانے کی کوئی اور صورت نکالتے - پولیس کی مدد سے کاروائی کرتے حکومت کا، قانون کا سہارا لیتے -

ہاتھ ملتے بھی تو کچھ ہاتھ نہ آتا - ناکام و نامراد، لٹے پٹے سے گھر پہونچے - ویران و سنسان گھر میں کہرام مچ گیا - اداسی سکوت و خاموشیاں ٹوٹ گئیں - سارے جہان میں طوفان آگیا قیامت کا سماں تھا - ظفر نیازی کے گاؤں جانے سے خوشیوں کی جو آس بندھی تھی - یوں سر جھکائے واپس آئے تو یاس میں بدل گئی - نغمہ شادی، نوحہ غم میں تبدیل ہو گیا - شادی والا خوشیوں سے بھرا گھر - خوشیوں کا گہوارہ ——— ماتم کدہ بن گیا شہنائیوں کی آواز سسکیوں میں بدل گئی - مہندی رات - سہاگ رات کا خواب ادھورا رہ گیا - خواب ٹوٹ گئے سپنے

ٹوٹ گئے ۔ شہزاد کی وفات کی خبر سب کے لیے روح فرسا تھی ۔ رونے، بلکتے، تڑپتے تو سب ہی تھے ، لیکن شبانہ کی حالت بہت خراب تھی ۔ سب میں چھوٹی تھی ۔ ہر وقت ہنستی مسکراتی شبانہ کے لیے غم اور پھر غم بھی جدائی کا، شہزاد جیسے بھائی کا ——— برداشت نہ کر سکتی تھی ۔ روتی تھی، بلکتی تھی ، فریاد کرتی تھی ——— تو ——— سب کا رو رو کر بُرا حال ہو جاتا ۔

موت کو سمجھے ہیں ، غافل ، اختتامِ زندگی
ہے ، یہ ، شامِ زندگی ، صبحِ دوامِ زندگی

سنہرے ، رو پہلے چاند کی دودھیا چاندنی بلند و پست پر پھیلی ہوئی تھی ۔ سفید نورانی ، نور برس رہا تھا۔ سیاہ بادل چھٹ گئے تھے ۔ کچھ دیر پہلے سیاہ بادلوں نے چودھویں کے چاند کو چھپا لیا تھا ۔ خوب زور کی بارش برسی تھی ۔ اور اس طوفانی بارش میں ظفر نیازی کی کوٹھی کی تمام آرائش و زیبائش ، کاغذی جھنڈیاں ، غبارے ، ہار پھول ، سہرے پانی میں شرابور ہو گئے تھے ۔ برقی قمقمے تیز آندھی میں دیواروں سے ٹکرا ٹکرا کر ٹوٹ گئے ۔ روشنیاں ماند پڑ گئیں

تھیں ۔ رونق کی جگہ ویران اداسی چھائی تھی ۔ گلاب کے رنگ برنگ پھول سے لدی، پھولوں میں چھپی بارہ دری، سفید سُرخ، زرد، گلابی، آتشی گلابی ۔ غرض بارہ دری کیا تھی پھولوں کا ایک بڑا سا ٹوکرا نظر آتی تھی ۔ اس کی چھت پر بھی گلاب تھے ۔ فرش پر بھی پھول پتیاں بکھری تھیں ۔ اطراف میں دُور دُور تک پھول اُڑ رہے تھے ۔ تیز ہوا سے بلبیں بکھر گئی تھیں ۔ ہر پھول ہر پتے میں لگے برقی قمقمے کچھ ٹوٹے پھوٹے، کچھ ثابت جل بجھ رہے تھے ۔ اسی پھولوں کی ٹوکرا سی بارہ دری کے درمیان میں لوہے کی بڑی خوبصورت میز اور میز کے اردگرد سفید کرسیاں پڑی تھیں ۔ ان کی پشت اور نشست پر سبز مخمل کی نرم گدیاں لگی تھیں ۔ درمیانی میز کے ساتھ کرسیاں جوڑ کر رکھ دی گئیں ۔ ساتھ ملا ملا کر اور ان کے اوپر ۔ خوبرو، دراز قامت شہزاد کا سفید تابوت پڑا تھا ۔

افرادِ خانہ کے ساتھ مہمان ۔ سارے مہمان ادھر ہی اُمڈ آئے تھے ۔ ہر کوئی بارہ دری کی طرف دوڑا آ رہا تھا ۔ ہجوم تھا بے شمار لوگ بارہ دری کے اندر باہر، اردگرد کھڑے تھے

ایڑیاں اونچی کر کے منہ دیکھنا چاہتے تھے آخری بار ۔ آخری دیدار کرنا چاہتے تھے ۔ پولیس کے چند افسران اور دو ڈاکٹر جنازے کے ساتھ تھے ۔ انہوں نے لاش کی حالت اچھی نہ ہونے کی وجہ سے بکس کھولنے کی اجازت نہ دی تھی ۔ کہ مردہ دریا میں سے نکال کر لائے تھے ۔

ڈھیروں پھول ڈالے گئے تھے تابوت پر ۔ ہر دل بے قرار ، ہر آنکھ اشکبار تھی ۔ ظفر نیازی ناکام و نامراد لوٹ آئے تھے ۔ لیکن پولیس والوں نے اپنا کام جاری رکھا خفیہ پولیس کے آدمیوں نے بڑی کوشش کے بعد بہت تلاش کے بعد اتہ پتہ پوچھتے ۔ کھیتوں کھلیانوں میں ، پہاڑوں پہ ڈھونڈا ، دریا میں غوطے لگائے ۔ آخر کار لاش کو تابوت میں ڈال کر مہر بند کر کے گھر لے آئے ۔ ظفر نیازی کے سپرد کر دیا ۔ شہزاد کو ، ظفر نیازی کی امانت کو ۔

سعدیہ بیگم بند ڈبے کے سرھانے کی طرف بیٹھی تھیں تابوت پہ ہاتھ پھیرتی جا رہی تھیں ۔ بڑی نرمی سے بڑی ملائمت سے جیسے شہزاد کا سر گود میں رکھے ہیں ۔ اور وہ پیار سے ان کے بالوں پر ، ان کے گالوں پہ ہاتھ پھیر

رہی ہیں - کئی بار انہوں نے تابوت کو چوم چوم لیا - کہ اس میں ان کے شرارتی شہزاد محوِ خواب تھے - وہ شوخ شہزاد جو سوتے میں بھی ہنستی مسکراتی آنکھیں کھول دیتے - اور ہونٹوں پہ ہنسی لیے جاگتے ہیں سوتے ہوئے بن جایا کرتے - لیکن آج کی نیند بڑی گہری تھی - کہ سب چاہنے والوں کی آہ زاری، بیقراری سے بے نیاز —— دُنیا و مافیہا سے بے خبر پڑے سو رہے تھے - سعدیہ بیگم کے قریب ہی فوزیہ بیگم حسین و خوبرو فوزیہ بیگم برسوں کی بیمار اور بوڑھی لگ رہی تھیں - آنسوؤں کی جھڑیاں لگی تھیں نہ دل پہ قابو تھا نہ آنکھوں پہ نہ آنسوؤں پر - ضبط کرنے کی کوشش کرتیں تو آنسو اور بھی بہتے، دل کو سنبھالتی تو اور بھی ڈوبتا جاتا - شبانہ دیوانہ وار چیختی - کبھی قہقہے لگاتی بارہ دری کے دروں سے ٹکریں مار رہی تھی —— کبھی آ کر تابوت سے لپٹ جاتی —— کبھی تقدیس، بے حس حرکت تقدیس کو جھنجھوڑ ڈالتی —— کبھی امی سے کبھی خالہ سے کبھی چچا کو سوال کرتی، پوچھتی - کبھی ایک سے لپٹتی، کبھی دوسرے سے —— ڈاکٹر اعجاز نے اس کو نیند کی دوا دی

تھی۔ انجکشن بھی لگایا تھا۔ لیکن صدمے کے جوش میں اس
پر بے ہوشی کی دوا بے اثر تھی ــــ اور تقدیس ــــ نحیف
و نزار ــــ بالکل زرد ہوتی ہوئی تقدیس اسی زرد لباس
میں آہستہ قدم چلتی۔ بڑے عزم سے بڑی ہمت سے آئی
تھی۔ اسی بارہ دری میں جہاں سینکڑوں، ہزاروں بار شہزاد
کے ساتھ بیٹھا کرتی۔ سب گھر والے بھی ہوتے کہ خوشگوار
موسم میں شام کی چائے یہاں پیا کرتے تھے۔ بہت خوبصورت
جگہ تھی ــ اور آج اسی پختہ سڑک پہ تقدیس خود بخود
قدم قدم چل کر شہزاد کو رخصت کرنے آئی تھی۔ اسی سڑک
پہ پھولوں کی روشوں کے درمیان میں چلتے ہاتھ پکڑے سہارا
دیئے شہزاد تقدیس کو لے کر گئے تھے۔ اسی جگہ بیٹھ کر شہزاد
نے انہیں کرسیوں پہ ــ اسی میز پہ کاغذ پھیلا کر قلم پکڑا
کر تقدیس سے اقرار وفا لیا تھا۔ شہزاد نے ان کا ہاتھ پکڑ
کر زندگی بھر کے ساتھ کا، ہاتھ نہ چھوڑنے کا، ساتھ نہ چھوٹنے
کا وعدہ کیا تھا ــــ اور آج خود ہی ــــ اپنی زندگی سے۔
اپنی تقدیس سے ــــ اپنی حیات سے ــــ اپنی
کائنات سے منہ موڑ لیا تھا۔ وہ اس وقت بھی تصور میں

بھی شہزاد کے سہاروں سے ہی چلتی ہوئی آگئی تھی ورنہ اس میں اتنی ہمت کہاں ———؟

"فرح بھابی! مجھے سہارا نہ دیجئے۔ مجھے اب بغیر سہاروں کے چلنے کی عادت ڈالنی ہے" فرح بھابی نے تقدیس کو اپنے بازو کے حلقے میں لے کر سہارا دینا چاہا تو وہ بڑے عزم سے بولی۔ فرح کو ڈر تھا کہ کہیں گر نہ جائے۔ چل نہ سکے گی — یہ دھان پان — نازک اندام سی لڑکی — پھر اتنا بڑا المیہ ——— لیکن تقدیس نے اس سڑک پہ اس پارہ دری میں کسی کا سہارا لینا گوارہ نہ کیا ——— کہ شہزاد تھے یہاں — یہاں کے ذرّے ذرّے میں ان کی یادیں تھیں۔ ان کے پاس شہزاد کا ان کی یادوں کا مضبوط سہارا تھا۔ وہ کسی اور کے سہارے چلنا کیسے گوارہ کرتیں۔ عالم خواب میں وہ شہزاد کے ساتھ تھیں — شہزاد ان کے ساتھ تھے — اور — وہ دلخراش منظر تو سب کو تڑپا گیا — جب تقدیس نے فرح بھابی کے ہاتھ سے سرخ زرتار دوپٹہ لے کر پھولوں سے ڈھکے سفید تابوت پر ڈال دیا۔ اپنے شہزاد کو دولھا بنا دیا اس کی ویران آنکھوں میں آنسو نہ تھے۔ سوکھے ہونٹوں

پہ سسکیاں نہ تھیں ۔ بڑی مطمئن ۔ بڑی پُر سکون تھی ۔ امّی اور خالہ کے سامنے تابوت کے قدموں کے پاس کھڑی خاموش چاروں طرف دیکھ رہی تھی ۔ جیسے کوئی فلم لگی ہے جیسے کوئی متحرک تصویر اس کے تصوّر میں نگاہوں کے سامنے ہے ۔ وہ اپنے ہی ہاتھ کو دوسرے ہاتھ میں دبائے سوچوں میں کھڑی تھی ۔ " تم تو کہتے تھے ۔ نہ ہاتھ چھوڑیں گے نہ ساتھ ۔ آج ساتھ بھی چھوڑ دیا اور ہاتھ بھی ۔۔۔" وہ اپنے دونوں خالی ہاتھوں کو دیکھتی رہی ۔

ظفر نیازی بیقراری میں کبھی مہمانوں کے پاس آتے کبھی تابوت کے پاس ۔ کبھی سر کی طرف کبھی پاؤں کی طرف ۔ کبھی ایک پہلو میں کبھی دوسرے میں ۔ خاموش تھے مگر بے لب ۔ بیتاب تھے ، بیقرار تھے ۔ کسی پل چین نہ آ رہا تھا ۔

نمازِ فجر کی اذان نے سب کو چونکا دیا ۔ تمام رات آنکھوں میں جاگتے گزر گئی تھی ۔ روتے تڑپتے سب خدا کی پکار پہ خدا کے حضور جھک گئے ۔ نماز کیا تھی ۔ سسکیوں ہچکیوں ، آہ و بکا کا ایک طوفان تھا ۔ ہر آنکھ رو رہی تھی ، ہر دل رو رہا تھا ۔ ایک پُر سکون تھے تو شہزاد ۔۔۔

شوخ و شنگ - شرارتی شہزاد - پل بھر چین سے نہ بیٹھنے والے شہزاد بڑی پرسکون نیند میں تھے - نہ کبھی خود قرار سے بیٹھتے نہ چین کرنے دیتے - ـــــ لیکن ـــــ آج جو بے قراری - جو اضطراب انہوں نے دیا تھا - اس کا تو حساب کتاب ہی نہ تھا -

سورج طلوع ہوا تو اس گھر کی خوشیوں کا آفتاب ڈوب گیا - زیرِ زمین - تہہ خاک دفنانے کے لیے - منوں مٹی کے تلے - شہزاد کی میت کو ظفر نیازی اور ان کے دوست احباب - آہوں ، نالوں کے شور میں آنسوؤں کے سیلاب میں، طوفان خیز حالات میں قبرستان کی طرف لے گئے - پھولوں کے بستر پہ سونے والے شہزاد کو قبر میں ابدی نیند سلانے کے لیے - ہمیشہ ہمیشہ کے لیے رخصت کرنے کے لیے -

باب ۱۲

ے کتنی نادیدہ تمناؤں کی حسرت لے کر
چاند ہر روز اندھیروں سے گزر جاتا ہے

خوش گوار موسم دھیرے دھیرے تبدیل ہوتا رہا۔ روشن چلچلاتی دھوپ میں گرم ہواؤں کی وجہ سے طویل دن کاٹے نہ کٹتے تھے۔ رات قدرے ٹھنڈی ہوتی۔ لیکن جلد ہی گزر جاتی۔ کہ موسم گرما میں دن بڑے اور راتیں چھوٹی ہوتی ہیں۔

رات کا وقت تھا۔ شبانہ نیند میں ڈر گئی۔ چیخیں مارتی ایک دم گھبرا کر اُٹھ بیٹھی۔ نیم بیداری کی حالت میں اُڑی رنگت اور سانس تیز تیز لے رہی تھی۔ آنکھیں پھاڑے خوفزدہ سی چاروں طرف دیکھ رہی تھی۔ کچھ بھی نظر نہ آ رہا تھا۔ متلاشی نظریں کچھ ڈھونڈ رہی تھیں۔

امّی جانی ـــــ امّی حضور !" شبانہ نے پوری قوت سے سعدیہ بیگم کو پکارا۔ آواز بڑی مدھم ۔ بہت ہلکی ۔ جیسے بڑی دُور سے ۔ بڑی گہرائی سے آرہی ہو ۔ ڈری ۔ سہمی بے جان آواز ـــــ سعدیہ بیگم مسہری سے ہٹ کر کونے میں قبلہ رو ۔ اُجلے تخت پر مخمل کی جائے نماز بچھائے نوافل پڑھ رہی تھیں ۔ تہجد کی نماز کے نوافل پڑھنے کے بعد وظیفہ کر رہی تھیں ۔ صاف ستھرے ۔ سادہ لباس میں سعدیہ بیگم کے مقدّس وجود پہ فرشتے بھی رحمتیں بھیج رہے تھے ۔ نیلے بلب کی ہلکی ہلکی روشنی میں دست بدعا سعدیہ بیگم بڑی پاکیزہ لگ رہی تھیں ـــــ بڑی نورانی سی نظر آرہی تھیں ۔ اتنے کم اُجالے میں بھی جیسے ان کے گرد نور کا ایک ہالہ سا بنا تھا ۔ اس نور میں نہا گئی تھیں دعائیں مانگ رہی تھیں ۔ دونوں ہاتھ اُٹھائے خدا کے حضور عاجزی سے آنکھیں بند کیے تھیں ـــــ شبانہ کے عالم خواب میں بے تحاشہ چلانے ـــــ خوفزدہ سی آواز میں پکارنے اور جاگنے پر دبے دبے لہجے میں امّی کو آوازیں دینے پر سعدیہ بیگم زیرِلب دعائیں پڑھتی ۔ درود شریف

اور قُل شریف دہراتی ـــــ اپنی جگہ سے اُٹھیں ـــــ تیز روشنی کا بلب جلا دیا۔

پریشان حال شبانہ اپنے پلنگ پہ بے جان پڑی تھیں۔ ایر کنڈلیشنڈ کمرہ تھا ـ پھر بھی ناتواں وجود پسینے میں غرق ـ

" شبانہ ـــــ شبانہ بیٹی ـــ " سعدیہ بیگم نے آہستگی سے شبانہ کے بھیگے بالوں پہ پسینے میں شرابور چہرے پہ ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ جھک کر آہستگی سے پکارا ـ وہ شبانہ کے پلنگ پر بیٹھی تھیں ـ

" امّی حضور ـ" شبانہ نے ماں کے ساتھ بے تابی سے لپٹتے ہوئے کہا ـ وہ سسک رہی تھی ـ ٹھنڈی ہوئی جاتی لرز رہی تھی ـ

" کیا ہوا میری بچّی ـــــ کیوں گھبرا رہی ہو میری جان ـــ " سعدیہ بیگم نے شبانہ کا سر اپنی گود میں لیتے ہوئے ـ ٹھنڈی پسینہ پسینہ پیشانی چوم لی ـ

" میرے بھائی جان ـــــ امّی ـــــ حضور ـ" شبانہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی ـ اب وہ پوری طرح بیدار تھی

ماں کے سینے سے لگی تڑپ رہی تھی ۔ سعدیہ بیگم نے اپنے مہین، ملائم دوپٹے سے شبانہ کا پسینہ خشک کیا ۔ آنسو پونچھے وہ اس کے سر پہ ۔ چہرے پہ شفقت سے بڑی محبت سے ہاتھ پھیر رہی تھیں ۔ کمزور ہاتھوں میں لرزہ تھا ۔ آنکھوں سے آنسوؤں کی دھاریں بہہ کر شبانہ کے بالوں میں ۔ جذب ہو رہی تھیں ۔ وہ کبھی شبانہ کے چہرے پہ پیار کرتیں ۔ کبھی سر کو چومتیں ۔ شہزاد کی وفات کے بعد ——— شبانہ اپنے کمرے میں گھبراتی تھی ۔ روزانہ رات کو ڈر جاتی ۔ نیند میں روتی ، بلکتی چیخیں مارتی بستر سے اُٹھ کر دوڑ پڑتی ۔ کئی مرتبہ گر کے چوٹ آ چکی تھی ۔ سعدیہ بیگم ڈر گئیں کہ کسی دن سیڑھیوں سے نہ گر پڑے زیادہ چوٹ ہی نہ آ جائے ۔ اب ان کے پاس باقی ہی کیا رہ گیا تھا ۔ یہی ایک شبانہ ——— وہ اپنی خواب گاہ میں پلنگ سے پلنگ جوڑ کر اپنے ساتھ سلاتی تھیں ۔ شبانہ کی حالت بدستور تھی ۔ روزانہ کا یہی معمول تھا ۔ اول تو نیند ہی نہ آتی ۔ اور اگر آ جاتی تو خواب میں شہزاد کو دیکھ کر روتا تڑپنا شروع کر دیتی سعدیہ بیگم ہزار ضبط و ہمت سے کام لیتیں ۔ لیکن آخر انسان تھیں ۔ ادھر جوان بیٹے کا صدمہ ۔ اب جوان بیٹی کی حالت

خراب تھی ــــ دیکھی نہ جاتی ــــ برداشت نہ ہوتی ۔ لیکن بڑے بلند حوصلے کی بڑی عظیم خاتون تھیں ۔ شبانہ کو تسلی دلاسہ دیتیں ۔ گود میں لے کر سر سہلا کر سلانے کی کوشش کرتیں ۔ لیکن یہ سب بھرم شبانہ کے سامنے ہوتا ۔ تنہائی بس سارے ضبط ۔ عزم ۔ حوصلے ٹوٹ جاتے ۔ سارے رحصن ٹوٹ جاتے ۔ صبر و ضبط کا یارا نہ رہتا ۔ خوب روتیں ۔ رو کر دل کی بھڑاس نکالتیں ــ جوان بیٹے کا المناک ۔ جگر گوشے ، اتنے پیارے بیٹے کی جدائی میں خون ر آنکھوں سے آنسوؤں کی صورت میں ٹپکتا ۔ نورِ نظر نظروں سے دور تھا ۔ لختِ جگر کی وفات سے جگر پاش پاش تھا ۔ نبانہ کی خاطر زندہ تھیں ۔ شہزاد کے بغیر زندگی بے معنی ھی ۔ اس دنیا میں اب باقی ہی ــــ کیا رہ گیا تھا ۔ زندگی سے کوئی لگاؤ نہ تھا ۔ بیٹے کے سوئم ، چہلم تک فوزیہ بیگم اور ظفر نیازی نے نہ آنے دیا ۔ ان کے پاس رہیں ۔ ہزاروں ارمانوں ، منتوں ، مرادوں کو دل میں بسائے گئی تھیں ۔ حسرتوں ، یاس و نامرادیوں کو دامن میں سمیٹے ۔ واپس آگئیں ۔ لٹی پٹی ۔ اُجڑی اُجڑی ۔ کن خیالوں میں

گئی تھیں ۔ کن حالوں میں واپس آئیں۔ خوشیوں کی دولت سے دامن بھرنے گئی تھیں ۔ تہی دست و تہی داماں واپس آئی تھیں ۔ وہاں شبانہ بہت گھبراتی ۔ خود بھی روتی تڑپتی تقدیس کو لپٹا کر دیوانہ وار چیخیں مارتی —— وہ بھی روتی —— سسکتی —— رو رو کر دونوں بے حال ہو جاتیں ۔ بڑے تو سب بظاہر حوصلہ دکھاتے ۔ ضبط سے کام لیتے ۔ لیکن دونوں لڑکیوں کی حالت دیکھی نہ جاتی ۔ مشکل تھی ۔ بے بسی اور مجبوری ۔ یہ تھی کہ اس دکھ کا کوئی مداوا نہ تھا ۔ اس پریشانی کا کوئی حل نہ تھا ۔ اس اُلجھن کو سلجھانا ناممکن تھا ۔ روپے پیسے ، دولت و سرمایہ خوشیاں خرید کر نہ دے سکتے تھے تقدیروں کو تبدیل نہ کر سکتے تھے ۔ ساری تدبیریں بیکار تھیں ۔ کوئی دوا ، علاج ، اس درد کا کوئی بھی تو درماں نہ تھا ۔ سب نے یہی مشورہ دیا کہ شبانہ کے دل و دماغ پر بہت زیادہ اثر ہے ۔ شدید ذہنی بیماری کا خطرہ ہے اس کے لیے ماحول کی تبدیلی اور مصروفیت چاہیئے ۔ کالج جانے سے طبیعت بہل جائے گی ۔ سہیلیوں ، ہمجولیوں میں وقت اچھا گزرے گا —— بڑا روح فرسا منظر

تھا - قیامت کا نظارہ تھا - جب شبانہ تقدیس سے رخصت ہو ئی - کہاں تو ارمان تھا - دلہن بنا کر لے جانا تھا - سہاگن بھاوج —— اور کہاں یوں ابھاگن —— عالم بیوہ گی ہیں - شہزاد کی عدم موجودگی ہیں چھوڑ کر جانا عورتوں کی تو بات ہی الگ تھی - خود ظفر نیازی پھوٹ پھوٹ کر رو رہے تھے - یہ وقت یہ حالت - یہ بے قراری دیکھی نہ جاتی تھی —— دونوں ایسی لپٹی تھیں کہ جدا ہی نہ ہوتیں -

" ہائے آپی میری آپی جان! بھائی جان تو کہتے تھے —" بھابی " کہا کروں —— اب کیسے کہوں گی - کس کو کہوں گی — بھابی —— بھابی جان! میرے بھائی جان ہی نہ رہے — آپی جی —— بھابی جان " شبانہ جنون کی سی کیفیت میں، شدتِ غم میں دیوانی ہوئی بولے جا رہی تھی - روئے جا رہی تھی - اتنی کمزور ہو گئی تھی کہ پہچانی نہ جاتی تھی - تقدیس بھی بستر سے لگ کر رہ گئی تھی اٹھتی تو بس چلتا پھرتا سایہ سا - خاموش، کم گو، بے زبان تو پہلے ہی تھی —— اب تو بالکل پتھر ہو گئی تھی - ہر وقت

مسکراتے چہرے پہ زردی ۔ ہر وقت چمکتی، بجلیاں گراتی آنکھوں میں بڑی خاموش اُداسی ۔ غم کے گہرے سائے تھے ۔ شہزاد کے ٹھنڈے میٹھے سایوں میں رہنے کی عادی ۔ ان کے بغیر تپتے جلتے صحراؤں میں تند و تیز غم واندوہ کی، سوگ کی ہواؤں میں جھلس گئی تھی ۔ ان کے جانے کے بعد جیسے زندگی ختم ہو گئی تھی ۔ شبانہ کی تڑپ دیکھتی تو زخم اور بھی ہرے ہو جاتے ۔ دُکھتے ناسور رسنے لگتے ۔ نین کنول ۔ سیال کٹورے چھلک پڑتے ضبط کے بندھن پھوٹ بہتے رخساروں پہ ۔ ڈاکٹروں نے بھی ۔ ملنے جلنے والوں نے بھی مشورہ دیا تھا ۔ سعدیہ بیگم کا بھی یہی خیال تھا ۔ دونوں لڑکیوں کو کچھ عرصہ علیحدہ رکھا جائے ۔ فوزیہ بیگم اور ظفر نیازی نے بھی اسی میں مصلحت سمجھی ۔

اس وقت عمر رسیدہ بڑی بی ۔ پُرانی گھریلو ملازمہ ۔ باہر راہداری میں مصلےٰ ڈالے تہجد کی نماز پڑھ رہی تھیں شبانہ کی بیداری اور بیقراری پہ وظیفہ ختم کر کے دُعائیں پڑھتی تسبیح کے دانے گھماتی، دروازہ آہستہ سے کھول کر اندر

آیتیں - قرآنی آیات - سورتیں پڑھ رہی تھیں - شبانہ پہ
دم کر رہی تھیں - اس گھر کا غم ان کا اپنا غم تھا - شہزاد
کو انھوں نے گودیوں کھلایا ، گود میں لے لے کر لوریاں
سنا کر سلایا تھا - پنگھوڑے میں ڈال کر بڑی محبت سے
جھولا جھلایا تھا - بہت بچپن میں ان کی اور تقدیس کی
تاریخی لڑائی بھی چھڑائی تھی - اتنا شوخ بچپن - شریر جوانی
مہتاب سا شباب دیکھا تھا - سہرے کی مہکتی کلیاں - کھلتے
پھول دیکھے تھے - یہ پھول یہ کلیاں مرجھا گئیں - ان
ٹوٹے بکھرے پھولوں کی - ان مرجھائی مسلی کلیوں کی بے
بسی کا - بے کسی کا اندازہ کچھ دکھی دل ہی کر سکتے ہیں -
دبلی پتلی - چھوٹے سے قد کی - کمزور - ضعیف العمر بڑھیا
کی دعاؤں کا اثر تھا - قرآن پاک کی آیات مبارکہ کی تاثیر
تھی کہ شبانہ کی طبیعت کچھ سنبھل گئی - چیخ و پکار ، جنونی
کیفیت میں افاقہ تھا -

" امّی حضور ! ہم کئی دنوں سے ایک ہی خواب دیکھ
رہے ہیں - لیکن آپ سے کہا نہیں ۔" شبانہ اپنے پلنگ
پہ دو زانو بیٹھی - چہرہ اُوپر کئے امّی کی طرف دیکھ رہی تھی

پلکیں بھیگی ہوئی تھیں اور لہجے میں آنسوؤں کی نمی تھی۔ آواز نہ نکل رہی تھی۔ بڑی مشکل سے بولی۔

"بیگم حضور! بیٹا رانی کا خواب ضرور سُنیے جناب۔ ان کے دل کا بوجھ کم ہو جائے گا۔" سعدیہ بیگم کو خاموش، سوچوں میں گم دیکھ کر بڑی بی نے بڑے ادب سے کہا۔

سعدیہ بیگم بڑی پریشان، فکروں میں غرق، غم ناک سی بیٹھی تھی۔ جیسے کچھ سُن ہی نہ رہی ہوں۔ کچھ دیکھ ہی نہ رہی ہوں۔

"ہم اکثر خواب دیکھتے ہیں کہ ابّا حضور تشریف لائے ہیں کتنا خوبصورت، بڑا نورانی چہرہ ہے۔ جیسے ہوتا تھا سبز رنگ کا ڈھیلا ڈھیلا، بڑا پاک صاف لباس پہنے ہیں ان کے ہاتھوں میں سفید آبدار موتیوں کی بڑی سی مالا ہے جس کے درمیان میں بڑا چمک دار ہیرا جڑا ہوا ہے اور اس میں سے روشنیاں نکل رہی ہیں۔ سورج کی شعاؤں کی طرح کرنیں پھوٹ رہی ہیں امّی جانی۔" شبانہ نے چپ چاپ بیٹھی سعدیہ بیگم کے شانے پہ ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

"پھر ابّا حضور۔۔۔ وہ مالا آپ کے گلے میں ڈال دیتے ہیں

اور پھر کیا دیکھتی ہوں ـــــ کہ میرے پیارے بھائی جان آ جاتے ہیں۔ آپ کے گلے سے لگے ہیں ـــ اور میں دوڑ کر بھائی جان سے لپٹ جاتی ہوں ـــ ہائے اللہ جی ـــ سچ مچ میرے بھائی جان ہوتے ہیں ـ اگر ـــ اگر میرے بھائی جان مل جائیں تو میں خوشی سے پاگل ہو جاؤں ـــــ مر ہی جاؤں خوشی سے ـــ" شبانہ اپنے دونوں ہاتھوں میں اپنا چہرہ پکڑے آنکھیں بند کیے لگاتار بول رہی تھی۔ جیسے بند پلکوں میں اپنے بھائی کو بند کئے ـ چھپائے دیکھ رہی ہو ـــــ وہ سعدیہ بیگم کی خاموشی ـــــ ایسی سطح سمندر کی سی خاموشی ـ جس کی تہہ میں ہزاروں طوفان مچل رہے ہوں ـ محسوس کر رہی تھی ـ پھر بھی آہستہ آہستہ ـ رک رک کر، رو رو کر اپنا خواب آج سنا دیا ـ

" امی حضور! ـ خدا کی قسم ـــ ابھی یہاں تھے میرے پیارے بھائی جان ـــ سچ امی جانی ـــ بالکل سچ ـــ" شبانہ نے ماں سے لپٹتے ہوئے کچھ اتنے درد بھرے انداز میں کمرے میں چاروں طرف دیکھتے ہوئے کہا ـ کہ یہ درد دینے

والے سفاک ۔ سنگدل ۔ ظالم دشمن بھی دیکھ لیتے تو ان کو رحم آ جاتا ۔ ان کے پتھر دل موم ہو جاتے ۔ پانی کی طرح پگھل کر بہہ نکلتے ۔

" بیٹا رانی ___ میری چندا ___ آپ کا خواب بہت اچھا ہے سرکار ! شہزاد میاں کی طرف سے بڑی اچھی خبر آئے گی ___ میری فال تو یہی کہتی ہے کہ ہماری سرکار زندہ ہیں ۔ میں بدنصیب بہتیرا دعا کرتی ہوں ۔ سر پٹختی ہوں لیکن معلوم نہیں ہوتا کہاں ہیں ۔ کس کے قبضے میں ہیں جب بھی استخارہ کیا ۔ دعا کی ___ بستر پر خاموش پڑے سوئے ہوئے دیکھتی ہوں " بڑی بی کے جھریوں زدہ بوڑھے چہرے پہ رونق آ گئی تھی ۔ وہ شبانہ کے خواب سے بہت خوش ہو رہی تھیں ___ یہ ہیروں جڑی مالا ___ شہزاد میاں ہی تو ہیں ___ جو ___ بڑے سرکار نے بیگم حضور کو دی ہے " اتنے غمناک ، نمناک ، سوگوار ماحول میں بھی بڑی بی مسکرا رہی تھیں ۔ وہ بڑی عابد و زاہد ۔ تہجد گزار نوافل پڑھنے والی بڑی نیک خاتون تھیں ___ جب سے شہزاد کا انتقال ہوا تھا ۔ یہ منحوس خبر ملی تھی ۔ وہ

یہی کہتی - کہ ہمارے شہزاد بیٹے - منے سرکار (بچپن میں وہ شہزاد کو پیار سے منے سرکار ہی کہا کرتی تھی) زندہ ہیں - ان کی وفات کی خبر غلط ہے -" لیکن سب اس کو بوڑھی سٹھیائی ہوئی، غم کی زیادتی سے پاگل ہوئی سمجھ کر اس کی بات پر توجہ نہ دیتے -

ادھر ظفر نیازی جیسے ایک بڑے عہدے پہ معمور- بارسوخ آدمی کے لیے خفیہ پولیس کی مدد سے حکومت سے مفرور ملزموں کو قید میں ڈلوا دیا - پوچھ گچھ ہوتی تھی - مقدمہ چل رہا تھا - بڑی بڑی اذیت ناک سزائیں دی جاتی تھیں لیکن ان کے بیانات میں کوئی تبدیلی نہ آتی تھی - اپنے جرم کا اقرار کرتے تھے کہ لاش دریا کے کنارے جنگل میں پھینک دی تھی - اور درست بھی تھا کہ پولیس نے میت دریا میں سے ہی نکالی تھی -

باب ۱۳

اک بار جو مِل جائیں وہ بچھڑے ہوئے لمحے
سو بار مجھے تلخیٔ ایام گوارا

بڑی سخت گرمی پڑ رہی تھی۔ دوپہر کے وقت شبانہ کالج سے واپس آئی۔ شمع بھی ساتھ تھی۔ وہ روزانہ شبانہ کے ساتھ آجاتی۔ شام کو اپنے گھر لے جاتی۔ کبھی کسی دوسری سہیلی کے گھر، ہر طرح سے اس کا دل بہلاتی۔ فرح بھابی اور تنویر بھائی بھی بہت خیال کرتے۔ چھٹی والے دن بچوں کو اِدھر بھجوا دیتے۔ کبھی شبانہ کو اپنے گھر لے جاتے کہ بچوں کے شور شرابے میں کچھ غم غلط ہوگا۔ اس وقت دونوں سیدھی سعدیہ بیگم کے کمرے میں آئیں۔ وہ وہاں موجود نہ تھیں۔ ملازم نے بتایا کہ وہ کھانے کے کمرے میں ان کا انتظار کر رہی ہیں۔ دونوں

وہیں آ گئیں۔

بڑا خوبصورت، وسیع و عریض، شاندار کھانے کا کمرہ۔ شفاف بڑی میز، صاف ستھری چمکتی کرسیاں۔ کمرے کی آرائش و زیبائش۔ ہر چیز اسی طرح تھی۔ جیسے پہلے ہوا کرتی تھی۔ انواع و اقسام کے کھانوں۔ سینکڑوں امیرانہ نعمتوں سے بھری ہوتی۔ کھانے سے اٹھتی خوشبوئیں۔ کمرے کے سوگوار ماحول میں پھیل جاتیں۔ لیکن اداس، اداس بڑی بوجھل خاموشی سوگواری میں دم گھٹ جاتا۔ دل و دماغ ماؤف ہوتے جاتے کہ شریر شہزاد کے زندہ شوخ قہقہے، کمرے میں گونجتے دیواروں سے ٹکراتے، جو وہ کھانے کے دوران لگایا کرتے شبانہ اور تقدیس کو چھیڑتے ہوئے، فوزیہ بیگم کو ستاتے ہوئے امّی کے ساتھ مذاق کرتے ہوئے۔ اس شور سے۔ ماضی کی آوازوں سے۔ پُرمسرت سازوں سے بڑی تکلیف ہوتی تھی۔ لقمہ حلق میں اٹک کر رہ جاتا۔ دونوں ماں بیٹی ایک دوسرے کی خاطر کچھ نہ کچھ کھا لیتیں۔ زہر مار کر لیتیں۔ بڑی اذیت ناک، تکلیف دہ خاموشی چھائی رہتی۔ اس وقت بھی شمع کے ساتھ سعدیہ بیگم کے سامنے بیٹھی شبانہ

نے بمشکل دو لقمے کھائے۔ برف کا ٹھنڈا پانی۔ پورے دو گلاس پانی ایک ہی سانس میں پی گئی۔ من میں لگی آگ کو ٹھنڈا کرنے کے لیے۔

"بیٹی ــــ کھانا تو کچھ بھی نہیں کھایا۔" سعدیہ بیگم نے شفقت و محبت آمیز لہجے میں نرمی سے کہا۔ انہوں نے بھی ہاتھ میں پکڑا لقمہ پلیٹ میں رکھ دیا تھا۔ وہ شبانہ کی خاطر کھا رہی تھیں اور شبانہ کھانا نہیں کھا رہی تھی۔

"اس وقت بھوک زیادہ نہیں امی حضور ــــ گرمی کی وجہ سے کھانے کو دل نہیں چاہ رہا۔" شبانہ گلوگیر لہجہ میں کہہ رہی تھی اور میز کے کنارے پہ سر رکھ کر آنسوؤں سے بھری آنکھیں ماں سے چھپانے کی کوشش کی ــ وہ اس وقت بہت ضبط کر رہی تھیں۔ لیکن ہمیشہ کی طرح ہمت جواب دے رہی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ اس کا اضطراب دیکھ کر امی بھی مضطرب ہو جاتی ہیں۔ ان کی صحت بہت کمزور تھی اکثر بیمار رہتی تھیں۔ دواؤں اور دعاؤں کا سہارا تھا۔ لیکن شبانہ اپنی کمزوری پہ قابو نہ رکھ سکی۔ کہ دامن صبر و ضبط ہاتھ سے چھوٹا جا رہا تھا۔

"بیگم ____ خوانخواہ رو رو کر ہلکان ہوتی ہو۔ اگر شہزاد بھائی ہوتے تو ہمیں پہچانتے نہیں کیا ____؟ وہ ہمیں ضرور بلا لیتے۔ ہمارے ساتھ آجاتے اگر وہ ہمارے بھائی جان ہوتے تو ____ تب ____ نا ____ بلکہ ہمیں بلانے، پہچاننے یوں ساتھ آنے کی کیا ضرورت تھی۔ وہ زندہ سلامت ہوں ____ تو کہیں اور کیوں رہتے ____ اپنے گھر آجاتے یہیں رہتے، ہم سب کے پاس ۔ ہمارے ساتھ۔ اسی طرح ہنستے مسکراتے، کھیلتے شرارتیں کرتے۔ وہ بیگانوں کی طرح کیوں کھڑے رہتے ____" شمع کی آنکھوں سے بھی آنسو ٹپک رہے تھے ۔ وہ اپنے آنسو پونچھتی۔ سسکتی ہوئی شبانہ کو اپنے بازو میں لیے ۔ ساتھ لگائے ۔ بڑی اپنائیت سے بڑی محبت سے کہہ رہی تھی ۔ ضبطِ غم کی کوشش ۔ اپنے آنسو روکنے کے لئے دانتوں میں ہونٹوں کو زور سے دباتی تھی اور ____ پھر ____ بڑی مشکل سے بڑی ہمت کر کے ____ شمع نے سعدیہ بیگم کو بتایا کہ کالج سے واپسی پہ ایک چوک میں ٹیکسی کے انتظار میں ایک خوبصورت لڑکی کے ساتھ دو نوجوان کھڑے تھے۔ جن میں سے ایک

بالکل شہزاد بھائی کی شباہتیں لیے تھا۔ ہم دونوں کو بہت غلط فہمی ہوئی۔ ان کے قریب موٹر روک کر ہم نیچے اُتر گئیں۔ بڑی دیر کھڑی رہیں۔ کہ شاید موٹر میں وہ اچھی طرح پہچان نہ سکیں۔ پھر ہم نے ان سے پوچھا بھی کہ کہاں جائیں گے وہ لوگ —؟ ساتھ چلنے کی دعوت بھی دی کہ ہم اُن کو گھر پہنچا دیں گے — لیکن ان کا گھر مخالف سمت میں تھا۔ بڑے معقول سنجیدہ سے دونوں نوجوان، بڑی فہمیدہ سی خاتون تھیں۔ یوں تنہا لڑکیوں کے ساتھ جانا مناسب نہ سمجھا اور ٹیکسی ملنے پر وہاں سے چلے گئے اور ہمیں بالکل بھی نہیں پہچانا۔ لیکن یہ بضد تھیں۔ کہ ان لوگوں کے پیچھے جاؤں گی۔ ان کے گھر کا پتہ کروں گی۔ امّی حضور کو چچا جانی کو ان کے گھر لے کر جاؤں گی۔ اور یوں ہمارے بھائی جان مل جائیں گے۔ ہمارے سارے دُکھ دور ہو جائیں گے۔ سارے غم خوشیوں میں بدل جائیں گے۔" خالہ جان! آپ کو کیسے بتاؤں کہ میں کتنی مشکل سے ان کو گھر لے کر آئی ہوں — یہ تو دوڑ کر — اس نوجوان سے لپٹنے لگی تھیں — "میرے بھائی جان" میں نے پکڑ کر روک

لیا۔ ورنہ وہ لوگ کیا کہتے - پھر ہم دونوں بڑی دور تک اپنی موٹر لے کر ان کے پیچھے بھی گئے۔ کہ ان کی کوٹھی کا پتہ کریں - لیکن ٹیکسی تھی اور بہت سی ٹیکسیوں میں مل گئی - اِدھر اُدھر راستوں میں نہ جانے کہاں غائب ہو گئی - کہ ایک ہی جیسی تو ساری ٹیکسیاں وہاں جا رہی تھیں۔ دوسری کاروں - بسوں - ٹرکوں - سکوٹروں وغیرہ کی وجہ سے اتنا ہجوم تھا کہ خدا کی پناہ -" شمع رو رہی تھی - اس کی آنکھوں سے جلتی موم بتیوں کی طرح ٹپ ٹپ آنسو گر رہے تھے - موتیوں کی طرح رخساروں پہ لڑھک رہے تھے - وہ بات بڑی مشکل سے رُک رُک کر، کر رہی تھی - کہ روتے ہوئے بات نہیں ہوتی تھی - آواز گلے میں پھنستی - لہجہ بھیگ بھیگ جاتا - بار بار بھیگے آنچل سے آنکھیں صاف کر رہی تھی - وہ اسی طرح اسی جگہ بڑی دیر تک شہزاد کی باتیں کرتی رہیں - آنسوؤں کے خزانے لٹاتی رہیں - شہزاد کی یادوں کی نذر کرتی رہیں - مؤدب کھڑا ملازم بھی رو رہا تھا - کہ شہزاد سے سب کو ہی پیار تھا - کیوں کہ وہ سب کا ہی خیال رکھتے تھے - سب سے محبت کرتے تھے - کھانا

ٹھنڈا ہوگیا - اور سب ٹھنڈی آہیں بھرتے - روتے رہتے - شہزاد کی جدائی کا غم جان لیوا تھا -

تقدیر اپنی دھن میں شب و روز کے موتیوں کی مالا پروتی رہی - اور — تقدیس — بڑے انمول، قیمتی ہیروں سے نگینوں سے بھی قیمتی موتیوں کی مالا پروتی توڑتی بکھیرتی رہی — آنسوؤں کے موتیوں کی مالا — سوگوار تقدیس کی آنکھوں سے آنسوؤں کے موتی گرتے رہے - تقدیس — تقدیر — کے اس کھیل پہ — اس المناک ڈرامہ پہ بے بس و مجبور، غموں سے چُور — خوشیوں سے دُور، خیالات سے کھیلتی رہی - ماضی میں کھو جاتی - تصورات کی دُنیا میں میلوں دُور سالوں پہلے کی طرف ماضی میں چلتی رہتی - پورے پچیس سال کی یادیں دہراتی رہتی - قدم، قدم پہ، شہزاد ساتھ، ساتھ - بچپن کی یادیں - جوانی کی یادیں - شہزاد کی باتیں - شوخیاں، شرارتیں بڑے ارمانوں کی رومان پرور - محبت بھری وارداتیں، ہر وقت رنگین متحرک تصویروں کی طرح ایک ایک بات - ہر ایک چیز - واقعات و لمحات - دماغ میں گھومتے رہتے

چکر لگاتے رہتے، نگاہوں میں گھومتے ـــــ اور ـــــ
خاموش تقدیس ـــــ کبھی کھلی۔ کبھی بند آنکھوں میں۔ دونوں
حالتوں میں ان ہی نظاروں پہ نظریں جمائے رہتی۔ ان ہی
مناظر میں کھوئی رہتی۔ شہزاد کی عقیدت کے نذرانے ـــ
الفت کی محبت کی سوغاتیں ـــــ کیا کچھ نہ تھا تقدیس کے
پاس ـــــ پھر بھی دامن خالی ـــــ دونوں ہاتھ خالی ـــــ
کہ شہزاد نہیں تھے ان سب چیزوں کے ساتھ ـــــ
وہی موسم، وہی برسات، وہی شہزاد۔ شوخی چہرے
پہ۔ آنکھوں میں۔ ہونٹوں پہ شوخی لیے قہقہے لگاتے، موسلا
دھار بارشوں میں تقدیس ان کی بانہوں کے سہارے چلتی رہتی،
موسم برسات کے ساتھ محبت کی بارش میں بھیگتی رہتی۔
موسموں کی تبدیلی کے ساتھ ان کی نوازشوں کی نوعیت بھی،
بدل جاتی ـــــ سردیوں میں اپنے ہاتھ سے کافی بنا کر پلاتے،
تو گرمی میں ٹھنڈا مشروب ہاتھ میں لیے تقدیس کو دے
رہے ہیں ـــ وہ انکار کر رہی ہیں ـــ شہزاد اصرار کر رہے
ہیں ـــ پی لیجئے۔ میرے حضور ـــــ جھوم جھوم کر گا
رہے ہیں ـــ،

پینا حرام ہے نہ پلانا حرام ہے
پی کر نشے سے ہوش میں آنا حرام ہے

نشے میں چور نگاہیں تقدیس کی مست جگمگاتی نگاہوں سے ملتیں تو مزہ دو آتشہ ہو جاتا۔ شرابیں، شرابوں میں ملتیں تو نشہ بڑھ جاتا۔ سخت سردی میں برفباری دیکھنے جاتے ہوئے سگریٹ کے دھوئیں سے تقدیس کی طبیعت خراب ہوئی تو سلگتا سگریٹ پاؤں تلے مسل دیا۔ شیشے کی طرح شفاف برف پہ سہارا دیتے ــــ ہاتھوں میں ہاتھ لیئے۔ پھر شبانہ اور تقدیس کی تصویریں اُتارتے ــــ اپنی تصویریں اُتروانتے ہوئے ــــ اپنے آگے تقدیس کو گھوڑے پہ بٹھلائے۔ پریوں کے دیس کے شہزادہ لگتے اور تقدیس نازک نازک کومل کومل بڑی حسین پریوں کی شہزادی۔ وہی بچوں کی کہانیوں والے شہزادہ شہزادی گھوڑے پہ سوار اُڑنے کے لیے تیار ــــ ساتھ میں شبانہ بھی دوسرے گھوڑے پر سوار ــــ گہری نیند سوتے میں شہزاد کے قہقہے سے آنکھ کھل جاتی۔ محوِخواب شہزاد تقدیس کا ہی آسمانی کمبل اوڑھے کرسی پہ نیم دراز میز پہ ٹانگیں دراز کیئے، کتنے

پیارے لگتے تقدیس کو۔ اور جب شرارت میں شہزاد نے لحاف پلٹ دی تھی —— تقدیس کی —— شب خوابی کے مہین لباس میں مارے شرم کے ان سے ہی شرماتی، گھبراتی، اب بھی بےخودی میں اپنے سینے پہ ہاتھ رکھ لیتی۔ دوپٹہ پھیلا لیتی۔ جیسے اس وقت بھی شرارت بھرے انداز میں شہزاد سامنے کھڑے ہیں... گلاب سا شباب بلور سے لباس میں سے جھلک رہا ہے وہ تصور میں ہی یہ سوچ کر جلدی سے اپنا ڈریسنگ گاؤن پہن لیتی۔ سُرخ گاؤن کی — کمر کے گرد بندھی ریشمی ڈوری — اپنے نازک سراپا پہ نثار ہوتی شہزاد کی نظریں وہ منہ پھیر لیتی۔ رخ موڑ کر ادھر کو ہو جاتی — سُرخ چوڑیاں پہنواتے ہوئے، کیسا چاہت بھرا خلوص، کتنی چاہت ہوتی۔ روشن چہرہ خوشیوں سے کیسا دمک رہا ہوتا بڑی بڑی خوبصورت آنکھوں میں شوخیاں، لبوں پہ شرارتیں شریر مسکراہٹیں۔ پھر جڑاؤ ٹیکہ ہاتھ میں لیے تقدیس کی پسند پوچھتے شہزاد ہنستے ہوتے بہانے سے ان کے بالوں میں اٹکا دیتے۔ ان کی پیشانی پہ سجا دیتے۔ گلاب

کی بے شمار نازک پتیوں سے بھری ساڑھی تقدیس کے اوپر پھیلاتے ہوئے شہزاد ——— اور وہ اب بھی شرما کر —— پھولوں کے بوجھ سے جھکتی جاتی ، دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپائے شرماتی رہتی ——— کبھی پکچر ہاؤس میں، کبھی ہوٹل میں، دریا کے کنارے ، کبھی پل پہ ، کبھی کشتی میں ، کبھی گاؤں میں ، کبھی شہروں میں سڑکوں پہ ، بازاروں میں، باغوں میں ، بہاروں میں ، گلزاروں میں شہزاد کے ساتھ گھوم رہی ہیں ——— اپنی بیماری میں شہزاد کی تیمار داری میں ناز برداریوں میں ، قریب ترین قربتوں میں کھوئی رہتی۔ ویسے ہی ان کے کشادہ سینے پہ سر رکھے ۔ ان کے سہارے سے بیٹھی کہانیاں سُنتی رہتی ۔ ان کے ہاتھوں سے چائے پیتی ایک گھونٹ خود پیتے تو دوسرے کے لیے تقدیس کے ہونٹوں سے پیالی لگا دیتے ۔ کھانا خود کھلاتے ———

سمندر کے کنارے پانی کی زوردار لہر سے ڈر کر ان کی گردن میں باہیں ڈالے ان سے اتنے زور سے لپٹ جاتی ۔ خیالوں کی دنیا میں عالم بے خودی میں ۔ زور سے بڑی مضبوطی سے اپنے تکیوں کو باہوں میں بھینچ لیتی ۔

ہزاروں بار شہزاد کی بانہوں کے حصار میں کسمساتی ۔ حلقے تنگ سے تنگ ہوتے جاتے ۔ سینے میں سانس رُکنے لگتا ۔ ان نرم لرجیل ہاتھوں کا لمس ـــــ اپنے بالوں پہ اپنے گالوں پہ عقیدت کے پھول ۔ محبت کے نذرانے ان پھولوں کی پھوار سی محسوس ہوتی ۔ وہ جذبات کی شدت ۔ وہ محبت کی گرمی ۔ پسینے چھوٹنے لگتے ۔ پسینوں میں بھیگی ہوئی تقدیس ہونٹوں کو اپنے ہونٹوں میں دبا لیتی ۔ دانتوں سے کاٹ لیتی ۔ روشوں میں ۔ کیاریوں میں ، گملوں میں رنگین پھولوں پہ پھیلی چاندنی میں ـــــ تقدیس کے مقدس ہاتھوں کو کتنے تقدس سے آنکھوں سے لگاتے ۔ بڑے بے قرار سے وہ آخری لمحات ۔ وہ آخری ملاقات ۔ وہ فرقت کی گھڑی ـــــ دائمی جدائیوں کا وہ منظر ـــــ وہ پیار ـــــ آخری پیار ـــــ آخری بالکل آخری بار ـــــ شہزاد نے تقدیس کی بند پلکوں کو چوم لیا ۔ پلکوں پہ چمکتے انمول ستاروں کو چُن لیا ـــــ یہ قیمتی خزانہ ـــــ آخری نذرانہ لے کر ۔ آخری نذرانہ لے کر چلے گئے ـــــ دور بہت دور ـــــ نظروں سے

دُور ــــــــــــــ گھبرا کر تقدیس کئی گھنٹوں کی سوچوں کے بعد بھیگی پلکیں اُٹھاتی۔ تو یہ چھلکتے ساغر بھرے کے پیالے۔ کٹورا سی آنکھوں سے چھم چھم چھلکتے بہتے آنسوؤں میں حسین سراپا دھندلا جاتا۔ نظر سے دور جاتے شہزاد کہیں بھی نظر نہ آتے ــــ ماضی میں کھوئی۔ حال میں بیدار ہوتی تو شام و سحر انمول ہیرے، موتیوں کے خزانے اپنے ماضی کی یادوں پر، یادوں کے خزانے شہزاد پر لٹاتی رہتی۔ خیالوں کی مالا ٹوٹ جاتی، موتی بکھر جاتے اور ــــــــ وہ پھر موتیوں کو چُننے لگتی۔ کون سی بات تھی جو یاد نہ آتی ــ کوئی بھی بات بھلائی نہ جاتی ــ ہواؤں میں فضاؤں میں یادیں ہی یادیں بکھری تھیں ــ چاروں طرف سے حسین ماضی کی یہ بڑی بڑی خوبصورت تصویریں سامنے گھومتی رہتیں ــ وہی آوازیں کانوں میں گونجتی رہتیں ــ دونوں ہاتھوں سے اپنے کانوں کو زور سے بند کر لیتیں ــ آنکھوں کو بند کر تی ــ آنکھوں پہ تکیہ رکھ لیتی ــ لیکن آوازیں بھی آتی چلی جاتیں ــ نظارے بھی نظروں کے سامنے رہتے ــ

؎ کیا کیا ہمیں یاد آیا ــــــــــــ جب یاد تیری آئی

بے زبان تقدیس کے غم کی گہرائی کا اندازہ لگانا مشکل تھا۔ وہ نیلے سمندروں کی طرح گہرا اور نیلے آسمانوں کی طرح وسیع تھا ـــــــ نازک تو تھی ـــ لیکن اب نزاکت نقاہت میں بدل گئی تھی۔ بے زبان، نحیف و نزار بالکل لاغر ہوتی جا رہی تھی۔ گلاب کی نازک پتیوں جیسے ہر وقت مسکراتے گلابی ہونٹ سفید ہو گئے تھے۔ گداز چہرے پہ ہڈیاں ابھر آئی تھیں۔ رنگت یوں زرد جیسے خون کا ایک قطرہ بھی جسم میں نہیں۔ خوبصورت آنکھیں بے نور سی نظر آتیں۔ گہرے گہرے نیلے حلقے آنکھوں کے نیچے پڑ گئے تھے۔ وہی چمکیلی، نشیلی، شرمیلی آنکھیں۔ جن کے نشے میں جھوم جھوم کر شہزاد مر کے بھی جینے کے وعدے کیا کرتے تھے۔ ان آنکھوں کی قسم کھا کر زندگی بھر ساتھ نبھانے کے وعدے کیا کرتے تھے۔ آج وہ خود تو واقعی مر گئے ـ لیکن مر کے جی رہے تھے۔ ماضی کی وادیوں میں تصورات کی دنیا میں ـ لیکن تقدیس کو جینے جی مار گئے ـ اس کی زندگی، زندگی نہ تھی۔ مر مر کے جیتی تھی ـــ کہ اب شہزاد تو واپس نہیں آئیں گے

مر کے زندہ نہیں ہو سکتے ــــ کبھی بھی ــــ کبھی بھی نہیں ــــ کہ وہ تو تقدیس کی ان چمکیلی، شرمیلی، نشیلی آنکھوں کے نشے میں ڈوب کر مر کے جینے کا وعدہ کیا کرتے تھے۔ اب یہ کیسے ممکن ہو گا ــ ان آنکھوں کا سارا نشہ۔ حُسن۔ سارا نور تو شہزاد کے دور جانے سے جاتا رہا تھا ــــ یہی کچھ سوچتے سوچتے نڈھال سی ہو جاتی، خستہ حال پڑی رہتی ــ نازوں کی پالی تقدیس۔ تقدیر کا وار سہہ نہ سکتی تھی۔ بڑی کاری ضرب تھی کیسے برداشت کر جاتی۔

فوزیہ بیگم ہنسے سے، کھلونا سے بھانجے کو گھنٹوں گود میں اٹھائے، گلابی گالوں کو، ریشم ایسے نرم بالوں کو چومتی رہتیں ــ کالج سے کتنی ہی تو چھٹیاں کر ڈالی تھیں شہزاد کی پیدائش کی خوشی میں ــ نہ پڑھائی نہ لکھائی ــ بس۔ ہر وقت ہر گھڑی سوتے جاگتے گڈے سے کھیلتی رہتی۔ شہزاد کی آغوں آغوں میں کھوئی۔ خود بخود ان سے باتیں کرتیں ــ پھر ان کی شرارتوں، مسکراہٹوں، شوخیوں اور قہقہوں کے مزے لیتی رہتیں ــ شہزاد چار پانچ برس کے ہوئے تھے کہ فوزیہ بیگم والدین کے انتقال کی وجہ سے بڑی بہن

کے پاس رہنے لگیں ۔ سارا دن خالہ بھانجے میں لاڈ ہوتے ۔ کھیل کود ۔ آنکھ مچولی ۔ وہ پڑھائی میں مصروف ہوتیں ۔ تو ــ چپکے سے آجاتے ـــــ نظر بچا کر ان کی کاپی، کتاب قلم ، دوات کچھ نہ کچھ اٹھا کر بھاگ جاتے ـــــ خالہ پیچھے بھانجا آگے ۔ دونوں دوڑتے ۔ کمروں میں ۔ راہداریوں میں ۔ برآمدوں سے ہوتے چھت پہ چڑھ جاتے ۔ کبھی باغ میں نکل جاتے ۔ آگے پیچھے لان میں ، روشوں پہ ۔ پھولوں کے درمیان ۔ درختوں کے پیچھے دوڑتے پھرتے ۔ بہت ستاتے خالہ کو ۔ وہ بڑی محبت سے ۔ بڑی منت سماجت سے ۔ خوشامد سے بہلا کر اپنی چیزیں واپس لے لیتیں ۔ جواب میں شہزاد ہنستے ، کھلکھلاتے ، قہقہے لگاتے ۔ بہت خوش ہوتے کہ خالہ کو خوب بھگایا ۔ ڈھیروں ۔ ٹافی ، چاکلیٹ ، کھلونوں کے وعدوں پہ ۔ کہانیاں سنانے کی شرط پہ ۔ لوریاں سنانے کی ضمانت دی جاتی ۔ شریر بھانجے کو گود میں لیے بے اختیار پیار کرتیں ۔ دوڑ دوڑ کر سانس پھول جاتی ـــ شہزاد کو ساتھ لیے سعدیہ بیگم کے پاس آتیں ۔ دونوں کی شکایات پیش ہوتیں ۔ سعدیہ بیگم مسکراتی جاتیں اور سوچ کر

رہ جائیں کہ یہ شرارتی بچّہ بڑا ہو کر کیا کرے گا ـــــــــ؟

جوں جوں بڑے ہوتے گئے۔ شرارتوں میں روزافزوں اضافہ ہوتا گیا۔ ہر وقت شوخیاں۔ ہر گھڑی شرارتیں۔ ہر دم قہقہے خود بھی ہنستے۔ سب کو خوب ہنساتے۔ گھر بھر کی رونق تھے۔ شبانہ اور تقدیس کے ساتھ چھیڑ چھاڑ۔ فوزیہ بیگم کو بھی نہ چھوڑتے۔ امی سے بھی برابر مذاق ہوتا۔ شرارتوں پہ کبھی پٹائی نہ ہوئی تھی۔ جب بھی کبھی موقع آتا تو فوراً دوڑ کر ہاتھ سے نکل جاتے نہ کبھی ابا حضور کے ہاتھ آئے نہ امی حضور سے مار کھائی۔ چھپ جاتے۔ کبھی خالہ اور کبھی چچا کی گود میں پناہ لے لیتے۔ اپنے چچا جان کو بھی تو بہت عزیز تھے۔ وہ روزانہ ڈھیر ساری چیزیں پیارے بیٹے کے لیے لے کر آتے۔ گود میں بٹھا کر ڈھیروں میٹھی میٹھی پیاری پیاری باتیں سنتے۔ اِدھر اُدھر کی گپیں۔ جھوٹی سچی کہانیاں۔ امّی۔ ابّا کی شکائتیں۔ خالہ جان سے شکوے شبانہ اور تقدیس کی شکایات۔ غرض سارا دن کی رپورٹ چچا جان کو دیتے۔ روزانہ شام کو چچا کے ساتھ سکوٹر پہ سیر کو جاتے۔ جونہی وہ کالج سے آتے پہلے پوری کوٹھی کا ایک

چکمہ شہزاد کو لگوا نے پھر اندر آنے کی اجازت ملتی - وہ بھی پیا۔
سے پیارے پیارے گلابی گالوں پہ پیار کرتے - کبھی خالہ سے
لڑائی ہو جاتی تو چچا سے کہانی سنتے ـــــ جب چچا سے جھگڑا
ہو جاتا تو خالہ سے صلح کر لیتے - ان سے لپٹے، لپٹے
کہانی سننے کی فرمائش کرتے ـــــ پھر ـــــ اپنی
خالہ جان کی ـــــ چچا جان سے شادی پہ ہنستے سے شہزاد
شہ بالا بنے کتنے پیارے لگ رہے تھے - کمخواب کی شیروانی
تنگ پاجامہ - سلیم شاہی سنہری پگڑی ـــ چھوٹا سا دولہا -
وقت کے ساتھ ساتھ شہزاد کا مہتاب سا شباب - خوبصورت
بڑی شفاف بلور سی جوانی ـــ اپنی تقدیس سے دلچسپی ـــ لگاؤ
اقرارِ محبت ـــ باقاعدہ نسبت ـــ وابستگی ـــ کا ـــ یہ ـــ ادھورا
سپنا ـــ ماضی سے نکل کر حقیقت کی دنیا میں آتے تو فوزیہ
بیگم اور ظفر نیازی ایک دوسرے کی ویران آنکھوں میں
دیکھتے رہ جاتے - دل کی سنسان وادی سے آہ اٹھتی -
خاموش لبوں پہ آ کے ٹھہر جاتی - تقدیس کا اداس سراپا ـــ
نمناک وجود ـــــ شہزاد کے المناک غم میں ـــــ اس
کی اندوہناک جدائی کے غم میں چپ چاپ گھلتی اپنی پیاری

بیٹی نہ دیکھی جاتی - آنسوؤں کے سیلاب تھے - آہوں کے طوفان تھے جو ان کمزور و ناتواں انسانوں سے رُک نہ سکتے تھے - غرض شہزاد ان کی دنیا سے کیا گئے - خوشبوؤں بھری بہاروں کے خزانے ساتھ لے گئے -

بہاریں لٹ گئیں - گلشن اُجڑ گئے - بھری بہاروں میں تقدیس اور شبانہ جیسے شگفتہ پھولوں پہ خزاؤں کے سائے تھے - ان کے ہونٹوں پہ آہیں، دل میں نالے تو آنکھوں میں آنسو تھے - پُرنور شب کے وہ جگمگاتے قہقہے - وہ مہندی رات کا دلفریب منظر - بے شمار بلب - ڈھیروں روشنیاں - اندھیروں میں ڈوب گئیں - سعدیہ بیگم - ایک بیوہ ماں - ایک بار پھر اُجڑ گئی تھی - دوبارہ بیوہ ہوگئی تھی ان کا سکون قلب - آنکھوں کی ٹھنڈک - شہزاد نہ رہے تھے - خالہ اور چچا کو سکھ، چین آرام و راحت کا تصور ہی نہ رہا تھا - دل کو بیقراریاں دے گئے تھے شہزاد - صبرو سکون کی دولت سے محروم دل بہلائے نہ بہلتے تھے - تنہائیوں میں سب ہی جی بھر کے روتے - انتہائے بیچارگی میں دلوں کو دلاسے دیتے - لیکن تیل کے بغیر چراغ نہ جلتے

شمع روشن نہ ہوتی ۔ چراغوں میں روشنی نہ آتی ۔ گلستانوں کے گلرنگ نظاروں کو دیکھنے کے لیے ذوقِ نظر نہ رہا تھا ۔ نظروں کو کچھ بھی تو اچھا نہ لگتا کیوں کہ ہر چیز میں رنگ و رعنائی ۔ گل رعنا ۔ شہزاد کی بدولت تھی ۔ زندگی کی بہاریں شہزاد کے دم سے تھیں ۔ پھول ڈالی سے ٹوٹ چکا تھا ۔ یہ نقصان ۔ یہ صدمہ ۔ یہ غم ناقابل تلافی تھا ۔ بچھڑ کر جانے والے کی واپسی کی امید نہ تھی ۔ دوبارہ زندگی میں ملنے کی آس نہ تھی ۔ ہنستے مسکراتے شہزاد کی جدائی کا غم دن بدن گہرا ہوتا جاتا ۔

باب ۱۴

تم سمجھتے رہو، مجھ کو اک اجنبی
اجنبی راہ منزل پہ چلتا رہے

چودھویں کا چاند ـــــ روشن روشن ـــــ بڑا خوبصورت بڑا سارا چاند ـــــ پوری آب و تاب سے چمک رہا تھا۔ کائنات کا ذرہ ذرہ چمک رہا تھا۔ بلند و پست دودھیا چاندنی کے نور سے منور ـــــ اتنی سفید چاندنی تھی کہ رات کے وقت بھی دن کا سماں تھا۔ رات پر دن کا گماں ہوتا تھا۔ چاندنی رات میں بڑی روانی سے بہتا دریا کا پانی سیال چاندی کی طرح چمک رہا تھا۔ اس آب و سیمی کی سرشور لہریں لہراتی، بل کھاتی، اٹھکیلیاں کرتی۔ کناروں سے ٹکراتی اچھل اچھل کر باہر آتی تھیں۔ بہتے پانی میں گول گول بھنور ـــــ بڑے بڑے، چھوٹے چھوٹے بھنور پڑتے۔

دور، دور تک ـ جہاں تک نظر جاتی پانی ہی پانی تھا ـ کہ دریا کا پاٹ بہت چوڑا تھا ـ دوسرا کنارہ تو کہیں نظر ہی نہ آتا تھا ـ پانی بڑی روانی سے بڑی تیزی سے شور مچاتا رواں دواں تھا ـ اور سرکش پانیوں کی منہ زور روانیوں پہ اچھلتی کودتی، لہروں کے سینہ کو چیرتی ـ ننھی سی سفید اور سرخ دھاریوں والی کشتی ہلکورے کھاتی ـ چھینٹے اڑاتی ڈولتی، سنبھلتی ـ پانی پہ بہہ رہی تھی ـ

فرزانہ ـــــ اور ـــــ جاوید ـــــ اس دلکش چاندنی رات کا لطف اٹھانے کے لیے ـــــ خوش گوار ہواؤں میں سیر کی غرض سے خوبصورت نظاروں میں تفریح کیلئے وقت گذارنے کے لیے آ گئے تھے ـ فیروزی سلک کی سنہرے باڈروں والی ساڑھی ـــــ ساڑھی پہ بھی سنہری بیلیں بنی تھیں ـ پلو تو بہت ہی بھاری اور خوبصورت تھا فیروزی ساڑھی میں فروزاں فرزانہ ـ گہرا گہرا میک اپ ـ عروس نو کے سولہ سنگھار ـ چمکتے زیورات ـ خوبصورت چہرہ چمکتی پیشانی ـــــ اور سفید اُجلی اُجلی چاندنی میں چمکتا پانی ـ حسین فرزانہ کی دلنشیں ادائیں ـ ناز و ادا ـ نخریلی اداؤں پہ

دل وجان سے فریفتہ جاوید ۔ فرزانہ پر پروانہ وار قربان ہو رہے تھے ۔ گہرے سوٹ ۔ قرمزی ٹائی میں خود بھی بڑے سمارٹ لگ رہے تھے ۔ سرخ گلابی ۔ گوری رنگت ۔ سیاہ گھونگھریالے بال ہوا کی تیزی کی وجہ سے پیشانی پہ بکھرے ہوئے ۔ بے ترتیب ہو رہے تھے ۔ وہ دونوں ہاتھوں سے پوری قوت سے چپو چلاتے ہوئے ۔ کشتی کے دوسرے کونے پہ اپنے سامنے بیٹھی فرزانہ کی مسکراہٹوں کا جواب دلفریب مسکراہٹوں سے دے رہے تھے ۔ وہ ہنس ہنس کر باتیں کر رہی تھی ۔ جاوید کی باتوں پہ ہنس ہنس کر دوہری ہو رہی تھی ۔ وہ کبھی فرزانہ کے متبسم چہرے کو دیکھتے تو کبھی لب دریا ۔ شب مہتاب میں جھومتے مسکراتے شگفتہ پھولوں پہ نگاہ ڈالتے ۔ فرزانہ تھی بھی تر وتازہ شگفتہ شگفتہ پھولوں سے بھی زیادہ شگفتہ ۔ پانی زیادہ تھا ۔ بہاؤ تیز تھا ۔ چپو چلاتے میں زور بہت لگ رہا تھا ۔ گرمی لگنے لگی ۔ پسینہ آرہا تھا جاوید کو ۔ پیشانی اور چہرے سے پسینے کے قطرے ٹپک رہے تھے ۔ دھاریں بہہ رہی تھیں ۔ ایک ہاتھ سے بٹن کھول کر ۔ دونوں چپو

چھوڑ کر ایک جھٹکے سے کوٹ اُتارا ـــــ اور فرزانہ کی
طرف اچھال دیا۔ کشتی بے قابو ہوگئی۔ اور فرزانہ نے زور
سے چیخ ماری۔ لیکن جاوید دونوں چپو سنبھالے کشتی کو
سنبھال کر چلا رہے تھے۔ کوٹ تہہ کر کے فرزانہ اپنی گود
میں رکھے تھی۔ چپو چلانے کے دوران آگے کو جھکتے تو
فرزانہ جاوید کی عرق آلود پیشانی اور چہرے پہ آیا پسینہ اپنے
رومال سے صاف کر رہی تھی۔ ریشمی ساڑھی پھسل پھسل
جاتی۔ بار بار ڈھلکتا آنچل بڑی نازو ادا سے سنبھالتی۔ تیز
چلتی کشتی ـــ سرکش تیز ہوا۔ آنچل پھر سرک کر ڈھلک جاتا
ہوا کے ساتھ اُڑنے لگتا۔ کبھی ہوا میں اُڑتے بالوں کو
دونوں ہاتھ سر پہ رکھ کے سنوارتی۔ تو کبھی پلو سنبھالتی۔
ساڑھی سنوارتی ـــ وہ شرماتی، لجاتی ساڑھی کا آنچل گوری گوری
کمر اور پیٹ کے گرد لپیٹ لیتی۔ سینے پر پھیلاتی ہوئی کندھے
پر لے آتی۔ اور شانے پہ اپنا ہاتھ رکھ لیتی۔ دوسرے ہاتھ
سے پھر اُڑتے بالوں کو سمیٹنے کی ناکام کوشش کر کے ہار سی
جاتی۔ جاوید، حُسن و جوانی کے روپ کو دلفریب نظاروں
میں دیکھتے بڑے بے خود سے چپو سے کھیلتے پانی پہ

بہے چلے جا رہے تھے - چاندنی رات کے خوبصورت دلکش نظاروں میں دونوں میاں بیوی نئی زندگی کی نویلی خوشیوں میں مست تھے - محبت کے ٹھاٹھیں مارتے سمندر میں غوطہ زن - لہروں کے ساتھ - لہروں کے اوپر عیش و مسرت کی زندگی کے مزے لے رہے تھے -

جاوید مقامی فیکٹری میں ملازم تھے - پڑھے لکھے سند یافتہ انجینئر - معقول تنخواہ تھی - چار کمرے کا مختصر مگر بڑا مکمل بنگلہ فیکٹری کی طرف سے ملا ہوا تھا - کمروں کے ساتھ غسلخانے صاف ستھرا باورچی خانہ - بجلی، پانی، گیس کی مفت سہولت دونوں طرف گول برآمدہ - جالیاں - پردے لگے - فرنیچر کمپنی کی طرف سے - بنگلے کے صحن کی حدود کے لیے اونچی سبز باڑ چاروں طرف لگی تھی - سرسبز لان - موسم کے پھول گملوں - کیاریوں میں لگے تھے - آم، جامن، امرود، مالٹے وغیرہ کے پھل دار درخت بھی تھے - ذاتی موٹر کا خرچہ ملتا تھا یا فیکٹری کی گاڑی آمد و رفت کی سہولت کے لیے آتی تھی - خانساماں کی تنخواہ بھی ملتی تھی کہ کمپنی امریکن لوگوں نے یہاں بنا رکھی تھی -

سگے ماموں کی حسین لڑکی فرزانہ سے اپنی پسند سے۔ فرزانہ کی مرضی سے چند دن ہوئے شادی ہوئی تھی۔ شادی کے لیے دو ماہ کی رخصت لی تھی۔ روزانہ فرزانہ کے ساتھ کہیں نہ کہیں سیر کا پروگرام بناتے۔ عیش کرتے۔ زندگی بڑی حسین، شب و روز بڑے رنگین گزر رہے تھے۔ اس وقت بھی دونوں اپنی ہی محبت کی دُنیا میں مست تھے کہ ایک دم مطلع ابر آلود ہونے لگا۔ سارے آسمان پہ گھرے گھرے بادل اچانک چھانے لگے۔ چودھویں کا پورا چاند تمام دنیا پہ اپنی روشنی پھیلا رہا تھا۔ اب بادلوں کے ساتھ آنکھ مچولی کھیل رہا تھا۔ بادلوں میں چُھپا چاند آہستہ آہستہ باہر نکلتا۔ ادھر سے پھر بادل چھا جاتے۔ چاند بادلوں کی اوٹ میں آجاتا جیسے کوئی ماہ جبین اپنے محبوب کے ساتھ آنکھ مچولی کھیل رہی ہو۔ کبھی پکڑی جاتی۔ کبھی چپکے سے کھسک جاتی۔ بالکل جیسے فرزانہ اور جاوید ——— جاوید اور فرزانہ آج کل ——— جاوید نے اوپر آسمان کا رنگ بدلتے دیکھ کر فرزانہ کو باہوں میں سمیٹ لیا۔ اسی طرح سہارا دے کر اپنی فرزانہ کو کشتی سے اترنے میں

مدد دی - پھر کشتی کو دریا کے کنارے لگے بڑے درخت کے ساتھ باندھا اور دونوں ایک دوسرے کے سہارے بانہوں میں بانہیں ڈالے، سرشار سے، جھومتے، جھامتے، دریا کے کنارے کنارے چلنے لگے - بڑے اونچے اونچے کھجور کے تناور درختوں کے جھنڈ کے نیچے - پھولوں کے تختوں سے پرے - کافی دور ان کی گاڑی کھڑی تھی - بارش شروع ہو چکی تھی - ہلکی ہلکی بارش - جاوید جھکے اور کیاری سے ایک آتشیں گلاب توڑا - پہلے سونگھا - ہونٹوں سے لگایا - پھر بڑے روحانی انداز میں فرزانہ کے گالوں سے چھو کر اس کے کالے بالوں میں لگا دیا - لمبی چوٹی فرزانہ کی کمر پر مست ناگن کی طرح بل کھا رہی تھی - محبت کا جواب - محبت کی زبان میں دیا - فرزانہ نے - پیار کا نذرانہ اپنے جاوید کی نذر کیا - پھول کا شکریہ - محبت کا شکرانہ تھا - فرزانہ کا پیار -

جاوید بڑی آہستہ موٹر چلا رہے تھے - کہ فرزانہ کی نازک مزاجی - تیز رفتار گاڑی سے طبیعت گھبراتی تھی - دونوں ہاتھوں سے جاوید کے ہاتھ پکڑ لیا کرتی -

"ہائے جاوید! آہستہ چلاؤ میرا دل گھبراتا ہے - مجھے

بڑا ڈر لگتا ہے " وہ اپنی نازک طبع کا یوں اظہار کرتی۔ اور جاوید نثار ہو جاتے اس ادا پہ " وہ دونوں ۔ دریا کے کنارے سے کافی دور ۔ پختہ سڑک سے بہت فاصلے پہ ۔ کھجور کے اونچے اونچے، بڑے بڑے درختوں کے گھنے جھنڈ میں سے گزر رہے تھے ۔ اندھیرے گھپ میں کہ جہاں چاند یا سورج کی روشنی کبھی پہونچ نہ سکتی تھی ۔

" اوئی اللہ ـــ " فرزانہ نے ڈر کے مارے چیخ ماری ـــ اور آنکھیں بند کر کے جاوید سے لپٹ گئی ۔ خوف کی زیادتی کی وجہ سے اب اس کی آواز نہ نکل رہی تھی ۔ جاوید نے ایک ہاتھ سے موٹر سنبھالتے ہوئے ۔ دوسرے بازو میں فرزانہ کو سنبھالا دیا ۔ بڑی محبت سے بڑی نرمی سے خوف سے لرزتی فرزانہ کو دلاسہ دیا ۔ ہمت و حوصلہ برقرار رکھنے کی تلقین کی ـ اور بریک لگادی ۔ گاڑی روک کر اُترے ـــ سامنے کی تیز روشنیوں میں منظر صاف نظر آرہا تھا ۔

" خوبرو ـــ دراز قامت ـ صحت مند ـ نوجوان ۔ ٹھنڈی ریت اور کھردرے پتھروں پہ بے سدھ پڑا تھا ۔ خاموش پُرسکون ۔ سویا ہوا نوجوان ـــ جیسے صدیوں کی مسافت کے

بعد — تھک ہار کر ۔ کوئی بڑا شوخ ۔ سرشور ۔ بڑا منہ زور دریا ۔ پتھروں کے سینے سے لگ کر ٹھنڈی ریت پہ ۔ درختوں کے سائے میں اجاڑ و سنسان جنگل کی آغوش میں محوِخواب ہو ۔ نیند گہری بڑی گہری تھی ۔ بڑی پُرسکون دنیا و مافیہا سے بے خبر تھا ۔ مست خواب نوجوان ۔ جاوید آہستہ آہستہ قریب آئے ۔ گھبرا کر اِدھر اُدھر دیکھا ۔ چارسو خاموش تنہائی ۔ ویران سناٹا ۔ پُرہول ہیبت ناک اندھیرا — درختوں کے پتوں کی سائیں سائیں — دریا کا شور ۔ پانی کے پتھروں سے ٹکرانے کی آواز ایسے میں بڑی خوفناک لگ رہی تھی ۔ اوپر سے سیاہ بادل ۔ گھنے جنگل میں ۔ اپنی جان کا خوف — جوان بیوی کا ساتھ ۔ ابھی تو شادی کو چوتھا دن تھا ۔ یہی سوچ رہے تھے ۔ پھر جان ہتھیلی پہ رکھ کے ہمت کی ۔ آگے بڑھے ۔ تھوڑا سا جھکے تو ـــــــــــــــ

، خوبصورت نوجوان کا بے جان زرد چہرہ ' خوف سے ان کی چیخ نکل گئی ۔ جوان لاوارث لاش کو دیکھ کر ۔ وہ دیکھتے رہے وہیں بے حس و حرکت کھڑے رہے ۔ ان کی آنکھوں کے سامنے ـــ موٹی موٹی بند آنکھیں ۔

دراز پلکیں ۔ سیاہ پلکیں ۔ چوڑا چہرہ ۔ خوبصورت ستواں ناک بکھرے ہوئے بے ترتیب بال ، اجلی پیشانی پہ بکھرے ہوئے ناک سے خون بہہ کر خشک ہو چکا تھا ۔ اور دھار کی صورت میں گداز ہونٹوں پر سے ہوتا ہوا ۔ سفید بے جان ہونٹوں پہ سرخی لگاتا ہوا ، تھوڑی کے درمیان چھوٹی سی گہرائی میں جم گیا تھا ۔ جابجا پھٹے کپڑے ۔ خون ہی خون ۔ داغ دار سفید کپڑے ۔ پاؤں میں جوتا نہیں تھا ۔ چہرے کو چھوا ماتھے پہ ہاتھ رکھا ۔ ٹھنڈا یخ بستہ ۔ نبض دیکھی ۔ بالکل مدہم شاید چل ہی نہیں رہی تھی ۔ جسم برف کی مانند ٹھنڈا ۔ ناک کے آگے ہاتھ رکھا ۔ برائے نام سانس آرہی تھی ۔ دل پہ ہاتھ رکھا تو ـــــــــ دھڑکن ابھی باقی تھی ۔ بالکل ہلکی ۔ بڑی معمولی سی ۔ جامہ تلاشی کے بعد بھی کچھ نام و پتہ ، پتہ نہ چل سکا ۔ جاوید کی جان نکل گئی ۔ حرکت کرنے کی سکت نہ رہی ۔ خوفزدہ فرزانہ ـــــــــ جاوید کا بازو مضبوطی سے پکڑے ساتھ کھڑی تھی ـــ اس وقت نہ کچھ بول سکتی تھی ۔ نہ سن سکتی تھی ۔ پیار محبت ، نازوانداز ۔ کسی بات کا ہوش نہ تھا ۔ رنگ فق تھر تھر کانپتی فرزانہ ـــــــــ

حالات بتا رہے تھے کہ حسین و جمیل نوجوانوں کو راہزنوں نے لوٹ لیا تھا۔ خون میں لت پت سفید مگر بہت قیمتی کپڑے بتا رہے تھے۔ کہ کوئی رئیس زادہ ہے۔ کسی دولت مند گھرانے کا چشم و چراغ ہے۔ دولت کے لالچ میں اس کی جان لی تھی۔ ڈاکوؤں نے۔ یہ سوچکر فرزانہ کی جان نکلی جا رہی تھی۔ جاوید بہت پریشان تھے۔ خوفزدہ بھی بہت۔ پھر بھی باہمت مرد۔ جوان جہان انسان۔ اللہ کا نام لے کر نیم جان۔ بے سدھ۔ مگر تنومند۔ دراز قامت حسین نوجوان کو دونوں مضبوط باہوں میں بڑی مضبوطی سے اٹھا لیا۔ قد و قامت بھی اچھی۔ جسم بھی صحت مند۔ اٹھانا مشکل ہو رہا تھا۔ گاڑی کی پچھلی نشست پر جوں توں کر کے لٹا دیا۔ لمبا چوڑا، اچھے خاصے وجود و وزن کا بے حس و حرکت نوجوان، اس خطرناک ماحول میں اٹھانا اور گاڑی میں لٹانا آسان کام نہ تھا۔ ڈری سہمی فرزانہ آنکھیں پھاڑے دروازہ کھولے کھڑی تھی گاڑی کا۔ اتنے خوف و ہراس میں بھی وہ جاوید کی مدد کر رہی تھی۔ گاڑی کا پچھلا دروازہ اچھی طرح بند کرنے کے بعد فرزانہ کو اپنے ساتھ

بٹھا کر جاوید نے آہستہ سے گاڑی چلا دی - بغیر کسی آہٹ
بغیر کسی آواز کے - انہیں بہت ڈر لگ رہا تھا - خوفزدہ تھے
راہزنوں سے خطرہ تھا - ڈاکو ویرانے میں ان کا بھی بھی
حشر نہ کر دیں - ان کے ساتھ نو نوجوان خوبصورت بیوی
ڈھیروں ڈھیر ہیرے جواہرات - قیمتی زیورات پہنے تھی -
اندھیرے گھپ میں فرزانہ نے جاوید کی ہدایت پر جلدی
جلدی طلائی چوڑیاں، بڑے بڑے جھمکے - گلوبند - بڑا ہار
غرض تمام زیورات اتار کر ساتھ گاڑی میں بنے چھوٹے
خانے میں رکھ دیئے - جاوید نے چابی گھما کر تالا لگا دیا - -
فرزانہ کے بالوں میں لگا سرخ گلاب جھک جھک کر جیسے اس
کے کان میں سرگوشی کر رہا تھا -

"اندھیرا ــــ چور ــــ ڈاکو ــــ قتل ــــ موت"

اس وہم سے فرزانہ کی رہی سہی جان بھی نکلی جا رہی تھی
خدا خدا کر کے تقریباً دو میل کا خاصہ طویل راستہ ختم ہوا ــــ
شہر کی پختہ کشادہ ــــ صاف ستھری سرمئی سڑک پہ گاڑی لا
کر جاوید نے رفتار تیز کر دی - بہت تیز - فرزانہ کی
طبیعت کی خرابی ــــ طبعی نزاکت کی پرواہ کیے بغیر - اس وقت

تو فرزانہ نے بھی سکھ کا سانس لیا۔ وہ سارے ناز نخرے ادائیں بھولی ہوئی تھی۔ طبیعت کی گھبراہٹ یاد نہ تھی۔ بس اپنی اور جاوید کی جان کے لالے پڑے تھے۔ دودھیا چاندنی بڑی دیر سے غائب ہو چکی تھی۔ چودھویں کا چاند چھپ چکا تھا۔ بڑی تیز آندھی چل رہی تھی۔ گہرے سیاہ بادل اور تیز طوفانی بارش۔ اوپر سے سارے شہر کی بجلیاں بند۔ ایک تو موسم خراب اوپر سے اندھیرا۔ بجلی بند ہو جانے سے موسم، منظر اور فضا اور بھی ڈراؤنی بڑی خوفناک ہو گئی۔ ہوا بڑی تیز چل رہی تھی۔ ہوا کی طرح تیز دوڑتی گہرے سبز رنگ کی موٹر شہر کے بڑے سرکاری ہسپتال کے سیاہ لوہے کے پھاٹک میں تیزی سے داخل ہوئی۔ چاروں طرف پانی ہی پانی۔ سڑک پر صحن میں۔ کمروں کے آگے۔ برآمدوں میں پانی۔ اُوپر آسمان سے دھواں دھار برستا پانی۔ چاروں طرف جمع ہو گیا تھا۔ تیز دھاروں کی صورت میں بہہ رہا تھا۔ اتنے خراب موسم میں اتنی رات گئے۔ ہسپتال میں ویرانی۔ سنسانی پھیلی تھی۔ ڈاکٹر صاحبان اپنی خوابگاہوں اور نرسیں اونگھتی ہوئی۔ اپنے افسران کی

عدم وجودگی ہیں ڈیوٹی سے غائب - مریض بے چارے اپنے
حال میں مرتے جیتے سپردِ خدا - خدا کے حوالے -

بڑی دیر کے بعد - پریشان کن تگ و دو کے بعد -
جاوید نے بڑی بھاگ دوڑ کی تو اپنے مریض کو ایمرجنسی
وارڈ میں داخل کروایا - ڈیوٹی روم میں کرسی پر نیم دراز
سامنے کرسی پہ پاؤں رکھے - سوتی جاگتی گڑیا سی نرس کو
جگا کر لائے - سفید فراک و شلوار کے ساتھ سر پہ چھوٹی
سی سفید ٹوپی رکھے - بڑی سمارٹ لگ رہی تھی - چونک
کر کھڑی ہو گئی - سفید کوٹ پہنے عمر رسیدہ ڈاکٹر عباس
بھی اپنے آلات سمیت آ گئے - نرس کی مدد سے مریض
کا فوری معائنہ کیا - حالت بہت خراب تھی - زندگی کے
آثار نہ تھے بچنے کی امید نہ تھی - مریض چند گھنٹوں کا مہمان
تھا - دل کی دھڑکن رفتہ رفتہ بند ہو رہی تھی - ڈاکٹر عباس
بڑے تجربہ کار - بڑے ماہر مشہور نیورو سرجن تھے -
ماہر دماغی امراض کے ڈاکٹر -

" دماغ پہ چوٹ ہے " انھوں نے پریشان حال جاوید
کی طرف دیکھتے ہوئے کہا - اور مریض کی حالت اور

پچھلے واقعات سے خوفزدہ ۔ گھبرائی ۔ روتی ہوئی فرزانہ کے سر پر شفقت سے ہاتھ رکھتے ہوئے کہا ۔

"دعا کرو بیٹی ۔ گھبراؤ نہیں ۔" وہ فرزانہ کو تسلی دے رہے تھے ۔ جاوید سے مختلف سوالات کر رہے تھے ۔ مریض کے متعلق ۔ ڈاکٹر صاحب کی آواز سن کر اور بھی کئی ڈاکٹر ۔ کئی نرسیں تیز تیز چلتے ہوئے آ گئے ۔ ڈاکٹر عباس کے ارد گرد ۔

" فوری اپریشن کا بندوبست کروایئے ۔ بڑی ایمرجنسی ہے ۔" ڈاکٹر عباس نے سفید یونیفارم میں مؤدب کھڑی نرس سے کہا ۔ انداز افسرانہ ۔ تحکمانہ ۔ مگر بزرگانہ شفقت لیے ہوئے تھا ۔ لہجے میں نرمی بھی تھی ۔ رعب بھی تھا ۔ وقار بھی تھا پیار بھی تھا ۔

تیز طوفانی بارش میں ۔ خاموش ۔ سنسان ہسپتال میں ایک دم زندگی بیدار ہو اٹھی ۔ جب کہ نوجوان مریض کی جان خطرے میں تھی ۔ زندگی کا بھروسہ نہ تھا ۔ حالت بڑی نازک تھی ۔ دو ڈاکٹر اور نرسیں ڈاکٹر عباس کے حکم سے ان کے ساتھ چل دیئے ۔ سب بڑی ہمدردی اور فکر مندی

سے مریض کی زندگی بچانے کے لیے تیار تھے ۔ دُکھی انسانیت کی خدمت ۔ مریضوں سے ہمدردی، اقربا کی پریشانی ۔ اور فکرمندی دُور کرنا ڈاکٹری کے پیشے کی بنیاد ہوتے ہیں ۔ کہ دن رات ان کا کام ہی یہی ہوتا ہے ۔ کہ بیماروں ، مریضوں ، زخمیوں کی تیمار داری ۔ خدمت گزاری اور اصل بیماری کا تدارک کریں ۔ خدا کا لاکھ بار شکر کہ ہسپتال میں بجلی کا علیحدہ انتظام تھا ۔ جنریٹر لگوائے گئے تھے ۔ ورنہ تو سارا شہر تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا ۔

ڈاکٹر عباس اپنے کام میں بڑے ماہر ۔ فن سرجری میں یکتا ۔ بزرگ ہونے کی وجہ سے ان کی پدرانہ شفقت مریضوں اور ان کے عزیزوں کی تسلی تشفی کا باعث ہوتی ۔ اس وقت مریض کی حالت انتہائی غیر تسلی بخش ہونے کے باوجود ، اس کی زندگی سے مایوس ہونے کے باوجود ۔ جاوید کی بڑی دلجوئی کر رہے تھے ۔ فرزانہ کی ہمت بندھا رہے تھے ۔ ان دونوں کو انتظار گاہ میں بیٹھنے کا کہہ رہے تھے ۔ فرزانہ روتی رہی ، گھبراتی رہی ۔ اور جاوید پریشانی میں ٹہلتے رہے ۔ کبھی اپریشن تھیٹر کے بند

دروازے تک جاتے ۔ پھر واپس آجاتے ۔ کبھی بینچ پہ بیٹھ جاتے۔ پھر کھڑے ہو جاتے ۔ ٹہلنے لگتے ۔ دونوں آپس میں کوئی بات نہ کر رہے تھے ۔ کئی گھنٹے کے بعد آپریشن تھیٹر کا دروازہ کھلا ۔ جواں سال بے ہوش مریض کو برقی سٹریچر کی مدد سے اُوپر کی منزل میں چھوٹے سے علیحدہ ، ہوادار، صاف ستھرے کمرے میں اُجلے بستر پر لٹا دیا گیا ۔ اردگرد سُرخ کمبل لپٹا تھا ۔ خون آلود کپڑے اُتار کر ہسپتال کے کپڑے پہنا دیئے گئے تھے ۔ برقی ہیٹر کی مدد سے کمرے کو گرم کیا جا رہا تھا ۔ تند ہواؤں، طوفانی بارش میں دریا کے کنارے جنگل میں لاوارث پڑے نوجوان کے یخ بستہ ۔ نیم مردہ جسم کو حرارت پہونچائی جا رہی تھی ۔ آکسیجن لگا دی گئی تھی ۔ کہ پھیپھڑوں پہ سردی کا اثر تھا ۔ سانس رُک رُک کر آرہا تھا ۔ لیکن وہ ان سب انتظامات سے اپنی خدمات سے بے خبر ۔ دنیا سے دنیا والوں سے بے نیاز بے ہوش پڑے تھے ۔ اسی افراتفری میں پریشانی میں وقت گزرتے کا پتہ ہی نہ چلا ۔ کب بادل چھٹ گئے ۔ کب بارش تھم گئی ۔ چاند دوبارہ نکل آیا ۔ اب تو

ستاروں کے دیپ آہستہ آہستہ بجھ رہے تھے ۔ چاند اپنی خوابگاہ میں جا چکا تھا ۔ سورج کی ننھی منی کرنیں ۔ آنکھیں ملتی بیدار ہو رہی تھیں ۔ کوٹھوں ، چھتوں ، سے گزرتی ۔ دیواروں کواڑوں سے ہوتی ۔ کھڑکیوں ۔ دروازوں کے شیشوں پہ چمکنے لگیں ۔ کہ رات کی زور دار بارش کے بعد آسمان صاف تھا ۔ بارش کا پانی چاروں طرف پھیلا تھا ۔ ہر چیز دُھلی دُھلی ، نکھری ہوئی نظر آ رہی تھی ۔ لیکن جاوید کے دل و دماغ پہ پریشانیوں کے بادل اسی طرح منڈلا رہے تھے ۔ گھر گھر کے آ رہے تھے ۔ وہ گہری سوچوں میں ڈوبے تھے ۔ مریض کی حالت خطرے میں تھی ۔ وہ بڑے نا امید تھے ۔ کہ ڈاکٹروں کے چہرے پہ مایوسی چھائی تھی ۔

ڈاکٹر عباس نے سخت نا امیدی کے باوجود بھی جاوید کو امید بندھائی تھی ۔ بے آس فرزانہ کو آس دلائی تھی ۔ ۔ ۔ تسلیاں دے رہے تھے کہ اگر چوبیس گھنٹے خیریت سے گزر جائیں تو پھر چیک اَپ کے بعد پتہ چلے گا ۔ شاید مریض کے ہوش میں آنے کی امید کی جا سکے ۔ وہ بھی کئی ماہ کے بعد ۔ دماغ کے پھپھلے ۔ بڑے نازک ۔ انتہائی کمزور

حصّے پہ ضرب آئی تھی - جس کی وجہ سے عموماً مریض بے ہوش رہتا ہے ۔ احساس کی ساری قوتیں جواب دے جاتی ہیں - کیونکہ عصبی نظام میں خلل واقع ہو جاتا ہے۔ اعصابی ریشے ٹوٹ پھوٹ جاتے ہیں - اگر خوش قسمتی سے ایسے مریض کو ہوش آ بھی جائے وہ بظاہر صحت یاب ہو بھی جائے تو بھی ماضی کو بھول جاتا ہے ۔ پچھلی یاد داشت کھو دیتا ہے - ڈاکٹر عباس نے آہستہ آہستہ مریض کی اصل حالت بتا دی تھی - جاوید کو اندھیرے میں نہیں رکھا تھا ــ تاکہ ذہنی طور پہ وہ آنے والے حالات کے لیے تیار ہو جائیں - جواں بھائی کی موت ــ یا ــ بے حس وحرکت مفلوج زندگی ــ دونوں صورتوں کے لیے ــ یہ صدمات برداشت کرنے کے لیے - درحقیقت وہ بھی اور ان کے دیگر ساتھی ڈاکٹر صاحبان، نوجوان کی زندگی سے ــ صحت سے بالکل ناامید تھے ــ مریض خطرے میں تھا - حالت خطرناک تھی -

جاوید ــ خوفِ خُدا ــ انسانی ہمدردی کے فطری جذبہ ــ دردِ دل کے احساس کی وجہ سے ــ انجان نوجوان

کو اپنی جان خطرے میں ڈال کر یوں بیابان سے اٹھا لائے تھے اپنا جان کر ہسپتال میں داخل کیا تھا اور یوں فکرمند تھے کہ ان کا چھوٹا بھائی ۔ سگا بھائی موت وحیات کی کشمکش میں ہے ۔ ڈاکٹر عباس سے تعارف بھی اپنا چھوٹا بھائی کہہ کر کروایا تھا ہسپتال میں اندراج بھی یہی کروایا تھا ۔ اپنا نام ۔ اپنا ایڈریس لکھوایا تھا ۔ نوجوان کو اپنا لیا تھا انہوں نے ۔ بھائی بنا لیا تھا ۔ ذاتی خرچ پہ علیٰحدہ کمرہ لیا ۔ دوسرے لوگوں کی وجہ سے مریض کو کسی امیر گھرانے کے چشم وچراغ کو تکلیف نہ ہو طبیعت بہت خراب تھی ۔ حالت نازک تھی ۔ نہ جانے کب کیا ہو جائے ۔ خدا کے حضور تو سرخرو ہوں گے کہ ایک بے بس انسان کو ۔ خدا کی مخلوق کو محض خدا کی خوشنودی کیلئے سہارا دیا تھا ۔ مریض کے لیے سارے انتظامات تسلی بخش ہو گئے ۔ تو کچھ مطمئن ہوئے ۔ ان کو مریض کے کمرے میں جانے کی ۔ ٹھہرنے کی اجازت نہ تھی ۔ صرف شیشے میں سے دیکھ سکتے تھے ۔ مریض کے پاس صرف ایک ڈاکٹر اور ڈیوٹی نرس رہ سکتی تھی ۔ ان کا اب وہاں ٹھہرنا بیکار تھا ۔ خدا کی حفاظت میں ، ڈاکٹروں کے سہارے پہ ــــ دل

ہی دل میں دعائیں مانگتے۔ ڈاکٹروں اور نرسوں کا۔ ان کی بروقت امداد و تعاون کا شکریہ ادا کرتے ہوئے فرزانہ کو لے کر گھر واپس آ گئے۔ کل دوپہر سے کھانا کھایا ہوا تھا۔ بھوک پیاس۔ پھر سنسان۔ ویران جنگل میں۔ اندھیرے میں نیم مردہ لاش کو دیکھ کر خوفزدہ ۔۔۔ پھر اجنبی نوجوان کی موجودہ حالت سے فکرمند۔ اس کی زندگی کے لیے پریشان۔ کہ ڈاکٹر رسمی تسلی کے علاوہ زیادہ اطمینان نہ دلا رہے تھے۔ اس کے ساتھ ساتھ رات بھر جاگنا بھی پڑا۔ بُرا حال تھا دونوں کا۔ تھرموس میں چائے سنیڈ وچز جو ساتھ لے گئے وہ بھی یاد نہ رہے تھے۔ رات کا کھانا بھی نہ کھا سکے کہ دریا کی سیر کے بعد ۔ کشتی میں گھومنے کے بعد مرغ پلاؤ۔ شہر کے مشہور ہوٹل سے مرغ پلاؤ کھانے کا پروگرام تھا قابل رحم حالت تھی بےچاروں کی ۔ اچھا ہنی مون ہوا۔ اب اگلی صبح گھر جو پہونچے تو مالکؒ، مالکن کی رات بھر کی غیرحاضری سے ملازمین حیران و پریشان بیرونی برآمدے میں بیٹھے تھے۔ نو، دس سال کی چھوٹی لڑکی جو فرزانہ کی تنہائی کے خیال سے رکھی تھی۔ وہ بھی کھانا کھائے بغیر برآمدے

میں فرش پہ سو گئی تھی ۔ کہ جاوید اور فرزانہ کے انتظار میں۔
نوکروں نے اس کو بھی کچھ نہ دیا۔ خود بھی کچھ نہ کھایا ــــ
ساری رات تو گیٹ پہ نظریں جمائے ــــ ہر آہٹ پہ کان
لگائے گذر گئی تھی ۔ دونوں میاں بیوی کو بخیریت آتا دیکھ
کر نوکروں کی جان میں جان آئی ۔ خُدا کا صدہا بار شکر
کرتے اُٹھ کر دوڑتے ہوئے آئے ۔ صاحب کی گاڑی کے
قریب ــ دونوں کی حالت خستہ تھی ۔ چہرے سے پریشانی
عیاں ۔ تھکن کے آثار ــــ اس وقت صبح کے دس بج رہے
تھے ۔ خانساماں نے جلدی جلدی ناشتہ بنایا۔ گرم چائے
پی کر ان کی آنکھیں کُھلیں ــ چکراتے سر کو سکون مِلا۔ تمام
رات کی کوفت اور پریشانی سے نڈھال ہو رہے تھے ــــ
زیادہ ــ پریشانی تو یہ تھی کہ ـــ آخر ـــ یہ اجنبی نوجوان
کون ہے ـــــ ؟ اور یوں جنگل بیابان میں کیوں پھینکا
گیا ۔؟ شکل و صورت ـــ سے امیر زادہ ـــــ شاہ زادہ
لگتا تھا ـــ اسی فکر ـــ اسی سوچ بچار ۔ میں نہا دھو
کر کپڑے تبدیل کیے ــ نیند سے بُرا حال تھا ۔ ایسے
سوئے کہ شام کو اندھیرا ہوتے جا کر کہیں بیدار ہوئے

جلدی جلدی تیار ہو کر ہسپتال پہنچے ۔ اب روزانہ کا معمول بن گیا کہ صبح و شام جا کر مریض کو دیکھ آتے ۔ ڈاکٹروں سے حالت پوچھتے ۔ دوا علاج کے بارے میں پوچھتے ۔ آمدنی اچھی تھی ۔ مالی حالت تسلی بخش تھی ۔ اخراجات زیادہ تر کمپنی کے ذمے تھے ۔ ابھی ابھی شادی ہوئی تھی ۔ فرزانہ کے والدین وطن سے باہر رہتے تھے ۔ اس لیے انہوں نے جہیز میں زیادہ چیزیں دینے کی بجائے ۔ ایک بڑی رقم یہاں کے بنک میں جمع کروا دی ۔ کہ بیٹی داماد اپنی پسند سے گھر کی گھرداری کی جو چیزیں پسند کریں بنوا لیں ۔ اپنی تنخواہ بھی ذاتی اخراجات کے بعد بنک میں رکھوا دیتے ۔ اس لیے ہسپتال کے اخراجات برداشت کرنے میں کوئی دقت پیش نہ آ رہی تھی ۔ قدرتی طور پر ہاتھ کھلا تھا ۔ دل بڑا تھا ۔ بڑے سخی انسان تھے ۔ بے دریغ روپیہ خرچ کرتے رہے ۔ بے لوث جذبہ تھا ان کا ۔ اسی مصروفیت میں شادی کے لیے لی ہوئی رخصت ختم ہو گئی ۔ پہاڑ پہ جانے کا پروگرام ۔ سرسبز وادیوں میں گھومنے کا ۔ خوبصورت جھیلوں کو دیکھنے کا ارادہ ۔ سارے پروگرام ملتوی کر دیئے تھے ۔ اسی طرح ہسپتال کے چکروں

ہیں - مریض کی دیکھ بھال میں دو ماہ گزر گئے - وہ دونوں بہت خوش تھے - کہ کسی مقصد کے لیے انہوں نے قربانی دی - سیر و تفریح کی بجائے خدا کے بندے کی خدمت کی ہے - ایک انسانی جان بچائی ہے - اس بات سے خدا تعالیٰ خوش ہو گا - اس کی خوشنودی حاصل ہو گی اور وہ اپنے فضل و کرم سے اور بھی خوشیاں دے گا ــــ اپنی رحمتوں سے برکتوں سے نوازے گا ــــ

جاوید نے کئی بار سوچا کہ اخباروں میں پرویز کیلئے اعلان نکلوا دیں - نہ جانے ان کے ورثاء پر کیا بیت رہی ہو گی - جوان شوہر کی ــــ جوان بھائی کی - جوان بیٹے کی جدائی نے کیا کیا قیامت ڈھائی ہو گی - اس اچانک موت نے ــــ نہ معلوم کتنے معصوم - کتنے بے زبان بچے باپ کے پیار سے محروم ہو گئے ہوں گے - باپ بوڑھا ہو گیا ہو گا - یہ سوچ کر کئی دفعہ قلم اٹھایا ــ کئی بار فون کرنا چاہا لیکن پھر اندیشوں میں گھرے وہیں رک جاتے - نہ جانے اس حادثہ کی بنیاد کیا ہے ــــــ ؟ اس نوجوان کی زندگی کی خبر پا کر دشمن کوئی اور حربہ ہی نہ آزمائیں

اس کی زندگی سے مایوس حیات ۔ موت وحیات کی کشمکش میں پڑا مریض ۔ کہیں اس کی وجہ سے ان کی اور فرزانہ کی زندگی بھی خطرے میں نہ پڑ جائے ۔ دشمن تو قتل کر کے ۔ مردہ سمجھ کر پھینک گیا تھا ۔ اب زندہ بچ جانے کا سُن کر غصے میں پھر حملہ ہی نہ کر دے ۔ اس کے ساتھ ہم لوگ کسی مصیبت میں نہ پھنس جائیں ۔ ہمدردی کرتے ثواب کماتے کہیں اپنی جان گنوائیں ۔ اسی خوف سے وہ خاموش رہے ۔

جاوید کی چھٹی ختم ہوگئی تھی ۔ وہ روزانہ دفتر جاتے ۔ فرزانہ گھر پہ ہوتی ۔ چھوٹی لڑکی جو جاوید نے فرزانہ کی خاطر رکھی تھی ۔ اپنی چھوٹی چھوٹی ۔ پیاری باتوں سے اس کا دل بہلاتی ۔ خانساماں باورچی خانے میں اپنے کھانے پکانے میں لگا رہتا ۔ مائی آکر صفائی وغیرہ کر جاتی ۔ دفتر کے بعد آرام کرتے ۔ اور شام کو دونوں میاں بیوی تیار ہو کر ہسپتال آجاتے ۔ آؤٹنگ بھی ہو جاتی ۔ کئی نئے پرانے لوگوں سے ملاقات ہو جاتی ۔ پرویز کو بھی دیکھ لیتے ۔ جو ابھی تک ویسے ہی خاموش پڑے تھے ۔ جاوید کسی دن وقت نکال

کے صبح کے وقت بھی دفتر سے آجاتے۔ فرزانہ کو ساتھ لے کر پرویز کو دیکھ جاتے۔

"جاوید صاحب ــــ پرویز آپ کے بھائی نہیں لگتے۔"

جاوید اور پرویز کی شکلوں میں فرق تھا۔ اگرچہ دونوں خوبصورت تھے۔ رنگت صاف تھی لیکن نقش ونگار نہ ملتے تھے۔ جاوید کشمیری تھے۔ پرویز پٹھان لگتے تھے

ایک دن ڈاکٹر عباس نے بے تکلفی سے کہا۔ دو تین ہفتے سے ملاقات تھی۔ کافی دوستی ہوگئی تھی ڈاکٹر صاحب سے۔

"ہاں! ان کے بھائی ضرور لگتے ہیں۔" ضعیف العمر ڈاکٹر نے جاوید کی بڑی حسین۔ بڑی پُرکشش بیوی فرزانہ کی طرف اشارہ کیا۔

"ڈاکٹر صاحب! یہ میری سگی ماموں زاد ہیں۔" جاوید نے خوشدلی سے کہا۔ وہ بڑے اطمینان سے بات کر رہے تھے۔" دراصل یہ اور پرویز بہن بھائی ہیں ــــ ماموں کے بیٹے غیر تو نہیں ہوتے نا۔ میرے بھی تو چھوٹے بھائی ہوئے۔ بڑے عزیز۔ بڑے پیارے بھائی۔"

جاوید نے اپنے بیان کو تقویت دینے کے لیے کہا۔ پھر

فرزانہ کی بیقرار آہ زاری ۔ پہلے دن کی پریشانی ۔ جب بھی دیکھتے آتی ۔ بہت گھبراتی تھی ۔ کہ دیکھنے والوں کو پختہ یقین تھا کہ وہ اپنے حقیقی بھائی کے لیے ہی پریشان ہے فرزانہ کی اس بات سے بھی جاوید کو بڑا سہارا ملا تھا۔جاوید بھی کسی سے کم خوبصورت نہ تھے ۔ لیکن ڈاکٹروں، نرسوں کو پرویز اور فرزانہ کی شکلیں ملتی لگیں — وہ بھی مصلحت کے تحت خاموش تھیں ۔

ڈاکٹر عباس پرویز کے حادثے کی تفصیل میں جانا چاہتے تھے اور جاوید بڑی مہارت سے پہلو بچا جاتے ۔ان کے اصرار پہ سکوٹر کے حادثہ کی کہانی سنائی تھی ۔ من گھڑت قصہ ۔ کہ حقائق سے تو وہ خود بھی ناواقف تھے ۔ مریض کا نام انہوں نے خود ہی پرویز رکھ دیا تھا ۔ کہ اصل نام پتہ تو ان کو معلوم نہیں تھا ۔ اپنا سگا بھائی ظاہر کیا ۔ ماموں کا لڑکا ۔ فرزانہ کا بھائی تسلیم کیا ۔ اگرچہ میڈیکل رپورٹ یہ بتاتی تھی کہ حادثہ سکوٹر کا نہیں ہوا ۔ جاوید کی پہلوتہی کو سمجھتے ہوئے ڈاکٹر عباس خاموش ہو گئے ۔ کہ اگر کوئی اپنے گھریلو حالات ظاہر نہیں کرنا چاہتا تو کیوں مجبور کیا

جائے۔

پرویز کی زندگی کے خطرے کے چوبیس گھنٹے آہستہ آہستہ۔ بڑی سست رفتاری سے رینگتے ہوئے گزر گئے تھے۔ اس کے بعد ڈاکٹروں نے کہا تھا کہ زندگی کی امید کی جا سکتی ہے۔ علاج ہو رہا تھا۔ دوائیں دی جا رہی تھیں۔ بڑی احتیاط، بڑا خیال، بڑی دیکھ بھال کی جا رہی تھی۔ مریض کو کوئی فرق نہ تھا۔ بیماری میں کوئی افاقہ نہ تھا سانس کی آمد و رفت جاری تھی۔ ورنہ زندگی کے کوئی آثار نہ تھے۔ پہلے دن سے جیسے بستر پہ لٹائے گئے تھے۔ ویسے ہی بے حس و حرکت سیدھے پڑے تھے۔ خوابوں کی دنیا میں کھوئے۔ خوراک ابھی تک دینے کا سوال ہی نہ تھا۔ بے ہوشی اور دماغی چوٹ میں بظاہر کوئی تبدیلی نہ آئی تھی۔ بس ایک آس تھی کہ سانس باقی ہے۔ جاوید اور فرزانہ کو پرویز کی حالت دیکھ کر ان پر رحم تو آتا ہی تھا۔ لیکن وقت کے ساتھ ساتھ ان سے بے لوث انس ہو گیا تھا۔ بے پناہ محبت ہو گئی تھی۔ اور وہ سچے دل سے ان کی صحت و عافیت کی زندگی۔ ان کی خیریت

کی خبر کے خواہاں تھے ۔ جاوید نے علیحدہ کمرے کے ساتھ دو پرائیویٹ نرسوں کو بھی رکھ لیا تھا ۔ صبح و شام ڈیوٹی بدلتی ۔ اکثر تو جاوید ــــ فرزانہ کے ساتھ ۔ رات بھر جاوید کے سرہانے بیٹھ کر گزار دیتے ــــ سچی لگن، خلوص دلی لگاؤ تھا ان کے پرخلوص انداز میں ۔ اب ڈاکٹروں نے نرسوں کے علاوہ ان دونوں کو بھی آنے جانے مریض کے پاس رہنے کی اجازت دے دی تھی ۔

گردش دوراں گردشوں میں تھی ۔ شب و روز کا چکر چل رہا تھا ۔ زندگی کا کارواں ۔ رواں دواں ۔ جاوداں پیہم رواں ہے زندگی ۔

دوپہر کا وقت تھا ۔ دنیا کے سارے ہنگامے عروج پر تھے ۔ کاروبار حیات میں ہر کوئی مصروف ــــ جاوید اپنے دفتر میں اپنے کام میں مگن تھے ۔ فرزانہ بنگلہ پہ گھر کے دھندوں میں لگی تھی ۔ پرویز ہسپتال کے صاف ستھرے کمرے میں اجلے سفید بستر پہ سرخ کمبلوں میں لپٹے حسب معمول بے حس و حرکت پڑے تھے ۔ موسم کے تازہ پھول سرھانے کی میز پہ پڑے تھے ۔ دائیں

طرف چھوٹی الماری پہ کچھ دواؤں کی شیشیاں ۔ تھرموس میں گرم چائے ۔ اون سلائی کی ٹوکری ۔ نرس کی چیزیں بھی وہیں تھیں ۔ دروازے ، کھڑکیاں بند ۔ فرزانہ کے لگائے ہوئے بڑے خوبصورت پھولدار پردے گرے تھے ۔ کیونکہ باہر سردی بہت زیادہ تھی ۔ برقی ہیٹر لگے ہوئے تھے ۔ سفید یونیفارم میں پرویز کی نرس لوہے کے پلنگ کے قریب لوہے کی ٹھنڈی کرسی ۔ برف کی طرح ٹھنڈی بغیر گدی کی کرسی پہ بیٹھی نرس سویٹر بن رہی تھی ۔ اس کا مریض تو نہ آنکھیں کھولے ، نہ منہ سے بولے ۔ روزانہ اسفنج کر کے کپڑے تبدیل کر دیتی ۔ خوشبودار پوڈر ۔ اور قیمتی پرفیوم لگا دیتی ۔ کمرہ خوشبوؤں سے مہکتا رہتا ۔ باقی وقت بے کار بیٹھی کبھی کوئی کتاب کوئی رسالہ دیکھ لیتی ۔ اب سردیاں تھیں تو سویٹر شروع کر لیا ۔ لیکن آج تو آج تو ــــــــ

مایوسیوں کی شام ڈھل گئی ۔ اُجلی اُجلی صبح دوام مسکرا اُٹھی ۔ ڈاکٹر عباس کی دواؤں کا اثر تھا ۔ جاوید اور فرزانہ کی شبانہ روز دُعاؤں ــــــ پُرخلوص دُعاؤں کا اثر تھا ۔

کہ۔۔۔ پرویز کی سیاہ، دراز پلکوں کو جنبش ہوئی۔ بند آنکھوں پر سے پلکیں اٹھیں۔۔۔ تو۔۔ خوبصورت۔۔۔ بڑی پیاری۔ بڑی بڑی آنکھیں۔ بڑی پیاری لگ رہی تھیں۔ وہ خوبصورت نشیلی آنکھیں۔ نیند سے بوجھل۔ سرخ سرخ آنکھیں کھولے اردگرد کا جائزہ لے رہے تھے۔ اجنبیت تھی۔ بیگانگی تھی ان آنکھوں میں۔ نامانوس سا ماحول تھا سر کو تکیے سے اٹھانا چاہا تو کمزوری۔ نقاہت اور تکلیف کی وجہ سے کچھ بھی نہ ہو سکا۔ پورے چھ ماہ کی طویل خاموشی۔ بے حس و حرکت بے ہوشی کے بعد اپنے مریض کو آنکھیں کھولے۔ حرکت کرنے کی کوشش کرتے دیکھ کر ڈیوٹی نرس کو یقین نہ آیا۔ وہ اون سلائیاں پھینک کر جلدی سے اٹھی۔ بے یقینی کے عالم میں قریب آئی سامنے کی طرف پرویز پہ جھک گئی۔۔۔ واقعی۔۔۔ بڑی بڑی آنکھیں۔۔۔ لمبی سیاہ پلکوں کے نیچے دودھ بھرے پیالے۔ گلابی گلابی شرابی۔ شیشے کے پیالے۔ وہ نظریں نرس کے چہرے پہ گاڑے خاموش تھے۔ اجنبی ماحول۔ اجنبی چہرہ۔ اتنا سکوت۔ اتنی خاموشی۔ پرویز

کے خوبصورت چہرے پہ گہری سوچوں کی دھوپ چھاؤں تھی ۔ بیماری کا ضعف تھا ۔ نرس ۔ خوشی سے پاگل ہوئی جا رہی تھی ۔ کس سے کہتی ۔ کس کو بتاتی ۔ دوڑتی ہوئی ۔ سیڑھیاں پھلانگتی ۔ ڈاکٹر عباس کے پاس آئی ۔ وہ اپنے مریضوں سے فراغت پا کر ۔ پردے کے پیچھے بستر پہ دوپہر کے وقت ذرا لیٹے تھے ۔ بڑی عمر کے آدمی ۔ تھوڑی دیر آرام کے لیے لیٹنا ان کے لیے ضروری تھا ۔ حواس باختہ نرس کی اُڑی رنگت اور پھولی ہوئی سانس دیکھ کر ڈاکٹر عباس ایسے گھبرائے کہ جلدی سے اُٹھ کر بیٹھ گئے ۔ گھبراہٹ میں جوتے بھی نہ پہنے ۔ ننگے پاؤں ہی چل دیئے ۔

" خیریت ـــــ مس نسرین ۔" ڈاکٹر عباس نے ڈرتے ڈرتے بڑی ہمت کر کے پوچھا ۔ نسرین پرویز کی ذاتی پرائیویٹ نرس تھی اور ڈاکٹر عباس اپنے مریض کی حالت سے واقف تھے ـــــ پھر نرس کی کیفیت دیکھ کر تو انکے اوسان ہی جاتے رہے ، ان کو کسی اچھی خبر کی امید نہ تھی کہ وہ مریض کی زندگی سے بالکل مایوس تھے ۔

" ڈاکٹر صاحب۔ ڈاکٹر صاحب " نرس نے پہلے پردے کا اور پھر دیوار کا سہارا لیتے ہوئے کہا۔ ہاتھ پاؤں کیا۔ ساری ہی کانپ رہی تھی۔ رنگ فق۔ اور سیڑھیاں پھلانگنے اور بھاگ کر آنے کی وجہ سے سانس غیر ہموار تھی۔ کھڑی ہانپ رہی تھی۔ بات کرنا مشکل تھی۔

" پرویز ــــ پرویز ــــ صاحب " وہ رک رک کر بول رہی تھی۔

" کیا ہوا ــــ کیا زندہ بھی ہیں ؟" ڈاکٹر عباس نے بڑی پریشانی سے پوچھا۔

" نہیں ــــ ڈاکٹر صاحب " نسرین نے آنکھیں بند کیے دیوار سے سر ٹکائے کہا۔ ابھی اس کی سانس برابر نہیں ہوئی تھی۔ سینے کے زیر و بم کو دبانے کے لیے دونوں ہاتھ سینے کے اوپر رکھے تھی۔ پھر گر سی گئی۔ دیوار کے سہارے سے زمین پر بیٹھ گئی۔

" نہیں ــــ نہیں ــــ نہیں " ڈاکٹر کی آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا۔ دونوں ہاتھوں سے سر پکڑ کر بیٹھ گئے۔ وہ اپنے آپ سے باتیں کر رہے تھے

انکار میں سر ہلا رہے تھے۔ ”یہ کیا ہو گیا؟ — ایسا نہیں ہونا چاہیئے تھا۔ میری ساری محنت ضائع گئی ——“ ان کی ہمت جواب دے گئی۔ وہ تو خود بے ہوش ہونے کو تھے۔

”ڈاکٹر صاحب —— پرویز صاحب نے آنکھیں کھول دیں — ڈاکٹر صاحب۔“ نسرین اب سنبھل گئی تھی۔ بہت خوش تھی نسرین۔

”سچ — میری بیٹی۔ سچ“ ڈاکٹر صاحب تو خوشی اور حیرانی سے بے قابو ہوئے جا رہے تھے۔ ان کے لیے یہ خوشخبری بڑی اہمیت رکھتی تھی۔ چھ ماہ سے دن رات محنت کر رہے تھے سر توڑ کوشش کر رہے تھے۔ سینکڑوں کتابیں دیکھ چکے تھے ہزاروں دوائیں آزما چکے تھے۔ بیرون ملک دوست ڈاکٹروں سے فون پر مشورے کرتے تھے۔ پرویز کو ہوش میں لانے کے لیے، اس کی صحت یابی کے لیے اپنی کوششیں بار آور ہوتے دیکھ کر — ان کے ہوش میں آنے کی خبر سن کر بڑھاپے کے باوجود — اپنی ضعیفی بھول کر دوڑتے ہوئے آئے۔ پرویز کے کمرے میں پہونچے۔ یہ خبر سن کر کئی اور ڈاکٹر۔ نرسیں بھی جمع ہو

گئیں ۔ ڈاکٹر عباس کے خوبرو مریض سے سب کو دلچسپی تھی حسن میں کشش ہی بہت تھی ۔ دلکش جوانی کو یوں بے سدھ پڑے دیکھ کر ہر دل دُکھی ہو جاتا ۔ بے اختیار دُعا نکلتی تھی ۔ اتنی بہت سی دُعاؤں کا اثر تھا کہ آج پرویز کی پلکوں کو جنبش ہوئی تھی ۔ ڈاکٹر عباس پرویز پر جھکے ہوئے تھے ۔ آلات کی مدد سے معائنہ ہو رہا تھا ۔ دوسرے ڈاکٹر بھی دلچسپی لے رہے تھے ۔ ڈاکٹر عباس کی مدد کر رہے تھے ۔ سب مصروف تھے اور پرویز بڑے خاموش، اپنے پلنگ کے گرد کھڑے ڈاکٹروں کو نرسوں کو دیکھ رہے تھے ۔ خاص طور پہ ڈاکٹر عباس کو اپنے بہت قریب پا کر ان کی طرف خالی خالی نظروں سے دیکھتے رہے ۔ دیکھتے رہے ۔ دیکھتے گئے ۔

" وہ ۔ وہ ۔ کہاں ۔ ؟ " بڑی کمزور ۔ نحیف سی سرگوشی ڈاکٹر عباس کے کانوں تک پہونچی ۔ انہیں یقین ہی نہیں آ رہا تھا کہ پرویز کے دل آویز لب حرکت کر رہے ہیں ۔ آواز آ رہی ہے ۔

" وہ ۔ کون ۔ ؟ آپ کے بھائی جان ؟ " عمر رسیدہ ڈاکٹر نے بڑے شفیق ۔ پدرانہ انداز میں زرد، زرد، خوبصورت چہرہ دونوں

کمزور ہاتھوں میں لیتے ہوئے ان کی پیشانی چوم لی - اُن کے سیاہ بالوں پر ہاتھ پھیر رہے تھے - جاوید خوشی سے نہال بے قابو ہو رہے تھے - دفتر میں پرویز کی نرس کا فون ملتے ہی دوڑتے ہوئے آ گئے - اب پرویز سے لپٹے - بے اختیار بالوں - پر - گالوں پہ - پیشانی کو چوم رہے تھے - اور پرویز ابھی تک اسی طرح خاموش - بڑی خاموشی سے صورت حال سے بے خبر - بڑی نقاہت محسوس کر رہے تھے - کمزوری بہت تھی ان کو - ڈاکٹروں، نرسوں اور جاوید - سب کے خوشیوں سے چمکتے چہرے - دیکھتے ہوئے - کچھ نہ سمجھتے ہوئے - پھر ایک بار - پھر - آنکھیں بند کر لیں - پہلے کی طرح لمبی لمبی پلکیں عارض پر جھک گئیں - بہت زیادہ کمزوری - سخت ضعف محسوس کر رہے تھے - ڈاکٹر عباس کے حکم پر نرس ٹرے میں دوائیاں اور ٹیکے وغیرہ رکھ کر لے آئی - ڈاکٹر صاحب نے اپنے ہاتھوں سے طاقت کا انجکشن لگایا - گلوکوز میں طاقت کی دوائیں ڈال کر لگا دیا - پلنگ کے قریب کرسی رکھوا کر - ڈوبتی نبض پہ ہاتھ رکھ دیا - نبضیں ڈوبتی جا رہی تھیں - سانس بگڑی ہوئی تھی آکسیجن لگا دی گئی - اوپر سٹینڈ میں لٹکتی بوتل میں سے قطرہ قطرہ

ٹپکتا گلوکوز ۔ نالی میں سے گذرتا آہستہ آہستہ سرنج میں آتا اور پرویز کے بازو میں لگی سوئی کے ذریعہ اس کے خون میں اس کے کمزور جسم میں داخل ہو رہا تھا ۔ اور جاوید وہیں ٹھنڈے فرش پہ خدا کے حضور سربسجود ۔ سجدہ شکر ادا کر رہے تھے خوشی کے آنسو آنکھوں سے جاری تھے ۔ ان کو جیسے کسی اور بات کا ہوش ہی نہ تھا ۔ ادھر پرویز کی طبیعت زیادہ خراب ہو رہی تھی ۔ لرزہ طاری تھا ۔ سردی لگ رہی تھی ۔ ایک دم تیز بخار چڑھ گیا ۔ ڈاکٹروں نے ڈیوٹی نرس کے سوا سب کو کمرے سے جانے کی ہدایت کی ۔ جاوید آنکھوں میں آنسو لیے رخساروں پہ بہتے آنسوؤں کو پونچھتے ۔ مڑ مڑ کے دیکھتے ۔ بادل نخواستہ کمرے سے باہر نکل آئے ۔ پرویز کے ہوش میں آنے کی خوشی کے جوش میں فرزانہ کو بھی بھولے ہوئے تھے ۔ اس نے تو رو رو کر پرویز کے لیے دعائیں مانگی تھیں ۔ ان کی صحت کے لیے بے چین رہتی تھی کہ اپنا تو کوئی بھائی نہ تھا ۔ ماں بچپن میں داغ مفارقت دے گئی تھی ۔ ماں کی کمی اور ۔ سوتیلی ماں کے سلوک کی وجہ سے دل کمزور تھا ۔ کسی کے بیٹے کو مجبور ، معذور پڑے دیکھ کر اس کے

میں بدلتی گئیں - کمزوری دور ہوتی گئی - پرویز دن بدن رو بہ صحت ہوتے گئے - تھوڑی تھوڑی - ہلکی غذا - دودھ پھلوں کے رس - یخنی وغیرہ لینا شروع کر دی - کبھی کبھار - ایک آدھ بات بھی کر لیتے - لیکن ان کا احساس بیدار نہیں تھا انہیں کچھ خبر نہ تھی کہ وہ کہاں ہیں ؟ یہاں کیوں ہیں ؟ کس حال میں پڑے ہیں - ایک مدت کے بعد آنکھیں کھولیں تو اپنے آپ کو ڈاکٹروں اور نرسوں میں گھرے پایا - ان کے رحم وکرم پر پڑے رہتے - جاوید اور فرزانہ بھی روزانہ شام کو آتے - ان سے باتیں کرتے - احوال پوچھتے - لیکن پرویز کو اپنا یا ان کا کچھ پتہ نہ تھا - پچھلی باتیں - گذشتہ یادیں - اپنا ماضی - بالکل یاد نہ تھا - سب کچھ بھول چکے تھے - آہستہ آہستہ نئی شکلوں سے مانوس ہوتے جا رہے تھے - ڈاکٹروں کا خیال تھا - کمزوری دور ہونے پر - دماغی قوت پوری ہونے پر - اگر چوٹ کا اثر جاتا رہا تو شاید کبھی پچھلی یادیں لوٹ آئیں - انہیں اپنا ماضی یاد آجائے - ڈاکٹر عباس کی محنت اور کوشش سے علاج ہوتا رہا - بعض ادویات جو ملک میں نہ مل سکتی تھیں - فرزانہ اپنے اباجان سے

نازک دل پہ بڑی چوٹ لگتی تھی۔

جاوید گھر پہنچے تو موٹر سے اُترتے ہی خانساماں سے لپٹ گئے۔ وہ اپنے کاموں سے فارغ ہو کر سامنے باڑہ اُٹھتے مالی کے پاس آ کھڑا تھا۔ اس سے باتیں کر رہا تھا۔

"ہمارے پرویز کو ہوش آگیا فرزانہ" بے خودی میں۔ ازحد خوشی میں ان کو فرزانہ اور خانساماں کا فرق بھی پتہ نہ چلا۔ خوشیوں میں ڈوبی آواز تھی۔ جاوید کے انتظار میں برآمدے میں کھڑی فرزانہ نے یہ خبر سُنی۔ جانفزا خوشی ملی تو دوڑ کر جاوید سے لپٹ گئی۔ جاوید بھی اس کو ساتھ لیے اندر آگئے۔ خوشی سے دونوں کی بھوک اُڑ گئی تھی۔ کھانا ہی نہ کھایا۔ ان سے کھایا ہی نہ جا رہا تھا۔ وقت کاٹنا مشکل ہو رہا تھا۔ کب ساڑھے چار ہوں اور وہ ہسپتال جائیں۔ جاوید پرویز کے ہوش میں آنے سے اتنے خوش تھے۔ اتنے خوش کہ ان کو مریض کے تیز بخار، لرزے اور زیادہ کمزوری کا خیال ہی نہ تھا۔ وہ خوش تھے۔ فرزانہ خوش تھی اور ان کو خوش رکھنے کے لیے خدا تعالیٰ مہربان ہو گیا۔ ربِ جلیل کی مہربانیوں کی انتہا ہو گئی۔ رفتہ رفتہ بے ہوشیاں۔ ہوش

لکھ کر منگوا لیتی ۔ فرزانہ کا اصرار تھا کہ پرویز کو لے کر یورپ چلتے ہیں اباجان کے پاس ۔ اوّل تو ڈاکٹر عباس پوری طرح راضی نہ تھے ۔ دوسرے فرزانہ کی سوتیلی ماں کے سلوک کی وجہ سے بھی جاوید جاتا مناسب نہ سمجھتے تھے ۔ وہ فرزانہ کے ساتھ اتنا اچھا سلوک نہ کرتی تھیں ۔ تو ۔ اب ۔ اس طرح ۔ ایک غیر آدمی کو لے کر جانا قطعاً مناسب نہ تھا ۔ ویسے بھی پرویز اب بہتر تھے ۔ بہت بہتر ۔ جاوید کو بھائی جان اور فرزانہ کو بھابی کہتے ۔ بظاہر صحت اچھی تھی ۔ خوب سُرخ و سفید بالکل ٹھیک ٹھاک لگتے تھے ۔ اب تو اس حد تک صحت یاب ہو چکے تھے کہ خود موٹر چلا لیتے ۔ لیکن اصل خرابی ۔ اور سب سے بڑی خرابی ۔ جو ہر چیز پہ بھاری تھی ۔ کہ ماضی کی ایک کرن بھی ان کے ذہن میں باقی نہ تھی ۔ مستقبل کی پرواہ نہ تھی ۔ بس حال میں بسر کر رہے تھے ۔ ان کو وہم بھی نہ تھا کہ جاوید اور فرزانہ غیر ہیں ۔ ان کے رشتہ دار نہیں ۔ کچھ بھی نہیں لگتے ۔ بلکہ غیر در غیر لوگ ، جو جنگل سے ان کو بے ہوشی کی حالت میں ــــ ان کی حالت پہ رحم کھا کر اُٹھا لائے تھے وہ ــــ سب کو اپنا ــــ اس گھر کو اپنا ــــ سمجھتے تھے ــــ بھائی

بھاوج کے ساتھ گھل مل کر رہتے - ہر وقت خوش رہتے یوں لگتا جیسے خوش باش رہنا ان کی فطرت ہے - جیسے غم کبھی ان کے پاس سے نہیں گذرا - ہنستے مسکراتے لیکن کم گو تھے - بات چیت زیادہ نہ کرتے - زیادہ تر دوسروں کی باتیں سنتے - مطالعہ کرتے رہتے - ڈھیروں رسالے - اخبار کتابیں - جاوید نے ان کے لیے جمع کر دی تھیں - پکچرز منگواتے رہتے - ان کی تفریح کے لیے کئی قسم کی کھیلوں کا سامان اٹھا لائے تھے -

جاوید اور فرزانہ نے ان کے لیے بڑی بڑی قربانیاں دیں ان کی خاطر کیا کچھ نہ کیا - فرزانہ کے والد کے بار بار اصرار کے باوجود وہ دونوں پرویز کو چھوڑ کر جانے کے لیے تیار نہ ہوئے - حالانکہ شادی کے بعد ایک دفعہ بھی فرزانہ میکے نہ گئی تھی - چند دن کے لیے تو پرویز مل گئے تھے - اب ان کو ساتھ لے جانا مناسب نہ تھا - چھوڑ کر جانا ناممکن - دونوں میاں بیوی پرویز کا ہر طرح سے خیال رکھتے - چھوٹے بچے کی طرح ان کی ناز برداریاں کرتے - ان کی چھوٹی چھوٹی باتوں کو بڑی اہمیت دیتے - کہ ان کی ہر خواہش پوری ہو

ان کے دل و دماغ کو سکون ملتا رہے ۔ مطمئن زندگی گذاریں گے تو ان کے ذہن پر سے پردہ اٹھ جائے گا ۔ شاید ان کو اپنا ماضی یاد آجائے ۔ تاکہ ان کے اقربا کا ۔ ان کے ورثا کا سراغ ملے ۔ ان لوگوں کی حالت کا اندازہ تو جاوید بن دیکھے ہی کر سکتے تھے ۔ کس طرح بے حال ہوں گے ۔ یہ سوچ کر دل کانپ جاتا تھا ۔ اگر موت کی خبر ان کے گھر پہونچی ہوگی تو کہرام مچ گیا ہوگا ۔ قیامت سے بڑھ کر قیامت گزر گئی ہوگی ۔ ماں باپ، بہن بھائی، بیوی بچوں پر ۔ گمشدگی کا علم ہوا ہوگا تو کہاں کہاں ٹکریں نہ ماری ہوں گی ۔ خوبصورت نوجوان کی جستجو میں، جواں سال عزیز کی تلاش میں کیا کچھ نہ کرتے ہوں گے ۔ سب باتوں کو سمجھتے ہوئے جانتے ہوئے بھی، محسوس کرتے ہوئے بھی جاوید وقت کی مصلحت کے تحت خاموش تھے :۔

باب ۱۵

نقوشِ پا سے ہمارے، اُگے ہیں لالہ و گل
رہِ بہار سے ہم بے نشاں نہیں گزرے

چند دن پہلے خانساماں چپکے سے کام چھوڑ کر بھاگ گیا۔ اب فرزانہ بے چاری کی جان پر بنی تھی۔ بڑی مصیبت آن پڑی تھی۔ سخت گرمی میں باورچی خانے میں کھانا پکانا پڑتا اگرچہ جدید سہولتیں سب ہی مہیا تھیں پھر بھی زیادہ وقت گزارنا مشکل تھا۔ زندگی بھر ملازموں سے خدمت کروائی تھی تعلیم کے سلسلے میں اور سوتیلی ماں کی وجہ سے زیادہ وقت ہوسٹل میں رہی تھی۔ گھریلو کام کی عادت نہ تھی۔ ویسے بھی گھر داری۔ خانہ داری سے گھبراتی تھی۔ پھر گرمی تو گرمی تھی۔ گرمی اپنی جگہ۔ روزانہ کام کرنے والوں کو بھی لگتی تھی۔ جاوید کی طبیعت بہت اچھی تھی۔ ہر وقت خندہ پیشانی سے فرزانہ کی مدد کے

بیچے تیار ۔ صبح کا ناشتہ روزانہ خود بناتے ۔ دفتر سے آنے کے بعد بھی اسی فکر میں ہوتے کہ فرزانہ کو زیادہ کام نہ کرنا پڑے ۔ چھٹی والے دن تو سارے کام خود نمٹاتے ۔ فرزانہ کو پوری چھٹی ہوتی ۔ یہ الگ بات کہ فرزانہ ان کے ساتھ ہاتھ بٹاتی ۔ دونوں مل جُل کر ہنسی خوشی کام کرتے ۔ زیادہ بوجھ بھی نہ ہوتا اور کام بھی جلدی ہو جاتا ۔ جاوید فرزانہ کو دیوانہ وار چاہتے تھے ۔ اس کی تکلیف گوارہ نہ تھی ۔ اور فرزانہ پروانے کی طرح ان پر ہر دم، ہر گھڑی نثار ۔

دوپہر کا وقت تھا ۔ کھانا پکانے کے لیے فرزانہ باورچی خانے میں تھی ۔ جاوید کے بھائی ۔ فرزانہ کے حسین دیور ۔ اپنی بھابی کا ہاتھ بٹا رہے تھے ۔ چھوٹی موٹی چیزیں اِدھر سے اُٹھا کر اُدھر پکڑاتے ۔ آلو چھیل کر کاٹ دیئے ۔ دہی پھلکیوں کے لیے ننھی مُنی پکوڑیاں بھی پرویز نے بنائی تھیں وہ جاوید کو کام کرتے دیکھتے رہتے تھے ۔ اس طرح کافی کچھ سیکھ گئے تھے ۔ فرزانہ سالن پکا چکی تھی ۔ سوئی گیس کے چولہے پر توا رکھ کے چپاتیاں بنا رہی تھی ۔ چھوٹے چھوٹے پھولوں والا سفید پرنٹ کا سوٹ پہنے تھی ۔ گول گھیرے

کا ایپرن لگائے کام میں لگی تھی ۔ آج خلاف معمول پرویز
کی نظریں بدلی ہوئی تھیں ۔ وہ بار بار اٹھتی گہری نظریں۔گرم
گرم نظروں کی تپش ۔ موسم کی گرمی اور جلتی آگ کی تپش کے
ساتھ محسوس کر رہی تھیں ۔ فرزانہ اپنے چہرے پر پرویز کی
نوکیلی پلکیں سورج کی تیز۔ تیکھی کرنوں کی طرح چھبتی لگ رہی
تھیں ۔ چور نظروں سے پرویز کو دیکھتی فرزانہ بہت گھبرا
رہی تھی ۔ کئی مرتبہ تو انگلیاں جلی تھیں ۔ ہاتھ بڑی مشکل سے
بچا تھا ۔ گھبراہٹ میں ہاتھ خالی توے پہ رکھنے لگی تھی ۔ آج
پرویز بدلے ہوئے تھے ۔ ان کے انداز بدلے ہوئے تھے
ان کی نظریں اور ہی تھیں ۔ کچھ اور ہی چیز تھی ان آنکھوں
میں ۔ اس وقت۔ پرویز کے خوابیدہ ذہن میں ہلچل مچی تھی
وہ فرزانہ کے سامنے دروازے سے ذرا دور کھڑکی کے
بڑھے ہوئے سیمنٹ کے تختے پر بیٹھے تھے ۔ آہستہ آہستہ
گنگنا رہے تھے ۔ بڑے غور سے فرزانہ کو دیکھ رہے تھے۔
باہر سے آتی ہلکی ۔ مگر گرم ہوا ان کے خوبصورت بالوں سے
کھیل رہی تھی ۔ بڑے نفیس کٹاؤ کے کام والا عمدہ لان کا
سفید کرتا پہنے تھے ۔ سفید لٹھے کی شلوار اور پاؤں میں سفید

ہوائی چپل تھے۔ ایک طرف دیوار کے ساتھ پڑا پنکھا ہیز پر رکھا چل رہا تھا۔

فرزانہ نے چپاتیاں رومال میں لپیٹ پلاسٹک کے ڈبے میں بند کر دیں تاکہ جاوید کے آنے تک گرم رہیں۔ چولہا بند گیا۔ جھاڑن سے اردگرد آٹا صاف کر کے اچھی طرح جھاڑ پونچھ کی۔ اور آٹے کا خالی برتن لیے۔ ایک طرف دیوار میں لگے پانی کے نل سے ہاتھ دھونے کے لیے سنک کی طرف مڑی۔ نل کھڑکی کے قریب کونے میں تھا۔ پرویز بھی وہیں تھے وہ جھک کر ہاتھ دھو رہی تھی۔ گلرنگ چہرہ آگ کی تپش سے سرخ ہو رہا تھا۔ گرمی کی زیادتی سے شعلوں کی طرح دہکتے رخساروں پہ پسینے کے قطرے، آنکھوں کے نیچے، پیشانی پر شبنم کی بوندوں کی طرح چمک رہے تھے۔ پرویز لپک کر آگے بڑھے۔ جھکی جھکی فرزانہ کو دونوں شانوں سے پکڑ کر اپنے ساتھ لگا لیا۔ مضبوط بازوؤں کے حلقے میں جکڑ لیا۔ بڑے زور سے۔ بڑی مضبوطی سے۔ فرزانہ کے شانے پہ ٹھوڑی رکھے، بڑے مسحور، بڑے مخمور انداز میں آنکھیں بند کیے گنگنا رہے تھے، مسکرا رہے تھے۔ فرزانہ پہلے ہی بدلی بدلی

گہری، بغور دیکھتی نگاہوں سے گھبرا رہی تھی - محویت ٹوٹی تو غضب ہو گیا - پرویز کے خفتہ دماغ میں جب بھی کوئی بھولی بسری یاد کروٹ لیتی - خوابیدہ احساس میں ہلچل مچا دیتی — وہ انجانی باتیں کرنے لگتے - جاوید اور فرزانہ ان کی باتوں کو سنتے کچھ نہ سمجھتے، کچھ سمجھ بھی جاتے - وہ زیادہ تر اپنے عزیزوں کے نام پکارتے تھے - کبھی کوئی واقعہ سُنا دیتے - ماضی کے واقعات دہراتے، خود بھی ہنستے، دوسروں کو بھی ہنسانے کی کوشش کرتے - عموماً بات ایسی ہوتی کہ سب ہی ہنستے - جاوید ان کی باتوں کو بڑے غور سے سُنتے - شاید ان کے خاندان کا کچھ پتہ چلے - ان کے اقربا سے - رشتے داروں سے واقفیت نکل سکے - جو کچھ پرویز بتاتے، جاوید یقین کر لیتے کہ بیانات کی تصدیق کے لیے ان کے پاس کوئی وسیلہ نہ تھا کوئی ذریعہ نہ تھا - ان کی باتوں میں بڑی دلچسپی لیتے - کچھ دیر کے بعد پرویز بالکل خاموش ہو جاتے - کئی گھنٹے تک چُپ چاپ لیٹے رہتے، سوچتے رہتے اور — اپنی ہی بیان کی ہوئی باتیں بھول جاتے - کچھ بھی یاد نہ رہتا -

فرزانہ سے باتیں کرتے - ہنسی مذاق - بے تکلفی سے

چھیڑ چھاڑ - لیکن سب کچھ تہذیب کے دائرے میں ـــ ہزار اپنائیت - بھائی چارے - رشتہ داری کے باوجود بھابی ـــ اور ـــ دیور، کا رشتہ، جس میں بھاوج کا احترام اور دیور کا رکھ رکھاؤ ہمیشہ ملحوظ رکھتے - کبھی بھی کوئی ایسی حرکت نہ کی تھی کہ جاوید کو اعتراض ہوتا - فرزانہ احتجاج کرتی ـــ جاوید گھر پہ نہ ہوتے تو یہ دونوں کیرم اور تاش کھیلتے رہتے ـــ گھنٹوں پیار سے کھیل جاری رہتا - کبھی جھگڑا بھی ہو جاتا - لڑائی ہاتھا پائی بھی ہو جاتی - لیکن جیسے بہن بھائی ہوتے ہیں ـــ جیسے دیور بھابی ہوتے ہیں - پھر صلح صفائی ہو جاتی - لیکن آج - تو - فرزانہ ـــ پرویز کی باہوں کے حصار میں قید تھی - ڈرے سہمے انداز میں - بڑی ہمت سے دل مضبوط کر کے - فرزانہ نے ان کی باہوں کے ہار میں سے نکلنے کی کوشش کی ـــ بوجھل ہاتھ - تنگ حلقہ - کامیابی نہ ہوئی اپنی بے قابو سانس کی رفتار کو قابو کرنا چاہا - گرمی کا موسم تھا - پسینے پہلے ہی آ رہے تھے - اب تو سر سے پاؤں تک نہا گئی پسینے میں - جان نکل رہی تھی - فکر کھائے جا رہا تھا - "پرویز کو کیا ہو گیا -؟ ایسے میں جاوید دیکھ لیں - تو کیا کچھ

نہ سوچیں گے ۔ کیا کچھ نہ کہہ دیں گے ۔ ان کی غیر حاضری میں .... ہائے میرا کردار داغدار ہو جائے گا ۔ ان کی نظروں سے گر جاؤں گی ۔ اعتماد اٹھ جائے گا ۔ غلط فہمیاں پیدا ہو جائیں گی ۔ ہائے ہمارا ساتھ چھوٹ جائے گا ۔ مجھے گھر سے نکال دیں گے ۔ کہ دیور کے ساتھ رنگ رلیاں مناتی ہوں "

اسی طرح پرویز کے قابو میں تھی ۔ سوچتی رہی ۔ پریشانیوں میں گھری تھی ۔ پھر بھی بڑی نرمی سے بولی ۔

" یہیں تو تھی آپ کے پاس " پرویز نے سوال کیا تھا کہ " وہ کہاں تھی ؟ "

فرزانہ پریشان تھی ۔ خوفزدہ تھی پھر بھی اسے یہ یاد تھا کہ پرویز بیمار ہیں ۔ ان کی یادداشت ٹھیک نہیں ۔ ان کے حواس بجا نہیں ۔

پرویز نے فرزانہ کا جواب سُنا تو ۔ اسی طرح بانہوں میں لیے گھوم کر اس کو اپنی جگہ کھڑکی میں بٹھا لیا ۔ اپنے سامنے دونوں ہاتھوں میں گلابی چہرہ تھامے جھکے ہوئے تھے ۔ ماضی کی سوئی ہوئی ۔ کھوئی ہوئی محبت بیدار ہو رہی تھی ۔ اپنی محبت کے حضور نذرانہ دے رہے تھے ۔ فرزانہ کے چہرے

پہ گالوں پہ چمکتے موتیوں کو چُن لینا چاہتے تھے ۔ اپنی من مرضی پر تلے تھے ۔ اور ۔ فرزانہ ان کی گرفت سے نکلنے ۔ ان کے ہاتھوں کے شکنجے سے نکلنے کی سوچ رہی تھی ۔ یونہی بے بس کھڑی تھی ۔ بڑی پریشان ۔ باہر گیٹ کے قریب موٹر ہارن دے رہی تھی ۔ پھر اندر آگئی ۔ ہارن کی آواز مسلسل آرہی تھی ۔ لمبا ہارن ، پھر رُک رُک کر وقفے سے جیسے سحری ، افطاری کا سائرن ۔ جیسے ہنگامی صورت میں خطرے کا سائرن ۔۔۔ اور خطرے کے سائرن سے فرزانہ کو یوں لگا ۔۔ " ہوائی حملہ ہونے والا ہے ۔ میری زندگی کی ہر چیز تہس نہس ہونے والی ہے ۔۔" جاوید آگئے تھے ۔ پرویز چونک گئے کیونکہ ہارن کی آواز مسلسل تھی قریب آتی جارہی تھی ۔ پلٹ کر دیکھا تو سامنے کھڑکی کی جالی میں سے جاوید نظر آئے ۔ وہ ہارن بجا بجا کر تھک گئے تو گاڑی گیراج میں بند کر کے اندر آگئے ۔ ہاتھ میں موٹر کی چابی کا چھلا گھماتے ۔ پیچھے مالی تھا ۔ بریف کیس اُٹھایا ہوا تھا اس نے ۔

" آج نہ جانے کیا بات ہے ؟۔ ان کا استقبال کرنے کوئی

بھی نہیں آیا؟۔"

روزانہ تو فرزانہ اور پرویز ان کی آمد پر خوشی خوشی باہر آتے تھے اور آج برآمدے میں پہونچے تو پرویز اکیلے تھے فرزانہ وہیں کھڑی تھی۔ کھڑکی کی جالی کی طرف اس کی کمر تھی۔ پھر باورچی خانے کے اندرونی دروازے سے ہوتی۔ کھانے اور بیٹھنے کا کمرہ پار کرتی اپنی خوابگاہ سے ملحق غسلخانے میں چلی گئی۔ دروازہ اندر سے بند کر لیا۔ آٹے سے بھرے ہاتھ دھوتی رہی۔ منہ بھی دھویا۔ بے خیالی میں بس منہ پہ چھینٹے مارتی رہی۔

"اگر جاوید دیکھ لیتے۔ تو؟ ۔ اگر ان کو پتہ چل گیا تو؟"

رہ رہ کے یہی فکر کھائے جا رہا تھا۔ ہزاروں قصّے کہانیاں سنی تھیں۔ کئی واقعات کتابوں میں پڑھے تھے۔ دنیا میں بے شمار حقائق بکھرے پڑے تھے۔ کتنی ہی لرزہ خیز داستانیں تھیں مظلوم عورتوں کی ۔ مردوں کی ۔ شکی مزاج، زودِ رنج، بدگمان مردوں کی کہ ہنستی بستی بیویاں ذرا سی غلط فہمی پہ ۔ ناراض ہو کر نکال دیں۔ سب کچھ پیار و یار۔ چھوڑ چھاڑ بہ جا وہ جا۔ خود گھر چھوڑ دیا۔ یا بیوی کو نکال دیا۔ پھر ساری

عمر نہ بیوہ نہ سہاگن ۔ نہ بیاہی نہ کنواری ۔ انتہائی کربناک زندگی عورت کو گزارنا پڑتی ۔ خدا کی کرنی پر مرے شوہر کو صبر آ جاتا ہے ۔ انسان اس کی رضا پر راضی ہو جاتا ہے ۔ لیکن یہ مصیبت ۔ توبہ ۔ توبہ ۔ ایک تو گھر بار سے گئے ۔ زندگی کے چین سکون سے محروم ہوئے ۔ اوپر سے خاوند کی بدگمانی کی وجہ سے اپنی بدنامی ۔ پاک صاف عورت کی عفت پہ حرف آیا ۔ عزت پر بے گناہی کا دھبہ لگ گیا ۔ نہ دین نہ دنیا ۔ نہ زندہ نہ مردہ ۔

فرزانہ پانی کے نل کے نیچے دونوں ہاتھ رکھے روئے جا رہی تھی ۔ پریشان ہو رہی تھی ۔ پھر وہی سوچ ۔ "اگر جاوید دیکھ لیتے تو؟ ۔ اگر اُن کو پتہ چل جائے تو؟ لوگ تو یہیں کہیں گے ۔ تالی ایک ہاتھ سے نہیں بجتی ۔ جوان دیور کے ساتھ بھابی ۔"

"ارے بیگم صاحبہ! جلدی کیجئے ۔ آج غسل اتنا طویل ہو گیا ہے ۔ ادھر گرمی سے ۔ بھوک سے برا حال ہے ہمارا ۔" جاوید بہت دیر انتظار کرنے کے بعد دروازہ کھٹکھٹا رہے تھے ۔ ایک دفعہ پھر زور سے ہاتھ مارا ۔

وہ بوٹ اُتار کر سلیپر پہنے، تولیہ پکڑے نہانے کیلئے کھڑے تھے۔

بھیگا بھیگا چہرہ لیے فرزانہ باہر نکلی۔ ہزار کوشش کے باوجود بھی مسکرا نہ سکی۔ بڑی سنجیدہ۔ بڑی رنجیدہ سی رونے کی وجہ سے آنکھیں سُرخ ہو رہی تھیں۔ گھبرائی ہوئی نظروں سے ادھر ادھر یوں دیکھا۔ جیسے یہیں کہیں۔ کوئی چور چھپا ہوا ہے۔ جاوید نے ان کی اس حرکت کو بھی پیار کی پیاری ادا سمجھ کر، ہنستے ہوئے اپنی باہوں میں لے لیا۔ پیار کر لیا۔ سُرخ گلابی چہرے پہ پانی کے چھینٹے۔ ہاتھ اس کے چہرے پہ پھیرتے ہوئے جاوید مسکرائے۔

"یہ پانی ہے یا رات بھر شبنم میں نہایا ہوا گلاب۔ گلاب پہ شبنم کے قطرے ہیں یا بارش کا پانی؟" فرزانہ خاموش رہی فکرمند سی۔ جاوید دفتر سے آئے تھے۔ گرمی بہت تھی جلدی جلدی نہائے۔ صاف کپڑے تبدیل کیے اور باہر آئے تو فرزانہ۔ وہیں۔ اسی جگہ کھڑی تھی۔ حیران و پریشان۔

"خیریت ہے بھئی۔ ؟ آج یہ بدلے بدلے میرے سرکار نظر آتے ہیں۔ کوئی خطا۔ کوئی گناہ بندے سے

ہو گیا ہو تو معافی مانگتے ہیں ۔ توبہ کرتے ہیں حضور توبہ میری توبہ" جاوید دونوں ہاتھ جوڑے فرزانہ کے سامنے کھڑے تھے۔ پھر دونوں کان پکڑ لیے۔ فرزانہ مسکرا دی۔ جاوید بھی ہنسنے لگے۔ اس کو لے کر کھانے کے کمرے میں آئے تو یاد آیا کہ وہ ابھی تک اسی طرح ایپرن لگائے کھانا پکانے کے بعد پسینے میں بھیگی تھی۔ جاوید کے آنے سے کچھ تسلی ہو گئی تھی۔ کچھ ان کے رویّے سے مطمئن تھی اسی وقت نہا کر کپڑے تبدیل کر کے آ گئی۔ سبز پھولدار پرنٹ کا جوڑا، سبز رنگ کا دوپٹہ اوڑھے تھی۔ اتنے میں دونوں بھائیوں نے مل کر جلدی جلدی کھانے کے برتن لگائے۔ کھانا میز پہ رکھا۔ آلو گوشت۔ قیمہ کریلے۔ دہی پھلکیاں پھلکے اور چاول۔ اچار چٹنی پہلے ہی میز پر پڑا تھا۔ سارا کھانا فرزانہ نے پرویز کی مدد سے پکایا تھا۔ ہر چیز تیار تھی۔ فرزانہ کا انتظار تھا۔ وہ آئی۔ جاوید موجود تھے پھر بھی ڈرتی ہوئی۔ جھجکتی ہوئی ان کے ساتھ کی کرسی پہ بیٹھ گئی۔ اس کے دل میں خوف تھا۔ چور چھپا تھا۔ اور جاوید اس کی ہر بات کو ادا۔ ہر حرکت کو نزاکت سمجھ کر خوش

ہو رہے تھے۔

پرویز دونوں کے سامنے میز کے پرلی طرف بیٹھے تھے۔ بالکل نارمل انسانوں کی طرح ہنستے، باتیں کرتے کھانا کھا رہے تھے۔ فرزانہ نے جاوید سے نظر بچا کر۔ چپکے سے نظر اٹھا کر دیکھا۔ حیران رہ گئی۔ اب اس وقت پرویز کی آنکھوں میں انجانی حیرانی نہ تھی۔ غیر معمولی چمک نہ تھی پہلے والی۔ روزمرہ کی باتیں کر رہے تھے۔ عام طریقے سے سادہ انداز میں۔ فرزانہ کی طرف دیکھ رہے تھے۔ جاوید کے ساتھ دفتر کی باتیں کر رہے تھے۔ پھر سیاست پر۔ ملکی حالات پر بحث ہونے لگی۔ الیکشن کے موضوع پر باتیں کرنے لگے۔ پرویز بڑی اچھی طرح۔ حاضر دماغ انسان کی طرح، بحث میں شریک تھے کہ اخبارات کا مطالعہ کرتے رہتے تھے۔ کتب پڑھتے رہتے تھے۔ اخبارات و رسائل روزانہ، ہفتہ وار، ماہنامے سب ان کی نظر سے گزرتے۔ بہت ذخیرہ تھا ان کے پاس معلومات کا۔ اسی طرح بڑے خوشگوار ماحول میں کھانا ختم ہوا۔ دونوں بھائی باتیں کرتے رہے۔ فرزانہ چپکے سے سر جھکائے سنتی رہی۔ کھانا

کھاتی رہی - بعد میں بقیہ سالن وغیرہ لے کر فریج میں رکھنے لگی - جاوید نے میز پر سے برتن اٹھا کر سنک میں رکھے - پرویز جھاڑن لے کر میز صاف کرنے لگے - غرض سب کے مل جل کر کام کرنے کے اصول پہ جاوید کا گھر کسی نوکر کے بغیر بڑے طریقے سے، بڑے سلیقے سے چل رہا تھا - ادھر سے فارغ ہو کر جاوید اور فرزانہ، پرویز کے ساتھ ان کے کمرے میں آئے - کہ ہر کھانے کے بعد ان کو نیند کی دوا دی جاتی تھی - ان کی تنہائی کے خیال سے دونوں یہاں آجاتے دوا کے اثر سے جب وہ سو جاتے تو مطمئن ہو کر جاوید اپنی خواب گاہ میں آجاتے - آج بھی دوپہر کے آرام کے لیے آئے تو فرزانہ نے سارا واقعہ کہہ دیا - وہ دل ہی دل میں خوانخواہ اپنے آپ کو چور سمجھ رہی تھی - خاصی پریشان تھی - دل پہ بڑا بوجھ تھا - "اگر جاوید کو غلط فہمی ہو گئی تو" اس نے اپنے آپ سے کہا - زیر لب کہہ رہی تھی - "تو ــــ تمہیں نکال کر دوسری بیوی لے آؤں گا - پاکباز، نیک سی، اور تمہیں تمہاری ماں کے پاس بھیج دوں گا - وہ ہر وقت تمہیں طعنے دیا کرے گی - کھانے پینے کو بھی کچھ نہ دیا کرے گی" جاوید پلنگ کے

کٹہرے پہ سر رکھے ۔ سر کے نیچے دونوں ہاتھ رکھے آنکھیں بند کئے سیدھے لیٹے تھے ۔

" ہاں مجھے غلط فہمی نہیں یقین ہو جائے گا کہ تم جاوید کو نہیں ۔ پرویز کو چاہتی ہو " جاوید بڑے سنجیدہ ہو رہے تھے ۔ اور فرزانہ گھبراہٹ میں اُٹھ کر بیٹھ گئی ۔ وہیں پلنگ پر جاوید کے سامنے ۔ اس کے اندیشے پورے ہو گئے ۔ اس کو جس بات کا ڈر تھا وہی ہوا ۔ اتنی گرمی میں سردی سے ٹھٹھرنے لگی ۔ آنکھوں کے آگے اندھیرے چھا گئے ۔ آنسوؤں کے پردے میں جاوید نظر نہ آ رہے تھے ۔ اپنی صفائی میں کچھ کہنے کی ہمت ہی نہ تھی ۔ یہ بھی پشیمانی تھی کہ خود نہ ہی بتاتی تو اچھا تھا ۔ شاید بات چھپ ہی جاتی "

" پگلی " جاوید نے اس کو اپنی باہوں میں لے کر سینے سے لگا لیا ۔ وہ تھر تھر کانپ رہی تھی ۔ آنسو بہے جا رہے تھے سسک رہی تھی ۔

" اپنی بہن ـــ اپنی بیوی ـــ اپنی دوست سمجھ کر تمہیں پکڑ لیا ہوگا ۔ اس میں گھبرانے اور آنسو بہانے کی کونسی بات ہے " وہموں کی ماری فرزانہ کو ساتھ لپٹائے ۔ سینے سے

لگائے پیار کر رہے تھے۔ اس کو تسلی دے رہے تھے۔
"میری دوست۔ میری ہمسفر۔ میں نے تو تمہارے تو ہمات بنائے تھے جو تمہارے دل میں اس وقت طوفان اٹھائے ہوئے تھے۔" جاوید ہنستے ہوئے کہتے رہے۔ فرزانہ کے آنسو پونچھتے رہے۔ اس کو بہلاتے رہے۔ اپنی خالص محبت اعتماد، دائمی رفاقت کا یقین دلاتے رہے۔ پیار کی لوری دے کر اس کو سلاتے رہے۔
"ڈاکٹر عباس کہتے ہیں۔ کھوئی یادداشت ایسے ہی واپس آتی ہے۔ ماضی کے واقعات کا حال سے اتفاقیہ ٹکراؤ۔ مستقبل کی صحت کا ضامن ہوتا ہے۔" جاوید، ڈاکٹر کے بیان کا حوالہ دے کر فرزانہ کو مطمئن کرنا چاہتے تھے۔ ہر طرح سے تسلی کروانا چاہتے تھے تاکہ اس کی گھبراہٹ، پریشانی دور ہو جائے۔ روشن خیال، تعلیم یافتہ شوہر کو اس پر اعتماد تھا۔ وہ بڑی مطمئن ہو گئی ذرا ٹھنڈے دل سے سوچا تو جاوید کی باتوں میں سچائی نظر آئی۔ اسے یاد آ گیا کہ ڈاکٹر صاحب نے ان دونوں کو ہدایت کی تھی کہ پرویز کی باتوں سے گھبرانا نہیں۔ ان کی کسی حرکت سے پریشان نہیں ہونا۔ اسی طرح رفتہ رفتہ ماضی کی تصویریں

دماغ میں گھومتی رہیں گی — تو ایکدن ساری یادیں پلٹ آئیں گی ۔ اپنا ماضی یاد آجائے گا ۔ مریض صحت یاب ہو جائے گا ۔ اللہ نے چاہا تو مکمل صحت یابی ہو جائے گی —

"خدا کرے ایسا ہی ہو جائے ۔ انشااللہ ایسا ہی ہو گا ۔"

فرزانہ نے سچے دل سے دعا کی ۔ بڑے خلوص سے بڑی سچائی سے اس نے ایسا چاہا ۔

"کاش پرویز صحت یاب ہو جائیں ۔ مکمل طور پر صحتیاب ۔

(آمین)

باب ۱۶

میرا خوابِ غفلت، بڑا ہی حسین ہے!!
تصور کی دُنیا بڑی خوبصورت بڑی دل نشیں ہے

جاوید جس کمپنی میں کام کرتے تھے۔ بڑی پُرانی تھی۔ اپنے مالک کے دادا پردادا کے وقتوں کی انہیں کے نام پہ چل رہی تھی۔ انہیں کے نام سے مشہور تھی۔ کمپنی کے مالک کا شمار ملک کے امیر ترین چند گھرانوں میں ہوتا تھا۔ فرم کی شاخیں جال کی طرح پھیلی ہوئی تھیں۔ لاتعداد شعبے تھے۔ بے شمار حصّے تھے۔ بزرگوں کی بنائی ہوئی کمپنی دن دگنی رات چوگنی ترقی کر رہی تھی۔ ساری اولاد کے اپنے اپنے حصّے تھے

اپنا اپنا کام تھا - لیکن نام سب کا ایک ہی چلتا تھا - جس حصّے
میں جاوید ملازم تھے - اصلی مالک کی چوتھی، پانچویں پشت
تھی - نسل در نسل جائیداد وراثت میں ملتی جاتی ، اولاد بھی
بے حساب تھی - بیٹے پوتے بڑھتے جا رہے تھے - اس شہر
میں کمپنی کے مالک کی پانچ لڑکیاں تلے اُوپر ہوئیں - تو گھبرا کر
دوسری شادی رچا لی - اب بیٹے کے لیے دعائیں مانگی جا
رہی ہیں - منتیں مرادیں - صدقہ خیرات - نذر نیازیں، چڑھاوے
سارا کچھ ہی ہوا - آخر کار اللہ کا کرم ہوا اور اسی پانچ بیٹیوں کی
ماں کے بیٹا پیدا ہو گیا - پانچ بہنوں کا اکلوتا بھائی - سب صدقے
واری جا رہے تھے - اللہ آمین کا بچہ - سب کے دلوں میں
ہزاروں ارمان تھے - ارمان پورے کرنے کے لیے تجوریوں
میں دولت بھی خوب تھی - ایک سال کا عرصہ گزر گیا - بڑی
دھوم دھام سے بڑی شان و شوکت سے بچے کی پہلی سالگرہ
منائی جا رہی تھی - سات دن سے بینڈ باجے والے آئے ہوئے
تھے - وہ سارا دن خوشی کے نغمے موسیقی کی دھنوں میں سناتے
رہتے - لنگر جاری تھا - شکرانے کے لیے صدقے خیرات کا
سلسلہ زوروں پہ تھا - غربا کے لیے روزانہ دیگیں پکوائی جاتیں -

روپیہ، پیسہ، کپڑے کے بے شمار تھان کمپنی کے مزدوروں
ان کے بچوں میں تقسیم کئے گئے۔ ایک ایک ماہ کی تنخواہ بطور
انعام سب کو زائد دی گئی۔ غرض خوشی کے اظہار کا ہر طریقہ
اختیار کیا گیا۔ غریبوں کے ساتھ ساتھ امیروں کو بھی اپنی
خوشی میں شامل کیا۔ شہر کے امراء۔ معززینِ شہر۔ دوست
احباب۔ کمپنی کے ادنیٰ ملازم سے لے کر افسران بالا تک۔
سب کو مدعو کیا تھا۔ سالگرہ کا جشن تھا۔ ایک میلہ چراغاں تھا۔
وسیع و عریض کوٹھی کے ذرے ذرے پہ کارکنوں کے گھروں پہ
روشنیاں چمک رہی تھیں۔

جاوید بھی مدعو تھے۔ پرویز بھی تیار تھے۔ سیاہ ڈنر سوٹ
میں خوبصورت قدوقامت۔ سرخ و سفید رنگت۔ بڑے اچھے
لگ رہے تھے۔ جاوید بھی ڈنر سوٹ میں تھے۔ فرزانہ کی
تیاری جاری تھی۔ وہ سنگھار میز کے سامنے بیٹھی تھی۔ سنگھار
زوروں پہ تھا۔ سرخ بڑی قیمتی ساڑھی میں گلابی چہرہ، دہکتے
انگاروں میں کھلے پھول کی طرح متبسم تھا۔ شادی ہوئے تین
سال گذر گئے تھے۔ وہی نزاکت، سجاوٹ۔ وہی بانکپن۔
حسن وروپ، جوانی۔ ویسا ہی تھا۔ عمر اور وقت نے کوئی بھی

تبدیلی بنہ کی تھی ۔

" چلئے بیگم صاحبہ ! لوگ کھاپی کر جا چکے ہوں گے ۔" جاوید آئینے میں دیکھتے ہوئے مسکرائے ۔ وہ فرزانہ کے دونوں شانوں پہ ہاتھ رکھے جھکے ہوئے تھے ۔ فرزانہ کے اوپر ــــ پرویز بھی ساتھ ہی کھڑے تھے ۔ سامنے کی طرف سنگھار میز کے شیشے کے سہارے سے ۔ آئینے میں عکس دیکھنے کی بجائے سامنے سے اصل روپ میں کھوئے تھے ۔ بڑے خاموش بڑے سنجیدہ ــ فرزانہ ــ رنگ برنگ نگینے جڑا طلائی گلوبند پانچ لڑی کا بڑا طلائی ہار ۔ بڑے بڑے جھمکے ۔ ایک ہاتھ میں سونے کی چوڑیاں ، جڑاؤ کڑے ، ساری انگلیوں میں خوبصورت انگوٹھیاں پہنے تھی ۔ سولہ سنگھاروں میں پلٹ کر جاوید کی طرف دیکھا ۔ مسکرا کر پھر جھک گئی ۔ ڈریسنگ ٹیبل کے دراز میں سے سرخ کانچ کی چوڑیاں ، چمکتی سنہری چوڑیاں نکال کر جلدی جلدی پہن رہی تھی ۔ بڑی پیاری بھولی بھالی سی لگ رہی تھی ۔ جاوید نوک پلک سنوری خوبصورت بیوی کو پیار بھری نظروں سے دیکھ رہے تھے ۔ بڑے خوش تھے اپنی خوش نصیبی پہ ۔ چوڑیاں پہن کر جلدی سے اٹھی ۔ نگاہ

اُٹھائی تو جاوید کی پیار چھلکاتی آنکھوں میں ڈوبنے لگی۔ لیکن ڈوبنے سے پہلے کشتی ڈولنے لگی۔ ہچکولے کھانے لگی کیونکہ پرویز کی نظریں بھی بڑی دیر سے فرزانہ پہ جمی تھیں — ان نظروں میں کچھ اور تھا۔ غیر معمولی چمک تھی۔ انجانی پریشانی بڑا عجیب انداز تھا ان نشیلی آنکھوں کا۔ وہ فرزانہ کے روپ سنگھار میں کھوئے دم بخود کھڑے تھے۔ کچھ سوچ رہے تھے بغور دیکھ رہے تھے۔

"چلیئے" فرزانہ ساڑھی سنبھالتی ہوئی آگے بڑھی۔ سر جھکائے اپنی گھبراہٹ کو چھپا رہی تھی۔ آواز میں لرزش تھی۔ سارے جسم پہ لرزہ طاری تھا۔ گھبرا کر جاوید کا بازو پکڑے تھی۔ سوچ رہی تھی۔ پرویز۔ پرویز — اس دن کی طرح ہی دیکھ رہے تھے۔ خوف کے مارے بُرا حال تھا فرزانہ کا۔

جاوید رُکے، میز پر جھکے۔ چھوٹی سی ڈبیا میں سے ایک گول سُرخ بندیا۔ جس کے درمیان میں سنہری تارا چمک رہا تھا۔ فرزانہ کی پیشانی پہ لگادی

پرویز کو تو جیسے کرنٹ لگ گیا۔ دم بخود کھڑے تھے اچھل پڑے۔ برق رفتاری سے آگے بڑھے۔

سرخ بندیا۔ سرخ چوڑیاں، سرخ ساڑھی، گلابی ہونٹوں پہ سرخی - مائل سُرخی - ماضی نے کروٹ لی - بے قراری بڑھ گئی - اوراق ماضی یادوں کی تند ہواؤں سے اُڑنے لگے بکھرنے لگے - کمرے کے اندر، کمرے کے باہر، ماضی کی کتاب کھلی ہوئی تھی - چاروں طرف سرخ ہی سرخ رنگ پھیلا ہوا تھا جیسے فرزانہ کا حسین سراپا سُرخ شعلوں میں گھرا تھا - ان کی آنچ سے شعلوں کی لپک سے پرویز جھلس رہے تھے - آگ بھڑکتی ہوئی سرخ سرخ آگ پرویز کو اپنی لپیٹ میں لیے جا رہی تھی - بڑی تیزی سے - آگ - آنچ - گرمی - پرویز تو موم کی طرح پگھلنے لگے - پسینے کے قطرے ٹپک رہے تھے - کانچ کی سرخ روپہلی چوڑیوں والا نرم و نازک ہاتھ، ہاتھ بڑھا کر اپنے ہاتھ میں لے لیا - چوڑیوں کو دیکھتے رہے - ان پر آہستہ آہستہ ہاتھ پھیرتے رہے - چہرے پہ تبسم بھی تھا سوچ کے گہرے بادل بھی تھے - نہ پوری طرح ہوش میں تھے نہ بے ہوش - مدہوش سے لگ رہے تھے - بے خود سے ہو رہے تھے -

"سُرخ ساڑھی - سرخ بندیا - سُرخ - چوڑیاں -،

میری۔ میری پسند۔" پرویز نے ہاتھ چھوڑ پوری فرزانہ کو پوری قوت سے اپنی باہوں میں سمیٹ لیا۔ اپنے پیار کو۔ اپنی پسند کو۔ جاوید کے ہوتے ہوئے، ان کے شوہر کی موجودگی میں۔

"میں لایا تھا۔۔۔ میں۔۔۔ نے۔۔۔ پہنائی تھیں۔" وہ فرزانہ کو اسی طرح بازوؤں میں جکڑے بے خودی میں کہہ رہے تھے۔ فرزانہ کے حواس ٹھکانے نہ تھے۔ وہ تو جیسے بے ہوش ہوگئی تھی۔ خوف کے مارے سانس بھی نہ لے رہی تھی۔

"ہاں۔ دیور بھیا لاتے تھے۔۔۔ اپنی بھابی کے لیے۔" جاوید نے کہا۔ وہ پرویز کی انجانے میں نادانی پہ نہیں بلکہ فرزانہ کی پریشانی پر پریشان تھے۔ کہ اُس دن شوہر کی غیر موجودگی میں واقعہ ہوا تھا۔ تو رو رو کر بُرا حال کر لیا تھا۔ بڑی ایمانداری سے ساری بات ان کو بتائی تھی۔ اپنی پاکبازی کی قسمیں کھا رہی تھی۔ اپنی محبت، خلوص کا یقین دلا رہی تھی آج۔۔۔ پھر۔۔۔

"بھابی کے لیے" پرویز نے اسی انداز میں فرزانہ کو

پکڑے زیر لب کہا۔

"نہیں — نہیں — میری بھابی نہیں — میری — میری اپنی —" پرویز دھیمے دھیمے کہہ رہے تھے۔ سرگوشی کے انداز میں بول رہے تھے۔ انہیں بعض اوقات ایکدم دورہ سا پڑتا۔ کوئی بھی واقعہ یاد آجاتا۔ نہ تو واضح طور پر بیان کر سکتے اور نہ ہی اپنے پر قابو رہتا تھا۔ کچھ دیر ایسی ہی کیفیت رہتی۔ پھر نارمل انسانوں کی طرح نظر آنے لگتے لیکن اس وقت جنون کچھ طوفانی نوعیت کا تھا۔ سب کچھ بھولے بیٹھے تھے۔ فرزانہ کو بھاوج ماننے کے لیے تیار نہیں تھے اور — فرزانہ، جاوید کے خوف سے لرز رہی تھی۔ زمانے کی باتوں سے ڈر رہی تھی۔ اپنی زندگی میں آنے والے طوفانوں سے دہل رہی تھی۔ دل بُری طرح، بڑی تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ بلکہ پوری دنیا میں زلزلہ آگیا تھا۔

"کتنا بھی روشن خیال ہو۔ آخر تو مرد ہے۔ خود تو جو مرضی کرتے پھریں — اپنی بیوی، بیٹی کو۔ بہن کو۔ غیر مرد کے ساتھ دیکھ نہیں سکتے۔ برداشت ہی نہیں کر سکتے۔ حد کر دی پرویز بھائی نے۔ آج تو مجھے گھر سے نکلوا

کمو ہی رہیں گے،، وہ سوچے جا رہی تھی۔ روئے جا رہی تھی۔ اپنی بربادی کے سامان نظر آرہے تھے۔

" اب کیا ہوگا۔ اب کیا ہوگا۔ میں مر جاؤں گی "۔ دل و دماغ چیخ رہے تھے۔

" ارے بھیا! یہ تو آپ کی بھابی ہیں۔ فرزانہ بھابی میری بیوی "۔ جاوید نے پرویز کے شانے پہ ہاتھ رکھ کے زور سے جھنجھوڑا۔

" بھائی جان ۔ بھابی ۔ بھابی ۔ آپ کی بیوی" ایکدم فرزانہ کو چھوڑ دیا۔ دونوں ہاتھ ہٹا لیے ۔ وہ تو اگر جاوید پکڑ نہ لیتے تو فرزانہ فرش پہ آگرتی۔ " فرزانہ ۔ فرزانہ۔ جاوید بھائی جان۔ بھابی "۔ وہی لفظ دہرا رہے تھے۔ آہستہ آہستہ زیر لب بار بار۔

جاوید جانتے تھے پرویز بیمار ہیں۔ اپنے حواسوں میں نہیں۔ ایک مخبوط الحواس سے کیا شکوہ۔ ذہنی مریض سے کیا شکایت۔ وہ تو خدا کا صدہا بار شکر ادا کرتے تھے۔ پرویز کو روبصحت دیکھ کر۔ کیا حالت تھی ان کی۔ کس طرح چھ ماہ کا عرصہ بے سدھ بدھ پڑے رہے تھے۔ یہ تو سب خدا کا فضل تھا۔

فرزانہ بھی سب کچھ جانتی تھی۔ لیکن پریشانی میں بھول جاتی۔ اب بھی رو رہی تھی۔ سسکیاں لے رہی تھی۔ سنگھار خراب ہو گیا تھا۔ جانے سے انکاری تھی۔ جاوید اس کو سمجھا رہے تھے۔ جب ان کے دل میں کوئی شک و شبہ نہیں۔ فراخ دل انسان۔ بیمار کو بیمار سمجھتے تھے۔ ان کی بیماری اور تیمارداری کی خاطر تو انہوں نے اپنا آرام، سکھ، چین، رات کی نیند سب کچھ قربان کیا تھا۔ تو وہ کیسے ان کے متعلق یا اپنی پاکدامن بیوی کے متعلق کوئی غلط بات سوچ سکتے تھے۔ وہ چھوٹے بھائی تھے فرزانہ بیوی۔ سمجھا بجھا کر دوبارہ تیار کروا کے فرزانہ کو ساتھ لائے۔ پرویز بھی خاموش ساتھ چل رہے تھے۔

"ہم جلد ہی ایک سرخ چوڑیوں والی لے آئیں گے اپنے بھیا کے لیے۔ سرخ بندیا لگائے۔ سرخ ساڑھی پہنے۔ ہاتھوں میں مہندی رچائے ہمارے گھر آجائے گی۔" جاوید نے بڑی محبت سے پرویز کے شانے پہ ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

وہ بڑے خاموش، اداس نظر آرہے تھے۔ "سرخ چوڑیوں والی"، پرویز نے آہستہ سے کہا۔ اور پھر گہری گہری نظریں فرزانہ کے حسین مکھڑے پر سے پھسلتی ہوئی چوڑیوں پہ آ

کر رُک گئیں۔ وہ عالم محویت میں گھورتے رہ گئے۔ اور فرزانہ کی جان نکل گئی ___ کہ اب دوبارہ خواہ مخواہ ہی جاوید یاد کرا رہے ہیں ۔

" ہاں۔ میرے بھیّا! سُرخ چوڑیوں والی ۔ میری بھابی ۔ تمہاری نہیں" پرویز کا شانہ زور سے ہلاتے ہوئے جاوید کہہ رہے تھے ۔ وہ اصل میں ان کو بیدار کرنا چاہتے تھے ۔ اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے لگے ۔ نہ جانے کونسی کہانیاں قِصّے سنانے لگے ۔ اور واقعی تھوڑی دیر کے بعد پرویز بالکل صحت مند حالت میں تھے ___ ماضی کو بھول ۔ حال میں گم ۔

" جلدی جلدی ___" جاوید نے تیز قدم بڑھاتے ہوئے دونوں ساتھیوں کو بھی تیز چلنے کی ہدایت کی ۔ وہ سوچ رہے تھے کہ یوں سرخ ساڑھی میں عروس نو کے روپ میں پرویز فرزانہ کو دیکھ کر پریشان ہو گئے ۔ اپنی بیوی کا نقشہ یاد آگیا ہو گا ___ دل میں یہی کچھ سوچ رہے تھے اور بظاہر پرویز اور فرزانہ کو تیز چلنے کے لیے کہہ رہے تھے ۔

" اوہ فرزانہ۔ آپ "

" ہیلو مسز تنویر "

فرزانہ اور مسز تنویر ایک دوسرے کو دیکھتے ہی لپٹ گئیں۔ ایک بار کہیں گاڑی میں ملاقات ہوئی تھی۔ مسز تنویر کی ظرافت کی وجہ سے خاصا لمبا سفر بڑا دلچسپ گزرا تھا۔ جو اب بھی دونوں کو یاد تھا۔

نئی نویلی دلہن کی طرح سجی فرزانہ ۔۔ اور ساتھ میں خوبصورت نوجوان ۔۔ فرزانہ کے شوہر کتنے باوقار، کتنے خوبصورت ہیں مسز تنویر سوچ رہی تھیں۔

"میرے دیور ۔۔۔ پرویز بھائی" فرزانہ نے تعارف کروایا۔ مسز تنویر نے بڑے تپاک، بڑی خوشدلی سے ہاتھ ملایا اور ہاتھ پکڑے ہی رہیں۔ بڑے غور سے۔ بڑے شوق سے پرویز کو دیکھتی ہی رہیں۔ پلک جھپکے بغیر۔ پرویز بھی چپ چاپ بے نیاز سے کھڑے تھے۔ اتنے میں بیرا ٹرے میں مشروب لیے آگیا تو وہ چونک گئیں۔

"اچھا ۔۔ دیور ہیں ۔۔ تو بھئی شوہر کہاں ہیں۔؟ ان سے بھی تو ملواؤ ۔" مسز تنویر ہوش میں آگئیں تو ادھر ادھر دیکھ کر فرزانہ سے پوچھا۔

"ان کے دوست کی طبیعت اچانک خراب ہوگئی تھی۔ راستے

میں سکوٹر پہ لڑکا ملا۔ تو۔ ہمیں یہاں پہونچا کر وہ فوراً اس کے ساتھ چلے گئے۔ کہتا تھا۔ پیٹ میں شدید درد اٹھا ہے اس کے والد کو۔" فرزانہ نے تفصیل بتائی۔

"آج آپ ہمارے گھر چلیے گا۔ یہاں قریب ہی ہے۔ اسی احاطے کی حدود میں" فرزانہ نے مسز تنویر کو دعوت دی۔ آئیے بیٹھتے ہیں مسز تنویر۔" پرویز کے ساتھ فرزانہ صوفے پہ بیٹھ کر مسز تنویر کو بھی بلا رہی تھیں۔ لیکن وہ سامنے کھڑی ان دونوں کو بڑے اشتیاق سے دیکھتی رہیں۔ اور نہ جانے کیا کیا کچھ سوچتی رہیں۔

"ہائے ــ بالکل ــ تقدیس ــ ہو بہو ــ شہزاد" ٹھنڈی آہ بھرتے ہوئے بڑی آہستہ سے مسز تنویر نے کہا۔

"کون ــــ؟ کہاں ــ؟" پرویز چونک سے گئے۔ پلٹ کر دروازے کی طرف دیکھنے لگے۔

"آپ کیوں چونک گئے ــــ؟ بھیّا ــ وہ ــ میرے دیور ــ دیورانی ہیں" مسز تنویر نے ذرا جھکتے ہوئے کہا۔ وہ پرویز کی آنکھوں میں کچھ ڈھونڈ رہی تھیں۔

"تقدیس ــ شہزاد ــ دیور ــ دیورانی ــ" پرویز کی

کچھ عادت سی تھی کہ کوئی بھی بات سُن کر، الفاظ سُن کر آہستہ آہستہ دہراتے تھے۔

"کیا آپ اُن کو جانتے ہیں" مسز تنویر نے بڑے شوق سے پوچھا۔

"نہیں ——" پرویز نے مڑ کر لاپرواہی سے انجانے میں انکار میں سر ہلا دیا۔

"بھابی —" پرویز نے مُڑ کر فرزانہ سے کچھ کہنا چاہا تو مسز تنویر جلدی سے آگے ہو گئیں —"جی میرے بھیّا —" مسز تنویر بولیں۔

"پرویز بھیّا! اگر فرزانہ آپ کی بھابی ہیں — تو میں بھی ہوں — ان سے بڑی —" مسز تنویر کا بڑا دل چاہ رہا تھا کہ پرویز کے ہونٹوں پہ بھابی کا لفظ آئے۔ تو وہ ان کی طرف دیکھ رہے ہوں۔ مجھے پکارتے ہوں —" بھابی۔ بھابی کاش —"

"چلیئے ٹھیک ہے۔ ہمیں ایک اور بھابی مل گئی۔ بھابی نمبر ا بھابی نمبر ۲ —" پرویز نے بڑی معصومیت سے پہلے مسز تنویر اور پھر فرزانہ کی طرف انگلی سے اشارہ کیا۔ مسز تنویر، پرویز

کے ساتھ صوفے پر بیٹھ گئیں۔ اور بلا تکلف خوبصورت پرویز کو اپنے ساتھ لگا لیا۔ "میرے اچھے بھیا! خدا تمہیں زندگی دے میں آج کتنی خوش ہوں" وہ پرویز کے شانے پہ ہاتھ رکھے بہت خوش تھیں مگر بے چین۔ کچھ پریشان بھی۔

"فرزانہ — میرا تو دل چاہ رہا ہے۔ نہ کچھ کھاؤں نہ پیئوں۔ بس تمہارے ساتھ تمہارے گھر جاؤں۔" وہ پرویز کو ہی دیکھے جا رہی تھیں۔ کبھی کھڑی ہو جاتیں۔ کبھی بیٹھ جاتیں۔ بس نظریں تھیں۔ کہ پرویز کے چہرے پر گڑی تھیں۔ اس کے سراپے کو دیکھے جا رہی تھیں — فرزانہ ہزار آزاد ماحول کی پروردہ۔ ذہن میں تو مشرقیت تھی۔ اپنے رسم و رواج۔ اپنی تہذیب مہذب طور اطوار کو پسند کرتی تھی۔ ایک شادی شدہ عورت۔ دو بچوں کی ماں — اس طرح ایک غیر در غیر مرد میں دلچسپی لے رہی تھی۔ دیوانوں کی طرح دیکھے جا رہی تھی۔ عجیب سا لگ رہا تھا۔ پہلے تو بڑے تپاک سے ان کو ملی ہیں اور اب پرویز میں ہی کھوئی تھیں۔ زیادہ توجہ ان کی طرف تھی۔ یہ بات اچھی تو نہ لگتی تھی — لیکن خاموش رہی۔

رات گئے بہت دیر تک دعوت طعام۔ پھر موسیقی، ڈانس

وغیرہ کے پروگرام کے بعد واپسی ہوئی - جاوید کا ہسپتال سے دو مرتبہ فون آچکا تھا کہ ان کے دوست کی طبیعت زیادہ خراب ہے - اپنڈکس کا اپریشن ہو رہا ہے - خود نہ آنے کی معذرت اور فرزانہ اور پرویز کی تسلی کروا رہے تھے - مسز تنویر اس وقت اتنی رات گئے فرزانہ کے گھر آنے پہ تیار - فرزانہ کو بڑا افسوس تھا کہ اچھی خاصی مسز تنویر ــــ کو کیا ہو گیا ہے - ایک اجنبی نوجوان میں یوں دلچسپی لینا - بے تکلفی سے پیش آنا - اچھا نہیں لگتا تھا - ایک میں ہوں کہ شوہر کے خوف سے لرز رہی تھی - مرتی جا رہی تھی کہ ان کو کوئی بدگمانی نہ ہو جائے - اور ایک یہ ہیں - عورت کے بھی کتنے روپ ہیں - کتنے رنگ ہیں - افسوس کے ساتھ فرزانہ کے دل میں ان کے لیے وہ جگہ نہ رہی - ان کی نگاہوں میں وہ عزت نہ رہی - اپنے مقام سے گر گئی تھیں - مسز تنویر تو کھینچتی چلی آ رہی تھیں - پرویز کی کشش میں اپنا آپ بھول گئیں - گھر بار، شوہر، بچے - روزانہ آتیں گھنٹوں بیٹھی رہتیں - اپنے گھریلو قصے - اپنے میل ملاقات - والوں کی باتیں دہراتی رہتیں - کیا کیا کچھ سناتی، بتاتی رہتیں - کئی تو بڑے بڑے البم اٹھا لائی تھیں - لاتعداد رنگین تصویریں - اپنی

اپنے عزیزوں کی۔ اقربا کی۔ وہ پرویز کے پاس بیٹھی دکھاتی سب کا تعارف کرواتی رہتیں۔ اور ایک دن تو اپنے دیور کی منگنی کی متحرک تصویر" ویڈیو فلم" ساتھ اُٹھا لائیں۔ کئی گھنٹے کی فلم ٹی وی پر چلتی رہی۔ وہ پرویز کے ساتھ بیٹھی دیکھتی رہیں۔ جاوید اور فرزانہ تو چپکے سے وہاں سے اُٹھ آئے کیونکہ پرویز بھی اس خاتون سے بہت مانوس ہو گئے تھے۔ وہ آجاتیں تو ان کے پیار میں، ان کے محبت بھرے انداز میں کھو جاتے۔ فرزانہ نے کئی مرتبہ کہا بھی کہ اپنے شوہر کو لائیں۔ جاوید بھی اصرار کرتے رہے۔ لیکن وہ توجہ ہی نہ دیتی تھیں جیسی گاڑی میں ملی تھیں۔ اب اس سے بڑی مختلف نظر آتی تھیں۔ بہرحال فرزانہ کے گھر ان کی آمدورفت۔ اور گھنٹوں قیام رہتا۔ فرزانہ اور جاوید کو نظر انداز کر کے پرویز کی دلوائی تھی۔ صاف لگتا تھا کہ صرف اور صرف پرویز کی خاطر آتی ہیں۔ سب سے احمقانہ بات تو یہ لگتی تھی کہ بس اپنے دیور کی، دیورانی کی باتیں کرتی رہتیں اور فرزانہ کی صورت دیکھتیں۔ سرخ و سفید۔ صحت مند گالوں نازک سراپا کو دیکھتیں تو سوچتی رہتی کہ میری دیورانی بھی کبھی ایسی تھی۔ فرزانہ جیسی۔ اور۔ میرے دیور۔ میرے

خوبصورت دیور ۔ پرویز کی طرح ـــــــ

جب سے مسز تنویر نے اپنے دیور کی منگنی کی فلم دکھائی تھی ـ فلم دیکھنے کے بعد پرویز کی طبیعت بہت خراب ہو گئی تھی ۔ سر میں ہر وقت درد رہتا ۔ بعض اوقات تو درد کی ایسی لہریں اٹھتیں کہ برداشت نہ ہوتی ۔ تڑپنے لگتے ۔ ڈاکٹروں نے اس تکلیف کو دور کرنے، مکمل آرام و سکون کی غرض سے نیند کی دوا تجویز کی تھی ۔ ہر وقت غنودگی میں پڑے رہتے ۔ آنکھ کھلتی تو مختلف نام لیتے ۔ اپنے عزیزوں کے نام پکارتے کبھی رونے لگتے ۔ کبھی ہنستے ۔ مسکراتے ۔ زیادہ تر خواب کی کیفیت تھی ۔ ذہنی تکلیف کا شدید دورہ تھا ۔ ہوش و حواس درست نہ تھے ۔ اس بے بسی کی حالت میں دیکھ کر فرزانہ اپنے آنسو ضبط نہ کر سکتی ۔ دعاؤں کے ساتھ روتی بھی بہت تھی ۔ مسز تنویر پر بہت غصہ تھا کہ ان کی ساری محنت ـ ڈاکٹروں کی کوشش ضائع کر دی اور پرویز زیادہ بیمار ہو گئے انہوں نے تو صاف صاف لفظوں میں مسز تنویر سے شکوہ کر دیا تھا ۔ خاصی ناراض ہوئی تھی ان کے ساتھ ـــ دبے دبے لفظوں میں اپنے گھر نہ آنے کا بھی کہہ دیا تھا ۔ اور مسز تنویر نے

آنا ترک کر دیا تھا۔

ڈاکٹروں کا خیال تھا کہ خوابیدہ ذہن بیدار ہو رہا ہے۔ ماضی کی یاد ذہن میں آتی ہے۔ ڈاکٹر عباس دن میں دو مرتبہ آتے۔ بڑی دیر اپنے مریض کے سرھانے بیٹھے رہتے معائنہ کرتے۔ سوچتے رہتے۔ ان کا خیال تھا کہ جلدی صحت یاب ہو جائیں گے۔ غذا، دوا کا ہر طرح خیال رکھنے کی ہدایت کرتے۔ اور یہ بھی کہ پرویز کی ہر خواہش کا احترام کیا جائے۔ وہ جو بھی کہیں، ان کی ہاں میں ہاں ملائی جائے۔ کسی بات کا جواب انکار میں نہیں ہونا چاہیئے۔

پرویز کی طبیعت کی زیادہ خرابی کی وجہ سے جاوید چھٹی پر تھے۔ ہر طرح کا خیال کرتے۔ اپنے ہاتھ سے روزانہ ناشتہ کھلاتے، کہ بڑے عزیز چھوٹے بھائی تھے پرویز۔ ان کی زبانی ماضی کی بے شمار داستانیں سنتے رہتے۔ کئی واقعات تو پرویز بار بار۔ کئی کئی بار دہراتے۔ جاوید حامی بھرتے جاتے۔ اصل حقائق ابھی پردے میں تھے۔ فرزانہ، دیوانے سے ہمیشہ خوف کھاتی تھی۔ اب ان کے اس طرح چیخنے چلانے کبھی ہنسنے، کبھی رونے سے۔ کبھی کبھی اٹھ اٹھ کر

بھاگنے سے تو فرزانہ بڑی خوفزدہ تھی ۔ کمرے کے باہر سے دروازے پہ لگی جالی میں سے دیکھتی ۔ پرویز کی صحت وسلامتی کی دعائیں مانگتی ۔ خدا کے حضور رو رو کر اپنے بھائی کی تندرست زندگی کے لیے عاجزی کرتی ۔

بڑی کوشش اور تلاش کے بعد ۔ ایک جز وقتی ملازمہ مل گئی تھی ۔ کپڑے، برتن، صفائی وغیرہ کافی کام کر جاتی ۔ کھانا پکانے والی کوئی نہ ملتی ۔ یہ کام فرزانہ کے ذمہ تھا ۔ پرویز کی بیماری کی وجہ سے جاوید گھر پہ ہی ہوتے ۔ فرزانہ کا ہاتھ نہ بٹا سکتے تھے ۔ مریض کو اکیلا چھوڑنے سے ڈاکٹر صاحب نے منع کیا تھا ۔ اس لیے جاوید سارا دن ان کے پاس ہی رہتے ۔

صبح اچانک دفتر سے فون آگیا ۔ کمپنی کے مالک نے فوری حاضری کا حکم دیا تھا ۔ نوکری کا معاملہ تھا ۔ مجبوری تھی ۔ جلدی جلدی تیار ہو گئے ۔ جاتے ہوئے فرزانہ کو پرویز کے ناشتے اور دوا کے متعلق ہدایات اور احتیاط کی تلقین کر گئے تھے ۔ وہ پہلے ٹال مٹول کرتی رہیں ۔ جب "دس" بج گئے اور بچاؤ کی کوئی صورت نظر نہ آئی ۔ تو دل مضبوط کر کے ناشتہ لیے پرویز کے کمرے میں آئی ۔ ڈر کے مارے برا حال تھا

لیکن مرتی کیا نہ کرتی ۔ جاوید کا بھی ڈر تھا ۔ وہ ایسی بات پسند نہ کرتے ۔ بہت ناراض ہوتے ۔ کہ انہیں پرویز سے ہمدردی تھی ۔ محبت تھی ۔ گہری محبت ۔ اپنے پیارے چھوٹے بھائی کی طرح ان کو چاہتے تھے ۔ ناشتے کی ٹرالی پلنگ سے ٹکرا گئی ۔ پرویز نے خوابناک آنکھیں کھولدیں ۔ نیند سے بوجھل سُرخ سُرخ آنکھیں ۔

"کون ۔۔۔ ؟" تھوڑا سا سر تکیے پہ سے اُٹھا کر پوچھا آواز میں غنودگی تھی ۔ نیند کا خمار تھا ۔

"پرویز بھائی ۔۔۔ مَیں ہوں ۔" فرزانہ ٹرالی کی دستی پہ ہاتھ رکھے آہستہ سے بولی ۔ جان نکل رہی تھی ۔ اکیلی تھی پرویز کے کمرے میں ۔

"کون ۔۔۔ ؟" پرویز سے اُوپر ہوتے ہوئے بغور دیکھ رہے تھے ۔ بڑی حیرانی سے مخمور آواز میں اپنا سوال دہرایا ۔

"مَیں ۔۔۔ مَیں ۔۔۔ فر ۔ ز ۔ ا ۔ نہ ۔۔۔ پرویز بھائی ۔" فرزانہ بڑی نرم آواز میں رُکتے ہوئے کہہ رہی تھی ۔

"شبانہ ۔۔۔ شبانہ " پرویز آنکھیں ملتے ہوئے اُٹھ کر بیٹھ گئے ۔ آواز میں خوشی تھی ۔ بے پناہ پیار تھا ۔ لہجہ

پرے کھسکا دیا۔ سرخ کوٹ پہنے فرزانہ سامنے کھڑی تھی
غور سے دیکھتے رہے۔ پھر ہاتھ بڑھا کر اس کا ہاتھ پکڑ لیا
کھینچ کر اپنے قریب کر لیا۔ دائیں ہاتھ میں اس کا ہاتھ پکڑے
دوسرے ہاتھ سے سہلا رہے تھے۔ نرم ہاتھ کو دیکھ رہے
تھے۔ ناخنوں پہ لگی کیوٹیکس کو پہچان رہے تھے۔ اپنے ساتھ
پلنگ پہ بٹھائے۔ اس کے سر پہ ہاتھ رکھ دیا۔

"مجھ سے ناراض ہو ــــ؟ میری اچھی بہن ــ میری گڑیا"
پرویز نے ٹرالی پرے دھکیل کر ــ کھینچ کر بڑے زور سے
اپنے سینے سے لگا لیا۔ اب ــ کاٹو تو بدن میں لہو نہیں۔
فرزانہ کے۔ "ہائے دلوانہ ــــ پہلے ہاتھ پکڑا۔ پھر بانہوں
میں جکڑا ــ بس اب گلا گھونٹ دیں گے" اپنے بالوں پہ
رکھا پرویز کا ہاتھ۔ گردن کی طرف پھسلتا محسوس ہو رہا تھا۔
گلے پہ دباؤ لگ رہا تھا۔ دم گھٹ رہا تھا۔

"خدایا ــــ جاوید کہیں سے آجائیں ــ میری جان چھڑائیں
ہائے مجھے بچائیں ــ بس آج میں مر گئی" فرزانہ یہی سوچ سوچ
کر بے دم ہوئی جا رہی تھی۔ اُٹھ نہیں سکتی تھی کہ پرویز کے
دونوں ہاتھوں کا دباؤ اس کے اُوپر تھا۔ اور ــ پرویز سنوج

رہے تھے کہ " ان کی بہن بہت ناراض ہے۔ ورنہ تو بے ساختہ گلے میں باہیں ڈال کر جھول جاتی۔

"میں منالوں گا ۔۔ صلح کر لوں گا ۔۔ اپنی ننھی سی بہن سے" پھر فرزانہ کو شانے سے پکڑ کر اپنے سامنے بٹھالیا۔ پھر ادھر اُدھر کمرے میں نظر گھما کر دیکھا۔

" وہ ۔۔۔ وہ ۔۔۔ کہاں " پرویز نے فرزانہ کا چہرہ اپنی طرف کرتے ہوئے بڑی ملائم آواز میں پوچھا۔

" وہ ۔۔۔ دفتر" بڑی ہمت کر کے فرزانہ بولی۔

" دفتر ۔۔۔ ؟ کب سے جانا شروع کر دیا ؟" پرویز بڑے حیران ہو رہے تھے۔

" آج صبح سے " فرزانہ، صبح اچانک بلاوے اور جاوید کی دفتر روانگی کا بتا رہی تھی۔

یک لخت پرویز کے دماغ میں درد شروع ہو گیا۔ ایک لہر سی اُٹھی۔ دونوں ہاتھوں سے سر پکڑ لیا۔ زور سے دبانے لگے۔ فرزانہ کو تو اب کچھ سوجھ نہیں رہا تھا۔ ان کا سر اپنے ہاتھوں سے دبانے کی کوشش کی تو ۔۔ ان کے مضبوط ہاتھوں کی گرفت اپنے سر پر زبردست تھی " اُف ۔ ہائے"

فرزانہ اب اور بھی ڈر رہی تھی ۔ ناشتے کو دیر ہوگئی ۔ دوا کو دیر ہوگئی تھی ۔ درد کا دورہ شروع ہوگیا تھا ۔" جاوید آگئے تو مشکل بڑھ جائے گی ۔ ناراض ہوں گے ۔ کیا کروں ۔ کیا نہ کروں " بات بھی ٹھیک تھی ۔ اس کی غلطی تھی ۔ ناشتے میں دیر کی ۔ دوا بروقت نہ ملی ۔ دواؤں کے سہارے جیتے مریض کی حالت غیر ہوگئی ۔ ڈاکٹر صاحب کی ڈانٹ کا ۔ ناراضگی کا خوف تھا ۔ اس الجھن میں پڑی تھی ۔

" شبانہ ! چچا جان کو سلام نہیں کرتی ـــــ ؟" درد کی شدت سے کراہ رہے تھے ۔ دونوں ہاتھوں سے سر کو دبائے ۔ پرویز نے چچا جان کو پہچان لیا ۔ دونوں نازک ہاتھوں سے ان کے شانے دباتی فرزانہ کو ڈانٹ رہے تھے ۔ اب تو اس کے رہے سہے حواس بھی جاتے رہے ۔ جاوید کو چچا جان' فرزانہ کو شبانہ کہہ رہے تھے پرویز ۔

" شبانہ سلام نہیں کرتی تو ہم کر دیتے ہیں " دفتر کے کام سے فارغ ہوکر جاوید واپس آگئے تھے ۔ تمام وقت پرویز کی طرف سے فکر ہی رہی ۔ فرزانہ کی عادت بھی جانتے تھے جب سے وہ زیادہ بیمار ہوئے تھے ـــ وہ زیادہ خوفزدہ

رہتی تھی ۔

"ابھی تک ناشتہ نہیں کیا میرے بھائی نے" جاوید کو بہت افسوس ہو رہا تھا ۔ کہ وہ ابھی تک بھوکے پڑے تھے دوا کے بغیر ۔ اور یہی وجہ تھی کہ درد بڑھتا جا رہا تھا ۔ وقفے وقفے سے جھٹکے لگتے تھے ۔

جاوید کرسی لے کر پرویز کے پلنگ کے قریب بیٹھ گئے ٹرالی میں سے گہری پلیٹ کر دلیہ لیا ۔ دودھ چینی ملا رہے تھے ۔ فرزانہ تھوڑی دیر ان کی کرسی کی پشت پر ہاتھ رکھے کھڑی رہی ۔ پھر چپکے سے کھسک گئی ۔ جاوید کرسی سے اُٹھ کر پرویز کے پلنگ پہ آ گئے ۔ اپنے ہاتھ سے چمچے میں دلیہ لے کر پرویز کو کھلانے لگے ۔

" لیجئے ۔ چچا جان ! میں اب اتنا بچّہ بھی نہیں ہوں ۔ آپ کے ہاتھوں سے چمچے کھاؤں ۔ آپ سے لوریاں سُن کر سو جاؤں " پرویز ہنس رہے تھے ۔ دونوں ہاتھ بھی سر پر سے اُٹھا لیے تھے ۔ جیسے اب درد بالکل نہیں تھا ۔ بھائی کے ہاتھ سے پلیٹ لے کر چمچہ پکڑ کر کھانے لگے ۔ جاوید نے لحاف برابر کر کے اوپر سفید نیپکن بچھا دیا ۔ پرویز بڑے آرام

سے بیٹھے دلیہ کھا رہے تھے۔

"شبانہ ـــ شبانہ ـــ کدھر چلی گئی"۔ اِدھر اُدھر کمرے میں دیکھتے ہوئے پرویز شبانہ کو بلا رہے تھے۔

"اچھا۔ کالج گئی ہو گی" پھر خود ہی اپنے سوال کا جواب دے دیا۔

"جی۔ وہ کالج چلی گئی ہے۔ بہت دیر ہو گئی تھی" جاوید نے پرویز کی تسلی کے لئے کہا۔ دلیہ کھا کر فارغ ہوئے تو جاوید کے ہاتھ سے دوا لے کر کھائی۔ "آج میرے سر میں بہت درد ہے"۔ پرویز نے اپنی تکلیف کا اظہار کیا۔ صبح سے دوا نہ ملی تھی، پچھلی دوا کا اثر زائل ہو چکا تھا۔ اس لیے درد کا احساس ہو رہا تھا۔ ورنہ تو غنودگی میں پڑے رہتے۔ تکیئے پر لٹا کر جاوید آہستہ آہستہ ان کا سر سہلانے لگے۔ تھوڑی دیر میں سو گئے۔ دوا کا اثر ہو گیا تھا۔ چاروں طرف سے لحاف درست کیا۔ بستر اپنے ہاتھوں سے ٹھیک کیا۔ پرویز کے بالوں کو سنوارا۔ شفاف پیشانی پہ بڑی محبت سے بڑی شفقت سے بوسہ دیا۔ کتنی معصومیت۔ کتنا حسن تھا اس خوبصورت چہرے پہ۔ جاوید بیٹھے دیکھتے رہے۔ کچھ دیر

کے بعد جُھک کر اپنے بوٹ اُتارے - کوٹ پہلے ہی اپنی کرسی کے سہارے پہ ڈالدیا تھا - فرزانہ باہر جالی کے دروازے سے لگی اندر کا نظارہ کر رہی تھی - چپکے سے سلیپر لائی - جاوید کے سامنے رکھے - ان کے بوٹ لے کر جانے لگی تو انہوں نے کان پکڑ لیا - "میرے بھائی کے ساتھ بڑی زیادتی کی ہے - ابھی تک بھوکا پیاسا پڑا تھا"

"اچھا جی — پھر نہیں کرتی — میری توبہ — معافی" فرزانہ واقعی پشیمان تھی - شرمندہ تھی - جب سے باہر گئی تھی - سجدے میں پڑی پرویز کے لیے دُعا مانگ رہی تھی - اسی کی دُعا کا اثر تھا کہ سخت تکلیف میں خدا نے سکون دے دیا - درد میں ایک دم افاقہ ہو گیا - اور وہ سو رہے تھے -

جاوید نے مسکرا کر کان چھوڑ دیا - فرزانہ بھی مسکرا دی -

"آہا —— میری بھابی ——"

"میرے بھیا — میرے راجہ —"

اس دن تو حد ہو گئی - جب کئی دن کے بعد - تقریباً ایک ماہ کے بعد مسز تنویر آئیں - تو پرویز دوڑ کر ان سے لپٹ گئے - جواب میں وہ بھی آنکھوں میں آنسو رو کے

اپنے پیارے دیور۔ راجہ بھیا کو لپٹائے کھڑی تھیں۔ ان کے دونوں بچوں کو خسرہ نکل آیا تھا۔ جس کی وجہ سے وہ آ نہیں سکتی تھیں۔ دل و دماغ ادھر ہی ہوتا تھا۔ کئی بار فون کرنا چاہا۔ لیکن فرزانہ کا رویہ کچھ اتنا اچھا نہ تھا۔ ان کی آمد سے ناگواری محسوس ہوتی تھی۔ اور آخری دن تو ان کا موڈ خاصا ہی خراب تھا۔ اب جب کمرے میں داخل ہوئی ہیں تو پرویز اور فرزانہ بیٹھے تاش کھیل رہے تھے۔ فرزانہ سفید شال میں لپٹی اور پرویز آسمانی شلوار قمیض پہ سیاہ بڑا سوئیٹر پہنے۔ دونوں کے چہرے خوشی سے چمک رہے تھے۔ ہنس ہنس کے کھیل رہے تھے۔ کھیلتے ہوئے ہنس رہے تھے اور مسز تنویر بڑی دیر سے کھڑی دیکھتی رہیں۔ وہی انداز تھے۔ جیسے شہزاد ــ شہزاد کے ساتھ تقدیس۔ وہ ایک بار پھر سوچ رہی تھیں۔ دل پہ قابو پانے کے لیے وہیں کھڑی تھیں۔

سفید شال میں لپٹی تقدیس۔ جب شہزاد بہانے سے اس کو کھانے کے کمرے میں لے گئے تھے۔ باتیں کر رہے تھے ناز اٹھوا رہے تھے۔ اس کے ہاتھوں سے لقمے کھا رہے

تھے ۔۔

وہ سامنے فرزانہ کو دیکھ رہی تھیں ۔ تقدیس کے متعلق ۔ سوچ رہی تھیں ۔ سرخ و سفید ۔ صحت مند ۔ خوش باش فرزانہ ـــ کہاں ہڈیوں کا ڈھانچہ ، زرد رو ، بیمار و لاچار تقدیس ۔ اُداس و پریشان تقدیس ۔ کبھی تقدیس ایسی صحت مند تھی ۔ کبھی شہزاد ایسے ہی تھے ۔ خوبصورت دلکش ۔ خوبرو اسی ادھیڑ بن میں تھیں ۔ کہ دونوں کی لڑائی ہو گئی ۔ پرویز بے ایمانی کر رہے تھے ۔ فرزانہ ہار رہی تھی ۔ وہ پتے پھینک کر کھڑی ہو گئی ـــ اور پرویز یکدم یوں اُداس ہو گئے ۔ بڑے پریشان سے بیٹھے فرزانہ کا چہرہ روٹھا ہوا دیکھتے رہے جیسے چھوٹے سے بچے کا کھلونا ٹوٹ گیا ہو ۔ آنکھوں میں بے بسی لیے چپکے بیٹھے تھے ۔ لیکن مسز تنویر کو ـــ فرح بھابی کو ـــ بہت دنوں کے بعد اچانک آتے دیکھ کر پہچان لیا ۔ خوشی سے کھل اُٹھے ۔

فرزانہ کو یہ بات بھی اچھی نہ لگی ۔ فرزانہ کی بے رخی سے فرح (مسز تنویر) پریشان تھیں ۔ لیکن کچھ نہ کہا ۔ بس تقدیس کی باتیں کرتی رہیں ۔ شبانہ کا ذکر بار بار کرتیں ۔ پرانے واقعات

اپنے پیارے دیور - راجہ بھیا کو لپٹائے کھڑی تھیں - ان کے دونوں بچوں کو خسرہ نکل آیا تھا - جس کی وجہ سے وہ آ نہیں سکتی تھیں - دل و دماغ ادھر ہی ہوتا تھا - کئی بار فون کرنا چاہا - لیکن فرزانہ کا رویہ کچھ اتنا اچھا نہ تھا - ان کی آمد سے ناگواری محسوس ہوتی تھی - اور آخری دن تو ان کا موڈ خاصا ہی خراب تھا - اب جب کمرے میں داخل ہوئی ہیں تو پرویز اور فرزانہ بیٹھے تاش کھیل رہے تھے - فرزانہ سفید شال میں لپٹی اور پرویز آسمانی شلوار قمیض پہ سیاہ بڑا سوئیٹر پہنے - دونوں کے چہرے خوشی سے چمک رہے تھے - ہنس ہنس کے کھیل رہے تھے - کھیلتے ہوئے ہنس رہے تھے اور مسز تنویر بڑی دیر سے کھڑی دیکھتی رہیں - وہی انداز تھے - جیسے شہزاد — شہزاد کے ساتھ تقدیس - وہ ایک بار پھر سوچ رہی تھیں - دل پہ قابو پانے کے لیے وہیں کھڑی تھیں -

سفید شال میں لپٹی تقدیس - جب شہزاد بہانے سے اس کو کھانے کے کمرے میں لے گئے تھے - باتیں کر رہے تھے ناز اٹھوا رہے تھے - اس کے ہاتھوں سے لقمے کھا رہے

تھے ۔۔

وہ سامنے فرزانہ کو دیکھ رہی تھیں ۔ تقدیس کے متعلق ۔ سوچ رہی تھیں ۔ سرخ و سفید ۔ صحت مند ۔ خوش باش فرزانہ ـــــ کہاں ہڈیوں کا ڈھانچہ ، زرد رو ، بیمار و لاچار تقدیس ۔ اُداس و پریشان تقدیس ۔ کبھی تقدیس ایسی صحت مند تھی ۔ کبھی شہزاد ایسے ہی تھے ۔ خوبصورت دلکش ۔ خوبرو اسی ادھیڑ بن میں تھیں ــ کہ دونوں کی لڑائی ہوگئی ۔ پرویز بے ایمانی کر رہے تھے ۔ فرزانہ ہار رہی تھی ۔ وہ پتے پھینک کر کھڑی ہوگئی ــ اور پرویز یکدم یوں اُداس ہو گئے ۔ بڑے پریشان سے بیٹھے فرزانہ کا چہرہ روٹھا ہوا دیکھتے رہے جیسے چھوٹے سے بچے کا کھلونا ٹوٹ گیا ہو ۔ آنکھوں میں بے بسی لیے چپکے بیٹھے تھے ۔ لیکن مسز تنویر کو ــ فرح بھابی کو ــ بہت دنوں کے بعد اچانک آتے دیکھ کر پہچان لیا ۔ خوشی سے کھل اُٹھے ۔

فرزانہ کو یہ بات بھی اچھی نہ لگی ۔ فرزانہ کی بے رخی سے فرح (مسز تنویر) پریشان تھیں ۔ لیکن کچھ نہ کہا ۔ بس تقدیس کی باتیں کرتی رہیں ۔ شبانہ کا ذکر بار بار کرتیں ۔ پرانے واقعات

دھراتی رہیں۔ پرویز کبھی تو حامی بھر لیتے۔ ہاں میں ہاں ملاتے جیسے سب کچھ یاد ہے۔ اور کبھی کچھ بھی یاد نہ رہتا۔ ادھر فرح کو پہچان لیا۔ تو دوسرے لمحے بھول گئے۔ اپنے آپ سے بھی بے خبر۔ فرح بے قرار تھیں۔ لیکن پرویز۔ پرویز کے روپ میں فرح کے نہیں۔ فرزانہ کے دیور بنے بیٹھے تھے۔ جاوید کے چھوٹے بھائی۔ ماضی بھول بھال حال میں گم۔

جاوید کے منہ بولے بھائی۔ فرزانہ کے حسین دیور۔ یوسف ثانی۔ گوہر گم گشتہ۔ تقدیس نیازی۔ کے۔ نیاز مند شہزاد تھے۔ شہزاد نیازی۔ وہی شوخ، شریر۔ شرارتی ذہن شہزاد۔

شادی کی دھوم دھام، مہندی کی رات میں جبکہ خوشیاں عین عالم شباب پہ تھیں۔ دشمنوں نے حملہ کر دیا تھا۔ اپنے ساتھیوں کے ہمراہ گھوڑا دوڑاتے جاگیر پہ پہنچے۔ وہاں قیامت کا سماں تھا آگ لگی تھی۔ چاروں طرف آگ برس رہی تھی۔ گولیاں برس رہی تھیں۔ بندوقوں کی آواز اور گولیوں کی بوچھاڑ میں۔ اپنے ملازموں کے روکنے کے باوجود آگے بڑھتے چلے گئے۔

دونوں طرف سے گولی چل رہی تھی - شہزاد ماہر شکاری، نشانہ خطا نہ جاتا - بے شمار دشمنوں کا صفایا کر دیا - سینکڑوں کو موت کے گھاٹ اُتارا - بہت سے زخمی ہوئے - شہزاد کے بہت سے آدمی - مزارع - ملازمین ختم ہو گئے - کئی لوگ کراہتے رہے - موت وحیات کی کشمکش میں تڑپتے رہے شہزاد بہادری سے ڈٹے رہے - شہزاد کے ذاتی گھوڑے کو بہت سے زخم آئے - ہاروں، پھولوں سے لدا، سجا سجایا دولہا کا گھوڑا - گولیوں سے چھلنی ہو گیا - اور گر پڑا زمین پر - نیچے شہزاد - اُوپر گھوڑا - گھوڑا گھسیٹ کر اُٹھایا - لہولہان شہزاد کو لے کر اندھیرے جنگلوں میں چھپ گئے - دشمن کا مقصد حل ہو گیا تھا - شہزاد کی لاش سمیت بھاگ کھڑے ہوئے کہ پولیس کی گاڑیوں کی آواز - دور سے آ رہی تھی - اب بچاؤ کی صرف ایک یہی صورت باقی رہ گئی تھی -

قیمتی کمخواب کی شیروانی، زرتار سہرا، سنہری جوتی، بڑھیا گھڑی، ہیرے کی انگوٹھی، ہزاروں نقد - جو کچھ بھی شہزاد کے پاس تھا لوٹ لیا - ہوش وحواس بھی چھین لیے تھے - چودھویں کے چاند کی پُر نور روشنی میں اپنے کالے کرتوت،

سیاہ کاریوں کا ثبوت دیا۔ آبادی سے کئی سو میل دور۔ دریا کے کنارے، گھنے جنگل میں، سنسان و بیابان جگہ پہ، ٹھنڈی ریت، یخ بستہ پتھروں پہ پھینک کر۔ اپنی جان چھڑا کر چلے گئے۔ شہزاد کو دنیا کی نظروں سے چھپا دیا۔ خود تاریکی میں چھپ گئے کہ اگر جوان بھتیجے ـــــ ہونے والے داماد کا ظفر نیازی تعاقب کریں ـــ تو ـــ بھی ـــ انہیں کچھ حاصل نہ ہو۔ یہیں ویرانے میں، نیم مردہ، سردی سے ٹھٹھر کر، اکڑ کر مر جائے گا۔ درندوں کی درندگی کا نشانہ بن جائے گا۔ لاوارث موت مر جائے گا ـــ ایسے میں یہاں کسی انسان کے گزر کا وہم و گمان بھی نہ ہو سکتا تھا۔ اب زندہ لاش کو کہاں اٹھائے پھرتے۔ پکڑے جانے کا ڈر تھا۔ انتہائی غلط کام کیا تھا۔ خطرناک اقدام کیا تھا۔ بڑی جگہ ہاتھ مارا تھا، اب مقابلہ سے ڈر تھا۔ سعدیہ بیگم کو جانتے تھے۔ زبردست، بارعب خاتون تھیں۔ ظفر نیازی اتنے بڑے آدمی تھے۔ بڑے سرکاری عہدے پہ فائز ـــــ اس لیے اب پکڑے جانے کے خوف سے یہ مصیبت گلے سے اتار ـــ پھینک کر دفع چکر ہو گئے ـــ لیکن ـــ جسے اللہ رکھے، اسے کون چکھے۔

خدا کی رحمت کا فرشتہ ۔ الٰہی رحمت و نصرت کا پروانہ پہنچ گیا ۔ جنگل ، بیابان میں ، پتھروں پہ یوں بے آسرا پڑے شہزاد کو اپنی پناہ میں لے لیا ۔ زندگی کی ہر آسائش ۔ نعمت سہولت مہیا کی ۔ جاوید ۔ فرشتہ صورت ۔ فرشتہ صفت ۔ جاوید نے دل و جان سے خدمت کی ۔ تیمارداری کی ، پھولوں کی طرح رکھا ۔ پھولوں پہ سلایا ۔ سچے دل سے چاہا ۔ روپیہ بے دریغ لگایا ۔ اپنے وقت کی ، تفریحات ، خوشیوں کی قربانیاں دیں جاوید نے خدا کی خاطر ۔ خدا کی مخلوق پہ ۔ فرزانہ نے دعائیں مانگیں ۔ اپنے سگے بھائیوں کی طرح ، ہر خیال رکھا دیکھ بھال کی ۔ دُعا ، دوا ، غذا ، لباس ، آرام دنیا جہان کی نعمتیں پرویز کے قدموں میں ڈال دی تھیں ۔ ہر مہینے مکمل چیک آپ کرواتے ۔ ڈاکٹر عباس مکمل معائنہ کرتے ۔ ہدایات دیتے ۔ احتیاط بتاتے ۔

شہزاد ایک دن جاوید اور فرزانہ کے ساتھ ہسپتال سے واپس آ رہے تھے ۔ موٹر خراب تھی ۔ ٹیکسی میں گئے تھے ۔ واپسی پہ ٹیکسی کے انتظار میں کھڑے تھے ۔ جب شبانہ نے ان کو دیکھا تھا ۔ شمع بھی ساتھ تھی ۔ وہ بھاگتی کے آگے

پیچھے پھرتی رہی ـــ لیکن بھائی ہوش وخرد سے بیگانہ، بہن کو کیا پہچانتے ۔ رفتہ رفتہ پورے تین برس کے بعد پوری طرح صحت یاب ہو گئے ۔ ان کا زخمی ذہن اب ٹھیک تھا ۔ ان کے احساس کی قوت بحال ہو گئی تھی ۔ اپنا اصل نام یاد آ گیا تھا ۔ اپنے گھر والوں کے نام یاد کرتے ۔ ان سب کی باتیں، اپنی شرارتیں، سب کو ستانا، چڑانا، بڑوں کی شفقت، محبت، ناز برداریاں، تقدیس کے ناز وانداز شبانہ کا لاڈ پیار ۔ چھیڑ چھاڑ ۔ غرض کیا کچھ نہ یاد آ گیا تھا ۔ پہلے تو فرزانہ کبھی شبانہ لگتی ـــ کبھی تقدیس سمجھ بیٹھتے ـــ فرح بھابی کو پہچان لیا تھا ۔ وہ شہزاد کو زندہ سلامت پا کر بہت خوش تھیں ۔ بے انتہا خوش، جب پہلی بار ملی ہیں ـــ بھولے بھٹکے شہزاد کو دیکھا ہے تو کیا حالت ہوئی تھی ۔ رنج وغم مسرت وشادمانی کا امتزاج تھا ۔ شہزاد کو زندہ پا کر خوش تھیں تو ہوش وحواس سے بیگانہ پا کر ۔ دیکھ کر آنسو نکل آتے کئی بار چاہا ـــ سب کچھ ـــ سب کو بتا دیں ـــ سب کی روٹھی ہوئی خوشیاں سمیٹ کر لا دیں ـــ شبانہ کو فرزانہ کے گھر لے آئیں ـــ تقدیس کو خوش خبری سنائیں ـــ

سعدیہ بیگم، فوزیہ بیگم اور چچا جان سے کہہ دیں — ان کے
دل کی جلن کم ہو جائے، ان کو زندگی بھر کا سکون مل جائے
لیکن — ڈرتی تھیں — شہزاد کو کچھ خبر نہ تھی۔ پچھلی
یادیں بھول چکے تھے۔ دماغ پہ چوٹ تھی۔ نہ کسی کی
جان نہ پہچان — پرویز کے روپ میں شہزاد۔ دیکھنے
میں اچھے بھلے صحت مند، سرخ و سفید، خوش باش۔
ایسے میں دل کی جلن کم ہونے کی بجائے خلش بڑھ جانے
کا ڈر تھا۔ صدمے پہ ایک اور صدمہ — ان کے ملنے کی
جانفزا خبر، روح فرسا بھی ہو سکتی تھی۔ حواس ٹھیک نہ
تھے، سمجھ بوجھ سے کام نہ لے سکتے تھے۔ بچھڑنے کا غم
کیا کم تھا — ؟" کہ ملنے کا غم اور بھی زیادہ ہوتا۔ ان کی
موت کے غم کے زخم ابھی ہرے تھے۔ یوں ہوش و
حواس سے بیگانہ زندگی کی خبر دے کر ان رستے زخموں
پہ نمک پاشی ہوتی۔ درد ٹیسیں۔ خون کی دھاریں بہہ نکلتی
تھیں۔ اقربا کے زخموں سے — دکھی دل — اور دکھ
سہنے کے قابل نہ تھے۔ مدتوں کے بعد ملنے پر بھی بچھڑے
رہتے۔ قریب ہوتے ہوئے بھی دور — کہ ان کے دماغ

میں یاد کی طاقت نہ تھی - پہچان کی صلاحیت کھو گئی تھی -
ڈاکٹر زیادہ لوگوں سے ملنا جلنا، ماحول کا بدلنا، زیادہ
مناسب نہ سمجھتے - ڈاکٹروں کی آس پہ — امید کی ڈوری
پکڑے - مناسب وقت کا انتظار کرتی رہی - سب گھر
والوں کو ذہنی طور پہ تیار کرتی رہی - سب کو اکثر و بیشتر کہتی
رہی - "میرا دل گواہی دیتا ہے - شہزاد ایک دن آ جائیں
گے - وہ زندہ ہیں -" وہ خود روزانہ ملتی تھیں، گھنٹوں
شہزاد کے پاس بیٹھی رہتی تھیں - اس لیے ایسی باتیں کر جاتیں
لیکن — شہزاد کے بزرگ - دونوں لڑکیاں — ان باتوں کو
طفل تسلیاں سمجھتے رہے — انہیں فرح کا یقین نہ آتا - ان
کی ہمدردی — اور خلوص سمجھ کر خاموش ہو جاتے -

جاوید کو جب فرح اور شہزاد کے تعلق کا پتہ چلا - حقیقت
کھلی — تو — بڑے حیران ہوئے - شرمندہ — بڑے
پشیمان ہو گئے - کہ ان دونوں نے فرح کی بار بار کی آمد —
اور دلچسپی کو غلط سمجھا — فرزانہ نے تو باقاعدہ معافی مانگی -
جاوید نے بھی بڑے خلوص سے معذرت کی - اپنے غلط
خیال کی معافی مانگی، اظہار شرمندگی کیا - ان دونوں کا بھی اتنا قصور

نہ تھا۔ لاعلمی میں انہوں نے غلط نہیں سوچا تھا۔ ایک عورت خوانخواہ ہی کسی نوجوان کے گرد چکر لگانے لگے تو یہ ایک معیوب بات تھی۔ ہمارے معاشرے میں انتہائی نازیبا قابلِ اعتراض حرکت اور — فرح محض شہزاد کی خاطر۔ اپنے "دیور راجہ" کی وجہ سے یہ سب کچھ سہہ گئیں — کہ وہ ان کو بہت عزیز تھے۔ کہ وہ ان کے عزیزوں کے عزیز تھے۔

فرح کے مشورے سے جاوید نے ظفر نیازی سے راہ رسم پیدا کی۔ فون پر بات کی۔ اپنا تعارف کروایا۔ کسی کام کا بہانہ لگایا۔ لیکن شہزاد کی خبر سے پہلو تہی کر گئے — اگرچہ ان کا دل چاہا کہ نقدیس کی اجڑی مانگ سجا دیں، شبانہ کو بھائی سے ملوا دیں — سعدیہ بیگم اور فوزیہ بیگم کے ارمان انہیں لوٹا دیں۔ ظفر نیازی کے بڑھاپے کا سہارا۔ دایاں بازو — ان کی خوشیوں کا سرمایہ ان کے دامن میں خوشیاں بھر دیں — لیکن مصلحت کے تحت انہوں نے یہ راز نہ کھولا — مصلحت کے تحت، مناسب وقت اور موقع کی تلاش میں تھے۔ شہزاد کو زندہ سلامت لے جا کر کسی دن وہ خوشیوں کا خزانہ اس سوگوار گھر پر نچھاور کرنا چاہتے تھے — شہزاد سب کو ملنے کی کی ہزار خواہش

کے باوجود بھی اپنے محسن کی رائے سے متفق تھے۔ کہ اس میں فرح بھابی کی ماہرانہ رائے بھی شامل تھی۔

فرزانہ ـــــــ شبانہ اور تقدیس کو دیکھنے کی بہت مشتاق تھی ـــــ کہ ان دونوں کی شباحت فرزانہ میں تھی ـــــ واقعات کے اتفاقات بھی تھے کہ شہزاد کی بھولی بسری یادیں۔ دوبارہ ایک چلتی پھرتی تصویر کی طرح ذہن کے پردے پہ آجاتیں اس میں فرزانہ کے وجود سے بڑی مدد ملی ـــــ جب ـــــ شدت کی گرمی میں باورچی خانے میں کھانا پکاتی فرزانہ کے گلابی دہکتے رخساروں پہ پسینے کی بوندیں، تقدیس کے چمکتے، دمکتے گالوں پہ مچلتے ان موتیوں کی یاد دلا گئے۔ وہ گھڑیاں یاد آ گئیں ـــــ جب سعدیہ بیگم بیمار تھیں ـــــ وہ اپنے ہاتھ سے یخنی بنا کر لائی تھی۔ پھر۔ سُرخ ساڑھی، سُرخ چوڑیاں سرخ بندیا میں سالگرہ پہ جانے سے پہلے فرزانہ ـــــ منگنی کی رات میں تقدیس کا نازک وجود نظروں میں گھوم گیا۔ سُرخ چوڑیاں پہنتے ہوئے فرزانہ پہ نگاہیں جمائے بہت سی حسین یادیں، شہزاد کے ذہن پہ ماضی کے دریچوں سے سورج کی سنہری کرنوں کی طرح جھانکنے لگیں ـــ فرزانہ سُرخ

کوٹ پہنے سامنے آئی تو سعے ہوئے ذہن میں ہلچل مچ گئی۔ چنچل شبانہ کالج کے سرخ یونیفارم کے کوٹ میں کالج جانے کیلئے تیار کھڑی نظر آئی۔ فرزانہ کے نام کی نسبت سے شبانہ کا نام یاد آیا۔ اور لبوں پہ بار بار آتا گیا۔ اگرچہ فرزانہ کے نقش و نگار تقدیس و شبانہ سے نہ ملتے تھے۔ لیکن گوری گلابی رنگت، حسین و نازک سراپا کے ساتھ وقت کا اتفاق اور واقعات کے سجیلے، نشیلے سایوں نے خفتہ ذہن کو بیدار کرنے میں بڑا کام کیا۔ اب تو فرزانہ کا سارا خوف جاتا رہا تھا۔ وہ وقت یاد آتا جب شہزادہ انجانے میں تقدیس سمجھ لیتے۔ جب فرزانہ، شبانہ لگتی تو بے خود ہو جاتے۔ تو فرزانہ کی جان نکلنے لگتی۔ اب ان کو جاوید کی باتوں میں کتنی سچائی نظر آ رہی تھی۔ جیسے وہ تو ماضی کا حال بتا سکتے ہیں۔ مستقبل کی خبر لا سکتے ہیں۔

" فرزانہ ـــــ وہ مجبور ہیں۔ بیمار و لاچار آدمی، اپنے حواسوں میں نہیں ـــــ ہو سکتا ہے۔ کوئی گڑیا سی بہن ہو ان کی ـــــ کوئی خوابوں کی شہزادی ـــــ محبت کی دیوی۔ ان کی بیوی کی شباحت ہو تم میں ـــــ ہم کیا جانیں ـــــ کہ کوئی فرزانہ اپنے جاوید کے لیے دہر بہ لب منتظر ہو۔ کہیں

اپنے بھیا کی لاڈلی، بھائی کو چاہنے والی بہن بے قرار ہو۔
سوچو تو فرزانہ ــــ ان حالات میں جاوید کیا کرتا۔ فرزانہ کیا
سوچا کرتی ــــ" جب بھی کوئی ایسا واقعہ ہوتا۔ فرزانہ گھبرا
جاتی۔ بہت ڈرتی تھی۔ اس وقت ہمیشہ جاوید اس کو
ناصحانہ انداز میں سمجھاتے۔ وقت اور حالات کے ساتھ گزارا
کرنا سکھاتے۔ اب فرزانہ ان کی ہر بات پر یقین کر رہی تھی
ہر نصیحت درست تھی۔ وہ فرشتہ تھے۔ ان کے خیالات
بڑے پاکیزہ تھے۔ بڑے سچے، مخلص، بڑے ہمدرد انسان
یہ سوچ کر اپنے جاوید پر فخر کرتی ــ فخر سے سر اونچا کر لیتی۔
خوشی سے جھوم اٹھتی کہ وہ ایسے سچے اور سُچے جاوید کی بیوی
ہے۔ اب تو فرزانہ کو اس بات پر بھی ناز تھا کہ خدا نے
اپنے حضور سے بڑا پیارا، بڑا اچھا بھائی عنایت فرمایا ــــ
خوبصورت، خوب سیرت، نیک، پاک شہزاد ــ شہزاد
کی بہنیں جتنا بھی ناز کریں۔ جتنا بھی غرور کریں کم ہے ــ
ــ کہ شہزاد واقعی انمول تھے"۔

باب ۱۷

سو اکھڑ رہا تھا، مریضِ الفت کا دم، کہ بالیں پہ آ گئے وہ
عجب تماشہ ہے، دُور ہٹ کر، اجل ہاتھ مل رہی ہے
کسی کی آمد کا سن کے چرچا، یہ حال ہے میرے لب پہ جاں کا
سنبھل سنبھل کر نکل رہی ہے، نکل نکل کر سنبھل رہی ہے

بہاریں آئیں، برسائیں گذریں، سردیوں کے بعد گرمیاں اور پھر سردیاں آتی رہیں، جاتی رہیں۔ موسموں کے تغیر و تبدل کے انہی چکروں میں تین سال کا طویل عرصہ گذر گیا۔ پورے تین سال بیت گئے۔

طاہر نیازی مرحوم کی عالیشان سفید محل نما کوٹھی، بڑی محنت سے بڑی نفاست سے سجائی گئی تھی۔ نئے روغن یا پالش کی وجہ سے وسیع و عریض عمارت، صاف ستھری، اجلی نکھری نظر آ رہی تھی۔ سر سبز لان، روشیں، کیاریاں اور گملے رنگ برنگے پھولوں کی بہار دکھا رہے تھے۔ کوٹھی کے

ذرّے ذرّے، کونے کونے، چپے چپے پہ رنگ برنگ قمقموں، اور جھنڈیوں کی آرائش سونے پہ سہاگہ تھا۔ خاص طور پہ بڑے لان کے درمیان میں سنگِ مرمر کے سفید حوض میں لگا مینار نما فوارہ چل رہا تھا۔ اس کے گرداگرد لگی رنگین، مختلف رنگ کی روشنیوں کا عکس پانی پہ پڑتا تو بڑے خوبصورت رنگوں کی پھوار پڑتی نظر آرہی تھی۔ قوس قزح کے رنگ پھوٹ رہے تھے۔

مختلف رنگ، ڈیزائن اور ماڈلز کی بے شمار موٹریں قطاروں میں کھڑی تھیں۔ بینڈ باجے کا شور تھا۔ گانوں کے ریکارڈ لگے تھے۔ شور و غوغا، قہقہے، زرق برق لباس، سنگھار پٹیار، چمکیلے زیورات کی بھرمار تھی، ہلچل تھی، بھرمار تھی، بڑا خوش کن ہنگامہ۔ شادی والا گھر مہمانوں سے بھرا پڑا تھا۔ بڑی محنتوں سے سجائے گئے وسیع و عریض لان میں مہمانوں کی نشست کا انتظام تھا۔ سامنے دیوان کی طرح اونچے سٹیج پر روشنیوں کی محراب کے نیچے، ہاروں، پھولوں اور گجروں کی محرابوں کے درمیان میں دولہا دلہن کے بیٹھنے کا انتظام تھا۔ یہ جگہ خاص طور پہ بڑی خوبصورت بنائی گئی تھی کہ یہ سعدیہ بیگم کی خواہشات تھیں، ان کی سوچ کا کمال تھا کہ انہوں نے بڑی دھوم دھام سے شادی کی تیاریاں کی تھیں۔ اتنی بڑی کوٹھی کی صفائی، سجاوٹ، نفیس آرائش، بناؤ سنگھار

سب ان کی ہمت اور ان تھک محنت کا نتیجہ تھا ۔ ایک بیٹی کا برائے نام ساتھ ، تن تنہا ساری ذمہ داری پُوری کر رہی تھیں ۔ دلہن کے لیے جہیز میں تمام ضروریات دنیا جہاں کی نعمتیں جمع کی تھیں ، کوئی کسر باقی نہ رہ جائے ۔ سسرال والوں کے دل میں کوئی بات نہ آئے ۔ کوئی شکایت کوئی شکوہ نہ رہے ۔ پُرتکلف دعوت کے لیے اپنی کوٹھی کے وسیع میدان میں انتظام تھا ۔ شہر کے شاندار ہوٹل والے بھاگم بھاگ کام کر رہے تھے ۔

آج سعدیہ بیگم کی بہت ہی پیاری ، نازوں کی پلی ، بڑی لاڈلی بیٹی کی شادی تھی ۔ وہ اپنی نُورِ نظر ، لختِ جگر ، چہیتی بچی کو اپنے ہاتھوں رخصت کر رہی تھی ۔ ان کے جواں مرگ بیٹے شہزاد کا پیارا ، طاہر نیازی کا ظفر نیازی سے افزار ، شبانہ کے ہزاروں ارمانوں کا ایک ارمان ، اس کی آپی ، ماں باپ کی آنکھوں کا تارا ، دل کا سہارا ، آج بڑی بے سہارا سی ، شہزاد کی بجائے کسی اور کے مقدر کا ستارہ بن رہی تھی ۔

ہنستی مسکراتی ، قہقہے لگاتی بہنوں کے گھیرے میں ڈاکٹر اعجاز حسین اپنے والد اور والدہ کے درمیان کھڑے مسکرا رہے تھے ، ان کی چاروں بہنیں ، جھلمل کرتے گہرے رنگوں کے بھاری جوڑے پہنے ، چہرے پہ سارے جہاں کی خوشیاں سجاتے اپنے بھائی کو آنچل کے سائے میں

سُرخ دوپٹہ پھیلاتے، بیچھے سے لے کر آرہی تھیں۔ دُولہا کی سجی سجائی موٹر سے اُتریں تو لڑکی والے سب استقبال کے لیے کھڑے تھے۔ روائتی شان سے، بڑے عزت واحترام سے سارا انتظام کیا گیا تھا۔ ایسے میں بڑی باہمت، بڑی حوصلہ مند خاتون سعدیہ بیگم چکرا گئیں۔ پاؤں کے نیچے زمین گھومنے لگی۔ دلوار کا سہارا لینا چاہا، سہارا بڑی دُور تھا۔ بڑی مشکل سے گرتے گرتے بچیں۔ اعجاز کی بہنوں کی جگہ، گھوڑے کی باگ پکڑے، اٹھلاتی مسکراتی، اپنی شبانہ کا خوشیوں کے نور سے منور چہرہ، شبانہ کی چنچل سہیلیوں کے جھرمٹ میں سہرا سجائے، شاہزادوں سے شہزاد گھوڑے پہ دولہا بنے نظروں میں گھومنے لگے۔ اس کے ساتھ ہی ان کا سر گھومنے لگا۔ عرش، فرش، ساری کائنات دہل گئی۔ آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔ ستارے سے ٹوٹنے لگے۔ پھر بھی بڑی ہمت سے، ہزار ضبط سے، پوری کوشش سے اپنے عزم کو اپنی قوتوں کو جمع کیا۔ وہ طوفان کی آمد سے پہلے کی رُکی رُکی ہواؤں کی طرح، جھکی جھکی گھٹاؤں کی طرح تھیں، جن میں سیاہ گھنے بادلوں کی گھن گھرج، بڑی غضبناک آسمانی بجلیوں کی کڑک، زبردست چمک طوفانی بارشوں کے بلاخیز طوفان، بڑے سنگدل طوفان ساری دنیا کو تہ وبالا کرنے کے لیے مچل رہے ہوں۔ یہ منظر دیکھ کر، وہ لمحات نظروں میں آئے

تو تڑپ گئیں۔ ان کا ارمان بھرا دل مچل رہا تھا۔ تمام جذبوں کو سلا دیا۔ تمام خواہشات کو دبا لیا۔ دستور زمانہ کے مطابق جلدی سے آگے بڑھیں۔ اپنے مخصوص باوقار انداز میں بارات کا استقبال کر رہی، آندھیوں کے طوفان سے بجھی ہوئی، روشنی سے محروم شمع کی طرح، امنگوں سے خالی دل لیے، ظفر نیازی اور فوزیہ بیگم دونوں کھڑے تھے۔ وہی سُرخ سُرخ گلاب اور سفید خوشبودار موتیا کے پھولوں کے ہار، بڑے خاموش، گہری سوچوں میں ڈوبے ظفر نیازی، اعجاز کو اپنے داماد، تقدیس کے دولہا کو ہار پہنانے کے بجائے، محبت سے گلے لگانے کے بجاتے، دُور خلاؤں میں نگاہیں جاتے، آسمان کی بلندیوں میں، خلاء کی وسعتوں میں کچھ تلاش کر رہے تھے۔ شہزاد کو — اس کے والد کو — اپنے پیارے بیٹے — اپنے محترم بھائی کو —— امتیاز حسین نے ان کو گلے سے لگا لیا۔ اعجاز بھی ان سے لپٹ گئے۔

فوزیہ بیگم گھبرائی گھبرائی، بہت مضطرب تھیں۔ حلق میں بار بار پھندا سا لگ رہا تھا۔ دل ڈوب رہا تھا۔ ہاتھ پاؤں ٹھنڈے — تمام جسم سُن ہوتا جا رہا تھا، دو مرتبہ ہاتھ اٹھاتے، دولہا کی ماں کے گلے میں ہار ڈالنے کے لیے —— لیکن ہر بار دل نے انکار کیا۔ بس

یوں ہی لگتا تھا کہ قریب کھڑی سعدیہ بیگم کے گلے میں ہار ڈال دیں گے۔
سعدیہ بیگم ان کی دلی کیفیت سے واقف تھیں۔ اپنی دِلی کیفیت کو
چھپائے، آہستہ سے ان کا ہاتھ پکڑ کر بیگم امتیاز حسین کے گلے میں
پھولوں کی مالائیں ڈلوا دیں۔

فرح بھابی، شمع اور دوسری بہت سی لڑکیاں بادلِ نخواستہ، موٹروں
سے اُترنے والے باراتیوں کو ہار پہنا رہی تھیں۔

استقبال ہوتا رہا۔

دل خون کے آنسو رو رہے تھے۔

ہونٹوں پہ زبردستی کی مسکراہٹیں تھیں۔

بہنوں کے جھرمٹ میں دولہا، پیچھے سب باراتی، دائیں بائیں
لڑکی والے ــــ اداس و پریشان لیکن باراتی بڑے بشاش ہال میں داخل
ہوئے۔ وسیع و عریض، خوب آراستہ و پیراستہ ہال کے دروازوں، دریچوں
پر لگے قیمتی خوبصورت پردے موسم بہار کی عطر بیز ہوا سے لہرا رہے تھے۔
ہوا میں جھومتے رنگ برنگ پھول پردوں کے ہلنے سے نظر آ رہے تھے۔
روشنیوں میں گھرے فوارے سے اُچھلتے پانی کا نظارہ بڑا دلکش تھا۔
دولہا خوشیوں سے نہال، چہکتی، بات بات پہ قہقہے لگاتی، بہنوں کے
درمیان، زرتار سہرہ لگائے، مہکتے پھولوں کے ہاروں میں چھپے بیٹھے

تھے ۔ ڈاکٹر اعجاز حسین ـــ وہی ڈاکٹر اعجاز حسین، جنہوں نے شہزاد کی وفات کے وقت ، بڑی پریشانی کے لمحات میں بے سہارا ظفر نیازی کو بڑا سہارا دیا ۔ ہر طرح سے خیال رکھا تھا ۔ سنبھالا تھا، اب اس وقت ، بڑی شان سے آئے تھے ـــ ظفر نیازی کو ایک اور سہارا دینے، شہزاد کی جگہ لینے ـــ وہ ان کے قریبی اور عزیز دوست امتیاز حسین کے بیٹے، بیرونِ ملک سے ڈاکٹری کی اعلیٰ سند لے کر آئے تھے ۔ والدین اور بہنوں کو، اونچے، ہم پایہ گھرانے کی خوبصورت خوب سیرت پڑھی لکھی لڑکی اور مال و دولت کی تلاش تھی ۔ طرفین کے متفقہ فیصلے ، باہمی سمجھوتے سے تقدیس کا انتخاب ہو گیا ۔ ساری شرائط پوری تھیں ۔ بات پکی ہوئی ، منگنی ہو گئی ۔ زبانی زبانی لڑکے والوں کی بڑی خواہش تھی ۔ بہت اصرار کیا لیکن دکھاوے کی کوئی رسم نہ ہو سکی کہ لڑکی والوں کے دل تو زخموں سے چور تھے ، بہانے سے ٹال دیا گیا ۔

تقدیس خاموش تھی ۔ خاموش رہی ۔ غم زدہ باپ ، چاہنے والی امّی، بہت پیار کرنے والی ، اتنی دکھی ، ستم رسیدہ خالہ حضور کے اقرار کے سامنے انکار کیسے کرتی ۔ سب کے فیصلے کے سامنے تقدیس کی بے زبان خاموشیوں کی صدائے احتجاج نے ، خاموشی سے ، چپکے سے دل میں گھٹ

کردم توڑ دیا۔ آرزوؤں، تمناؤں اور ارمانوں کے سفینے، محرومیوں، مجبوریوں کے گہرے سمندروں میں ڈوب گئے۔ فضاؤں کے ارتعاش کو، بادلوں کے زوردار شور کو، امیدوں کے خرمن کو جلانے والی بجلیوں کو، موسموں کے تغیر و تبدل نے اپنی پناہوں میں لے لیا۔ بجلیاں گر پڑیں۔ تقدیس کے مُنّے سے دل پہ، کانچ کی نازک چوڑیوں سے بھی زیادہ نازک، آبگینۂ دل ٹوٹ پھوٹ گیا۔ چکنا چور ہو گیا۔ کوئی آہٹ نہ ہوئی، کوئی آواز نہ آئی۔ اس آواز کی کانوں کان خبر نہ ہوئی۔ باراتیوں کو تو ذرا بھی خبر نہ ہوئی۔۔۔ کہ ان کے چہرے خوشی کے رنگ میں رنگے تھے۔ دل خوشیوں سے معمور تھے۔ ان کے آس پاس خوشیوں کے بھرپور ہنگامے تھے۔ کان پڑی آواز سنائی نہ دے رہی تھی۔

دلہن۔۔۔ بہو۔۔۔ اور بھاوج کے روپ میں تقدیس کو پا لینے کی خوشی، سسرال والے مگن تھے۔ باراتیوں کی تواضع، خاطر مدارت، بڑے پُر تکلف طریقے سے ہو رہی تھی۔

سعدیہ بیگم نے فرح کی نگرانی میں شمع کے ساتھ دوسری لڑکیوں کی ڈیوٹی لگائی تھی کہ خیال رکھیں۔ کسی کو کوئی شکایت نہ ہو۔ لڑکیاں مہمانوں سے بھرے ہال میں چکر لگا رہی تھیں، پوچھ رہی تھیں۔ واقعی مہمان نوازی میں، خاطرداری میں کوئی کسر نہ رہ جائے۔

کیونکہ ـــ شبانہ خاموش، اداس و سوگوار اپنے کمرے میں دیوار کے ساتھ ریشمی گاؤ تکیے کا سہارا لیے دبیز قالین پہ لیٹی ہوئی تھی۔ سر دیوار کے ساتھ لگا تھا۔ الجھے بال، سوجی ہوئی سُرخ سرخ آنکھیں، رنگت بالکل زرد، ململگی، مسلی، آسمانی پھولدار قمیص، آسمانی شلوار۔ دو تین دن کے استعمال کی وجہ سے شکن آلود، میلا آسمانی دوپٹہ شانوں پہ بکھرا پڑا تھا۔ شبانہ کے شانے پہ سر رکھے، زرد لباس میں تقدیس آنکھیں بند کیے چپ چاپ پڑی تھی۔ پچھلی راتوں کے زرد و بیمار چاند کی طرح بے رونق و بے نور چہرہ، ڈوبتے چاند کی تھکن تھی اس چہرے پہ، بڑی اداسی، بڑی پریشانی۔

سعدیہ بیگم ماموں کے کمرے کا زرد پردہ ہٹا کر اندر آئیں۔ بڑی احتیاط سے بڑی آہستہ، فوزیہ بیگم باہر دروازے کے قریب دیوار سے لگی کھڑی رو رہی تھی۔

ظفر نیازی راہداری میں بیقراری سے ٹہل رہے تھے۔

لیکن سعدیہ بیگم اپنے مخصوص باوقار انداز میں، چہرے پہ مسکراہٹ لاتے ہوتے، جو مسکراہٹ نہیں، ایک بے بس، دلدوز چیخ تھی۔ اپنی چیخوں کو بڑی مشکل سے روکتی، نڈھال، بے حال، سوگوار، لڑکیوں کے قریب آئیں۔ ہاتھ میں کچھ کاغذ طے کیے پکڑے تھیں۔

سیاہ قلم بھی ہاتھ میں تھا۔

"شبانہ بیٹے! ابھی تک لباس تبدیل نہیں کیا — ؟ اٹھو بیٹی تیار ہو جاؤ، باہر سب مہمان آ گئے ہیں"۔ بکھری بکھری تمام قوتوں کو جمع کر کے حوصلہ مند سعدیہ بیگم نے بڑی محبت سے بیٹی کے اُلجھے بالوں کو درست کرتے ہوئے کہا۔ ان کی نگاہوں میں شبانہ کی افراتفری، بھاگ دوڑ، بڑے چاؤ سے کپڑوں کی تیاری، شہزاد کی بارات سے کر تقدیس کو دلہن بنا کر لے جانے کی تیاری کا منظر گھوم گیا۔ کیسا چمکتا چہرہ، کتنی خوش باش تھی۔

شبانہ نے شدّتِ گریہ سے سُوجی، سرخ آنکھوں پر سے ہاتھ اٹھایا بڑی حسرت سے، حسرتوں کی تصویر، اپنی امّی، جواں مرگ بیٹے کی بیوہ بوڑھی ماں کی طرف بڑی حسرت سے دیکھا۔ ان کی آنکھوں میں ارمانوں کے بجھے بجھے چراغ تھے۔ دھواں دھواں سا تھا۔ پھر دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپا لیا، آنکھوں پہ ہاتھ رکھ لیے۔ آنسوؤں کی دھاروں کی قطاروں سے نرم لرزتے ہاتھ بھیگتے چلے گئے۔ دبی دبی سسکیاں کمرے کی خاموشیوں کو توڑتی رہیں۔ سعدیہ بیگم بڑی مشکل سے اپنے آنسو روکتی رہیں۔

"میری چندا، میری جان"! سعدیہ بیگم نے زرد دوپٹے میں لپٹا تقدیس کا سر شبانہ کے شانے پہ سے اٹھا کر اپنی گود میں رکھ لیا۔ وہ

ان دونوں کے قریب ہی دو زانو بیٹھی تھی۔ وہ اُلجھے بکھرے خشک بالوں پہ بڑی محبّت سے ملائمت سے ہاتھ پھیر رہی تھیں۔

تقدیس نے بڑی ناتوانی ہیں، بڑی مشکل سے آنکھیں کھولیں۔ دراز پلکوں کے اندر حسرتوں کے بجھے دیپ کی طرح بے نور آنکھیں، آنکھوں کے نیچے گہرے سیاہ حلقے، پلکیں اٹھا کر خالہ کی طرف دیکھا تو ان کا، سعدیہ بیگم کا دل کٹ کر رہ گیا۔ بڑے ضبط سے کام لیا۔ تمام ہمت کو جمع کیا۔ ہونٹوں کو دانتوں میں دبائے، بڑی دیر خاموش سر جھکائے بیٹھی رہی۔ آنسو چھپاتی رہیں۔ سسکیاں روکتی رہیں۔ ذرا سنبھلیں تو جھک کر تقدیس کی بھیگی پلکوں کو چوم لیا۔ ان کی آنکھوں پہ لب رکھ دیئے — اور — اور — تقدیس تڑپ گئی۔ جیسے چھری کے نیچے مجبور پرندہ، جیسے جاندار کی شہ رگ کٹ جائے، جیسے کسی نے تیز دھار خنجر دل کے پار کر دیا۔

شہزاد — شہزاد — شہزاد کا پیار!

شہزاد کی آواز!

چاروں طرف سے آنے لگیں۔ وہی نظر آنے لگے۔

کہ ان پلکوں کو؟

ان آنکھوں کو وہی اس طرح محبت کے نذرانے دیا کرتے تھے۔

آخری بار کا پیار؟

ان کی قربت کا احساس؟

ان کا لمس، ہزار بے زبان سہی، لیکن احساس کی زبان تھی۔ حس بولتی رہی، وہ تڑپتی رہی۔ بند پلکوں کے اندر بھی شہزاد، پلکوں سے باہر بھی شہزاد، دُولہا بنے شہزاد اس کی پلکوں سے تارے چن رہے تھے۔ جاگیر پہ جانے سے پہلے، آخری بار۔

"میری اچھی بیٹی — لو — اپنے ہاتھ — سے — دستخط کر دو۔" سعدیہ بیگم نے تقدیس کو اپنے سہارے سے بٹھاتے ہوئے، اس کی آنکھوں پر سے، اس کے دونوں ہاتھ اٹھائے، نکاح فارم پھیلا کر، لرزتے ہاتھوں سے سیاہ قلم کھولا، دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپائے شبانہ کی گریہ زاری اور بیقراری بڑھ گئی۔ سسکیاں ہچکیوں میں بدل گئیں۔ تڑپ دیکھی نہ جاتی تھی۔

"امّی جانی، امّی حضور — خدا کے لیے، میری پیاری امی حضور۔" شبانہ نے آنسوؤں میں ڈوبے دونوں ہاتھ ناتواں بتے کی طرح لرزتی ماں کے آگے جوڑ دیے۔ رو رہی تھی، بلک پڑی۔ تقدیس کے دونوں ہاتھ پکڑ لیے۔

"ہائے — نہ — آپی — میری آپی جی — نہیں۔" شبانہ تقدیس کے دونوں ہاتھ اپنے سینے سے لگائے فریاد کر رہی تھی۔ "میری آپی —

میری بھابی ___ لوگوں کو نہ دیکھئے امی جان ___ ہائے ہائے میری جان، میری جان نکل جائے گی ___ للہ ___ بھائی جان ___ بھائی جان آ جائیے۔ میرے بھائی جان۔" شبانہ تڑپ تڑپ روتے ہوئے اپنے بھائی کو آوازیں دے رہی تھی۔

"بھائی جان ___ میری آپی کو، میری بھابی کو لینے کے لیے دوسرے لوگ آ گئے ہیں ___ ہائے بھائی جان ___ آپ کہاں ہیں ___ میرے بھائی جان!" شبانہ چیخ رہی تھی۔ بیقرار تھی ___ بے تاب تھی ___ شہزاد کی آواز سننے کے لیے، اس کے جواب کے لیے۔

سعدیہ بیگم کے حوصلے جواب دے رہے تھے۔ ہمّت کی دیواریں گرتی جا رہی تھیں۔ اعصاب بے حس ہو گئے تھے۔ وہ تھر تھر کانپ رہی تھیں۔ شبانہ کی بیقرار، آہ و زاری، تقدیس کی بے زبان بے بسی کے آگے وہ بے بس ہوئی جا رہی تھیں۔ کافی دیر کی کوشش کے بعد دل کو مضبوط کیا۔ دماغ کو حاضر کیا، اپنے ہاتھ سے شبانہ کے آنسو صاف کیے، ساتھ لگا کر پیار کیا، کچھ کہنا چاہا، وقت کی نزاکت، ہمت کے فیصلوں، تقدیر کے لکھے کے متعلق کچھ کہنا چاہا، لیکن کچھ بھی نہ کہہ سکیں ___ اور ___ پھر وقت کا، مصلحت کا تقاضہ، اپنا مطالبہ دہرایا، تقدیس کے سامنے۔ اس نے خالہ کی گود میں سر رکھے ان کی آواز سنی۔

ان کے سینے کے ساتھ لگی تھی، دل کی دھڑکنوں کی آواز بھی سُن رہی تھی۔ ان کا پیغام اس کے کانوں میں گونج رہا تھا۔ لیکن تقدیس کے بے رنگ، ساکت لبوں کو جنبش نہ ہو سکی۔ ٹھنڈا برف ناتواں وجود تھر تھر کانپنے لگا۔ کبھی آنکھیں کھولتی، کبھی بند کرتی، جیسے دُور، دُور کچھ دیکھنے کی کوشش کر رہی ہے۔ کمرے کی دیواروں سے باہر، وسیع آسمانوں کی وسعتوں سے بھی پرے، منظر بڑا خوبصورت تھا۔ اتنا دلکش بڑا پُرکشش، شوخ و شریر شہزاد، ہنستے مسکراتے، سارے جہاں کی شوخیاں آنکھوں میں لیے، ہونٹوں پہ شرارتی مسکراہٹیں سجائے خوبصورت سُرخ و سفید سراپا گلاب — گلاب کے پھولوں کی تازگی، شگفتگی لیے، زندہ دل، زندہ سلامت زندگی لیے روبرو تھے۔ پھولوں سے ڈھکی بارہ دری کے دلکش، پس منظر میں تقدیس کا ہاتھ پکڑے دستخط لے رہے تھے۔ ان کے نکاح میں آنے کی، زندگی کے سفر میں ساتھ ساتھ چلنے کی، رفیق زندگی بن جانے کی منظوری لے رہے تھے۔ ویسے ہی کاغذات، وہی سیاہ پن، سنہری خول، بالکل ویسا ہی، اور آج شہزاد کی امّی — سعدیہ بیگم — تقدیر کے ہاتھوں کتنی مجبور — ایک بار پھر اپنی تقدیس سے نکاح فارم پہ منظوری لینے آئی تھیں۔ التجا کر رہی تھیں، مرحوم شہزاد کی والدہ، جنہوں نے کتنے ارمانوں سے تقدیس

کی پیدائش کے جلدی بعد، گود میں لے کر پیار کرتے ہوئے اپنے بیٹے کے لیے مانگ لیا تھا۔ اپنے اکلوتے بیٹے کی جوانی کا خواب دیکھا تھا۔ ان کے سہرے کے لیے امیدوں کی بہت سی کلیاں چُنی تھیں۔ وہ ادھ کھلی کلیاں پھول نہ بن سکیں۔ لیکن ان کی مہک سے آج بھی، اس وقت بھی اس کمرے میں سانس رُکتی محسوس ہو رہی تھی، دم گھٹ رہا تھا کہ تقدیس بھی تو ان کے سہرے کے پھولوں میں سے گرا ہوا ایک پھول تھی۔ بدنصیب پھول، مسلی ہوئی کلی، تقدیس اپنی خالہ کے احساسات، ان کے جذبات سے خوب واقف تھی۔ تیز دھڑکتے دل کی آواز، دھڑکنوں کی زبان اچھی طرح سمجھتی تھی۔

یہ تو سب بھرم ہیں۔

ظاہر داری، دنیا داری ہے۔

دنیا داری کے پردے، ظاہر داری کے بھرم ہیں۔

"اٹھو میری بچی، اپنی خالہ جانی کا، آج تک کبھی کہنا نہیں ٹالا — میری پیاری بیٹی نے۔" سعدیہ بیگم سینے کے اندر رُک رُک کر آتی سانس کو برابر کرنے کی کوشش میں آہستہ آہستہ بول رہی تھیں۔ شبانہ کی بےقراری کا وہی عالم تھا۔ اسی طرح تڑپ رہی تھی۔ کبھی تقدیس کے

دونوں ہاتھوں کو سینے سے لگاتی، کبھی پکڑ کر چوم لیتی، کبھی چھوڑ دیتی۔ کبھی گھبرا کے کھڑی ہو جاتی، کبھی بیٹھ جاتی۔ کسی پل قرار نہیں آ رہا تھا۔ سعدیہ بیگم نے شبانہ کی طرف دیکھا۔ کچھ کہنا چاہا، تسلی کروانا چاہی لیکن زبان نے ساتھ نہ دیا۔ کیا کہیں کیا نہ کہیں۔ آخر ضبط کی بھی تو کوئی انتہا ہوتی ہے۔ صبر کی کوئی حد ہوتی ہے۔ کہاں تک اپنے نفس کو کچلتی۔ ٹپ ٹپ آنسو تقدیس کے چہرے پہ گرنے لگے۔

"خالہ حضور!" تقدیس نے دھیرے سے آنکھیں کھولیں۔ آہستہ سے بولی۔

"جی بیٹے ___ خالہ حضور کی آنکھوں کے نور۔" سعدیہ بیگم جھک گئیں۔

تقدیس کی آواز بڑی مدھم آ رہی تھی، بس ہونٹ ہل رہے تھے۔ اپنا کان اس کے ہونٹوں سے لگا لیا۔

لیکن اب وہ خاموش تھی۔

اس دنیا میں نہ تھی۔

سعدیہ بیگم نے ٹھنڈی پیشانی پہ ہونٹ رکھ دیئے۔ وہ بڑی دل شکستہ، شکست خوردہ نظر آ رہی تھیں۔

تقدیر کی گردش ــــ گردشِ دوراں کے ساتھ ساتھ بدلتے حالات، لمحاتِ ماضی کی یاد!

اس وقت کی صورتِ حال سے تقدیس ٹوٹ گئی۔

دل کا شدید دورہ پڑا تھا۔

قدرت کی اتنی بڑی ستم ظریفی برداشت سے باہر تھی۔ اتنا بڑا صدمہ سہہ نہ سکی۔ اس کا دل ڈوب گیا تھا۔ نبض بند ہو رہی تھی۔ بے ہوش ہو گئی تھی۔ شبانہ میں نہ جانے اتنی قوت کہاں سے آ گئی تھی کہ چھلانگ لگا کر بھاگتی ہوئی کمرے سے باہر آئی۔ درمیان میں قالین پہ اس کا آسمانی دوپٹہ گر پڑا۔ دو تین بار پاؤں میں الجھا، گرتے گرتے بچی تھی۔ گرتی، پڑتی ننگے پاؤں، بغیر دوپٹے کے چیخیں مارتی دیواروں سے ٹکریں مار رہی تھی۔

فوزیہ بیگم اور ظفر نیازی دھک سے رہ گئے۔ وہ راہداری میں ہی کھڑے تھے۔ شبانہ کو فوزیہ بیگم نے پکڑ لیا۔ وہ خود دیوار کا سہارا لیے بے جان سے کھڑی تھیں۔ ظفر نیازی کو کچھ سمجھ نہ آ رہا تھا۔ گھبرا کر کبھی اندر آتے، کبھی باہر نکل جاتے، حواس باختہ تھے۔ تقدیس کو دل کا شدید حملہ ہوا تھا۔ سعدیہ بیگم کا دل تو جیسے خوف کے مارے بند ہو گیا۔ منظر بڑا دلخراش تھا۔

خوش باش باراتیوں اور دیگر مہمانوں سے بھرے ہال میں خبر پہنچی، بڑی دلنواز موسیقی اور دھنوں کی جگہ چیخوں کی آوازیں آنے لگیں۔ خوشبوں کی برسات کی جگہ آنسوؤں کی پھوار پڑنے لگیں۔

شمع اور فرح کے ساتھ، ہاروں، پھولوں سمیت "سہرا لپیٹے ڈاکٹر اعجاز فوراً" مریضہ کو دیکھنے کے لیے آ گئے۔ مہمانوں میں چند اور ڈاکٹر بھی موجود تھے، کوئی اعجاز کے استاد تھے، کوئی ہم جماعت اور کوئی رفیق کار دوست، سب ہی کوشاں تھے۔

"لیکن!

تقدیس کی بے ہوشیاں گہری ہوتی گئیں، بہت گہری، جیسے وہ ہوش میں آنے کے لیے وہ بے ہوش نہیں ہوئی تھی۔ دل کا زبردست دورہ تھا۔ اکھڑی، بگڑی سانسوں کو مصنوعی سانس کے ذریعے بحال کرنے کی کوشش ہو رہی تھی۔ آکسیجن فوری طور پر لگا دی گئی۔ اتنے سارے ڈاکٹروں کی وجہ سے ہسپتال کی تمام سہولتیں گھر پر ہی مہیا ہو گئیں۔ زائد لوگوں سے کمرہ خالی کروا لیا گیا۔ غیر متنفس کی موجودگی، مریضہ کے تنفس میں رکاوٹ کا باعث تھی۔

تقدیس کی زندگی کی ڈور!

سانس کی نیا ـــ آس دیاس کی لہروں میں ڈوبتی، ابھرتی رہی۔

ہچکولے کھاتی رہی - بھنور میں تھی۔ نہ آر نہ پار - مریضہ کی حالت سخت خطرے میں تھی - ڈاکٹروں نے شبانہ کو سکون کا انجکشن لگا دیا تھا کہ اس کی آہ وزاری، بیقراری، شور شرابہ، خود اس کے لیے اور مریضہ کے لیے بھی خطرناک تھی - کئی دن سے بھوکی پیاسی، پریشانی کی وجہ سے جان تو اس میں باقی نہ تھی، گرتی جا رہی تھی - اب تو جیسے اس کی دماغی صحت بھی ٹھیک نہ تھی - ہوش و حواس سے بیگانہ، دیوانوں کی سی حرکتیں کر رہی تھی - کبھی ہنسنے لگتی، کبھی چلانا شروع کر دیتی - پوری قوت سے شہزاد کو آوازیں دیتی - اس لیے اسے دوا دے کر سلا دیا گیا -

بڑی بوجھل رات گذری - طویل دن بھی گذر گیا - رفتہ رفتہ شام ہو رہی تھی، گھری ہوتی جا رہی تھی، سیاہی چھا رہی تھی - اُجالے اندھیرے کی آغوش میں روپوش ہو گئے تھے - پورے چوبیس گھنٹوں سے تقدیس نے آنکھ نہ کھولی تھی -

ڈاکٹر اعجاز پلنگ کے قریب تقدیس کی نبض پہ ہاتھ رکھے گھڑی دیکھتے رہے - دوسرے ڈاکٹر بھی سوچ بچار اور دوا علاج میں لگے ہوئے تھے - بے شمار انجکشن لگائے جا چکے تھے -

مریضہ کے ساتھ کے کمرے میں افرادِ خانہ، میل ملاقات والے،

دوست احباب، افسردہ، خاموش بیٹھے تھے۔ قبرستانوں کی سی خاموشی تھی۔ موت کا سا سناٹا تھا۔ جیسے یہاں کوئی بھی موجود نہیں۔ ہر کوئی سراپا دعا، مجسم التجا، تقدیس کی زندگی کی بھیک قادرِ و توانا خدا کے حضور مانگی جا رہی تھی۔ ہزاروں صدقہ و خیرات ہو رہا تھا۔ منتیں مانی جا رہی تھیں۔ سعدیہ بیگم مدھم چراغوں کی روشنی میں تلاوتِ قرآن پاک کر رہی تھیں۔ دیگر خواتین بھی، بڑی عقیدت سے، احترام سے، بڑی سوگوار، قرآن خوانی میں مصروف تھیں۔ فوزیہ بیگم خاموش، سکتے کے عالم میں آنکھیں پھاڑے، دیواروں کو، دروازوں کو تک رہی تھیں۔ ان کو تو کچھ نظر ہی نہ آ رہا تھا۔ نہ بول سکتی تھیں، نہ سننے کی صلاحیت تھی۔ جیسے کچھ بھی نہ جانتی تھیں۔ گم صُم پتھر کی صورت ظفر نیازی سیدھے نہ چل سکتے تھے۔ کمر دوہری ہو گئی تھی۔ شہزاد کا غم کیا کم تھا کہ یہ افتاد آن پڑی۔ اب تقدیس نظریں چُرا گئی تھیں۔ وہ بڑے غم زدہ، افسردہ، بڑے مایوس نظر آتے تھے۔ سنجیدہ چہرے پہ اخذہ پیشانی پہ غم کی سلوٹیں تھیں۔ غم کی لکیریں، اور غم کے سایوں میں مضبوط وجود، ناتواں سائے کی طرح آہستہ آہستہ متحرک تھا۔ ایک ہی ایک بیٹی ساری عمر کی دولت، زندگی بھر کی کمائی، سرمایہ دھن، آج سراپا ہو رہا تھا۔ خدائے مجازی سے ملن کے بجائے خدائے حقیقی سے

ملنے کی تیاری میں۔

"خدایا رحم"۔ ظفر نیازی نے آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے دونوں ہاتھ اٹھا کر دعا مانگی۔ اب تو ان میں حرکت کرنے کی سکت نہ تھی۔ ہمت جواب دے گئی تھی۔

امتیاز حسین اپنے دوست کے سہارے سے بیٹھے تھے۔ ڈاکٹر اعجاز کا ظفر نیازی کے ساتھ صرف بیٹی ہونے والے داماد کا رشتہ نہیں تھا۔ بلکہ یہ رشتہ ان قدیم تعلقات و مراسم کا نتیجہ تھا، جو امتیاز حسین اور ظفر نیازی کی گہری دوستی، گہرے خاندانی روابط اور ہر وقت کے میل جول سے تھا۔

اب تعلقات مضبوط ہونے کا وقت آیا، رشتے داری ہوتے لگی تو حالات نے ایسی کروٹ بدلی، ایسے نازک موڑ پہ آگئے، بڑی مصیبت آپڑی تھی۔ اس مشکل کی گھڑی میں، امتیاز حسین اور ان کے گھر والے ہمدردی کر رہے تھے اور اعجاز تو سعادت مند بیٹے کی طرح، غم خوار دوست کی طرح تمام ذمہ داری سنبھالے تھے۔ اتفاق کی بات تھی کہ وقت کی ضرورت کے تحت ڈاکٹری کی تعلیم بھی حاصل کر چکے تھے۔ اس وقت بہت کام آرہی تھی۔ تقدیس کی صحت کے لیے، ان کی زندگی کے لیے انہوں نے اپنے شب و روز وقف کر دیئے۔ اپنی تمام کاوش و

کوشش دام پہ لگا دیں لیکن جیسے تقدیس نے اعجاز کی تیمارداری سے، ان کی مسیحائی سے بائیکاٹ کر رکھا تھا۔ بیماری بدستور تھی۔ افاقہ ذرا برابر بھی نہ تھا بلکہ مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی۔

تقدیس ان کو کسی صورت میں اپنا تسلیم کرنے کے لیے تیار نہ تھی۔ ہوش میں بھی بیہوشی میں بھی ان کی مدد کے لیے رضامند نہ تھی۔ ان کا سہارا اسے قبول نہ تھا۔ اعجاز کی مہربانیوں، نوازشات وعنایات سے منہ پھیرے، اپنی کائنات بند پلکوں تلے چھپائے، نہ جانے کون سے سپنے دیکھ رہی تھی۔ اپنے سپنوں کی من چاہی تعبیریں دیکھ رہی تھی۔ اگر آنکھ کھولتی تو خواب بکھر جاتے، سپنے ٹوٹ جاتے۔ اس کو یہ احساس نہ تھا کہ اس کی پلکوں کی ایک جنبش کے لیے کتنے بیقرار دلوں کو قرار نہیں۔ اس کا ممتا سا دل تو یہ برداشت ہی نہ کر سکا۔ اس ستم کو سہہ ہی نہ سکا کہ ان کے اپنے شہزاد کی جگہ کوئی اور ہو، وہ اپنے دل سے چھوڑ حرف قلم سے بھی یہ رضامندی نہ دے سکیں، ان کو منظور نہ تھا کہ کسی کی نظر شہزاد کی نگاہ بن کر ان پر پڑے۔ وہ اپنی پلکیں اٹھائیں تصورات کی تصویروں کے بجائے جیتے جاگتے اعجاز ہوں، شہزاد کی بجائے اعجاز ان کے ناز اٹھائیں۔

یہ کیسے ممکن تھا؟

یہ کیسے ہو سکتا ہے؟

یہ کیونکر ہوگا؟

"نہیں — نہیں — نہیں"

دل و دماغ میں کش مکش تھی ۔ سوچوں میں ایک ہلچل تھی ۔ ایسی دنیا جس میں شہزاد نہ ہوں، ایسی حیات، جس میں خالہ حضور کی جگہ کوئی اور خاتون ہوں ۔ ایسی کائنات جس میں شبانہ جیسی نند نہ ہو، کوئی اور ہو ۔ سب ہی اور ہوں ۔ اعجاز ہوں، اعجاز کی امی ہوں، ان کی بہنیں ہوں،

"اف میرے خدا — نہیں چاہیئے ایسی دنیا، ایسی کائنات، ایسی حیات، اس سے تو موت اچھی، ایسی زندگی سے مر جانا بہتر"

یہ تقدیس کے دل کی آواز تھی، جو لبوں تک نہ آسکی ۔ آہ بھی نہ نکلی، سسکی بھی نہ لے سکی ۔

یہ انکار سعدیہ بیگم کے کانوں تک نہ پہنچ سکا ۔ فوزیہ بیگم کو شرمندگی نہ ہونے دی ۔ ظفر نیازی نہ سن سکے ۔ جوان بیٹی کا شادی سے انکار، والدین کو زمانے سے نظریں چرانے پہ مجبور نہ کر سکا ۔ ان کے سر نہ جھکنے پائے ۔ باراتیوں کو، ڈاکٹر اعجاز کو، ان کے والدین کو، ان کے گھر والوں کو، دنیا والوں کو، کسی کو بھی پتہ نہ چلا ۔ کچھ بھی خبر نہ ہوئی ۔ بیماری ہے، بیماری اچانک آجاتی ہے — سو آگئی ۔ لیکن یہاں تو بیماری خطرناک

صورت کی تھی، حالت خطرناک تھی۔

تقدیس اس دنیا کو چھوڑ دینے پہ؟

اس دارِ فانی سے کوچ کرنے کی تیاریوں میں تھی۔ عزیز و اقربا بے چین تھے۔ ملنے والے بھی پریشان تھے۔ اسی حالت میں دن گذرتے گئے۔ بوجھل دن، بھاری راتیں!

"امّی حضور —— بھائی جان ——" شبانہ نے اپنے دونوں کانوں پہ ہاتھ رکھے۔ زور سے آنکھیں بند کیے، اتنے زور سے چیخ ماری کہ سب ڈر گئے۔ اٹھ کر بھاگی، پھر وہیں رک گئی۔

ظفر نیازی نے ان کو پکڑنا چاہا۔

شمع نے دوڑ کر سہارا دیا۔ دوسری طرف سے امتیاز حسین نے پکڑ لیا کہ خود ظفر نیازی میں کسی کو سہارا دینے کی طاقت نہیں تھی۔ سعدیہ بیگم شبانہ کی حالت دیکھ کر کانپ رہی تھیں۔ جلدی سے قریب آئیں۔ فوزیہ بیگم کوشش کے باوجود بھی اُٹھ نہ سکیں۔

"شبانہ —— شبانہ بیٹی" سعدیہ بیگم نے پیار کر کے اپنے ساتھ لگا لیا۔ اس کی کمر پہ ہاتھ پھیرنے لگیں۔ شمع کی مدد سے لے کر واپس مڑنا چاہا کہ اپنے پاس بٹھائیں، اپنی گود میں لٹائیں۔

"نہیں —— امّی جانی نہیں —— میں نہیں جاؤں گی۔ میں یہاں سے

نہیں جاؤں گی ۔ سچ بھائی جان وہاں ہیں ۔ خدا کی قسم بھائی جان ہیں ۔ اس پردے کے پیچھے۔" شبانہ چیخ رہی تھی، ادھر ہی دیکھ رہی تھی، پوری آنکھیں کھولے۔

کچھ دیر پہلے، صوفے پر اوندھی پڑی شبانہ نے قدرتی جذبے کے تحت، کسی غیبی کشش کی وجہ سے آنکھیں کھولیں۔ تھوڑا سا سر اونچا کر کے دیکھا تو جیسے بجلی کی لہر اس کے ناتواں وجود میں دوڑ گئی۔ اتنی کمزور تھی، طاقت نہ تھی، قوت نہ تھی، بڑی تیزی سے اٹھ کر بے تابانہ دوڑی۔ زور سے چیخ ماری۔ پھر وہیں رک گئی۔ جیسے پاؤں نہ چل رہے ہوں۔ من من بھر کے بوجھل پاؤں آگے نہ جا سکے، قدم اٹھ ہی نہ سکے۔

سب نے اس کا وہم، کوئی خواب ۔ ہمیشہ کی طرح کا خواب، محض خیال سمجھ کر اس کو سنبھال لیا۔ سب تسلی دے رہے تھے کہ ایسی کیفیت تو اکثر پیدا ہو جاتی ہے۔ سینکڑوں دفعہ اس کو شہزاد نظر آئے، پھر بے چاری خود ہی رو دھو کر چپ ہو جاتی۔ لیکن آج وہ اس کو خواب و خیال، یا وہم ماننے کے لیے تیار نہ تھی۔ پکا یقین تھا اس کو۔

"ہائے کوئی ۔ خدا کے لیے کوئی مجھے وہاں تک لے جائے ۔ دروازے کے باہر ۔ میرے بھائی جان کے پاس۔" شبانہ بے چارگی سے

کہہ رہی تھی۔ وہی تیز طرار، اچھلتی کودتی، بیڈمنٹن کی کھلاڑی، طلائی تمغے لینے والی شبانہ منت کر رہی تھی، کسی کا سہارا ڈھونڈ رہی تھی، چند قدم چلنے کے لیے۔ پے در پے صدمات سے شہزاد کی موت کا غم تو تقدیس کی بیماری کا الم — ایک دم ساری خوشیاں کے چھن جانے سے صحت خراب ہو گئی تھی، بڑی کمزور ہو گئی تھی کہ قریب دروازے تک جانا مشکل لگ رہا تھا، وہاں پہنچنا ناممکن نظر آتا تھا۔

"ظفر بھیا — دروازے تک لے جا کر تسلّی کروا دیجیے" شبانہ کے بیقرار اصرار پر سعدیہ بیگم نے کہا — لیکن خود وہیں بیٹھ گئیں۔ ظفر نیازی بھی نہ جا سکے۔

"آؤ — میری جان — میری گڑیا — میں خود لے کر جاؤں شہزاد کے پاس" فرح بھابی نے محبت سے شبانہ کو پکڑ لیا اور ساتھ لے کر جانے لگیں۔

"میں تو ہر روز کہتی تھی — وہ ضرور آئیں گے — آج ہی آ جائیں گے ابھی" فرح بھابی شبانہ سے کہہ رہی تھیں اور سعدیہ بیگم حیرانی سے ان کا منہ دیکھتی رہ گئیں — کتنا اعتماد — خلوص اور صدق تھا فرح کی آنکھوں میں اس کے چہرے پہ سکون اور سچائی

کا نور تھا۔

ظفر نیازی برقی انداز میں شہزاد سے لپٹ گئے۔ زور سے لپٹا لیا ان کو اپنے ساتھ۔

سعدیہ بیگم، فوزیہ بیگم عالم حیرت میں!

بے یقینی سی!

خواب کی کیفیت میں؟

گوہر گم گشتہ کو دیکھ رہی تھیں۔

سینے سے لگایا، پیار کیا، لیکن پھر بھی یقین نہ آیا، اعتبار آہی نہ رہا تھا — ایسے خواب تو سب افرادِ خانہ اکثر اور خاص طور پہ شبانہ تو روز ہی دیکھتی تھیں۔

خاموشیاں ٹوٹ گئیں۔

محفل میں ہلچل مچ گئی۔

شہزاد — شہزاد ہونے لگی۔ ہمت و سکت تو پہلے نہ تھی، اس اچانک خوشی میں — بے یقینی کی کیفیت میں اور بھی آنسو بہنے لگے، خوشی کے آنسو، رشک و مسرت — سب کا رو رو کر برا حال ہو گیا۔ شہزاد بھی اشکبار تھے۔ ان کو سارے واقعات یاد تھے۔ ایسے درد انگیز منظر کو دیکھ کر کمزور دل فرزانہ تو رو ہی رہی تھی۔ تندرست و توانا، اتنے لمبے

چوڑے نوجوان جاوید بھی آنسو ضبط نہ کر سکے۔ کمرے میں موجود ہر آنکھ سے آنسو بہہ رہے تھے۔ مہمانوں کا ہجوم، محفل کی خاموشی، گھر والوں کے آنسو، پریشانی، جاوید اپنے معرکہ آراء کارنامے کی خوشی میں کچھ بھی نہ سمجھے۔ ہر کسی کا رونا، سب کے آنسو، انہوں نے سمجھا — اچانک خوشی ملنے سے یہ حالت ہے۔ ان کا خیال تھا — غیر یقینی کی حالت میں دفعتاً مردہ شہزاد کی زندگی کی خبر — ان کی آمد، بچھڑ کر ملنا، جوان بیٹے کے مل جانے کی خوشی پہ چاہنے والوں کے آنسو نکل پڑے ہیں۔

فرزانہ اور جاوید دونوں یہی سمجھ رہے تھے، یہی سوچ رہے تھے، شہزاد کا ذہن تو اس وقت کچھ بھی سوچنے، سمجھنے میں، کسی بھی بات میں اُلجھنے سے عاری تھا۔

شہزاد اپنے گھر آ گئے تھے۔

فرزانہ اور جاوید کے ساتھ!

انہونی ہو گئی تھی!

خوابوں کی تعبیر مل گئی تھی۔

دعاؤں میں تاثیر آ گئی۔ صبر کا امتحان ختم ہو گیا

مہربان خدا کو سب کی بے بسی پہ رحم آ گیا۔ شہزاد کو زندہ سلامت

پا کر بھی خواب کا سماں تھا۔ بے یقینی کا عالم تھا۔

شبانہ کا سینکڑوں بار کا دیکھا ہوا خواب اب بھی خواب لگ رہا تھا۔ وہ پوری طرح جاگتے میں بھی، سچائی کو جانتے ہوئے بھی ڈر کے مارے آنکھیں نہ کھول رہی تھیں کہ — کہیں — پہلے کی طرح خواب نہ ہو، خواب — خواب ہی نہ رہ جائے — کہ شہزاد واقعی سعدیہ بیگم کی باہوں میں ان کے سینے سے لگے تھے۔ تھوڑی دیر کے لیے آنکھیں کھولتی، پھر بند کرلیتی۔

ایکدم اٹھی — بھائی کو بازو سے پکڑے کھینچتی ہوئی تیزی سے تقدیس کے کمرے کی طرف دوڑی۔ سفید بستر پہ تقدیس بیہوش پڑی تھی۔ آکسیجن لگی تھی۔ ڈاکٹر اعجاز بڑے افسردہ، بڑے پژمردہ سے سر جھکائے پلنگ کے قریب نیچی کرسی پہ خاموش بیٹھے تھے۔ ہاتھ تقدیس کی ڈوبتی، نیم جان نبض پہ تھا۔ نہ جانے کس پل، کس گھڑی یہ ہلکی رفتار بند ہو جائے، کب فرشتۂ اجل روح قبض کرلے۔ سب کی آنکھوں کا نور، دل کا سرور، نظروں سے دور چلا جائے۔ نہ جانے کب — نہ جانے کدھر؟

شبانہ دونوں کمروں کا درمیانی دروازہ، دونوں ہاتھوں سے کھٹاک، ٹپاخ کھولتی، تیزی سے اندر آئی۔ الجھے بال، شدتِ گریہ

سے سُرخ سُرخ چہرہ سُوجھی آنکھیں، سفید ہونٹ، میلا کچیلا بے ترتیب لباس، دوپٹے سے بے نیاز، جنون کی سی حالت میں آگے بڑھی، دونوں شانوں سے پکڑ کر تقدیس کو جھنجھوڑ ڈالا۔

"آپی جان — آپی جی اُٹھیے — بھابی جان — بھائی جان آگئے۔ سچ کہتی ہوں، میرے پیارے بھائی جان زندہ ہیں — سچ مچ آگئے، وہ دیکھیے —"

وہ تقدیس کو اٹھا کر بٹھانے کی کوشش کر رہی تھی۔ تقدیس کی بیماری کی وجہ سے نڈھال تھی — شہزاد کے زندہ سلامت آنے کی خوشی میں — غم کی زیادتی — خوشی کے جوش میں اپنے جذبات پر، اپنے حواس پہ قابو نہ تھا۔ جنونی کیفیت تھی۔ ڈاکٹر اعجاز کو دھکا دے کر کرسی سے فرش پہ گرا دیا۔ پھر کرسی بھی پلٹ دی۔ انداز میں جیسے دیوانگی تھی۔ ڈاکٹر بے چارے کو زمین پر پٹخ دیا۔ خود تقدیس کے اوپر گری رو رہی تھی — بھائی کی آمد کی خوشی میں ہنس رہی تھی۔ جیسے دماغ پہ اثر تھا! ذہنی صحت درست نہ تھی۔

"آپی — آنکھیں کھولیے — بھائی جان کو دیکھیے۔" اپنے دونوں ہاتھ تقدیس کی آنکھوں پہ رکھے، وہ انگلیوں سے دونوں آنکھیں کھولنے کی کوشش کر رہی تھی۔ بند پلکیں اٹھا رہی تھی۔ شبانہ کے آنے، اوپر

کائنات، تقدیس کی حیات گھٹاٹوپ اندھیروں میں ڈوب گئی۔ مصنوعی سانس کے ذریعے چلتی تقدیس کی سانس کی ڈور، کمزور ترین ہوتی گئی۔ نبض نہ مل رہی تھی۔ زرد رنگت سفید ہوتی جارہی تھی۔ گردن آہستہ آہستہ ایک طرف کو مڑتی جارہی تھی۔ سر ڈھلک رہا تھا۔

ڈاکٹر اعجاز کی مسیحائی بھی کوئی معجزہ نہ دکھا سکی۔

خدائے مجازی سے ملن نہ ہو سکا۔

خدائے حقیقی کے پاس جانے لگی۔

شبانہ کی آمد، تقدیس سے لپٹ جانے کا حادثہ کچھ ایسا فوری تھا، شہزاد کے دوسرے کمرے سے آنے کا واقع ایسا اچانک ہوا کہ تقدیس کی زندگی کے نگران اس کی رکتی سانس کے محافظ ڈاکٹر اعجاز ایکدم کچھ بھی نہ کر سکے۔ کچھ بھی نہ سمجھ سکے۔ وہ خود کرسی سے گر گئے تھے۔ کرسی الٹی پڑی تھی۔ جلدی سے فرش سے اٹھ کھڑے ہوئے۔ سامنے شہزاد کھڑے تھے، دروازے کا سہارا لیے۔ خوبصورت شہزاد کے دلکش ہونٹوں پہ خاموشی تھی۔ ماضی میں ہمیشہ مسکراتے ہونٹوں پہ اداسی تھی۔ شوخیوں بھری چمکتی آنکھوں میں ہزاروں بن کھلے غنچوں کی ناکام نامراد حسرتیں تھیں ان کی نگاہوں میں۔ وہ اس بے سہارا ڈولتی، ڈوبتی کشتی کی طرح ڈول رہے تھے، لرز رہے تھے، جو زبردست طوفان

گرنے سے آکسیجن کی نلکی ناک سے نکل گئی، ایک طرف گری پڑی تھی۔ اس کی مدد سے جاری سانس رکنے لگا۔ دم گھٹنے لگا۔ آخری سانس لیتے ہوئے تقدیس نے آنکھیں کھولیں، پلکیں اٹھائیں تو سامنے دروازے میں کھڑے شہزاد سے نگاہیں ملیں۔ اکھڑی اکھڑی سانس لیتے ہوئے تقدیس پلکیں جھپک رہی تھی۔ بڑی مشکل سے آنکھیں کھولنے کی کوشش کر رہی تھی۔ جیسے اس دنیا سے جانے سے پہلے، موت کے ظالم ہاتھوں میں آنے سے پہلے ایک بار۔۔ آخری بار شہزاد کو دیکھنا چاہتی تھی کہ تصورات کی تصویروں میں وہ آخری زندہ تصویر شہزاد کی اپنی آنکھوں میں چھپانا چاہتی تھی، ساتھ لے جانا چاہتی تھی۔ اپنی حیات کی خوشیاں، اپنی ممات کا سرمایہ۔۔ تیز تیز سانس لیتی، پلکیں اٹھاتی، کبھی گھبراتی، جیسے تیز و تند ہواؤں میں چراغ جلانے کی کوشش کر رہی تھی۔ بجھتے دیپ روشن کرنا چاہتی تھی۔ اپنی آنکھوں کے دیپ، اکھڑی سانسوں کے دوران جگانا چاہتی تھی۔

لیکن دیپ جل نہ سکے۔

آنکھوں پر سے پلکیں پھر اٹھ نہ سکیں۔

آنکھوں کی روشنی پہ سائے آ گئے۔ اندھیرے چھا گئے۔ ساری

سے تو بچ نکلی تھی ۔ لیکن اب کنارے اس سے روٹھ گئے تھے ۔ وہ خود تو منجدھار میں پھنس کر ساحل پہ پہنچ گئے تھے ۔

لیکن !

ان کی تقدیس ؟

ان کی بڑی پیاری تقدیس کی زندگی کا سفینہ !

جیسے ساحل کے قریب ڈوب رہا تھا ۔

جس کو ساحل پہ کھڑے شہزاد کی نگاہوں کی کشش نے روک رکھا تھا ۔

اگر پل بھر کو شہزاد پلک جھکا لیتے تو یہ کشش ختم ہو جاتی ۔ تقدیس کی زندگی ختم ہو جاتی، وہ اس دنیا سے ناطہ توڑ لیتی ۔

ڈاکٹر اعجاز نے بڑی مشکل سے تقدیس پہ گری بیہوش شبانہ کو اٹھایا ۔ تقدیس خاموش پڑی تھی ۔ موت و حیات کی کش مکش میں تقدیس ـــــ اور زندہ و سلامت شہزاد کی واپسی ـــــ غم اور خوشی کا امتزاج،

یہ ملنے کی گھڑیاں !

وہ بچھڑنے کی ساعتیں !

دونوں احساسات مل کر شبانہ کے حواس لوٹ کر لے گئے ۔ بیہوش ہوتی تو خاموش رہتی ، ذرا ہوش میں آتی تو ہوش و خرد سے بیگانہ، دیوانہ وار قہقہے لگاتی ، کبھی روتی ، کبھی چلاتی ـــــ عرصہ دراز تک لاپتہ رہنے کے

بعد شہزاد کے مل جانے کی خوشیوں کی، سب کی خوشیوں کی صبح مسرت ابھی مسکرائی بھی نہ تھی کہ تقدیس کی زندگی کی شام ڈھلتی نظر آ رہی تھی۔ مایوسیوں کے تاریک گھنیرے اندھیرے چار سُو پھیل رہے تھے۔ نا امیدیوں کے بادل گھِر گھر کے آ رہے تھے، اور خوشیوں کی فضا پر چھا رہے تھے، تقدیس کی سیاہ دراز پلکوں پہ ستارے جگمگا رہے تھے۔ رات بڑی اذیت ناک بڑی کربناک تھی۔ اندھیری سیاہ رات۔ رات بھر ستارے ٹمٹماتے رہے۔ دن کے اُجالوں میں چھپتے لگے کہ سپیدۂ سحر نمودار ہو رہا تھا۔

صبح ہو رہی تھی۔

اور تقدیس کی طبیعت لمحہ بہ لمحہ بگڑتی جا رہی تھی۔

حیات آخری لمحوں میں پہنچ چکی تھی۔ ڈاکٹر اعجاز بے بس ہو کر ہاتھ ملتے اُٹھ کھڑے ہوئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون پڑھ رہے تھے۔ گویا وہ ہار گئے۔ تقدیس جیت گئی۔ زندگی ہار گئی، موت جیت گئی۔

دل کی بیماریوں کے ماہرین ڈاکٹروں کے بورڈ نے مریضہ کو ہسپتال بھجوا دیا۔ آخری کوشش، آخری آزمائش کرنے کے لیے۔ تقدیس کو ہسپتال کے ایک علیحدہ کمرے میں شیشے کے بنے شفاف بکس میں رکھ دیا گیا۔ نیلے

موٹے تولیے میں گردن تک لپٹا ہوا تقدیس کا کومل وجود ——
بے جان زرد چہرہ، نیلے پانیوں میں تیرتے کنول کی طرح تیر رہا تھا۔
اور ایسے میں تقدیس کے کمرے میں، تقدیس کے سرہانے کی طرف کھڑے دو ڈاکٹر اور پاؤں کی طرف دو نرسیں سفید بڑے بڑے کوٹ سفید کپڑے سے سر اور چہرہ ڈھانکے، صرف آنکھیں نظر آتی تھیں۔ جیسے موت کے چاروں فرشتے تقدیس کی میّت اٹھانے کے لیے تیار ہیں۔ ان کا یہ حلیہ دیکھ کر اچھے بھلے صحت مند لوگ بھی دہل رہے تھے۔ شیشے کے تابوت نما بکس میں ایک سرخ بلب روشن تھا، یہ بلب دل کے مریض کی نازک ترین حالت ظاہر کرتا تھا۔ زندگی کی علامت بھی۔ اگر بلب زرد ہو تو طبیعت بہتر، سبز ہو جائے تو مریض کی حالت تسلّی بخش، اگر بجھ جائے تو مریض ختم۔
لیکن بلب بدستور سرخ تھا۔
خطرے کی نشانی!
ڈاکٹر اعجاز تقدیس کی زندگی سے مایوس ہو ہی چکے تھے۔ شہزاد کی اچانک آمد، شبانہ کا جنون۔ حالات کچھ ایسے تھے کہ وہ خود بھی سوچ سمجھ کی صلاحیت کھو چکے تھے۔ ہسپتال میں مریضہ کے کمرے سے کافی دُور، ایمرجنسی روم سے پرلی طرف ظفر نیازی کے نام سے ایک کمرہ ڈاکٹر اعجاز

نے ریزرو کروایا تھا۔ سب عزیز و رشتے دار پریشان حال وہاں بیٹھے دُعائیں مانگ رہے تھے۔ اعجاز حواس باختہ کبھی اس کمرے میں آتے تو کبھی ایمرجنسی روم کی طرف جاتے۔ تقدیس کی زندگی کے ڈوبتے، ابھرتے، سُرخ ستارے کو دیکھتے، کم از کم تقدیس کی زندگی کی علامت تو تھا۔

قریبی رشتے داروں، افرادِ خانہ میں سے کسی کو بھی اس طرف جانے کی اجازت نہ تھی۔ اعجاز کو صرف ڈاکٹر ہونے کی حیثیت سے یہ رعائت حاصل تھی۔ اس رعائت کے سب سے بڑے حقدار شہزاد چاہتے ہوئے بھی وہاں نہ جا سکتے تھے۔ بظاہر شہزاد بالکل ٹھیک ٹھاک، صحت مند تھے۔ ان کے خاص معالج ڈاکٹر عباس اور دیگر ماہرین نے ان کی صحت کی طرف سے مکمل تسلّی کروائی تھی۔

لیکن!

یہاں تقدیس کی بیماری کی وجہ سے صورتِ حال اسقدر پریشان کن تھی کہ گھر والے تو کیا جاوید کا بُرا حال تھا۔ فرزانہ پریشان تھی۔ وہ دونوں سوچ رہے تھے کہ اگر اس پریشانی سے شہزاد کو کچھ ہو گیا تو ــــ اگر پہلے خبر ہوتی تو ان کو ابھی یہاں نہ لاتے۔ لیکن سب مشورہ وہاں فرح کا چل رہا تھا۔ جب انہوں نے آنے کی اجازت دے دی تو د

سب چلے آئے۔ دراصل فرح پہلے تو اسی انتظار میں تھی کہ تقدیس ذرا روبصحت ہو تو شہزاد کو لے کر جائیں تاکہ ان کی کمزور طبیعت پر کوئی بُرا اثر نہ پڑے۔

لیکن!

یہاں تو مریضِ محبت دن بدن موت کی طرف رواں دواں، ٹھیک ہونے کی کوئی صورت نظر نہ آتی تھی۔ شہزاد کو ملنے کی، شہزاد کو پانے کی قسم کھائی تھی تقدیس نے۔

اعجاز کی بارات اور تقدیس کی شدید بیماری کے بعد فرح اور فرزانہ سالگرہ کی دعوت میں ملی تھیں، شہزاد کو پہچانتے ہوئے بھی وہ فوری یقین نہ کر سکی تھیں کہ آیا وہ شہزاد ہی ہیں یا پرویز — جاوید کے چھوٹے بھائی — فرزانہ کے دیور — لیکن آخرکار وہ بامراد، کامیاب ہوئیں، جب پرویز نے خود ان کو پہچان لیا۔ فرح بھابی کہہ کر لپٹ گئے — تو فرح کو یقین کامل ہو گیا۔

اب پریشانی یہ تھی کہ ابتدائی ملاقاتوں میں تو پرویز یعنی شہزاد خود ہی بیمار تھے۔ پوری طرح کسی کو پہچانتے نہ تھے۔ اس لیے ادھر آکر کوئی بات نہ کی۔

اور جب شہزاد ٹھیک ہوئے تو تقدیس کی حالت چند دن پہلے بگڑ چکی

تھی۔ اس لیے فرح مناسب وقت اور حالات کا انتظار کرتی رہیں۔

آخر کار فرح کی اجازت پر جاوید اور فرزانہ سعدیہ بیگم کی کوٹھی میں آ گئے۔ ظفر نیازی نے جب جاوید کی آواز پر نظریں اٹھائیں۔ ان کے خوشی و شادمانی سے چمکتے چہرے کو دیکھا — ان کے پیچھے فرزانہ کے ساتھ کھڑے شہزاد کو فوراً پہچان گئے۔ لپک کر لپٹ کر گئے اپنے شہزاد سے۔

اس کے بعد تقدیس کی حالت اور بگڑ گئی۔

شہزاد سب کچھ دیکھ رہے تھے، بڑے خاموش تھے۔ جاوید کو بڑا خوف تھا، فرزانہ بھی خوفزدہ تھیں کہ انہوں نے شہزاد کی ایسی ایسی حالتیں دیکھی تھیں کہ خدا کی پناہ — یہاں کے حالات سے گھبرا رہے تھے۔ وہ شہزاد کے لیے پریشان تھے، لیکن شہزاد بڑے صبر سے، بڑی خاموشی سے سب کچھ برداشت کر رہے تھے۔

جاوید اور فرزانہ — جاوید مایوسیوں کے فلک پر امیدوں کے روشن روشن، چودھویں کے چاند کی طرح ابھرے۔ اس اُجڑے گھر میں اُجالا بن کر، روشنیوں کی دیپ مالا بن کر اور فرزانہ — آشاؤں کی کلیوں کی مالاؤں کی طرح معطر، پھولوں بھری بہاروں کی خوشبو بن کر آئی تھیں۔ ان دونوں کے آنے سے ویران خزاؤں میں بہاروں کی

عطر بیز خوشبو پھیل گئی ۔ بڑی ٹھنڈی ٹھنڈی اُجلی اُجلی چاندنی پھیل گئی ۔ کیونکہ وہ ـــ اس گھر کے چاند کو، اُجلے اُجالے کو، اُمیدوں کے چراغ کو، اس گھر کے روپ کو، سنگھار کو، بڑی جانفزا پُرمسرّت بہار کو لے کر آئے تھے ۔ اس کی نگہبانی کی تھی ۔ اپنی جان پر کھیل کر اس کی پاسبانی کی تھی ۔ ان کی محبت بھری محنت کا نتیجہ تھا کہ آج اس وقت شہزادیہاں کی پریشان کن صورتِ حال کے باوجود، اپنے بہت پیارے بھائی جان کے سہارے، بڑی مخلص، بڑی نیک سیرت، خوبصورت فرزانہ بھابی کے دلاسوں، تسلیّوں اور حوصلہ افزائی کی وجہ سے، مردانہ وار سب کچھ سہہ رہے تھے ـــ کہ ـــ جاوید نے اس گھر کی تمام ویرانیاں دور کرنے کی ہمت کی تھی ۔ ساری پریشانیاں ختم کرنے کا عزم کیا تھا ۔ سارے بوجھ اپنے مضبوط شانوں پہ اٹھا لیے تھے ۔

وہ تندرست و توانا ایک باہمت، پُرعزم، بلند حوصلہ انسان تھے، جوان تھے ۔

اور نازک فرزانہ ؟

اپنی تمام تر نزاکتوں کے باوجود !

صنفِ لطیف ہونے کے باوجود !

اس کام میں اپنے جاوید کے ساتھ تھی ۔ قدم بہ قدم، شانہ بہ شانہ !

برابر کی شریک ؟

دونوں ہی قابلِ قدر تھے۔

دونوں ہی قابلِ احترام تھے۔

انسانیت کی ایسی مثال قائم کی تھی کہ خدا کی خدائی بھی ان کو سلام کرتی تھی۔

باب ۱۸

سہ دریا کے سوا بھی اٹھتے ہیں طوفان ہزاروں دنیا میں
تو جن کو کنارے سمجھا ہے، ناداں وہ کنارے جھوٹے ہیں

کالج میں چھٹی تھی۔
عقیلہ، شکیلہ دونوں بہنیں گھر پر تھیں۔ ہفتہ بھر کی صفائی اپنی نگرانی میں نوکروں سے کروائی۔ شادی ملتوی ہو جانے کی وجہ سے بکھرا پڑا سامان ٹھکانے لگوایا۔ دیگر چھوٹے بڑے کام سب کروائے۔ جب کام کاج سے فارغ ہو گئیں تو عقیلہ سلائی کی مشین لے کر بیٹھ گئی۔ درزی سے یونیفارم کے دو قمیص سلوائے تھے۔ مرضی کے مطابق اچھے نہ سلے تھے۔ اونچی دکان پھیکا پکوان، بڑی دکان تھی کپڑے کا ستیاناس کر دیا۔ بعد میں بات بھی نہ سنتا تھا۔ سخت افسوس ہو رہا تھا۔ اچھا خاصہ خود ہی سی لینی تھی۔ لیکن ایک تو اب فیشن ہو گیا تھا کہ درزیوں سے کپڑے سلواؤ، دوسرے بی ایس سی کا آخری سال تھا، پڑھائی اور

پریکٹیکل کی وجہ سے وقت نہ ملتا تھا۔ اب کپڑا خراب کروا کے، سلائی ضائع کر کے، بیٹھی خود ادھیڑ رہی تھی۔ دوبارہ سی رہی تھی۔ ساتھ ساتھ بڑبڑا بھی رہی تھی۔ درزی کو بُرا بھلا کہہ رہی تھی۔ بہرحال کام ہو رہا تھا۔

شکیلہ نے کالج میں ہفتہ سوشل ورک کے دوران کاغذ کے پھول بنانے سیکھے تھے۔ کئی اقسام کے، مختلف رنگ کے پھول بیٹھی بنا رہی تھی۔ گھر بھر کے بڑے چھوٹے سارے گلدان اکھٹے کیے اپنے اردگرد گھاس پہ رکھے ہوئے تھے۔ پھول بنا بنا کر گلدانوں میں سجاتی جاتی تھی کہ کہیں گیلے کاغذ کے پھول ادھر ادھر رکھنے سے خراب ہو جاتے۔

پچھلے چند دن سے امتیاز حسین کے گھر میں کچھ پریشانی سی تھی۔ ہر طرف اُداسی چھائی تھی۔ خاص طور پر چھوٹی دونوں بہنوں کے دل بہت خراب ہوئے تھے۔ بھائی کی شادی ملتوی ہو گئی۔ بڑی بدمزگی ہو گئی تھی۔ اتنے پروگرام بنائے تھے۔ کئی دن سے سہیلیاں جمع تھیں۔ سارا دن، پوری رات خوب رونق رہی تھی۔ گانے بجانے، شور شرابے، ہنسی مذاق میں ہر وقت مصروف رہتی تھیں۔ بہنوں کے ساتھ ساتھ سہیلیوں کو بھی بڑا شوق تھا۔ کئی جوڑے سلوائے تھے۔ بہت سی تیاریاں کی تھیں۔ دعوت ولیمہ کے لیے تو بڑے بھاری بھاری جوڑے تیار تھے۔ شادی کے بعد عزیزوں، رشتہ داروں کی طرف سے دعوتوں، پارٹیوں، سیر اور تفریحات کے لمبے چوڑے پروگرام سب خاک

ہیں مل گئے، تقدیس کی اچانک بیماری کی وجہ سے۔

امتیاز حسین معہ بیگم کے اس دن سے وہیں تھے۔ بہت گہرے قدیم دوستانہ تعلقات، پھر نیا نیا سمدھیانہ ہوا تھا۔ شہزاد کی وفات کی وجہ سے گھر والے پہلے ہی دل شکستہ تھے۔ اُوپر سے تقدیس کی نازک حالت نے تو ختم ہی کر دیا تھا۔ ایسے میں کیسے چھوڑ کر آ جاتے۔ پرانا تعلق نئے رشتے سے زیادہ مضبوط تھا کہ نیا نیا رشتہ تو اب ریشم کے دھاگے کی طرح پھسلتا، ٹوٹتا نظر آ رہا تھا کہ تقدیس کی زندگی سے سب مایوس تھے۔ اس کی خطرناک حالت دیکھ کر بچنے کی کوئی اُمید نہ تھی۔ ڈاکٹر جواب دے چکے تھے۔ بڑے تکلیف دہ دور سے نیازی خاندان گذر رہا تھا۔ ڈاکٹر اعجاز صورتِ حال کو بڑی اچھی طرح سمجھتے تھے۔ خود بھی ڈاکٹر تھے، دوسرے ڈاکٹروں کی رائے سے بھی واقف تھے۔ والد کی قدیم دوستی، انسانی ہمدردی دامادی کے رشتے اور ڈاکٹر ہونے کے ناطے سے تقدیس کے پاس ہی رہتے۔ اگرچہ وہ اعجاز کی دیکھ بھال اپنے قریب ترین اقربا کی تڑپتی، بیقرار، بے چین زندگی سے بے نیاز، دنیا و مافیہا سے بے خبر زندگی سے منہ موڑ رہی تھی۔

اعجاز کی بڑی دو بہنیں شادی شدہ تھیں۔ اپنے اپنے گھر کی ذمہ داریاں، بچوں کی پڑھائی، شوہر کی ملازمت کی وجہ سے زیادہ دیر نہ

رُک سکتی تھیں۔ ایک تو دوسرے شہر بیاہی ہوئی تھی، میاں فوج میں تھے۔ دوسری اسی شہر میں تھیں۔ ان کے شوہر سفارت خانے میں افسر تھے، کبھی ملک میں ہوتے تو کبھی دوسرے ملک چلے جاتے۔ اس لیے عقیلہ شکیلہ دونوں چھوٹی لڑکیاں پورے گھر کی مالک و مختار تھیں۔ نوکروں کی سختی آئی ہوئی تھیں۔ ہر وقت بلاوجہ کی ڈانٹ ڈپٹ، مفت کا رعب، بڑے بننے کا شوق پورا ہو جاتا۔ بہرحال ملازمین کی مدد سے گھر کا نظام خوب چل رہا تھا۔ کبھی کبھار شام کے وقت جا کر یہ بھی تقدیس کو دیکھ آتیں۔ وہ زندگی سے رُوٹھی ہوئی تھی اور موت سے گلے مل مل کر بچھڑ جاتی تھی۔ اس بیماری کا انجام سامنے نظر آ رہا تھا۔ آج نہیں تو کل بھائی کے لیے کسی نہ کسی کا انتخاب کرنا ہی تھا بلکہ انہوں نے تو پہلے ہی دو اور لڑکیوں کا انتخاب کر لیا تھا کہ ادھر سے تو صاف مایوسی تھی۔ اپنے جیسے امیر گھرانے کی اچھی خوبصورت، فیشن ایبل خوش ذوق، اپنی ہم ذوق لڑکیوں کا انتخاب کیا تھا۔

اس وقت بھی دونوں اپنے اپنے کام کے ساتھ ساتھ اپنی پسند کی لڑکیوں کی باتیں کر رہی تھیں۔ دونوں میں سے کون سی زیادہ اچھی ہے بحث ہوتی رہی۔ دونوں اپنے اپنے دلائل سے ثابت کرتی رہیں کیونکہ ایک عقیلہ کی پسند تھی تو دوسری شکیلہ کی۔ کوئی فیصلہ نہ ہو سکا تو موضوع

بدل لیا - کالج کی باتیں ہونے لگیں - پروفیسروں کے مزاج، لباس، چال ڈھال، پڑھانے کے انداز کی باتیں کرنے لگیں - دوسری سہیلیوں کے تذکرے کر رہی تھیں - آپس کے مذاق، چھیڑ چھاڑ، اچھے بُرے مختلف واقعات دُہرائے جا رہے تھے -

دونوں بڑی مصروف تھیں کہ باتوں کے ساتھ ساتھ اپنا کام بھی کر رہی تھیں - پچھلی طرف کے چھوٹے گول برآمدے کے سامنے والے لان میں بیٹھی تھیں - موسم سرما کی ہلکی دھوپ اور خوشگوار ہوا مزہ دے رہی تھی - کام دونوں کا ہی کافی تھا - ایک کو تو دو قمیضیں سینی تھیں اور دوسری تو ڈھیروں کاغذ اور کئی گلدان لے کر بیٹھی تھی -

کام ختم ہونے کی اُمید نظر نہ آتی تھی - وقت کافی ہو گیا تھا - دو تین بار تو ملازم کھانا تیار ہونے کی اطلاع دے کر گیا تھا - اسی خیال میں کہ بس تھوڑا اور ہو جاتے - دونوں ہی نہ اُٹھ رہی تھیں - کھانے سے زیادہ کام کی طرف توجہ تھی -

"بی بی صاحب! کوئی مہمان خاتون آئی ہیں" ملازم نے مؤدبانہ آ کر کہا -

پہلے تو کسی نے توجہ نہ دی - اسی طرح لگی رہیں -

"جناب! کیا حکم ہے؛ ادھر ہی لے آئیں!" ملازم نے دوبارہ پوچھا -

"شکیلہ جاؤ، ذرا تم دیکھو کون ہیں - میرا تھوڑا کام باقی ہے۔" کل بزمِ ادب کے اجلاس کی وجہ سے ایک قمیض تیار ہونا ضروری تھی کہ عقیلہ کو اجلاس میں شرکت کرنا تھی - اس لیے اس نے شکیلہ سے کہا۔

"میرا کام بہت پڑا ہے۔ پھر پورے ایک ہفتے کے بعد چھٹی ہوگی، تم چلی جاؤ۔" شکیلہ نے صاف جواب دے دیا۔

عقیلہ دونوں میں چھوٹی تھی، لیکن بڑی سمجھدار تھی۔ ملازم سے مہمان خاتون کو ڈرائینگ روم میں بٹھانے کا کہتی ہوئی، اپنا سامان، چیزیں سمیٹ رہی تھی۔ جلدی جلدی ہاتھوں سے اپنے بال سنوارتی، گھریلو استعمال کی وجہ سے کپڑوں پہ آئے شکن ہاتھوں سے درست کرتی، دوپٹہ گلے میں ڈال کر اندر کی طرف چل دی۔ شکیلہ کو موسم کے مطابق مہمان کی تواضع کرنے کے لیے کہا۔

"کھانے کا وقت ہو رہا ہے، آرام سے کھانا کھلا دو۔" شکیلہ نے کہا، سر اٹھائے لاپرواہی سے کہہ کے اپنے کام میں لگی رہی۔ وہ اپنی دھن کی پکی تھی۔ اس کی بلا سے کوئی آئے یا جائے۔ بڑی لاپرواہ، اپنی دنیا میں مگن رہنے کی عادی، کسی بات کی، کسی کام کی دھن لگ جاتی، تو کھانا پینا چھوڑ، سب کچھ بھول بھال کر لگ جاتی، کام ختم کر کے ہی دم لیتی تھی۔

عقیلہ تیز تیز چلتی سامنے کے دروازے سے ڈرائینگ روم میں داخل ہوئی۔ اجنبی خاتون نے کھڑے ہوکر بڑے تپاک سے مصافحہ کیا۔ انگریزی وضع کا چھوٹا کوٹ اور گھٹنوں تک بڑے جھول کی گرم کپڑے کی فراک پہنے تھی۔ زرد فراک، سرخ کوٹ اور سُرخ اونچی ایڑی کے جُوتے۔ سُرخ و سفید رنگت، سنہری بال شانوں پہ بکھرے تھے۔ عمر بھی زیادہ نہ تھی۔ مغربی انداز، رکھ رکھاؤ کی وجہ سے خاصی سمارٹ لگ رہی تھی۔ سفید گول موتی نما ٹاپس کانوں میں پڑے تھے اور موتی موتیوں کا تین لڑی کا سفید ہار گلے میں پہنے، لمبی ڈوری کا پرس کندھے پہ لٹک رہا تھا۔ بھورے بال، گلابی گالوں اور نیلی آنکھوں والے گول مٹول سے دو بیٹے بھی ساتھ تھے۔ بڑے پیارے صاف ستھرے سمارٹ، ہائی نیک سویٹر اور جینز پہنے تھے۔

خاتون نے اپنا تعارف کروایا۔ بچوں کا بتایا تو عقیلہ حیران رہ گئی۔ عجب کشمکش میں پڑی وہیں کھڑی رہ گئی۔ دانتوں میں انگلی دبائے سوچ رہی تھی۔ کبھی اس کی بات کا یقین آتا، کبھی خیال آتا کہ غلط ہے۔ ایسا نہیں ہو سکتا۔ کبھی سوچتی:

"کیا یہ سچ ہے؟"

"کیا ایسا ممکن ہے؟"

کبھی اس کا دل اقرار میں جواب دیتا، کبھی انکار کر دیتا۔

دل و دماغ میں عجیب گڑبڑ سی مچی تھی۔ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کیا کرے۔ نہ تو مہمان خاتون کو جھٹلا سکتی تھی نہ ہی اس کا دعویٰ تسلیم کر سکتی تھی۔ دونوں باتوں کے لیے شکیلہ کے پاس وقت نہ تھا۔ اتنی بڑی الجھن کے باوجود، چونکہ نئی تہذیب نئی روشنی میں آنکھ کھولی تھی۔ طبیعت پر زیادہ بوجھ نہ لیا۔ کوئی خاص اثر نہ ہوا — اچھا یا برا۔ ہنسی خوشی، بڑی تہذیب، بڑے سلیقے سے مہمانداری کے تمام آداب کا خیال رکھا۔ بڑے اخلاق سے مہمان کی تواضع کی۔ چائے پھل بسکٹ، مٹھائی وغیرہ سب کچھ پیش کیا۔ ملازم اچھے تھے خود بخود ہی سارا کام کر لیتے تھے۔ ویسے بھی ان دونوں کو تو ابھی بچوں میں شمار کیا جاتا تھا۔ ابھی بے بی صاحب کہلاتی تھیں۔

شکیلہ کو وہیں سے کمرے ہی سے آوازیں دیتی رہی۔ دو دفعہ ملازم کو بھی بھیجا کہ آئے تو اس کو بھی ساری بات بتائے، لیکن وہ اپنی لاپرواہ طبیعت کے باعث بہن کی آوازیں اور پیغام سن کر بھی نہ آئی۔ وہیں بیٹھی تھی، اپنے پھولوں میں غرق، پھر ان کاغذی پھولوں کی آرائش میں مصروف، گلدانوں میں پھول سجائے، مسکراتی گنگناتی، بڑی خوش خوش دونوں ہاتھوں میں گلدان پکڑے، ڈرائنگ روم میں آئی۔ اپنے بے ترتیب

لباس، چہرے پہ آئے بکھرے بالوں سے بے نیاز، رسمی سا سلام کیا۔ پھولوں کو جگہ جگہ رکھ کر دیکھا، جہاں مناسب سمجھا رکھ کر واپس جانے لگی کہ اس کی ساری توجّہ، سارا خیال باہر پڑے باقی پھولوں کی طرف تھا۔ وہ اپنے بکھرے بالوں کو سر کے جھٹکے سے پرے ہٹاتی واپس مُڑی۔ عقیلہ نے انگریزی خاتون سے انگریزی میں تعارف کروایا کہ "میری لاپرواہ سی بہن ہے اور اس وقت پھول بنانے میں بہت مصروف!

"شکیلہ! تم ان کاغذ کے مصنوعی پھولوں سے اتنا پیار کرتی ہو۔ ادھر دیکھو تو سہی خدا نے ہمیں اتنے پیارے پیارے قدرتی پھول دیئے ہیں"۔ عقیلہ نے دائیں بائیں دونوں بچوں کو ساتھ لپٹائے گلابی گالوں کو چُومتے ہوئے کہا۔

بچّوں کی ماں مُسکرا رہی تھی۔

عقیلہ کے رویہ سے بڑی خوش ہو رہی تھی کہ بچّوں کو کتنا پیار کر رہی ہے۔ ان کا اتنا خیال کیا ہے، بڑے ادب و احترام سے پیش آ رہی ہے۔

شکیلہ تو ویسے ہی پیارے پیارے پھولوں اور بچوں کی دیوانی تھی۔ پلٹ کر دیکھا تو لپک کر آ گئی۔ دونوں بچوں کو لے کر بیٹھ گئی۔

سبز شلوار قمیض اور کالا سویٹر پہنے تھی۔ سویٹر کی آستین چڑھائی ہوئی تھی، سامنے سے بٹن کھلے تھے۔ دوپٹہ وہ بہت کم، کبھی کبھار، زیادہ تر کالج کے اوقات میں برائے نام سا گلے میں ڈال لیتی تھی۔

اب بچوں سے خوب خوب پیار ہو رہا تھا۔ چاکلیٹ اور ٹافیوں کے وعدے ہو رہے تھے۔ بچے اجنبی ماحول سے گھبرا رہے تھے۔ خوش ہو گئے اور شکیلہ سے بڑے مانوس ہو گئے اور پکّی دوستی ہو گئی۔ یہ اس کی صفت تھی کہ بچوں کو فوراً اپنا گرویدہ بنا لیتی اور بڑوں کو کبھی زیادہ قابل توجہ نہ سمجھتی۔ اب بھی خاتون سے زیادہ اس کے بچوں میں دلچسپی لے رہی تھی۔

امتیاز حسین کی بڑی لڑکی جمیلہ جو اسی شہر میں رہتی تھی، کئی دن کے بعد میکے آئی تھیں۔ چھوٹی لڑکی کو بخار کے ساتھ سارے جسم پہ آبلے سے نکل آئے تھے۔ خاصی تکلیف تھی، وبائی مرض تھا۔ اور ڈاکٹر بہت احتیاط بتاتے تھے، اس لیے گھر سے نہ نکل سکے یقدسیں کو بھی دیکھنے نہ جا سکی تھیں۔ آج بچی ٹھیک تھی تو ادھر آ گئیں۔ شکیلہ کو باہر لان میں پھولوں اور بچوں کے ساتھ کھیلتے دیکھا تو پوچھا۔

"یہ بچے کون ہیں؟"

"ہمارے پیارے پیارے مہمان!" جبکہ شکیلہ جانتی تھی، باجی

کو بھی بتا دیا۔ دونوں ہاتھوں میں گلدان پکڑے باجی کے ساتھ اندر آئی۔ دونوں گول مٹول سے بچے بھی ساتھ ساتھ بھاگ رہے تھے اور واقعی یہ انگریز بچے بڑے پیارے لگ رہے تھے۔ باجی اندر آئیں، مہمان سے ملنے کے بعد عقیلہ نے تعارف کروایا۔ حقیقت کا علم ہوا۔ اس عجیب و غریب انکشاف سے باجی تو بہت پریشان نظر آ رہی تھیں۔ وہ سمجھدار تھیں۔ ان کی سوچ کا انداز دونوں ناتجربہ کار لڑکیوں سے مختلف تھا۔

"کوئی فریب نہ ہو!

کوئی دھوکہ ہمارے ساتھ ہو رہا ہے؟

یہی سوچ کر انہوں نے امّی جان کو بلا بھیجا۔

اپنے بڑے بہنوئی کو فوری دوسرے شہر میں فون کر دیا۔ اپنے شوہر کو بھی بلوایا۔

اعجاز ــــ جو ماضی کو فراموش کر کے مستقبل کی فکر کیے بغیر، حال میں گم تھے، اور چوبیس گھنٹے کے لیے، شام و سحر سے بے نیاز تقدیس کے ہو کر رہ گئے تھے، وہ اب پہلے سے بہتر تھی۔ لیکن ڈاکٹر ابھی پریشان تھے۔ پوری طرح مطمئن نہ ہوتے۔ اسی لیے ڈاکٹر اعجاز بھی دوسرے ڈاکٹروں کے ساتھ وہیں ٹھہرے ہوئے تھے۔

"احمق ــــ بے وقوف۔" جمیلہ باجی کو تو بہت غصہ آ رہا تھا۔ انہوں

نے عقیلہ کو خاص طور پر تاکید کی تھی کہ اعجاز کو ساتھ لیکر آئے۔ وہ اسی وقت گاڑی خود لے کر بڑے حالوں، امّی اور ابّو کے پاس پہنچی۔ رنگ فق، سانس چڑھی ہوئی۔ چپکے سے آکر امّی کے ساتھ بڑی رازداری سے بات کی۔ انہوں نے قصّہ سنتے ہی دونوں ہاتھوں میں اپنا سر پکڑ لیا۔ رنگ اڑ گیا تھا ان کا۔ کافی بڑی دیر تک پریشان سی خاموش بیٹھی رہیں۔

اعجاز کی سب میں بڑی بہن راحیلہ بھی رات ہی آئی تھیں، دوسرے شہر سے، اور ادھر ہی تھیں، امّی ابّو کے پاس کہ وہ تقدیس کو ہی پوچھنے دیکھنے کے لیے آئی تھیں۔ اس وقت دور پرلی طرف فوزیہ بیگم کے پاس بیٹھی تھیں، ادھر ادھر کی باتوں میں مصروف تھیں کہ اچانک عقیلہ کو دیکھا۔ لباس بھی تبدیل نہ کیا ہوا تھا۔ چہرے پہ پریشانی کے آثار۔ پھر امّی کے انداز دیکھ کر چپکے سے اٹھ کر آئیں۔ قریب آئیں تو اصل معاملہ معلوم ہوا تو جلدی سے مہمانوں کی آمد کا بہانہ بنا کر گھر واپس آ گئیں۔ امّی ابّو جان بھی ساتھ تھے، سب نے اعجاز کو بھی بلوایا۔ وہ ساتھ لانا چاہتی تھیں۔ لیکن وہ ڈاکٹروں کے بورڈ کی میٹنگ میں بیٹھے تھے۔ فوری آ نہ سکتے تھے۔ راحیلہ باجی ان کو جلدی گھر پہنچنے کی تاکید کرتے ہوئے آئی تھیں۔ امتیاز حسین وغیرہ تو سب ہی بہت

پریشان ہو گئے۔ انتہائی لاعلمی میں ۔۔ بالکل انجانے میں، ان پہ جو افتاد پڑی تھی، قیامت ٹوٹ پڑی تھی، ان کے لیے بڑی سخت شرمندگی کا باعث تھی ۔ وہ لوگ تو کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہ رہے تھے۔ خاص طور پر ظفر نیازی اور ان کے گھر والوں کے سامنے تو اب ان میں سے کوئی آنکھ نہ اٹھا سکتا تھا۔

امتیاز حسین تو بہت غصے میں تھے، رنجیدہ بھی، افسردہ بھی، کہ ان کے اتنے عزیز دوست کے ساتھ دھوکا ہوا تھا، غصے میں بہت کچھ کہہ رہے تھے۔ نااہل بیٹے کو ڈانٹ رہے تھے۔ بیوی بیٹوں پر غصہ نکال رہے تھے۔ نئی تہذیب اور آزادی کو کوس رہے تھے، جس میں اچھے برے کی تمیز ہی نہ تھی۔ بڑے برہم ادھر سے ادھر ٹہل رہے تھے۔

فوری پریشانی تو بیگم امتیاز حسین کو بھی ہوئی تھی لیکن شروع سے آزادی کی دلدادہ، فیشن کی پروردہ، نئی تہذیب و نئی روشنی کی پرستار انگریزی تہذیب پہ اپنی دیسی تہذیب کو قربان کرنے پہ ہر وقت آمادہ اپنے بچوں کی تربیت بھی انہی خطوط پہ کرتی تھی۔ وہ تو وقتی بات تھی کہ پریشان ہو گئیں ۔۔۔ کہ تقدیس سے شادی کا چکر چل چکا تھا، ورنہ وہ پسند کی شادی کے خلاف نہ تھیں۔

انہیں تو کوئی عیب نظر نہ آیا تھا۔ خاص طور پر لڑکیوں کے لیے کوئی حرج نہ تھا۔ جنہوں نے زندگی گذارنی ہے اپنی پسند اپنے مزاج کی لڑکی سے شادی کریں۔

اس وقت انہیں شکایت تھی تو صرف یہ کہ والدین کو بتا دیتے تاکہ مزید کسی کارروائی میں نہ الجھا جاتا۔ انہیں اعجاز کی خفیہ شادی کا افسوس نہیں تھا۔ ان کی انگریز بیوی اور دو بچوں کے آنے سے فکرمند نہ تھیں۔ فوری پریشانی اور گھبراہٹ جو ہوئی ہے تو اس بات سے کہ شرمندگی کا احساس ہوا تھا۔ زمانے کی باتوں کا خوف تھا۔ لوگوں سے ڈرتی تھیں۔ سب سے بڑی بات تو یہ تھی کہ ظفر نیازی سے اتنے گہرے تعلقات، قریبی راہ و رسم ہوتے ہوئے دھوکہ دیے رہے ہیں۔ پہلے شادی شدہ اور دو بچوں کے باپ ہوتے ہوتے محض والدین اور بہنوں کی خوشی کے لیے، محض ظفر نیازی کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے تقدیس جیسی مقدس لڑکی کو بیاہنے چل پڑے پھر ظاہرداری اور دھوکہ بازی کا یہ عالم کہ تقدیس کی بیماری کے بعد بھی جان و جگر سے دیوانہ وار، پروانہ صفت، بظاہر بڑے خلوص سے اس کی تیمارداری میں شب و روز لگے ہیں۔ ان کے انداز میں ہمدردی اور دوستی میں صداقت نظر آتی تھی۔ اپنے آپ کو بھلاتے ہوئے تھے۔

ظفر نیازی کی خاطر، بڑی اپنائیت سے ان کا خیال رکھتے تھے لیکن غیب کا علم اور دلوں کے حال تو خدائے واحد ہی جانتا ہے۔ حقائق سے بھی وہی ذات پاک واقف ہے۔ جھوٹ اور سچ کا اصلی فرق بھی اس کو ہی معلوم ہے۔ انسانوں کے پاس تو ظاہری حالات و واقعات ہی ہوتے ہیں، جن کے مطابق وہ خوش ہو جاتا ہے یا پریشان ہو سکتا ہے۔

ڈاکٹروں کی میٹنگ ختم ہوئی۔

تقدیس کی بیماری اور صحت کی طرف رفتہ رفتہ آمد پر وہ سب مطمئن تھے۔ جلدی صحت یاب ہونے کی اُمید تھی۔ اعجاز اس بات سے بہت خوش خوش آئے۔ جاوید اور شہزاد بھی ساتھ تھے۔ سب کو خوش خبری دیں۔

ابھی بات پوری بھی نہ ہوئی تھی، ڈاک آئی تو اعجاز کے نام کا لفافہ ملا۔ ان کے نام ڈاکٹر لقمان ایک عزیز دوست کی بیوی زینت کو سرطان ہو جانے کی اطلاع دی۔ ساتھ میں جہاز کے ٹکٹ اور ہدایات تھیں، وہ بھی ڈاکٹر ہی تھے اور تعلیم حاصل کرنے کے بعد وہیں ملازمت کر لی تھی۔ وہاں کے رنگا رنگ ہنگاموں میں مدہوش ہو کر وطن واپسی کا خیال دل سے نکال دیا تھا۔ بیوی چند ماہ قبل اعجاز کے ساتھ ہی آئی

تھی۔ بچّے بھی ساتھ تھے۔

اعجاز کو گھر والوں نے شادی کے لیے بُلایا تھا اور وہ اپنے میکے والوں کو ملنے آئی تھی۔ اچانک درد اٹھا، ڈاکٹروں نے جگر کا سرطان بتایا۔ بیماری کی نوعیت بڑی شدید تھی۔

لقمان کو اطلاع ملی تو فوراً اعجاز کو زینت اور بچوں کو لے کر آنے کا کہا۔ دونوں بچپن کے ساتھی، اور اب بھی دوستی میں بڑا خلوص اور پیار تھا۔ انکار ناممکن تھا۔ کوئی بات بنا نہ سکے اور بہانہ بنانا بھی نہ جانتے تھے۔ آناً فاناً سفر کی تیاری ہوگئی۔ کپڑے چیزیں سب ادھر ہی تھیں۔ دو جوڑے بیگ میں ساتھ رکھے۔ دوست کے بیوی بچوں کو ساتھ لے کر ہوائی جہاز سے روانہ ہوگئے۔ وقت کا پتہ ہی نہ چلا۔ پل بھر میں یہ جا وہ جا۔

بیگم امتیاز حسین جلدی گھر پہنچنے کا پیغام چھوڑ کر گئی تھیں اور اعجاز بغیر اجازت چلے گئے۔ لمحہ بھی ضائع کرنے کی مہلت نہ تھی۔ جہاز کا وقت ہوگیا تھا، اس لیے چند سطور لکھ کر لفافہ میں ڈال دیں۔ گھر والوں کے نام یورپ روانگی کا پیغام تھا اور امّی ابّو کے پیغام کے جواب میں مجبوری اور معذرت، ملازم کے ہاتھ بھجوا گئے، اور خود سات سمندر پار ادھر اور سات سمندر پار سے، اُڑتی تتلی ادھر — "روزی" — اپنے

آپ کو اعجاز کی بیوی اور دو بچّوں کی ماں بتاتی تھی ۔

بیگم امتیاز حسین نے اپنے شوہر اور بڑی لڑکیوں کی مخالفت کے باوجود بغیر کسی تصدیق، بغیر کسی تفتیش کے اپنی بہو تسلیم کر لیا ۔ یکدم دو پوتے پا کر بڑی خوش تھیں کہ ساری عمر سے ایک اور بیٹے کی خواہش تھی لیکن اعجاز چار بہنوں کے تنہا ہی بھائی تھے ۔ اس کے علاوہ رنگِ زمانہ بھی یہی تھا ۔ موجودہ معاشرت ۔ جدید تہذیب، مغرب زدہ مشرقی دنیا میں ایسا ہی ہوتا تھا ۔ سب کچھ جائز، سب کچھ روا، ہر بات ممکن، پوتوں کی آمد کی خوشی میں اور وقت کے تقاضوں کے مطابق آہستہ آہستہ امتیاز حسین کو بھی ہموار کر لیا ۔ پہلے پہل تو وہ بہت بپھرے ۔ عاق کرنے کی دھمکی دی ۔ اپنے بے عزتی اور ذلّت کے لیے بڑے شرمندہ تھے ۔ انہیں ظفر نیازی کے گھر رشتہ مانگنے کی بہت سبکی تھی، اور اعجاز پہ غصّہ بھی زیادہ یہی تھا کہ تغافل اور تجاہل عارفانہ سے کیوں کام لیا ۔ دھوکہ کیوں دیا ۔ صاف صاف کہہ دیتے ۔ چپکے سے بہنوں کو بتا دیتے، ماں سے کہہ دیتے، باپ سے معذرت کر لیتے، لیکن رفتہ رفتہ بیوی نے دلائل دے دے کر کچھ قائل کر لیا، بڑی مشکل سے ۔ لیکن آخر کار اولاد کے ہاتھوں ہار مان گئے ۔ کچھ بیوی کی عقلمندی تھی اور کچھ وقت کے ہاتھوں مجبور ہو کر روزی کو منظور کر لیا ۔

بیگم امتیاز حسین کا خیال تھا کہ اعجاز آجائیں تو اپنے بیوی بچوں کو پاکر خوش ہو جائیں گے۔ اگرچہ پہلے تو کچھ شرمندگی ہوگی، وقتی طور پہ اپنی اصلیت چھپانے میں سبکی محسوس کریں گے لیکن حالات کے مطابق سنبھل جائیں گے۔ پھر گھر والوں کی فراخ دلی اور روشن خیالی، ان کے بیوی بچوں کے ساتھ مروت وضعداری کا سلوک دیکھ کر خوش ہو جائیں گے۔ وقت کے ساتھ سمجھوتہ کرلیں گے۔ لیکن وہ ان سب باتوں کے ہونے سے پہلے ہی واپس یورپ جا چکے تھے۔

روزی اور بچے خوش باش اور ٹھیک ٹھاک۔

تقدیس!

اعجاز سے نکاح کے جال میں آنے سے بال بال بچ گئی۔

خدا کا کوئی خاص ہی فضل تھا۔ اگرچہ اس بچاؤ کے لیے اتنی شدید، اتنی خطرناک بیماری سے دوچار ہونا پڑا تھا۔ اگلے جہاں جاکر واپس آئی تھی۔ دل کے شدید حملوں کی وجہ سے اعجاز سے بچی تھی۔ لیکن ان سے شادی ہو کر تو زندگی کا روگ لگ جاتا۔ نہ جی سکتی، نہ مر سکتی۔ وہ تو ایسی بیماری، ایسا روگ تھا کہ جیتے جی نہ اس سے چھوٹ سکتی تھی نہ ان کے ساتھ رہ سکتی تھی۔ نہ زندہ نہ مردہ۔ پھر اس بیماری کا نہ کوئی علاج نہ دوا۔ دھوکہ فریب لاعلاج مرض ہیں۔ لادوا

بیماریاں۔

خدا کی قدرت تھی، کوئی معجزہ نمائی تھی کہ اس وقت شادی نہ ہو سکی۔ اب تو اعجاز اور اس کے گھر والوں کو شہزاد کی بخیریت و عافیت واپسی کے بعد اس نئے نئے ہونے والے بندھن کی آس نہ تھی۔

ظفر نیازی انکار نہ بھی کریں، پھر بھی تقدیس اور شہزاد کی بچپن کی منگنی تھی۔ دونوں کا نکاح ہو چکا تھا۔ بارات آ چکی تھی۔ رخصتی باقی تھی کہ شہزاد کی گمشدگی کی وجہ سے بات یہاں تک پہنچی تھی کہ اعجاز سے بات پکی ہو گئی۔

لیکن!..

وہ پکی بات اب کچی ہو گئی تھی۔

دھوپ چھاؤں کی آنکھ مچولی سی نظر آ رہی تھی۔

کہ شہزاد!

اس گھر کی خوشی، اس گھر کا اجالا، اس گھر کی رونق، سارے جہاں کی خوشیاں، دنیا بھر کی روشنیاں، بے شمار رونقیں، دنیا بھر کا سکون و اطمینان سمیٹ کر اس گھر میں آ گئے تھے۔ اداس و سوگوار، خاموش ویران گھر میں وہ تمام رونق، خوشیاں، شادمانیاں واپس آ گئی تھیں جو سب و جاتے ہوئے ساتھ لے گئے تھے۔ سارے گھر میں، سارے جہاں میں

پوری کائنات میں یوں چکا چوند ہو گئی تھی جیسے سیاہ بادلوں میں چودھویں کا چاند نکل آیا ہو۔ جیسے بڑی تاریک، بڑی اندھیری رات میں روشن روشن ستارے چمک رہے ہوں۔ ان ستاروں کی روشنی میں، اس ماہِ کامل کی چاندنی میں نہائے۔ نکھرے نکھرے سب کے مقدر چمک اٹھے تھے۔ سب کی سوئی قسمت چمک اٹھی تھی۔

کیونکہ؟

اب تو اس گھر کا روپ!

اس گھر کا سنگھار!

سب کا غرور؟

سب کا پیار؟

تقدیس رو بصحت تھی۔

شبانہ خوشی سے نہال، شہزاد لشباش، سب خوش، سب شاداں، ہر نیا دن سب کے لیے نئی زندگی کا، زندگی کی خوشیوں کا، مسرتوں بھری خولصبورت زندگی کا پیغام لے کر آتا۔

"نیکلی ہونٹوں — چڑھی کوٹھوں"۔

اعجاز کی انگریز بیوی اور بچوں کی آمد، اور ان کی اچانک وطن سے روانگی کی خبر، نوکروں کی زبانی، پاس پڑوس سے ہوتی، دور نزدیک

پھسل گئی۔ اڑتی اڑتی ظفر نیازی کے کانوں تک بھی پہنچی۔ فوری تو سن کر انہیں بے حد رنج ہوا، اعجاز جیسے نوجوان کی دورنگی پہ، اندر سے کچھ، باہر سے کچھ، اس دھوکہ بازی پہ، فریب کاری پہ بہت افسوس ہوا۔ بڑے رنجیدہ ہو گئے لیکن بعد میں خدائے قادر کی قدرت کا شکرانہ ادا کیا کہ ان کی ایسی نیک سیرت، پاک طینت خوبصورت بیٹی کو خدائے پاک نے محض اپنے فضل سے اس جنجال سے بچا لیا۔ مکروفریب کے جال میں پھنسنے سے بچ گئی۔

اس خبر کو سن کر سب سے زیادہ خوشی شبانہ کو ہوئی تھی کہ سب سے زیادہ مخالفت بھی وہی کرتی تھی، بلکہ اس کو تو اعجاز سے نفرت تھی۔ وہ تو یہ نام نہ سن سکتی تھی۔ ان کو دیکھنا گوارا نہ تھا۔ ان کا وجود برداشت ہی نہ کر سکتی تھی۔

اور تقدیس کے لیے تو جیسے "روزی" کا نام روح افزا بن گیا۔ ایک نئی زندگی کا پیغام بن گیا۔ شہزاد کی آمد کی خبر سے نہیں بلکہ ان کی آمد کی خوشبو سے مہکتی فضائیں آنکھیں کھولی تھیں۔ ان کی صورت دیکھ کر ہوش سنبھالا تھا۔ ان کی موجودگی سے اور اعجاز کی روانگی سے ان سے چھٹکارا پا جانے کی خبر نے وہ معجزہ نمائی کی کہ تقدیس دل کی سیریس مریضہ سب دِل وِل بھول کر بستر پر اُٹھ بیٹھیں۔

اگر اعجاز سامنے رہتے تو مریضِ محبت نے تو جان دے دی ہوتی۔ سچی اور مخلص محبت تو خود جام شرابِ حیاتِ ابدی ہوتی ہے۔ پھر محبت کی چاشنی، محبوب کی موجودگی، سب کچھ کھو کر، سب کچھ پالینے کی خوشیوں کے جوش میں، نشے میں مدہوش تقدیس، بڑا ہی سکون تھا۔ چار سُو پُرسکون، بڑی خوشگوار، پُرمسرت بہاروں کی ہوائیں دل بھر چلتی رہتیں۔

ہر رات!

ان کے لیے، ان سب کے لیے!

امن و سکون کی کلیاں چٹختی رہتی۔ ہر طرف اطمینان بخش فضا تھی۔ ان رنگا رنگ شب و روز کا حسن و تازگی، ان پھولوں کی خوشبو تقدیس کے بیمار و کمزور بدن میں رچتی گئی۔ زرد چہرے پہ گلرنگ پھولوں کا رنگ چڑھتا گیا۔ وہ تو صحت کے روپ سے سنگھار سے سنورتی جا رہی تھی۔

ستیانہ؟

جو تقدیس اور شہزاد کے غم میں پاگل ہو گئی تھی، اب بالکل بحال تھی۔ خوشیوں سے نہال، اس کی وہی شوخیاں، وہی تیزیاں، قہقہے، نازو انداز تھے، لاڈ پیار، قہقہے، مسکراہٹیں، چمکتی آنکھوں میں ستاروں کی جگمگاہٹیں سب کچھ لوٹ آیا تھا۔ شہزاد جو زندہ سلامت لوٹ آئے تھے، تقدیس جو ٹھیک ہو

گئی تھیں۔

والدین بچّوں کے غم میں نڈھال، بڑے حال اب اپنے بچّوں کو اپنی حیات کو اپنی کائنات کو یوں مسرتوں میں ہنستے کھیلتے دیکھ کر قربان جاتے۔ جاوید کی مہربانیوں کے لیے، فرزانہ کی عنایات کے لیے ہر کوئی، سب افرادِ خانہ فرداً فرداً شکر گذار تھے، نہ صرف شکر گذار بلکہ ممنونِ احسان تھے، احسان مند تھے کہ ان دونوں کو کو بلند سے بلند مقام دیتے تو وہ بھی ان کے اور ان کے احسانات کے شایان شان نہ تھا۔ اپنی آنکھوں پہ بٹھاتے کہ پلکیں ان کے قدموں تلے بچھاتے۔ دل میں بسا لیتے کہ دل ان پر نثار کر دیتے۔ انہوں نے تو سب کو بے دام غلام بنا لیا تھا۔ بے مول خرید لیا تھا۔ انمول شہزاد کی دوبارہ زندگی کے ساتھ ساتھ ایک اور شہزاد، ایک اور جوان بیٹا بڑا ذہین وفہیم، عقل مند، دانشور بیٹا مل گیا تھا۔ شہزاد سے بڑا بھائی سعدیہ بیگم اور فوزیہ بیگم کا منظورِ نظر، ظفر نیازی کا لختِ جگر، نور نظر، شبانہ کے بڑے بھائی جان، تقدیس کے لیے بھی قابلِ احترام۔

اس اعزاز میں فرزانہ بھی برابر کی شریک تھی۔ اس کی بڑی قدر و منزلت کی جاتی تھی۔ بڑی عزت تھی۔ بڑا بلند مقام تھا ان کا سب

کے دلوں میں سب کی نگاہوں میں کہ وہ حقیقت میں اسی کی حقدار تھی۔

سعدیہ بیگم نے قانونی طور پر جاوید کو اپنا بیٹا بنا لیا۔ سرکاری کاغذات میں لکھوا دیا۔ اپنی دولت میں، جائیداد میں، گھربار میں برابر کا حقدار بنا دیا۔ اپنے حقیقی بیٹے کی طرح۔

اب وہ شہزاد کے ساتھ، شہزاد کی عدم موجودگی میں سعدیہ بیگم کے بڑے بیٹے کی حیثیت سے شہزاد کے بھائی جان کی حیثیت سے ہر طرح کی ذمہ داریوں کے ذمہ دار ہوتے، جاگیر کی دیکھ بھال، جاگیرداری کی ساری ذمہ داری اب ان پر تھی۔ وہ سارے کام بڑی اپنائیت سے، بڑی جانفشانی سے کرتے۔ وہ اس عزت افزائی سے قدردانی سے بہت خوش تھے۔

اگرچہ شروع میں انہوں نے سعدیہ بیگم کو صاف صاف کہہ دیا تھا کہ انہوں نے شہزاد کی نگہبانی کسی لالچ یا معاوضے کے لیے نہیں کی۔ یہ تو خدا کا حکم تھا، اور انسانیت کا تقاضہ، انسان کی عظمت کا امتحان۔

لیکن سعدیہ بیگم نے پاس بٹھا کر، کمر پہ ہاتھ محبت سے پھیر کر، بڑی شفقت سے انہیں سمجھایا تھا، انہیں اپنایا تھا کہ ان کے خلوص اور ممتا کے پیار کو وہ نظرانداز نہ کر سکے، اور اپنی امی حضور کے حکم کے آگے

خاموشی سے سر جھکا لیا۔

واقعی سچے دل سے سچی لگن سے انہوں نے ہر بات کا خیال رکھا۔ خاص طور پر شہزاد تو ان کو بہت پیارے تھے۔ بہت ہی زیادہ عزیز۔ ان کی خاطر سب کچھ قبول کر لیا۔ سارے کام کرتے کہ شہزاد پر ابھی زیادہ بوجھ بھی نہ ڈالنا چاہتے تھے۔ بے شک اب وہ بفضلِ خدا صحت مند تھے۔ بالکل تندرست۔

لیکن!

بیماری کی شدّت اور ان کی کمزوری کی نوعیّت سے تو جاوید ہی واقف تھے۔ فرزانہ ہی جانتی تھی۔

ڈاکٹر عباس کا مہربانیوں کا شکریہ ادا کرنے خود سعدیہ بیگم ان کے پاس گئیں۔ کس کس طرح ان کا شکریہ ادا کیا۔ وہ چاہتی تھیں کہ دنیا جہاں ان کو دے دیں — ان کو سونے چاندی میں تول دیں — ان کو اپنے بیٹے کی زندگی کے بدلے میں اتنا کچھ دے دیں کہ ڈھیر لگ جائیں۔ بلند پہاڑوں جتنے ڈھیر، وسیع سمندروں سے بھی زیادہ، وسیع آسمانوں کی وسعتوں سے بھی زیادہ بڑے خزانے ان کے قدموں میں ڈال دیں۔

لیکن یہ سب کچھ دینے کا سوچ کر بھی یوں لگتا کہ وہ ڈاکٹر عباس

کے اتنے بڑے کارنامے کے بدلے میں کچھ بھی نہیں دے رہیں۔ اپنے آپ کو تہی دست محسوس کرتیں کہ ڈاکٹر عباس عظیم تھے۔ ان کی عظمتوں کو سلام کیا جا سکتا تھا۔ ان کا احترام کیا جا سکتا تھا۔ انہوں نے جس طرح شہزاد کا علاج کیا تھا، اپنے بچّوں کی طرح خیال کیا تھا مادی اشیاء میں سے کچھ بھی دینا ناکافی تھا۔ ان کی شان اور عظمت کے خلاف تھا۔

باب ۱۹

؎ تمہارے رُخ پہ تابندہ ہیں میرے پیار کے غازے
بکھر سکتے نہیں ہرگز، میری یادوں کے شیرازے

موسم بہار تھا۔ بہار آئی تھی — ایک بار پھر — بڑی خوبصورت، بڑی جاندار بہار، اپنی تمامتر رعنائیوں کے ساتھ، ہوشربا جلوہ سامانیوں کے ساتھ جلوہ گر تھی۔ بڑا ہی پُربہار شباب تھا موسم بہار پہ۔ دُنیا جہاں کی بہاریں — اور خوشیاں سمٹ کر دونوں گھروں میں جمع ہو گئی تھیں — بڑی رونق تھی — سورج کی کرنوں کی سی چکا چوند، چاند کی چاندنی کی سی ٹھنڈی روشنی — ہر فرد خوش، ہر نفس شاداں و فرحاں — کہ گھر کے در و دیوار سے، ذرّے ذرّے سے، پتّے پتّے سے بوٹے بوٹے سے خوشیاں اُبل رہی تھیں۔ روشنیاں پھوٹ رہی تھیں کہ دونوں نیازی گھرانوں کی ساری مایوسیاں، ساری نامرادیاں ساری اداسیاں، سارے غم، دکھ اور ساری پریشانیاں مٹ گئی

بخش ۔ قسمت چمک اٹھی تھی، مقدر میں اُجالے بکھر گئے تھے۔

جشنِ بہار تھا۔

مہمانوں کی بھرمار تھی۔

مبارک سلامت کا شور تھا۔

کان پڑی آواز سنائی نہ دے رہی تھی۔ ایسے میں شہزاد اپنی عادت کے مطابق ساری شوخیوں اور شرارتوں کے ساتھ خوش باش شہزاد رونق میں اضافہ کر رہے تھے۔ اصل میں یہ ساری رونق ان کے دم سے تھی۔ اس خوشی میں سعدیہ بیگم نے بڑی شاندار دعوت طعام کا اہتمام کیا تھا۔

اس گھر کی بہاروں پہ بہار آجانے کی خوشی میں!

اس گھر کے گل و گلزار پہ ایک بار پھر گل رنگ نکھار آجانے کی خوشی میں۔ اس گھر کے در و دیوار سے سوگواریوں، اداسیوں، خاموشیوں اور مایوسیوں کے بادل چھٹ جانے کی خوشی میں ــــ خوشیوں کے ہنگامے بپا تھے کہ سب سے بڑا غم شہزاد کی جدائی تھی ــــ تو سب سے بڑی خوشی شہزاد کی آمد تھی۔ یعنی بہاروں کی آمد تھی۔

شہزاد کی نئی زندگی ــــ تقدیس کی صحت یابی کی خوشی میں سعدیہ بیگم نے ایک جشن کا انتظام کیا تھا۔ جشنِ بہاراں اپنے عروج پہ تھا۔

انہیں بہاروں کے جشن میں دل و نظر کے لیے نظاروں میں اور بھی حسن بکھر گیا۔ جب بینڈ باجے کی آوازوں میں موسیقی کی دلنواز دھنوں میں، پٹاخوں کے شور میں پھلجڑیوں کا زور تھا۔ برقی قمقموں کی جھالروں، لڑیوں اور سہروں کی خوبصورت آرائش میں رنگا رنگ روشنیاں پھوٹ پھوٹ پڑ رہی تھیں۔ ایسے میں — بڑے خوبصورت — بڑے دلکش منظر میں، بڑے خوبصورت، بہت قیمتی، سنہری جھلمل جھلمل کرتے کپڑوں میں لپٹی تقدیس، گھونگھٹ میں چہرہ چھپائے، جھکی جھکی، جگ مگ کرتے زیورات سے لدی پھندی — شہزاد کی دلہن — شہزاد کے ساتھ، ان کے آگے گھوڑے پہ بیٹھی تھی۔

شبانہ بھی بہت خوبصورت زرتار غرارہ سوٹ پہنے، بڑا بھاری قرمزی دوپٹہ سنبھالتی، بڑے فخر سے، خوشیوں سے جھومتی، ناز سے اٹھلاتی، نزاکت سے بل کھاتی، شہزاد کے گھوڑے کی بھاگ پکڑے آگے آگے، آہستہ آہستہ چل رہی تھی۔ وہ اپنی خوش نصیبی پہ نازاں، بڑی شاداں تھی — کہ آج اپنے بھائی کے گھوڑے کی باگ پکڑے بامراد لوٹ رہی تھی۔ اپنی آپی کو، اپنی بھابی کو سچ مچ دلہن بنا کر ہاروں، پھولوں اور سہرے میں اپنے پیارے بھائی کو چھپا کر، تقدیس کو بھابی کے روپ میں بھائی کے ساتھ گھوڑے پہ بٹھا کر لا رہی تھی۔ وہ کتنی خوش تھی

اتنی خوش کہ اس کے خوبصورت، صحت مند، مسکراتے، چمکتے، خوشیاں برساتے چہرے سے عیاں تھی۔

فرزانہ اور فرح دونوں بھاوجیں، زرق برق لباس میں اپنی پوری عروسی شان کے ساتھ گھوڑے کے ساتھ تھیں۔ شمع اور باقی بہت سی سہیلیاں بھی ایک جھرمٹ کی شکل میں، جھم جھم کرتے کپڑوں میں شبانہ کے پیچھے دولہا دلہن کے گھوڑے کو گھیرے جھوم جھوم کر چل رہی تھیں۔ اس سارے منظر سے شادی کی رونق اور بھی دوبالا ہو گئی تھی۔

سعدیہ بیگم کی سفید بڑی موٹر دلہن کی طرح سجی ہوئی تھی۔ کرن کے جال، پھولوں کے ہار اور لڑیوں سے ڈھکی تھی۔ لڑکیوں کے دائرے کے پیچھے آہستہ آہستہ آ رہی تھی۔ جاوید ان کے بڑے پیارے بیٹے، ان کے بڑھاپے کا سہارا، ان کی خوشیوں کے آسرے، بڑے فرمانبردار، تابعدار بیٹے، امی حضور کے ساتھ اگلی سیٹ پر بیٹھے اور موٹر خود چلا رہے تھے۔ کل شام بڑی دھوم دھام سے بارات ظفر نیازی کے گھر گئی تھی اور اب بڑی شان و شوکت سے واپس آ رہی تھی۔ سعدیہ بیگم کی گاڑی کے پیچھے بہت سی مختلف رنگوں کی گاڑیاں باراتیوں سے بھری آ رہی تھیں۔ بارات کیا تھی، موٹروں کا ایک بہت بڑا جلوس تھا۔ سجی سجائی آراستہ گاڑیاں بے شمار تھیں۔ ڈاکٹر اعجاز کے گھرانے نے مع اپنی بہو "روزی"

کے بڑے ذوق وشوق سے پوری طرح شرکت کی تھی۔ قدیم دوستی میں اعجاز کی غلطی کی وجہ سے کھٹائی نہ آئی تھی۔ دونوں چھوٹی بہنیں عقیلہ اور شکیلہ اس وقت بھی شمع اور دوسری لڑکیوں کے غول میں شامل تھیں۔ بڑے قیمتی بھاری کام کے غرارہ سوٹ پہنے تھیں۔ یہ سعدیہ بیگم نے شہزاد کی بہنوں کی حیثیت سے باقی لڑکیوں کے ساتھ ان کے لیے بھی بنوائے تھے۔ اپنے اکلوتے بھائی کی شادی تو ان بے چاریوں کے نصیب میں نہ تھی۔ بغیر بتائے، بغیر شامل کیے اور دیس میں شادی رچالی تھی۔ اس لیے ان کا زیادہ ہی خیال کیا جارہا تھا۔ وہ بھی بڑی خوش باش شادی کی تمام تقریبات میں شامل رہیں کہ وہ شہزاد کی بہنیں جو تھیں، امتیاز حسین اپنے قدیم دوستانہ مراسم کو قائم رکھنا چاہتے تھے، اگرچہ انہیں اپنے بیٹے کی حرکت پر شرمندگی بہت تھی۔ زمانے سے بھی اور ظفر نیازی سے تو بہت زیادہ شرمندہ تھے۔ لیکن ظفر نیازی بڑے وسیع القلب، روشن خیال انسان تھے۔ انہوں نے اعجاز کی پرواہ کیے بغیر اپنی راہ ورسم کو اسی طرح رکھنا پسند کیا۔ اس لیے امتیاز حسین بھی بیوی بیٹوں سمیت بڑی خوشدلی سے ظفر نیازی اور ان کے گھرانے کے سب لوگوں کی فراخدلی کے شکر گذار شادی میں آئے تھے۔ دولہا دلہن کو بڑے قیمتی تحائف بھی دیئے تھے۔

بارات واپس آ گئی۔ لڑکی رخصت ہو گئی تو ایکدم گھر میں خاموشی اور اداسی چھا گئی۔ مہمان ابھی باقی تھے۔ شور وغل، رونق اسی طرح تھی۔ برقی روشنیاں اسی طرح جل رہی تھی، اسی طرح روشن تھیں، لیکن بیٹی کی رخصتی کے بعد کا مخصوص ماحول تھا۔ سب کے ہوتے ہوئے ایک دلہن کے چلے جانے سے، دلہن والی نشست خالی دیکھ کر دل بھر بھر آیا تھا۔ فوزیہ بیگم کی بیٹی سعدیہ بیگم کے گھر گئی تھی۔ شہزاد بیاہ کر لے گئے تھے۔ لیکن بیٹی کو بوقت رخصتی مل کر کتنا رو رہی تھی۔ تقدیس بھی سسکیاں بھر رہی تھی۔ آنسوؤں کی دھاریں بہہ رہی تھیں۔ اگرچہ بیٹی خود ماں سے بھی زیادہ چاہنے والی، سر آنکھوں پہ بٹھانے والی، دل وجان قربان قربان کرنے والی، زمانے کی دھوپ سے بچانے کے لیے، پلکوں کی چھاؤں میں چھپانے والی خالہ کی بہو بن کر گئی تھی۔ اتنے دلی ارمانوں کی، منتوں مرادوں کی شادی بخیر وخوبی انجام پانے کے بعد بھی اپنے پیارے شہزاد کی موجودگی میں تقدیس کو دے کر بھی دونوں میاں بیوی بڑے اداس اداس تھے۔ گھر پہ، درودیوار پہ اداسی چھائی تھی۔ بڑی خاموشی سی لگ رہی تھی کہ اس گھر سے لڑکی رخصت ہوئی تھی۔

رفتہ رفتہ مہمان بھی جانے لگے۔ ابھی ہزاروں کام پڑے تھے۔ شادی کے ہنگامے سمیٹنے تھے۔ سارے انتظام واہتمام کو ٹھکانے لگانا تھا۔

ابھی بہت کچھ کرنا تھا۔ ملازموں سے کروانا تھا۔ جاوید اور فرزانہ نے تو بہت زور لگایا کہ خالہ جانی اور چچا جان دُلہن کے ساتھ، شہزاد کی بارات کے ساتھ جائیں مگر وہ ان کے بھی بڑے پیارے بیٹے تھے۔ اگرچہ فرزانہ نے جاوید کے ساتھ بارات کی آمد سے پہلے کے سارے کام سنبھالے ہوئے تھے۔

اب فوزیہ بیگم کا اور ظفر نیازی کا دل بے اختیار چاہ رہا تھا کہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر سب کے ساتھ چلے جائیں۔ شہزاد کی دُلہن کا استقبال خود کریں۔ لیکن انہوں نے صاف صاف کہہ دیا کہ ان دونوں کی بارات کی واپسی میں زیادہ ضرورت ہے۔ گھر کے بڑے بیٹے، بڑی بہو، شہزاد کی شبانہ کی بڑی بھاوج، بڑے بھائی۔ سعدیہ بیگم نے بھی ان دونوں کو وہاں رُکنے کی اجازت نہ دی — کہ ان کا مقام بھی کچھ اور تھا۔ ان کی اہمیت ہی بہت زیادہ تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد ہی فوزیہ بیگم اور ظفر نیازی اپنے گھر کے ضروری کاموں کو نمٹا کر آ گئے۔ ان کی اپنی کوٹھی کے عقبی حصے میں سعدیہ بیگم مقیم تھیں۔ وہیں پہنچ گئے۔ باقی سارے کام کل کے لیے چھوڑ دیئے۔

آج اس وقت سب ہی بہت خوش تھے۔ کیسی اداسیوں میں، مایوسیوں میں، ناامیدی کے گھرے اندھیروں میں امیدوں کی روشنی پھیلی تھی چمکتے

سورج کی روشن کرنوں کی روشنی کی طرح ـــ انہیں خوشیوں کی دِلی مرادوں کی روشنی میں چمکتی، کرن کناری سے چمکتی ریشمین مسہری میں دلہن بیٹھی تھی۔ تقدیس چمک رہی تھی۔ قدرتی حسن، زیورات و سنگھار سے چمکتا چہرہ گھونگھٹ میں چھپا تھا۔ خوبصورت ارمانوں کی جوت جگی تھی۔ مرادوں کے دیپ جگمگ جگمگ کر رہے تھے۔ ساری خوشیاں سارا حسن باریک ڈوپٹے کی چلمن سے چھن چھن کر اور بھی خوبصورت نظارہ پیش کر رہا تھا۔ ادھر شہزاد کے حسین چہرے کا نکھار بھی قابلِ دید تھا۔ بڑے پُر بہار، گل و گلزار، دلی مسرّت سے گلنار چہرے کی چمک پہ نظر نہ ٹھہرتی تھی۔ شوخ آنکھوں کی روپہلی چمک، چاند ستاروں کو، سچے موتیوں کو، ہیروں کی چمک کو ماند کر رہی تھی۔ جوشِ مسرّت میں پاؤں رکھتے کہیں تھے تو پڑتے کہیں تھے۔ عجیب ہی نشہ تھا۔ کیف و مستی تھی کہ جھوم رہے تھے، چاند سے چہرے کی پُر نور چمک سے ہر چیز چمک رہی تھی۔ فرش عرش، سارا گھر، سب گھر والے بھی بہت خوش تھے۔

اور جب!

شہزاد نے بڑے ارمانوں سے ہزار چاہت سے تقدیس کا دوپٹہ دونوں ہاتھوں میں پکڑ کر سرکایا، گھونگھٹ اٹھایا، زرتار جال کا دوپٹہ، جال کے دائروں میں دائرے اور ہر دائرے میں پھول بنے تھے۔ دوپٹے کے

اطراف میں چاروں طرف نوکدار کرن اور چوڑا لچکا ٹکا تھا۔ اتنے قیمتی دوپٹے کا پلو جو اٹھا تو۔ جیسے چراغوں میں روشنی نہ رہی — ساری روشنیاں لرزنے لگیں، بلبوں کی روشنی، سہروں کی روشنی، گوٹہ کناری کی سچی چمک سب ہی ماند پڑ گئیں کہ تقدیس کے چہرے کی چمک، ٹھنڈی پرسکون چاندنی کی سی چمک تھی۔ گہرے رنگ کی لپ سٹک لگے ہونٹوں پہ افشاں، موتی موتی کٹورا سی بند آنکھوں پہ افشاں آنکھوں سے نیچے دہکتے رخساروں پہ افشاں چمک رہی تھی۔ تقدیس کے منور چہرے کے نور سے اور زیادہ دمک رہی تھی۔ پھر کانوں میں بڑے بڑے بڑے جڑاؤ جھمکے، دودھیا لمبی گردن میں گلوبند، بڑے چھوٹے ڈھیروں طلائی ہار، ہیروں سے نگینوں سے سچے موتیوں سے جڑے ہوئے، سندر پیشانی پہ چمکتی سرخ بندیا — اس کے اوپر بہت خوبصورت منا سا طلائی ٹیکہ۔

شہزاد تقدیس کی ٹھوڑی کے نیچے انگلی رکھے، کھڑے ہی رہے۔ دیکھتے ہی رہے — دیکھتے ہی چلے گئے — بس دیکھتے ہی رہ گئے۔

وہ خود سنہری کمخواب کی شیروانی، سنہری قیمتی جوتا، سنہری پگڑی اور پگڑی کے گرد، سر پہ لپٹا سہرا، ڈھیروں پھولوں کے، کرن کناری کے ہار پہنے تھے۔ خوبصورت چہرہ محبت کی اور خوشیوں کی سرخی سے سرخ ہو رہا تھا۔ نورانی کیفیات کے نور سے منور تھا — اور — تقدیس کی سچے موتیوں

کی طرح چمکتی، ہیروں سے بھی زیادہ روشن آنکھیں کھلیں، سیاہ بند پلکوں کے نیچے، خوبصورت آنکھیں، پلکوں کے اُٹھنے اور جھکنے میں نظر آنے لگیں۔ دیئے کی نازک سی لَو کی طرح باریک ہونٹ لرز رہے تھے۔ تو شہزاد زیادہ دیر کھڑے نہ رہ سکے، بے خود ہو گئے۔ اس خودی، بے خودی کے عالم میں اپنی تقدیس پہ پروانہ وار نثار ہو گئے —— دیوانہ وار قربان ہوتے رہے —— اور تقدیس مدہوش سی تھی۔ ہزاروں مرادوں کی، سینکڑوں ارمانوں کی، ارمانوں بھری، بڑی رُوح پرور، بڑی پُرسکون، بڑی دلکش، بڑی دلنشیں، بڑی ہی حسین رات اپنا سفر طے کرتی رہی۔

بڑی اذیّت ناک جدائیوں کے بعد، فاصلے مِٹ گئے۔ جدائیاں مٹ گئیں —— خوش قسمتی کے ستاروں کی روشنی میں ساری مجبوریاں مجبور ہو گئیں —— دُوریاں —— دُور ہو گئیں۔ ساری پریشانیاں اندھیروں میں غائب ہو گئیں۔ ماضی کی ستم ظریفیوں کی، کٹھن آزمائشوں کی گھڑیاں کٹ گئیں۔ مقدّر کے سارے شکوے، ساری شکایتیں ختم —— مصیبت کے لمحات میں دن بڑے لمبے اور راتیں بڑی طویل ہوا کرتی تھیں۔ لیکن خوشیوں کی گھڑیوں کے سمٹنے، ملن رات کے گذرنے کا احساس بھی نہ ہوا۔ اتنی چھوٹی، بڑی مختصر، بڑی مسرور، بڑی مخمور

رات نے ہولے سے کروٹ بدلی اور شرمیلی شرمیلی، نشیلی نشیلی، مسکراہٹ لبوں پہ لیے ایک اُجلی صبح نے آنکھیں کھولیں۔ خوش نصیبوں، خوشیوں کی روشن صبح کے اُجالے چار سُو بکھر گئے۔ ویسے ہی اُجلی اُجلی صبح کی طرح بڑی دلکش، بڑی خوبصورت، شرمیلی شرمیلی، نشیلی مسکراہٹ تقدیس کے چہرے پہ کھیل رہی تھی۔ اس کے ہونٹوں کو چھو رہی تھی۔۔۔ نشے سے چُور، مخمور سی بڑی خوبصورت آنکھیں۔۔۔ محوِ خواب شہزاد کے حسین و پُرنور چہرے پہ واری جا رہی تھیں۔۔۔ ایسے ہی باہمی محبّت کے خمار میں۔۔۔ ایک دوسرے کے پیار کی پھوار میں مسرتوں کی، شادمانیوں کی چھاچھم برسات میں شب و روز بڑے حسین بڑے دلنشیں گذرتے رہے۔۔۔ گذرتے گئے۔

انگریزوں کے دیس میں۔۔۔ فرنگیوں کے وطن میں ہفتے کی شام بڑی رنگین، بڑی حسین ہوا کرتی ہے۔ خاص طور پر ایک مشہور کلب میں رقص و موسیقی کا بڑا خوبصورت یادگار پروگرام پیش کیا جاتا۔۔۔ بہت زیادہ ہجوم ہوتا۔ ہزاروں لوگ ٹوٹ پڑتے۔ ٹکٹ کم ہو جاتے۔ بیٹھنے کی جگہ نہ رہتی، ہال میں، کئی کئی مہینے پہلے بکنگ کروانا پڑتی۔ بڑی محنت سے بڑی مشکلوں سے باری آیا کرتی۔ اس وقت فرش سے کئی فٹ اُونچے اخاصے بلند سٹیج پہ رقص ہو رہا تھا۔ رقص کیا تھا، نوخیز جوانی کی عریانی کی نمائش

تھی۔ نازک سی حسینہ پتلی کمر کو لچکاتی، بل کھاتی، خوبصورت جسم کو جھٹکاتی تو لوگ تڑپ تڑپ جاتے، چست اور مہین لباس، انگریز تہذیب کی آئینہ داری خوب ہو رہی تھی۔ رقص کے دوران جھکتی تو قیامت، اٹھتی تو اور بھی مصیبت ـــ دیکھنے والوں میں اپنے پرائے سبھی بیٹھے تھے، انگریزی بھی، دیسی بھی لوگوں کے لیے کھلے عام دعوتِ نظارہ تھی۔ جیسا دیس ویسا بھیس ـــ سب ہی بڑے شوق سے، بڑے ذوق سے سب کچھ دیکھ رہے تھے۔ شراب کے جام پہ جام پئے جا رہے تھے۔ دور پہ دور چل رہے تھے۔ جو شراب نہیں پینا پسند کرتے تھے، وہ سوڈا لیمن پی کر گذارا کر رہے تھے۔ تالیوں، سیٹیوں اور ہا ؤہو کا ایک شور تھا۔ مغربی دھن پہ رقص بھی جاری تھا۔ رقص کے بعد اصل میں محفل رنگ پہ آگئی تھی۔ شراب کا نشہ چڑھ چکا تھا۔ اور پوری محفل ہی رقص میں تھی۔ جوڑے بھی اکیلے بھی ـــ ساتھ بدل جاتے۔ اپنے ساتھی نہ ہونے کا ہوش بھی کسی کو نہ تھا۔ ایک عجیب تماشہ تھا۔ ایسے میں چند تماشبین لوگ بھی آئے ہوئے تھے۔ محض رقص و سرود کی محفل دیکھنا چاہتے تھے ـــ نہ رقص میں شامل ہوتے نہ پینے پلانے میں ـــ!

ڈاکٹر اعجاز بھی اس بزمِ عیش و عشرت میں عموماً آیا کرتے۔ ہفتہ بھر کی تھکاوٹ، محنت کی زیادتی سے دل و دماغ پہ جو بوجھ سا

پڑ جاتا - اس کو دُور کرنے کے لیے کچھ دیر تفریح بھی ہو جاتی -- نئے پرانے دوست احباب سے ملاقات بھی ہو جاتی - اپنے ہم وطن بھی دوست تھے - غیر ملکیوں سے بھی اچھے تعلقات تھے - وقت خوب اچھا گذر جاتا - پروگرام ختم ہوا تو لوگ آہستہ آہستہ ہال سے نکلنے لگے - گھر کی طرف جا رہے تھے - ہجوم تھا -- بہت زیادہ لوگ، جانے انجانے ہر طرح کے لوگ تھے - اعجاز بڑی دیر سے غور کر رہے تھے -- سوچ رہے تھے - بڑی مانوس سی شکلیں تھیں - جانے پہچانے چہرے تھے - دماغ بھی کافی زور ڈالا تو ایک دم یاد آ گیا -- وہ پہچان گئے - پوری طرح سب کچھ یاد آ گیا - دونوں کو پہچان لیا تھا -- اعجاز نے -- سارے واقعاتِ ماضی نظروں کے سامنے آنے لگے -

"ہیلو" اعجاز آگے بڑھے - بڑے تپاک سے، بڑے پُرجوش انداز میں بولے - شہزاد نے پلٹ کر دیکھا -- پہلے تو سمجھ نہ آئی - ایکدم غیر متوقع ملاقات کے لیے تیار نہ تھے -

"اوہ -- ڈاکٹر صاحب! آپ -- کیسے ہیں --" شہزاد کچھ حیران سے تھے، اعجاز کے تپاک اور خود بخود ملنے پر -- پھر بھی اسی پُر تپاک انداز میں جواب دیا - پہلے تو ہاتھ ملایا، پھر بغلگیر ہو گئے - انہیں یاد آ گیا تھا - ڈاکٹر اعجاز نے ظفر نیازی کو بڑا سہارا دیا تھا - تقدیس کی

تیمارداری بڑے خلوص سے کی تھی۔ وہ الگ بات تھی کہ اپنی شادی کو راز ہیں رکھا بلکہ وہ راز تو شہزاد کے لیے اچھا ہی ثابت ہوا۔ خود بخود چھٹکارا ہو گیا۔ اعجاز میدان چھوڑ گئے ــ اور حقدار کو، اصلی حقدار کو اس کا حق مل گیا ــ ورنہ نہ جانے آج کیا کچھ ہو چکا ہوتا۔

یہ سب سوچ کر شہزاد اعجاز سے زیادہ ہی محبت سے پیش آئے۔ شاید اظہارِ تشکر تھا۔ تقدیس سے دست بردار ہو جانے کے لیے ان کے دل ہی دل میں شکر گذار تھے۔ تقدیس خاموش کھڑی تھی۔ گلابی ساڑھی میں صحت مند حسن اور بھی حسین ہو گیا تھا۔ پرس کی زنجیر نما سنہری ڈوری کو انگلی پہ لپیٹتی، کبھی کھولتی، بظاہر بیگانہ سی کھڑی تھی۔ جیسے پہچانا نہیں۔

"آداب ــ مسز شہزاد۔" اعجاز نے مؤدبانہ انداز میں جھک کر تقدیس کو بھی سلام کیا۔ وہ مسکرا کر چپکے سے دو قدم پیچھے ہو گئیں، شہزاد کے ساتھ ــ اور مضبوطی سے شہزاد کے بازو کو دونوں ہاتھوں سے پکڑ لیا ــ اعجاز بڑی اپنائیت سے، بڑی بے تکلفی سے مسکرا مسکرا کر باتیں کرتے رہے۔

"صحت و تندرستی مبارک ہو ــ مسز شہزاد ــ اور شادی بھی۔"

"شکریہ ــ!" تقدیس نے سر جھکاتے آہستہ سے شکریہ ادا کیا۔

"ڈاکٹر صاحب آپ سے ایک درخواست ہے، اگر قبول کریں تو؟" شہزاد نے اعجاز کے شانے پہ ہاتھ رکھتے ہوئے بڑی شرارت سے کہا۔

"جی فرمائیے؟" ڈاکٹر اعجاز ہمہ تن گوش تھے۔ جلدی سے بولے۔

"آپ — ہماری بیگم کے سامنے چہرے پہ نقاب ڈال کر آتے تو اچھا تھا۔" شہزاد شرارت بھری آواز میں بولے، شوخیوں سے چمکتی آنکھوں سے تقدیس کی طرف دیکھ رہے تھے اور اعجاز سے مخاطب تھے۔

دونوں نے بڑی خوشدلی سے قہقہہ لگایا۔ تقدیس بھی مسکرا رہی تھی۔ بات سب کی سمجھ میں آگئی تھی۔ شہزاد اکثر اعجاز کا نام لے لے کر تقدیس کو ستاتے، ان کے نام سے چھیڑتے۔ کوئی نہ کوئی بات کرتے۔ اب اعجاز کو ایکدم سامنے دیکھ کر فوری طور پہ تقدیس گھبرا گئی۔

لیکن شہزاد کی موجودگی!

پھر اعجاز کے ساتھ دوستانہ رویہ!

اعجاز کا بھی انداز برادرانہ، غیر جانبدارانہ سا تھا۔ جلدی سنبھل گئی۔ کافی دیر موٹروں کے قریب کھڑے باتیں کرتے رہے۔ سب کا حال احوال پوچھتے رہے۔ اپنے وطن کا اہلِ وطن کا، گھر والوں کا، شہزاد کے سارے گھرانے کا، خاص طور پر تقدیس کی صحت یابی پہ بڑی خوشی کا اظہار کر رہے تھے۔ اس وقت گلابی ساڑھی میں گلابی رنگت، چہرے پہ حسن و شباب کا رنگ دیکھ کر بے ساختہ

دیکھتے رہے۔ اس شگفتہ گلاب کو ۔۔ کہ انہوں نے تو بیمار لاچار زرد اور تقدیس دیکھی ہوئی تھی۔ خدا کی قدرت، اس کی شان کو دل ہی دل میں مان رہے تھے۔ بڑا کارساز ہے خدائے باری تعالیٰ!۔

اعجاز نے دل و جان سے ان کو اپنا مہمان بنایا۔ کئی دن اپنے پاس بڑے خلوص سے، محبت سے رکھا۔ اپنا کلینک بھی دکھایا۔ بہت سی سیریں کروائیں۔ ان کی تفریحات کے لیے شمار مواقع فراہم کیے۔ کام کی وجہ سے خود ساتھ جا سکتے تو ان کے لیے اچھا انتظام کروا دیتے۔ ان کی شادی کی خوشی میں یہ بڑا سا کئی منزلوں والا کیک بنوایا۔ اپنے دوست احباب کو دعوت میں بلایا۔ اور اس خوش نصیب جوڑے کا اپنے قریبی عزیزوں کی حیثیت سے متعارف کروایا کہ ان کے والد اور ظفر نیازی کے تعلقات اور دوستانہ ایسا ہی تھا کہ قریبی رشتہ داروں سے بھی زیادہ ۔۔ انہوں نے اپنے بزرگوں کے قدیم تعلقات کو بڑی اچھی طرح نبھایا۔ بڑی پرتکلف دعوت دی تھی اعجاز نے ان دونوں کے اعزاز میں ۔۔ ان کی پرخلوص تواضع ۔۔ اپنائیت کے انداز، چہرے پر صداقت کی خلوص کی روشنی تھی۔ محبت کا نور تھا۔ یہ دیکھ کر شہزاد کے دل میں تقدیس کے ذہن میں کسی دھوکے، کسی فریب کا گمان بھی نہ آسکتا تھا۔ سارے شکوک و شبہات جھوٹے لگ رہے تھے۔ ماضی کے واقعات میں صداقت نظر نہ آ رہی تھی۔ لیکن ان کے نجی مسئلہ میں ذاتی بات میں دخل

نہیں دے سکتے تھے۔ کچھ بھی پوچھنا مناسب نہ لگتا تھا۔ پھر بھی اس غلط فہمی کے بارے میں کئی سوال زبان پہ آتے رہے۔ لیکن اعجاز کے کانوں تک نہ پہنچ سکے۔ ان کو وطن سے آئے، گھر بار چھوڑے کئی ہفتے گذر چکے تھے۔ کئی ہفتے کافی مدت بیت چکی تھی ___ ڈاکٹر لقمان کی بیوی کو اچانک لے کر آتے ہیں ___ کہ پلٹ کر بھی نہ دیکھا ___ نہ اپنا اتہ پتہ دیا۔ نہ کسی کا پوچھا۔ ماں باپ کی، بہنوں کی خبر نہ لی۔ نہ اپنے بیوی بچوں کا پوچھا ___ بڑے بے فکر، بے نیاز، بس اپنے کام میں لگے رہے۔

ڈاکٹر لقمان کے ایڈریس پہ گھر والوں نے، بڑی بہنوں نے، چھوٹی بہنوں نے، بہنوں کے بچوں نے بھی خطوط لکھے۔ خیریت پوچھی نہ خطوط کی رسید دی۔ نہ خط لکھا نہ جواب دیا۔ خط لکھنے سے ہمیشہ سے دامن بچاتے رہے اور اب وہ عادات اور بھی پختہ ہو چکی تھیں۔ خیر خیریت پوچھنا تو ایک طرف انہیں بتانے کی بھی کبھی ضرورت نہ سمجھی۔ والدین، بہنیں، رشتہ دار سب ان کی شادی کے ارمانوں میں تھے۔ کہاں ان کی صورت کو ترس گئے۔ ان کی تحریر دیکھنے کے لیے آنکھیں ترس رہی تھیں۔ دوست کی بیوی کو لے کر ایسے گئے کہ پلٹنا تو درکنار سارے رابطے، سارے واسطے ہی قطع کر گئے۔ ہمیشہ کی عادت تھی، جب

بھی گھر آتے، چاہے کئی سال کے بعد آئیں، بڑی اچھی طرح ملتے، بڑی محبت سے پیش آتے، گھر والوں پہ، امّی ابا پہ، بہنوں پہ جی جان سے صدقے واری جاتے۔ اپنی لاپرواہیوں کوتاہیوں کے شکوے ہنس ہنس کر سنتے۔ بڑی بہنوں کی فرمائشیں پوری کرتے، چھوٹی بہنوں کے نخرے دیکھتے۔ ان کی ہر طرح کی نازبرداریاں کرتے، آتے ہوئے ڈھیروں تحائف سب کے لیے، ہر فرد کے لیے اٹھا لاتے۔ یہاں بھی خوب شاپنگ کرواتے — خوب پیسہ بہاتے — غرض یہاں آ کر بڑے سعادت مند بیٹے، بڑے حسّاس بھائی بن جاتے — بہنوں سے پیار لیتے، ان کو اپنا پیار دیتے۔ ان کے بچّوں کا بھی خوب خیال کرتے۔ ڈانٹ ڈپٹ جب خوب ہوتی تو آئندہ خط لکھنے کے پکّے وعدے کر لیتے۔ لیکن جا کر پھر وہی حال — بس خط لکھنے کو کوئی نہ کہے — جواب کی اُمید نہ رکھے کہ بڑی بُری عادت بنالی تھی — خط نہ لکھنے کی، خط کا جواب نہ دینے کی۔

ادھر گھر میں "روزی" مع دونوں بچوں کے براجمان تھی۔ ہزار ناراضگی کے باوجود امتیاز حسین نے بہو کو پورے حقوق کے ساتھ رکھ لیا۔ بچّوں کے تمام اخراجات، تعلیم کا بندوبست اور اعجاز کی بیوی اور اس کے بچوں کی ماں کی حیثیت سے پوری ذمہ داری انہوں نے سنبھال لی تھی۔ کچھ بیٹے کی نالائقی کی وجہ سے شرمندہ تھے۔ اس لیے زیادہ ہی خیال رکھتے۔ اور

سب سے رکھواتے ۔ اس تکلیف کا ازالہ کرنا چاہتے تھے جو اعجاز کی وجہ سے "روزی" اور بچوں کو اٹھانا پڑی تھی ۔ وہ بھی بڑی جلدی گھل مل گئی ۔ یہاں کے ماحول کو کافی حد تک اپنا لیا تھا ۔ زبان، لباس، خوراک وغیرہ سب کچھ اسے بہت پسند آیا ۔ مغربی انداز چھوڑ کر مشرق کی بہو، مشرق کی بیٹی بن گئی ۔ اگرچہ تہذیب یافتہ لوگ، ترقی یافتہ معاشرہ بذاتِ خود انگریزی تہذیب و تمدن کی عکاسی کرتا تھا ۔ بہرحال کہلاتا مشرقی ماحول ہی تھا ۔

وطن میں شہزاد اور تقدیس "روزی" کی حیثیت اور مقام اپنی آنکھوں سے دیکھ کر گئے تھے ۔ امتیاز حسین نے شہزاد کی شادی کے بعد بڑی پُرتکلف دعوت اپنے گھر پہ دی تھی ۔۔۔ ان کے گھر بھی شادی کے دنوں میں پہلے اور بعد بھی "روزی" کی آمد و رفت رہتی تھی ۔ بڑی شان سے بڑی مان سے وہ امتیاز حسین کے گھر میں رہ رہی تھی ۔ اس لیے گردشِ دوراں کی طرح "روزی" کا نام، اس کا کام ہر وقت دماغ میں گردش کرتا رہتا ۔ شہزاد بھی سوچتے رہتے ۔۔۔ تقدیس بھی سوچتی رہتی ۔۔۔ کہ آخر یہ چکر کیا ہے؟ جب دوستی گہری ہوتی گئی ۔ بے تکلفی کافی ہو گئی تھی ۔۔۔ تو ۔۔۔ آخر ایک دن شہزاد نے پوچھ ہی لیا ۔۔۔ اعجاز سے روزی کا چکر " اعجاز تو ایکدم سن کر حیران رہ گئے ۔۔۔ " روزی ۔۔۔ ؟ روزی ۔۔۔ کون

روزی ــــ ؟

سوچتے رہے۔ کچھ یاد نہ آیا۔ خاصے پریشان ہوئے ــــ لیکن لاپرواہ انسان فوراً دماغ سے نکال دیا۔ سر کو جھٹک دیا۔ بیکار سی بات تھی ــــ :

"اچھا ــــ اچھا ــــ تو خوب ــــ یہ تو اچھا ہوا، بھلے سے دو پیارے پیارے بیٹے مل گئے اور بیوی بھی گوری چٹی، میم زادی ــــ یہ تو مزہ ہوا نا ــــ نہ ہینگ لگی نہ پھٹکری"

اعجاز بڑی خوشدلی سے قہقہہ لگا رہے تھے۔ ہنستے ہوئے اپنا ہاتھ شہزاد کے ہاتھ پہ دوستانہ انداز میں مارتے ہوئے بولے۔ شہزاد بھی ہنس رہے تھے۔

لیکن ؟

مسئلہ حل نہ ہوا تھا۔ اصل الجھن وہیں تھی۔

"شائید اعجاز ٹال رہے ہیں" شہزاد نے سوچا۔

"سچ سچ بتائیے بھئی اعجاز! یہ معمہ کیا ہے ــــ ؟" شہزاد نے پھر پوچھا۔

"شہزاد بھائی! دیکھئے آپ کو تو اپنی پسند کی بیوی پانے کے لیے اور ان کو من مرضی کا دولہا حاصل کرنے کے لیے کتنے کٹھن مراحل سے گذرنا پڑا۔

اور دیکھئے — اُوپر والے کی مہربانی — کہ ہمیں مفت — بالکل مفت میں سب کچھ ہاتھ آگیا۔" اعجاز نے اُوپر آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے خدا کی مہربانی کا تذکرہ کیا۔

ایسی دلچسپ باتوں سے شہزاد کو اعجاز بہت پسند آئے۔ ہلکی پھلکی مزاحیہ باتیں کرتے تھے، اور یوں ان کی دوستی دن بدن مضبوط ہوتی گئی۔ بڑے اچھے بڑے گہرے دوست بن گئے۔ ظفر نیازی اور امتیاز حسین کی طرح پکّے دوست۔

اور ایک دن!

اعجاز نے بڑی سنجیدگی سے "روزی" سے دست بردار ہوتے ہوئے اصل واقع بتا دیا۔ عقدہ حل کر دیا۔ سارا راز کھول دیا کہ اتفاق سے زمانۂ طالب علمی میں اخراجات کی زیادتی، مہنگائی بہت زیادہ اور روپے پیسے کافی ہونے کے باوجود بھی کم ہوتا تھا۔ مکانوں کی قلت، کرائے بہت زیادہ، ملک میں ہر چیز کی گرانی کی وجہ سے چند لڑکے مل جل کر ایک مکان میں رہتے تھے۔ وہ اور ان کا ساتھی اعجاز نامی ڈاکٹر ایک ہی کمرے میں تھے۔ یہاں کا کھُلا ماحول، لڑکیوں کی آزادی، غیر مردوں سے بے تکلّفی، بربادی کی حدود تک بے راہ روی — اس اعجاز اور روزی کی دوستی بہت بڑھ گئی۔ حد سے بڑھی ہوئی آزادئ نسواں کی وجہ سے ان کو دو بچوں کا باپ اور "روزی" کا قانونی

شوہر بننا پڑا۔

بعد میں دوسرے ڈاکٹر اعجاز نہ جانے کہاں بھاگ گئے کیونکہ ان کے خیال میں شادی کر کے نبھانا اتنا ضروری نہ تھا۔ ویسے مزاج میں رنگینی زیادہ تھی، اور نئی نئی چیزوں کو زیادہ پسند کرتے تھے۔ روزی ان کو تلاش کرتے ہوئے دو تین بار کمرے میں بھی آئی — لیکن ان کا کچھ پتہ نہ تھا کہ کہاں گئے ہیں — اتنے میں وہ خود بھی فارغ التحصیل ہو کر اپنے گھر واپس آ گئے — اپنے گھر میں — اپنی بہنوں کے پاس، اپنے والدین کے پاس — روزی کو اپنے شوہر کے گھر بار کا کچھ علم تو تھا نہیں — پوچھتی پوچھتی ہمارے گھر پہنچ گئی۔

ان کو یعنی ڈاکٹر اعجاز ابنِ امتیاز حسین کو اچانک لقمان کی بیوی کے ساتھ ملک چھوڑ کر آنا پڑا — وہ بے چاری بھی مر گئی — اور میرے خلاف میری عدم موجودگی میں اتنی بڑی غلط فہمی پیدا ہو گئی — اب شہزاد کے بتانے پہ انہیں اصل صورتِ حال کا علم ہوا — تو ہزار لاپرواہ سہی لیکن بڑے پریشان — اپنی کوتاہی پہ غصہ بھی آیا کہ اگر خطوط کا جواب دینے کی عادت ہوتی تو نوبت یہاں تک نہ پہنچتی۔

وہ سوچ رہے تھے ابا جان کو کتنا غصہ آیا ہو گا۔ کتنی بے عزتی محسوس کی ہو گی — امی کیسے پریشان ہوئی ہوں گی — بہنیں کیا سوچتی ہوں گی۔ اِن

کے سارے احساسات بیدار ہو اُٹھے۔

شہزاد اور تقدیس جب ہنی مون کے بعد واپس وطن لوٹے تو اعجاز بھی ان کے ساتھ ہی آ گئے۔ وہ دونوں اپنا ہنی مون کا پروگرام ختم کر کے واپس آ رہے تھے۔ خوشگوار ازدواجی زندگی کی بہاریں لوٹتے، خوشیوں کے جھولے جھولتے ـــ ملک ملک کی سیریں کرتے ـــ خوبصورت شہروں کی سجاوٹیں دیکھتے، خوبصورت مناظر سے لطف اندوز ہوتے، ایک دوسرے کے محبت بھرے، حسین ساتھ سے اور بھی حسین ہو گئے تھے۔ بڑے خوش خوش بڑے شاداں واپس آئے۔

اسبات کی بھی بہت خوشی تھی کہ اعجاز بے قصور ہیں۔ محض نام کی یکسانیت کی وجہ سے اس مظلوم، بے گناہ پہ اتنا بڑا الزام لگ گیا تھا۔ سب کی نگاہوں سے گر گئے تھے۔ اپنا مقام کھو بیٹھے تھے۔ بلاوجہ، بے قصور، انجانے میں ـــ ان کو اصل حالات کی خبر ہی نہ تھی۔ جب علم ہوا تو بھاگے ہوئے آئے ـــ اپنی بے گناہی ثابت کی، اپنے گھر والوں کی پریشانی دور کی۔ ان کے دل سے اپنے متعلق ساری غلط فہمیاں دُور کر دیں اور یوں ساری فضا صاف ستھری ہو گئی۔

ظفر نیازی اور امتیاز حسین نے سفارت خانے کی مدد سے روزی کے اصل شوہر ڈاکٹر اعجاز کو ڈھونڈ نکالا۔ اس کے بیوی بچوں کو بخیریت

اس کے سپرد کیا۔ جاوید، شہزاد اور اعجاز کی کوششیں بھی اس مہم میں برابر شامل تھیں۔

بعد میں بھی "روزی" ان سب سے ملنے کے لیے آتی رہی، کیونکہ ان لوگوں کا سلوک بہت اچھا تھا۔ بہت لگاؤ ہو گیا تھا اس کو۔ خاص طور پر دونوں بچوں کو تو سب بہت ہی پیار کرتے تھے۔ شکیلہ کے تو وہ "پکے" دوست تھے۔

گذشتہ چھ ماہ پہلے شہزاد کی شادی کے بعد چند دنوں "تک" دعوتوں پارٹیوں کا سلسلہ جاری رہا۔ بڑی گہما گہمی تھی۔ ہر وقت، ہر روز ایک جشن کا سماں رہتا۔ پھر شہزاد تقدیس کو لے کر ہنی مون منانے کے لیے یورپ اور دوسرے ملکوں، تقریباً ساری دنیا کے دورے پہ چل پڑے۔ کئی مہینے کی خوب سیر و تفریح کے بعد واپس آئے تھے۔ خوشحالی، فارغ البالی کی وجہ سے دونوں کی صحت قابلِ رشک، رنگ وروپ قابلِ دید تھا۔ چمکتے چہرے، صحت مند بدن شہزاد تو خیر پہلے ہی اچھے بھرے بدن کے تھے۔ اب تو نازک اندام تقدیس دبلی دبلی، پتلی کمر والی تقدیس بھی بدلی بدلی تھی۔ خوب صحت مند سُرخ و سفید، فربہی مائل، نزاکت، لطافت کے بجائے اچھی خاصی موٹی موٹی سی لگتی تھی۔ آنکھوں میں سچے موتیوں کی چمک۔ چہرے پہ کندنی دمک تھی۔ ہر وقت متبسم، ہر وقت بشاشش۔ پھر بھی کچھ گھبرائی سی، شرمائی رہتی۔

سب میں بیٹھنے، سب کے سامنے آنے سے کترائی کترائی رہتی۔

ماہ اکتوبر کی سہانی شام تھی۔

موسم بڑا خوشگوار تھا۔

سب افرادِ خانہ ڈرائینگ روم میں بیٹھے تھے کہ باہر کچھ خنکی بڑھ گئی تھی۔

"خالہ جانی — اب بتائیے — اپنی بیٹی کے بدلے — آپ شہزاد کی بیٹی سے بدلے لیں گے — یا ہماری پیشگوئی کے مطابق پچھلے سارے دعوے، بدلے بھول کر اپنی نواسی کے ناز اٹھائیں گے — نخرے دیکھیں گی، خوب لاڈ پیار میں بگاڑیں گی"۔ شہزاد فوزیہ بیگم کے پہلو میں صوفے پہ ان کے ساتھ بیٹھتے ہوئے شرارت بھرے انداز میں کہہ رہے تھے۔ ہمیشہ کی طرح شرارت کے موڈ میں تھے۔

فوزیہ بیگم سامنے دیوار کے ساتھ صوفے پہ بیٹھی تھیں۔ بڑی خوبصورت چھوٹی سی ٹوکری گود میں پڑی تھی۔ پیازی رنگ کی اون کے گولے اس میں رکھے تھے — اور نرم نرم اون سے سلائیاں پکڑے بُنائی کر رہی تھیں۔ دل میں ہزاروں ارمان تھے، اور چہرے پہ شوق اور چاؤ کی چمک تھی۔

جاوید اور فرزانہ ساتھ ساتھ سامنے کے صوفے پہ بیٹھے تھے۔ جاوید ڈائری میں کچھ لکھ رہے تھے۔ اور فرزانہ جاوید کا سفید سویٹر بُن رہی تھیں۔ پچھلے

سال شروع کیا تھا۔ اب دوبارہ سردی آ رہی تھی۔ اب بھی بات اگلے سال پہ جاتی نظر آ رہی تھی۔ پھر بھی بڑے خلوص سے لگی ہوئی تھیں۔

تقدیس سعدیہ بیگم کے ساتھ نرم نرم کشنوں اور گول تکیے کے سہارے سے دیوان پہ بیٹھی تھی۔ قرمزی رنگ کی ساڑھی، گوری گلابی رنگت کو اور بھی حسین بنا رہی تھی۔ ساڑھی کے بارڈر اور آنچل پہ سفید پھولوں کی بیلیں بہار دکھا رہی تھیں۔ وہ ساڑھی خوب لپیٹ لپاٹ کر بڑی سمٹ سمٹا کر سعدیہ بیگم کے قریب بیٹھی کوئی رسالہ دیکھ رہی تھیں۔ ڈیزائن بک تھی شاید۔۔۔ رنگین صفحات پہ رنگین تصویریں نظر آ رہی تھیں۔

سعدیہ بیگم زیرِلب دعائیں پڑھتی جا رہی تھیں۔ چہرے پہ بڑا تقدس اور پاکیزگی کا نور تھا۔ دعائیں پڑھ پڑھ کر تقدیس پہ پھونک رہی تھیں۔ وہ ساڑھی اپنے گرد لپیٹ کر جو بات چھپانے کی کوشش میں تھیں۔ شہزاد بڑے آرام سے بھری بزم میں اعلان کر رہے تھے۔ ہنس رہے تھے۔۔۔ شرارت کر رہے تھے، شوخی کر رہے تھے۔ آج پھر تقدیس۔۔۔ اسی دیوان پہ اسی جگہ سعدیہ بیگم کے قریب بیٹھی تھیں۔ جہاں کچھ عرصہ پہلے آ کر بیٹھی تھیں تو شہزاد نے ڈرامائی انداز میں، بڑی چاہت سے، خوشیوں سے بھرپور انداز میں اظہارِ محبّت کیا تھا۔ اپنی محبّت کا اقرار

اور تقدیس سے منگنی کا اعلان کر دیا تھا۔ بزرگوں کو اپنی رفیقِ زندگی سے متعارف کروایا تھا ۔ ان کو اطلاع کر دی تھی۔ اس وقت تقدیس شرما کر پھولوں کی نازک ڈالیوں کی طرح جھکتی گئی ۔۔ شرما کر، مسکرا کر، دانتوں میں انگلی دبالی تھی ۔ چہرہ ایکدم سرخ ہو گیا تھا۔ شگفتہ سرخ گلاب کی طرح، تر و تازہ چہرہ ۔

"چل شریر کہیں کا ۔۔" فوزیہ بیگم نے بڑی خوش دلی سے ہنستے ہوئے کہا ۔۔ اور شہزاد کے بالوں پہ پیار سے ایک تھپڑ لگایا ۔۔ وہ آڑے ترچھے خالہ کی گود میں سر رکھے، بچوں کی طرح لیٹے تھے ۔ دونوں باہیں خالہ کے گلے میں ڈالے تھے ۔ اتنے بڑے ہو کر بھی خالہ کے سامنے منّے سے بن جاتے ۔ وہی چار برس کے شہزاد ۔۔ خالہ کے پیار کا بھی وہی انداز تھا ۔ ان کو بھی اپنے شرارتی شہزاد کھلونا سا ہی لگتے ۔

"اس معصوم کا کیا قصور ہے ۔۔ ہنستا تو سب کو تم اور بدلے اولاد سے لیے جائیں ۔۔ اب تو واقعی تمہاری پیش گوئی پوری کرنا پڑے گی۔" دیکھو میں تو ابھی سے لاڈ پیار کی تیاری میں ہوں ۔" فوزیہ بیگم نے سلائیوں میں چڑھا پیارا سا نرم سویٹر شہزاد کے سامنے کرتے ہوئے جوشِ مسرت میں کہا ۔

"اے ۔۔ بیگم حضور! جناب ۔۔ اللہ نظرِ بد سے بچائے ۔

دشمن دور — میں صدقے جاؤں — قربان جاؤں — دُلہن رانی کے"۔
بڑی بی شہزاد کی کھلائی نے آگے ہو کر جھکتے ہوئے تقدیس کی چٹاپٹ
بلائیں لیتے ہوئے کہا۔
"اللہ نے چاہا تو بیٹا ہوگا — شہزاد میاں' نانی جان سے نواسی کے
لاڈ نہ کروائیے — نواسہ آئے گا خیر سے آپ کے گھر بیٹا آئے گا"۔
بڑی بی نے تقدیس کی نظر اتارتے ہوئے — بڑے ہی محبت بھرے
انداز میں خلوص دل سے کہا۔ وہ اپنے پرانے تجربات اور بڑی بوڑھیوں
کے قدیم اقوال و روایات کی روشنی میں — تقدیس کے روشن چہرے
کی — ان کی آنکھوں کی کندنی دمک سچے موتیوں کی چمک پر قربان
ہوتے ہوئے — دعائیں پڑھ کے دم کرتے ہوئے کہہ رہی تھیں۔
" خدا خیر رکھے — ساتھ خیریت کے خوشیوں کی گھڑیاں آئیں۔
دونوں خدا کی نعمتیں ہیں — ہمارے لیے بیٹی بھی ہیروں سے کم نہیں۔
بیٹا ہو یا بیٹی دونوں برابر ہیں"۔ سعدیہ بیگم نے بڑی محبت سے تقدیس
کے چہرے پہ ہاتھ پھیرتے ہوئے محبت سے بالوں پہ پیار کرتے ہوئے
کہا — !
"بھابی جان — ہمارا بھتیجا ہوگا نا — تو ہم بھابی جان سے کنگن
چوڑیاں لیں گے، ہیروں والی مالا بھی —" شہناز نے تقدیس کے گلے میں

باہنیں ڈال کر پیار کرتے ہوئے کہا۔ وہ تقدیس کے پیچھے، تخت کے کونے پہ ایک گھٹنا رکھے کھڑی تھی۔ گلابی سوٹ پہنے تھیں۔ قمیض کے دامن اور گلے پہ ریشمیں رنگین دھاگوں سے بڑی نازک بیل کڑھی تھی۔ لاپرواہی سے دوپٹہ گلے میں پڑا تھا۔ تقدیس مسکرا رہی تھیں۔ شبانہ کے پیار کے جواب میں ہاتھ پکڑ کے اپنے ساتھ سامنے بٹھا لیا۔ سعدیہ بیگم کے قریب۔ اپنے دونوں کے درمیان میں ـــــ منہ سے کچھ نہ کہا۔

"میری پیاری گڑیا ــــ میری رانی ــــ تم کنگن چوڑیاں کہہ رہی ہو۔ ہم تو تمہارے لیے جھومر، جھلنیاں، جھانجر، پازیب سب کا بندوبست کر لائے ہیں۔" شہزاد صوفے پہ سیدھے ہو کر اٹھ بیٹھے اور شبانہ سے مخاطب تھے۔ ہونٹوں پہ مخصوص مسکراہٹ تھی ــــ آنکھوں میں شرارت چہرے پہ خلوص اور پیار تھا ــــ ڈھیروں پیار تھا اپنی پیاری سی چھوٹی بہن کے لیے ــــ میری بہن میں تو تمہیں سارا جہاں دوں گی ــــ سارے جہاں کی خوشیاں لاؤں گا۔" شہزاد کی آواز میں بڑے بھائی کا پیار اور انداز میں اپنے مقام کی ذمہ داری بھی تھی۔ چھوٹی بہن کے مستقبل کا ہر خیال تھا۔

"جی بھائی جان ــــ کیا ــــ؟" شبانہ کچھ نہ سمجھتے ہوئے حیرانی سے

انجان سی بھائی کی طرف دیکھتی رہی۔ بھولی بھالی نادان سی لڑکی۔

"میری بچی ـــ" اللہ خوش قسمت بنائے ـــ نیک نصیب ہو۔"
سعدیہ بیگم نے شبانہ کو باہوں میں لے کر سینے سے لگاتے ہوئے پیار کرتے ہوئے دعائیں دیں ـــ ان کی آنکھوں میں نمی تھی اور لہجہ بھی بھیگ رہا تھا ـــ بیٹی پرایا دھن، پرائی امانت ـــ آج نہیں تو کل رخصت ہو جائے گی ـــ اس کی خوش نصیبی کے لیے دعا گو تھیں ـــ
شبانہ نے امی کے دونوں ہاتھ آنکھوں سے لگا لیے ـــ بڑی محبت سے ہونٹوں سے لگا لیے۔

"میری امی جان ـــ امی حضور!" اور بیگی سی شبانہ امی سے لپٹ گئی ـــ رونے لگی ـــ شہزاد نے جلدی سے فضا کو صاف کرنے کے لیے کہا۔

"اماں ـــ آپ تو بس اب جھولے، کھٹولے، کھلونوں، جھنجنوں کا بندوبست کیجیے ـــ ہمارا بیٹا یا بیٹی جو بھی آنا ہے ـــ اس کے استقبال کی تیاری کیجیے ـــ آپ نے بیٹے کا آرڈر دیر سے بک کروایا ہے، اماں بی ـــ" شہزاد اپنے بچپن کی آیا ـــ بڑی بی سے اپنے مخصوص انداز میں وہی شرارت بھری باتیں کیا کرتے ـــ وہ ان کی باتوں سے بڑی خوش ہوتیں ـــ نہال نہال ہو ہو جاتیں ـــ ہزاروں دعائیں، نظریں اتارتی رہتیں ـــ ڈھیروں بلائیں لیتی۔

"اللہ پاک — تیرا لاکھ لاکھ بار شکر کرتی ہوں — تو نے اپنے خاص کرم سے — ہمارے شہزاد میاں، ہنستے کھیلتے شہزاد بیٹے زندہ سلامت واپس دلا دیئے —— توبہ توبہ — کیسی ویرانی تھی، بڑی سنسانی تھی — شہزاد کے بغیر اس اتنے بڑے گھر میں۔" بڑی بی آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے دونوں ہاتھ باندھے کہہ رہی تھیں — انہیں شہزاد کی غیر حاضری کے مناظر یاد آتے تو لرز لرز جاتیں — خدا وہ وقت کسی پہ نہ لائے۔"

"بھائی جان — دیکھئے — انصاف کیجئے — آپ سے کتنے سال بعد ہماری شادی ہوئی ہے —— اور ہماری ہونہار بیگم صاحبہ محترمہ چند دن بعد ان کے پیروں تلے جنت بن جائے گی۔" شہزاد اب جاوید سے مخاطب تھے اور تقدیس کی طرف اشارہ کر رہے تھے۔ ہنس رہے تھے۔ جاوید ان کے سامنے صوفے پہ بیٹھے تھے۔ ساتھ ہی فرزانہ بھی تھیں۔ دونوں شہزاد کی بات پہ ہنس دیئے۔

"میرے بھیا جانی — ہمیں تو شادی کے تیسرے دن ہی خدا نے اتنا خوبصورت اتنا بڑا پیارا سا بیٹا دے دیا ہے — جوان جہان پرویز — شرارتی شہزاد۔" جاوید نے بھی بڑی سنجیدگی سے شہزاد کی شرارت کا جواب دیا۔

"فکر نہ کرو، ہم تم دونوں سے آگے ہی ہیں۔" جاوید نے مزید کہا۔ فرزانہ بھی شہزاد کی طرف دیکھ رہی تھیں۔ انہوں نے واقعی چھوٹے بچّے کی طرح، اپنے حقیقی بھائی کی طرح، پیارے بیٹے کی طرح شہزاد کو رکھا تھا۔ ان کی دیکھ بھال کی تھی۔ اس وقت بھی شہزاد کو دیکھتے ہوئے ان کے چہرے پر ممتا تھی۔ آنکھوں میں شفقت تھی، اپنے چھوٹے بھائی، اپنے بیٹے شہزاد کے لیے۔

"اچھا — اچھا — بھابی — ابھی آپ ٹھہر ہی جایئے تو اچھا ہوگا کہ لالی کہتی ہیں — ہمارا بیٹا پیدا ہوگا — تو — پھر — آپ جلدی سے ایک منی سی گڑیا — پیاری پیاری چینی کی گڑیا سی بیٹی، جاوید بھائی اور فرزانہ بھابی کی راج دلاری لا دیجئے گا۔"

شہزاد اب فرزانہ کے آگے جھکے ہوئے تھے۔ ان کے ہاتھوں سے سلائیاں پکڑے ان سے کہہ رہے تھے۔

"پھر ہم ان دونوں کی شادی رچائیں گے — ہمارا گڈا، آپ کی گڑیا" خوب ناچیں گے، گائیں گے، بڑی دھوم مچائیں گے ہم دونوں بھائی۔" شہزاد فرزانہ کو ستا رہے تھے۔ نہ فرزانہ کو، نہ تقدیس کو، نہ بھاوج کو نہ بیوی کو، کسی کو بھی معاف نہ کرتے — دونوں کو چھیڑ رہے تھے۔ فرزانہ تو جاوید کے قریب بیٹھی ہنستی رہی اور تقدیس اسی طرح لیٹی، سمٹی اور سر جھکائے بیٹھی رہی — رُخ دوسری طرف پھیرے تھی — سیدھی مانگ نکال کر ڈھیلے ڈھیلے

ریشمی بال جوڑے میں باندھے تھے۔ بالوں کے اس انداز میں بڑی سادگی، اور اس سادگی میں بڑا حُسن تھا۔ بڑا تقدس تھا۔ چھوٹے چھوٹے طلائی بندے کانوں میں پہنے تھے۔ گلے میں زنجیر اور انگلی میں ہیرے کی انگوٹھی چمک رہی تھی۔ دونوں ہاتھوں میں طلائی چوڑیاں تھیں

" دلہن حضور! ہماری بیگم صاحبہ! اگر بٹیا بھی ہو جائے اور بیٹی بھی تو" وہ اب تقدیس کے شانے پہ ہاتھ رکھے پوچھ رہے تھے۔ تقدیس آہستہ سے ہنس دی۔ ان کی باتوں پہ، شرارتوں پہ شرم بھی آ رہی تھی۔ خاص طور پر جاوید بیٹھے تھے۔ بڑے بھائی بھی تھے۔ جیٹھ بھی تھے۔ لیکن شہزاد کو کسی کی پرواہ نہ تھی۔ نہ کسی کو دیکھتے نہ خیال کرتے۔ نہ ان کو کوئی منع کرتا تھا۔ ایسی باتوں میں اپنی شرارتوں میں انہیں ہی کرتے تھے۔ مانتے بھی کب تھے۔ ہر کسی کو مذاق میں اڑاتے۔ ایک بات کوئی کہہ دے تو دس جواب ان کے پاس ہوتے۔

" پھر آپ کہہ دیجئے!

اک میرا چاند!

اک میرا تارا!

امّی کی لاڈلی!

ابّو کا پیارا!

بیٹی آپ کی!

بیٹیا ہمارا!

بیٹی کا نام توصیف گل، امی کے نام پہ — بیٹے کا نام حماد گل، ابو کے نام پہ۔" ابو کہتے ہوئے بڑے فخر سے اپنے سینے پہ ہاتھ رکھ کر، اکڑ کر کہہ رہے تھے، اور امی کے لیے تقدیس کی طرف اشارہ تھا۔ سب خوش ہو رہے تھے۔ ہنس رہے تھے۔ خدا کا شکر ادا کر رہے تھے کہ اس کا لاکھ لاکھ احسان ہے۔ کہ آج شہزاد، ہنستے، کھیلتے، خوش باش شہزاد سب کے پیارے شہزاد، سب کے ساتھ ہیں — یہ بھی کوئی معجزہ تھا — خدا کی خاص ہی مدد تھی۔ جتنا بھی شکر کیا جاتا — اس کا احسان مند ہوا جاتا کم تھا۔

تقدیس کے تو پہلے ہی بے حساب لاڈ پیار تھے۔ ناز نخرے اٹھائے جاتے تھے۔ بچپن سے لے کر اب تک — اب تو خاطر مدارت کی رکھ رکھاؤ اور تواضع کی نوعیت ہی اور تھی۔ جب سے غیر ملک کی سیر سے واپس آئی ہیں — یہاں تو حال ہی کچھ اور ہو گیا — سعدیہ بیگم کا بس نہیں چلتا تھا کہ جہاں ان کی تقدیس — ان کی بہو — ان کے ہونے والے پوتے کی بننے والی ماں — جہاں پاؤں رکھے وہاں پہلے ہاتھ رکھ دیں۔ وہ پاؤں اٹھاتی تو صدقے واری جاتیں — سینکڑوں ہدایتیں نوکروں کو دی جاتیں — ہزاروں احتیاطیں کرتیں۔ کروڑوں دعائیں دیتی رہتیں — فوزیہ بیگم کی خوشی کا بھی یہی حال تھا۔ نہال

ہو ہو کر جاتیں تقدیس پہ سے ـــ دونوں بہنیں ـــ اپنی اولاد کو ـــ بول بڑھتے، پھلتے دیکھ کر بڑی ہی خوش تھیں۔ ہر وقت صدقہ خیرات، دعائیں درود پڑھا جاتا۔ روزانہ صبح سویرے آنکھ کھلنے سے پہلے تقدیس کا صدقہ دیا جاتا، نظر اتاری جاتی۔ خوشی کے مارے شبانہ کا اپنا پاؤں نہ ٹکتا تھا۔ ہر وقت چہکتی رہتی ـــ جب بھی بازار جاتی ـــ ڈھیروں کھلونے اٹھا لاتی چھوٹے بچے کے لیے جو بھی چیز نظر پڑتی، اٹھا لاتی ـــ سعدیہ بیگم نے درزی کو بچے کے کپڑے، بستروں اور بے شمار چیزوں کا آرڈر کر دیا جاتا۔ روزانہ تیاری دیکھنے جاتیں، اس کو مزید تاکید کرتیں کہ چیزیں اچھی سے اچھی ہونا چاہئیں۔ فوزیہ بیگم نے بچے کے اونی سویٹر، جراب، ٹوپیاں، گرم پاجامے بنانے شروع کیے ہوئے تھے۔ چھوٹے چھوٹے فراک اپنے ہاتھ سے بھی سی رہی تھیں۔ غرض سب ہی بہت خوش مرادوں کے دن تھے۔ ارمانوں کی راتیں تھیں۔ فرزانہ اور جاوید بھی اس خوشی میں برابر کے شریک ـــ سعدیہ بیگم ساتھ ان دونوں کے لیے بھی دعائیں کرتیں ـــ کہ شادی کو واقعی کئی سال گذر گئے تھے۔ ابھی تک اولاد نہیں تھی۔ انہیں فرزانہ بھی بہت عزیز تھی۔ جاوید بھی بہت پیارے تھے۔ ان کے لیے بھی ـــ ان کی اولاد کے لیے بھی وہ دل میں بڑے ارمان رکھتی تھیں۔ ہر وقت دعائیں دیتی تھیں ـــ دعائیں مانگتی تھیں۔

شہزاد صرف شرارتیں ہی نہیں کیا کرتے تھے ۔ بڑے بڑے کام کی، بڑی اہم، بڑی ضروری باتیں ___ بڑی سنجیدہ باتیں ___ اچھے اچھے کام بھی کیا کرتے تھے ۔ مثلاً انہوں نے بے گناہ، بے قصور ڈاکٹر اعجاز کو واقعی بے قصور ثابت کیا ___ ساری غلط فہمیاں دُور ہو گئیں ۔ والدین اور بیٹے کے درمیان فضا کے "تکدر کو صاف ستھرا، پاک صاف کر دیا ۔ ماں باپ کو بیٹا مل گیا ___ بیٹے کو ماں باپ مِل گئے ۔ روزی کو اپنا گھر اپنا شوہر مل گیا ۔

اعجاز کو شہزاد بہت اچھے لگے ۔ شہزاد کو اعجاز بہت پسند آئے ۔ دونوں کی دوستی ہو گئی ۔ خوب گہری، بڑی پکّی دوستی ۔ ادھر امتیاز حسین اور ظفر نیازی بھی دوست تھے ۔ دوستیاں، رشتے داری میں بدل گئیں ۔ دونوں گھرانے ایک دوسرے کے دیکھے بھالے تھے ۔ پسند ناپسند کا مسئلہ اٹھا ہی نہیں، اٹھ ہی نہیں سکتا تھا ۔ منظوری کی رسمیں پُوری ہوئیں ۔ ایجاب قبول ___ منگنی ___ نکاح ___ رخصتی ___ سارے مراحل سے گذر کر رشتہ داری پکّی ہو گئی ___ تعلّقات اور بھی مضبوط ہو گئے ___ کہ اعجاز کی شادی ہو رہی تھی ___ وہ دولہا بنے بارات میں اپنی بہنوں کے گھیرے میں آئے ۔ دلہن لے کر واپس جا رہے تھے ۔ عروسی سرخ کمخواب کا جوڑا ___ بھاری کام کا دوپٹہ، ڈھیروں زیورات، ہیرے

جواہرات پہنے دُلہن رخصت ہو رہی تھی - شبانہ سسرال جا رہی تھی — شہزاد کی بہن — ان کے دوست اعجاز کے ساتھ ظفر نیازی کے دوست امتیاز حسین کے بیٹے ڈاکٹر اعجاز کی دلہن شبانہ — زیورات میں وہ کنگن چوڑیاں اور مالا بھی چمک رہی تھی - جو شہزاد نے اپنے بیٹے — شبانہ کے بھتیجے "حماد" کی پیدائش پر شبانہ کی خواہش پوری کرتے ہوئے اپنا وعدہ پورا کرتے ہوئے بنوا کر دیئے تھے -

دونوں بڑے بھائی دائیں بائیں ساتھ ساتھ جا رہے تھے - جاوید اور شہزاد نے دونوں طرف سے بہن کو سہارا دیا ہوا تھا - جاوید کے ساتھ فرزانہ — اور شہزاد کے ساتھ تقدیس، سعدیہ بیگم کی دونوں بہوئیں — فرزانہ کی دونوں بھابیاں — خوب سجی، سنوری، دونوں ہی بڑی پیاری، بڑی خوبصورت لگ رہی تھیں - دونوں بیٹوں کے پیچھے سعدیہ بیگم اور فوزیہ بیگم اور ان کے درمیان میں ظفر نیازی سب خوش بھی تھے — آنکھوں میں آنسو آ رہے تھے، دل افسردہ بھی تھے — اُداسی بھی تھی تو خوشی بھی تھی — شبانہ اس گھر سے جا رہی تھی - اس بات سے دل اداس تھے - آنکھوں میں نمی تھی تو اس بات کی خوشی تھی - دل مطمئن تھے کہ شبانہ — شہزاد کے سہارے سے اپنے

گھر جا رہی تھی۔ اسبات کی اور بھی خوشی تھی کہ سعدیہ بیگم کے منہ بولے پیارے بیٹے جاوید بھی بہن کو رخصت کر رہے تھے۔

ننھی منی گڑیا ـــ شبانہ کی بھتیجی ـــ سعدیہ بیگم کی بڑی لاڈلی پوتی ـــ جاوید اور فرزانہ کی بیٹی ـــ پھپھو جانی کے ساتھ کا عروسی جوڑا پہنے مُنّا سا ٹیکہ پیشانی پہ سجائے ـــ دونوں بھائیوں حماد اور پرویز کے درمیان بڑی شان سے ٹمکتی جا رہی تھی۔ جاوید کا بیٹا پرویز اور شہزاد کا بیٹا حماد، دونوں چچا زاد بھائی ـــ کمخواب کی سنہری شیروانی، ویسی ہی ترچھی سنہری ٹوپی ـــ آڑا سفید پاجامہ ـــ اور سنہری سلیم شاہی پہنے تھے۔ پھپھو جانی کے آگے آگے، منی سی دلہن فریدہ اور ننھے ننھے سے شہ بالا ـــ سعدیہ بیگم کے دونوں پوتے ـــ یہ منے فرشتے اپنی شبانہ کی رخصتی میں شامل تھے۔ چہرے پہ معصومیت اور پاکیزہ سی مسکراہٹ تھی۔

یہ دلہن کی رُخصتی کا جلوس آہستہ آہستہ کمرے سے راہداری سے ہوتا ہوا وسیع و عریض برآمدے میں پہنچ چکا تھا۔ پیچھے دُولہا کی بہنیں ـــ ان کی سہیلیاں، شبانہ کی سہیلیاں، باقی سب باراتی، ان کے مہمان ـــ میکے والوں کی طرف کے لوگ ـــ بہت زیادہ ہجوم تھا۔

برآمدے کی سیڑھی سے اُوپر۔۔۔ برآمدے میں فرح بھابی اورنج ساڑھی میں زیورات اور سنگھار سمیت کھڑی تھیں۔ کرن کناری کے سہرے، رنگ برنگ غبارے، جھنڈیاں، برقی قمقموں کی مدد سے بڑا بلند مہرابی دروازہ تھا۔ سارا برآمدہ بھی اسی طرح آراستہ تھا۔۔۔ طویل راستے کے آخیر میں فرح بھابی دونوں ہاتھ اُوپر کیئے قرآن پاک پکڑے تھیں۔ ان کے سامنے شمع زرد کپڑوں میں واقعی شمع لگ رہی تھی، چمک رہی تھی۔ دونوں نند بھاوج، فرح اور شمع چاروں ہاتھوں سے گنبد سا بنائے تھیں، اور ہاتھوں میں سنہری جزدان میں قرآن پاک تھا۔

شبانہ کے شانہ بشانہ اعجاز، ساتھ ساتھ، قدم بہ قدم، دولہا دلہن کو قرآن پاک کے سائے میں سے گذارا جا رہا تھا۔ شبانہ کو قرآن پاک کی برکتوں کے سائے میں اس گھر سے رخصت کیا جا رہا تھا، اپنے گھر بھیجا جا رہا تھا۔۔۔ ہزاروں دعاؤں کے ساتھ، ڈھیروں تمناؤں کے ساتھ؟

اس طرح ظفر نیازی اور امتیاز حسین کی قدیم دوستی پُرخلوص جذبات، قابلِ قدر احساسات مل کر دوستی کو اور بھی مضبوط کر گئے۔ شبانہ۔۔۔ وہی شبانہ۔۔۔ جو تقدیس کے لیے اعجاز کا نام نہ لینے

دیتی تھی۔ تقدیس سے شادی کے تذکرے سے ہی بے چین ہو جاتی، روتی تھی، تڑپتی تھی، سعدیہ بیگم کی منت کرتی، ہاتھ جوڑتی تھی۔ تقدیس کے ہاتھ پکڑ لیے تھے کہ دستخط نہ کریں — اعجاز کی رفیقِ زندگی بننے کی حامی نہ بھریں، منظوری نہ دیں — اعجاز —— ان کی آپی کو بیاہ کر لے جائیں — یہ ناممکن تھا۔ شبانہ سوچ ہی نہ سکتی تھی — سوچ کر ہی لرز جاتی تھی — ان کے اتنے پیارے، بہت ہی پیارے بھائی جان کی جگہ — ڈاکٹر اعجاز کو نہ مل سکتی تھی — ڈاکٹر اعجاز کیسے لے سکتے تھے۔ وہ یہ ماننے کے لیے ایسی بات سوچنے کے لیے تیار ہی نہ ہوتی تھی —— وقت وقت کی بات تھی —— وہ وقت اور تھا۔ یہ وقت اور تھا —— آج پورے سولہ سنگھاروں میں سجی، سنوری، دلہن بنی شبانہ اور —— دلہن بھی اعجاز کی —— اسی ڈاکٹر اعجاز کی، جن کا نام سننا گوارا نہ تھا۔ جن کا اپنے گھر آنا ناگوار گذرتا تھا۔ بڑا فرق تھا — شبانہ کی سوچ میں —— اس کے جذبات میں۔

اب تو —— اپنے بھائی جان کی خوشی سے!

شہزاد کی خوشی کے لیے!

شہزاد کے دوست اعجاز کی خواہش پر!

اپنی خوشی سے —— بڑی خوشدلی سے —— اپنی رضامندی سے،

شبانہ، شہزاد کے سہارے سے جارہی تھی۔ سسرال جارہی تھی ـــ میکے سے رخصت ہو رہی تھی۔

وقت کے ساتھ، حالات کے ساتھ، خیالات بھی بدل جاتے ہیں۔ اعجاز کے ساتھ تقدیس کو رخصت کرنے کے لیے سب غمزدہ تھے۔ دل پہ پتھر رکھ کر جگر کے ٹکڑے کو رخصت کرتے ہوتے روتے تھے ـــ اعجاز کی دلہن تقدیس بنے ـــ شبانہ کی بیقراری، آہ وزاری دیکھی نہ جاتی تھی۔

آج نہ صرف شبانہ بدل گئی تھی، بنفسِ نفیس ـــ تقدیس ڈاکٹر اعجاز کی شادی کی تمام تقریبات میں دل وجان سے حاضر، پیش پیش تھیں، بڑی خوش، بڑی بشاش ـــ ان کی شبانہ کی شادی تھی، کیسے نہ ہوتیں ـــ اس وقت کی پریشانی، شہزاد کی عدم موجودگی تھی ـــ ان کا غم تھا ـــ اور اب ساری خوشیاں شہزاد کی وجہ سے تھیں۔ ان کا دم تھا ـــ ان کے وجود کی رونق تھی ـ جیسے شہزاد نہیں تھے تو فطرت نے شام وسحر کی رعنائیاں لوٹ لی تھیں۔ حجر، شجر، فضا، ہوا سب ہی سوگوار رہتے تھے۔ شب وروز کی رونقیں، شہزاد کی بدولت ہوتی تھیں۔ ہوتی ہیں ـــ ہوتی ہیں ـــ ہوتی رہیں گی۔

تاروں پھولوں سے ڈھکی موٹروں کی قطاریں کھڑی تھیں۔ باراتیوں

کی گاڑیاں ـــ شہزاد نے دروازہ کھول کر سب سے اگلی موٹر میں شبانہ کو بٹھایا ۔ سر پہ ہاتھ رکھا ، پیار کیا ـ پھر اعجاز کو گلے لگا کر ، اپنے دوست کو ، اپنے بہنوئی کو پیار کیا اور شبانہ کے ساتھ پچھلی سیٹ پر بٹھا دیا ۔ جاوید نے بھی اسی انداز میں بہن ، بہنوئی کو الوداع کہا ـ اگلی گاڑی چلی تو آہستہ آہستہ سب گاڑیاں روانہ ہو گئیں ـــ شبانہ کو لے کر !

شبانہ کی رخصتی کے بعد ، گھر کی فضا ، بڑی بوجھل ، بڑی خاموش و اداس اداس ہو رہی تھی ۔ شمع اور فرح تو دلہن کے ساتھ چلی گئی تھیں ۔ باقی افرادِ خانہ نے بھی تھوڑی دیر کے بعد اِدھر ہی چلے جانا تھا ـــ گھر کی بات تھی کون سے غیر تھے ـــ رات کا کھانا ، اِدھر ہی سب نے سب کے ساتھ کھانا تھا ۔

لیکن !

سعدیہ بیگم کے ڈرائینگ روم میں سب لوگ چُپ چاپ خاموش بیٹھے تھے ۔ تقدیس اور فرزانہ کمرے کے درمیان میں بڑے قیمتی خوبصورت قالین پہ بیٹھی تھیں ـــ بڑی چُپ سی ، اداس اداس ، اپنی چنچل شبانہ کی کمی بہت محسوس ہو رہی تھی ۔ اس کے مستقبل کی خوشیوں کی دل ہی دل میں دعائیں مانگ رہی تھیں ـــ بار بار آنسو پونچھ رہی تھیں ۔ سعدیہ بیگم

اور فوزیہ بیگم بھی چپ چاپ ——— آہستہ آہستہ بہتے آنسوؤں کو روک رہی تھیں ——— ظفر نیازی کی بیرونِ ملک سے کال آ رہی تھی، وہ سننے کے لیے گئے ہوئے تھے۔ جاوید بھی خاموش تھے ——— اور آج تو خلافِ معمول شہزاد بھی خاموش تھے۔ خاصے افسردہ سے نظر آ رہے تھے۔ چہرے کی رنگت پھیکی پڑی تھی۔ چمکتی آنکھوں میں بار بار دھواں سا چھا رہا تھا ——— دھند سی آ جاتی ——— تو سر کے جھٹکے سے منہ دوسری طرف پھیر کر آنکھیں رومال سے صاف کر لیتے۔

شبانہ ان کی لاڈلی، بڑی ہی پیاری ——— ایک ہی ایک تو بہن تھی۔ بچپن سے اب تک کا زمانہ یاد آ رہا تھا ——— جھگڑے لڑائیاں، صلح صفائی، غصے ناراضگی، سلوک پیار ——— سب ہی کچھ یاد آ رہا تھا۔ یوں لگتا تھا ابھی شبانہ سامنے سے آ کر، دوڑ کر گلے میں باہیں ڈال دے گی۔

"بھائی جان!" اور کوئی فرمائش کرے گی، واقعی شہزاد بڑے اداس تھے ——— براؤن رنگ کا سوٹ پہنے تھے ——— ان پہ یوں خاموشی اور سوگواری کچھ سج نہ رہی تھی ——— وہ تو ہنستے مسکراتے، چھیڑتے، ستاتے ہی اچھے لگتے تھے ——— اب تو گھر میں ماشاء اللہ تین چھوٹے بچے تھے۔ یہ ان کے ساتھ بچہ بن جاتے ——— خوب کھیلتے کودتے۔ حماد اور پرویز میں چھ ماہ کا فرق تھا ——— فریدہ پرویز سے سال بھر چھوٹی ——— منی گڑیا۔

بھی اب دو سال کی ہو گئی تھی۔ سارے جہاں کی باتیں مٹکاتی، شہزاد کو دونوں بچے ہی بہت پیارے تھے لیکن زبیدہ کو ان سے اور شہزاد کو بھی فریدہ سے زیادہ لگاؤ تھا۔ بڑی دوستی تھی دونوں کی۔ اب بھی وہ شہزاد کو یوں خاموش دیکھ کر ماں کی گود سے نکل کر غرارہ سنبھالتی، شہزاد کی گود میں آ بیٹھی تھی ــــ شہزاد بھی اس کو پا کر، شبانہ کی جگہ ننھی شبانہ کو پا کر خوش ہو گئے۔

"بھائی جان! ہمارا گڈا ــــ آپ کی گڑیا" والا پروگرام یاد ہے"۔ وہ سر جھکائے بیٹھے جاوید کے کندھے پہ ہاتھ رکھتے ہوئے مسکرائے۔ حماد اور پرویز دونوں بھائی اپنے کھلونوں سے کھیل رہے تھے۔ قالین پہ ایک طرف بیٹھے بڑے مگن تھے۔

فریدہ کو گود میں اٹھائے سعدیہ بیگم کی گود میں بٹھا دیا۔ ادھر آرام سے کھیلتے حماد کو چھیڑا ــــ پرویز کو ستایا ــــ دونوں کھیل چھوڑ کر بابا جان ــــ اور چچا جان کی طرف متوجہ ہو گئے۔ فریدہ کو دادی کی گود میں دیکھا تو دونوں دوڑتے ہوئے آ گئے۔ جاوید شہزاد کی بات پہ مسکرا رہے تھے۔ اس شرارتی کو کیا جواب دیتے۔

"امی حضور ــــ یہ لیجئے"۔ حماد کو بھی سعدیہ بیگم کی گود میں بٹھاتے ہوئے شہزاد ہنس رہے تھے۔

"یہ دونوں — گڈا — گڑیا" ایک جوڑی اور مکمل ہوگئی۔ ایک رشتہ اور پکا ہوگیا۔" شہزاد خوشدلی سے تالیاں بجاتے ہوئے کہہ رہے تھے۔ کمرے کی بوجھل فضا میں — شبانہ کی کمی کی وجہ سے واقعی دم گھٹ رہا تھا۔ جیسے سانس رک رک کر آنے لگا۔ ویسے بھی آرام سے بیٹھنے کی عادت کہاں تھی — اور واقعی سب خوش ہو رہے تھے شہزاد کی باتوں پہ — فریدہ اور حماد کی منگنی کر رہے تھے۔ بڑے زور کا قہقہہ لگا — خوش ہو کر تینوں بچے بھی تالیاں بجا رہے تھے۔ پرویز بھی دادی کے گھٹنے سے لگے قہقہے لگا رہے تھے — اور شہزاد کی شوخ مزاجی کی وجہ سے سب ہی خوش ہو گئے۔ اُداسی دُور ہو گئی۔

سعدیہ بیگم پوتا پوتی کو گود میں لیے پیار کرتی رہیں۔ ڈھیروں دعائیں دیتی رہیں — پرویز کو بھی ساتھ لگاتے برابر کا پیار اور دعائیں مل رہی تھیں۔ تھوڑی دیر کے بعد تینوں بچے کمرے کے درمیان میں اچھلنے لگے۔ تالیاں بجا رہے تھے۔ خوش خوش ہو رہے۔ آج ان خوشیوں کی گھڑیوں میں ساتھ ہی اداسی کے لمحات میں سب ایک ہی بات سوچ رہے تھے۔

"کاش — یہ باغ و بہار — باغ میں کھلتے یہ ننھے منے شگفتہ پھول — دیکھنے کے لیے آج طاہر نیازی ہوتے تو اس گل و گلزار کو اس

بہار کو، اور بھی حسن مِل جاتا۔

شہزاد نے گھڑی دیکھی، شبانہ کو گئے دو گھنٹے ہو گئے تھے۔ سب کو جلدی جلدی تیار ہونے کے لیے کہتے، گاڑیاں نکلوانے چل دیے، اور تھوڑی ہی دیر کے بعد سب میکے والے شبانہ کے پاس بیٹھے تھے۔ خوش باش، خوشحال — شاداں و فرحاں — بڑے مطمئن، بڑے پُرسکون —!

ادا

ب

سلمیٰ غزنوی کے زیرِ طبع ناول

• قندیل • شاماں • فریحہ

افسانے اور ناول